حیات اللہ انصاری

حصۂ اوّل

کتاب دان لکھنؤ

قیمت پانچوں جلدوں کی
مع کیس ستّر (۷۰) روپیہ
مع محصول ڈاک اور پیکنگ

"لہو کے پھول" نامی پریس و تنویر پریس لکھنؤ اور اعلیٰ پریس، سودیشی پریس، یونین پریس اور جمال پریس دہلی سے طبع ہو کر کتاب والی بی ۱۲ ریور بینک کالونی لکھنؤ سے شائع ہوا۔

حاصلِ حیات

شریکِ حیات

سلطانہ

کے نام

بڑے لیڈروں کے علاوہ جن کے ناول میں حوالے دیے گئے ہیں
سب کردار فرضی ہیں۔ بڑے بڑے مشہور شہروں کے علاوہ جن
ضلعوں اور قصبوں کے گرد کہانی گھومتی ہے وہ بھی فرضی ہیں

پیش لفظ

اس دور کی حیرت انگیز کامیابیوں میں اٹمی طاقت کی دریافت اور انسان کا
چاند پر پہنچ جانا ہی نہیں، اہنسا کے زور سے ہندستان کا آزادی حاصل کر لینا
بھی ہے
اور انتظام

کے اندر بے حد مضبوط بنا لیا تھا۔ اُس نے ایسے لوگوں کی ایک فوج پیدا
کر لی تھی جو انگریزی زبان، انگریزی معاشرت اور کلچر اور ہر انگریزی چیز
کے غلام بن چکے تھے اور اپنے ملک کو اور اس کی ہر چیز کو پست سمجھتے تھے
اس طرح وہ اپنی خودداری کھو چکے تھے اور انگریزی سامراج کو نعمت اور
آزادی کی جدوجہد کو کفران نعمت قرار دیتے تھے۔

ب

ہندستان کے اصل مسائل غریبی، بے کاری، بیماریاں، جہالت، فرقہ پروری، اونچ نیچ اندرچاؤں اور بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی موتوں کو وہ اس طرح دیکھتے تھے گویا کہ ہندستان ایسی باتوں کا مستحق تھا۔ ایسے زبردست راج اور ایسے خراب حالات سے ہندستانی عوام نے اس طرح نکرلی کہ ہتھیاروں کو ہاتھ لگانا کیسا اُنھوں نے اپنے نہتے پن کو اپنا ہتھیار بنا لیا اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بجائے اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں۔ یہ نرالا طرزِ جنگ ابتداء میں کچھ لوگوں کے لیے معمہ رہا تو کچھ لوگوں کے لیے مضحکہ خیز۔ لیکن نمک کی ستیہ گرہ اور ۱۹۴۲ء کی انقلابی تحریک نے ہندستان ہی کو نہیں دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔

جس زمانے میں ہندستان میں عدم تشدد کی تحریک چل رہی تھی، اسی زمانے میں عالمی سطح پر تشدد کی بھی آزمائش ہو رہی تھی کہ وہ مسائل کے حل کرنے میں کس حد تک کارآمد ہو سکتا ہے۔ انگلستان اور فرانس کے سامراج کے مقابل میں جرمنی میں نازیت، اٹلی میں فسطائیت اور جاپان میں فوج پرستی ترقی کر رہی تھی اور اس [illegible] سے دونوں گروہ میں اسلحہ اور فوج کی دوڑ ہو رہی تھی۔ پھر آگے [illegible] دوڑ نے دوسری عالمی جنگ کی شکل اختیار کر لی اور وہ بھیانک لڑائی ہوئی ہے جس کی سفاکیاں اور درندگی تاریخ میں مثال بن گئیں۔ لیکن اس کے باوجود جنگ نے کوئی خاص مسئلہ حل نہیں کیا۔ اس کے برخلاف عدم تشدد نے ہندستان کو آزاد کرا دیا اور ایسی طاقت پیدا کر دی جو بائیس سال سے رجعت پسندی کا مقابلہ کر رہی ہے۔ بہت سے مسائل، اس میں شک نہیں کہ عدم تشدد سے حل نہ ہو سکے، لیکن

اس کے باوجود جو کچھ حل ہوگیا وہ بے حد بڑی چیز ہے۔

اہنسا کی تحریک نے ۲۸ سال میں ہندستان کو آزاد کرالیا اور پھر ایک ایسی طاقت ور حکومت کی بنا ڈالدی جو بائیس سال سے مضبوطی سے قائم ہے۔ زمینداری کا خاتمہ، والیانِ ریاست کا خاتمہ، جمہوریت کا قیام اور اس کے ساتھ سوشلزم کو اور پنج سالہ منصوبوں کو چلانا اور پھر بنکوں کو قومیانا، ایسے ایسے حیرت انگیز کارنامے بھی اسی نے کر دکھائے ہیں، اس کے مقابل میں دوسرے ملک جو ہندستان کے ساتھ آزاد ہوئے تھے، طرح طرح کے انقلابوں اور تبدیلیوں کا شکار رہے اور پھر وہاں کی آزادی اور جمہوریت جلد ہی ڈکٹیٹرشپ میں بدل گئی۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنھوں نے ہندستان کی اس عظیم جدوجہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگرچہ ان میں سے کم ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے سمجھا بھی ہے کہ انھوں نے کیا چیز دیکھ لی ہے اور محسوس کیا ہے اس کے مستقبل [illegible]

اس نے تو [illegible] کہ اپنے ضمیر کے لیے کس طرح اپنے آرام، چین بلکہ زندگی کو قربان کیا جا سکتا ہے اور ایسے قربانی کے عزم سے کیا طاقت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس [illegible] سال انقلابی دھارے نے ہندستان کی زندگی کے ہر ہر گوشے کو متاثر کیا تہذیب کے خشک مقاموں کی آبپاشی کی اور بنجر حصوں کو روئیدگی کے قابل بنادیا۔ صرف سیاست ہی میں نہیں، اقتصادیات، سماجیات، اخلاقیات،

اور عام رہن سہن ہر چیز میں نمو پیدا ہوگیا، دیہاتوں اور شہروں کے درمیان
صدیوں سے جو خلیج چلی آ رہی تھی وہ پٹ گئی، ہریجن اُبھرنے لگے، ہندستان
کے اصل مسائل یعنی غریبی، بے کاری، جہالت، فرقہ واریت، صوبہ واریت اور
دوسری چیزیں، یہ سب مایوسی سے نکل کر حل کی تلاش میں لگ گئیں، ادب پر
اخلاقیات اور فکر پر بھی گہرا اثر پڑا۔ غرضکہ ایک موسم بہار تھا جو ملک کے
گوشے گوشے پر چھا گیا۔ البتہ قدرتی قواعد کے مطابق بہار سے پہلے پت جھڑ
کا موسم بھی آیا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ تو ہندستان کی جدوجہد کی عظمت کو سمجھتے
ہیں اور نہ ہندوستانی قوم کی اس بلندی کو جس نے جدوجہد کو کامیاب بنایا
ایسے لوگ یا تو ناقابل عمل اخلاقی کتابوں کے اصولوں پر ان چیزوں کو پرکھتے
ہیں یا دوسرے ملکوں کے گن گانے والوں کے مبالغوں سے متاثر ہیں۔
ان دونوں باتوں کی وجہ سے ان کے ذہن میں افراد اور قوم کی جو تصویر
ہے وہ بچوں کی کہانیوں کی پریوں کی طرح کی ہے جن کا وجود اس دنیا
میں نہیں۔ اگر حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندستان کی اٹھائیس
سالہ جدوجہد ہندستان [illegible]، تاریخ عالم کا بے حد قیمتی سرمایہ ہے
اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس کو اس کے قدرتی رنگوں میں
محفوظ کر لیا جائے، ممی بنا کر نہیں بلکہ اس طرح کہ گوشت و پوست کے
ساتھ ساتھ جان بھی محفوظ رہے اور زمانہ آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا
محسوس ہو۔ کیا ممکن ہے ایسی بات ؟

مگر کیوں محفوظ کیا جائے اس دور کو ؟ کیا صرف اس غرض سے کہ عالمی عجائب گھر میں ایک عجوبہ کا اضافہ ہو جائے ؟

آج انسان کے قدم چاند پر پہنچ چکے ہیں اور مریخ کے سطح کے واضح فوٹو آرہے ہیں۔ ان کامیابیوں سے سائنس کے لئے نئی جدّوجہد کے راستے کھل رہے ہیں۔ ایک طرف یہ ترقیاں ہیں اور دوسری طرف انسانیت ویسی ہی مجروح ہے جیسی پہلے مجروح تھی۔ آج بھی دنیا کی اکثریت غریبی اور بے کاری کا شکار ہے، فرقہ وارانہ اور نسلی فساد ہو رہے ہیں، پرائے ملکوں پر، ان کے باشندوں کو نکال کر قبضہ کیا جارہا ہے اور بین اقوامی کشیدگی کا پارہ کافی اونچا ہو رہا ہے۔ یہ کیسا تضاد !!

سائنس دانوں میں ایک ایسی خوبی ہے جو اُن کو برابر خوب سے خوب تر کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ یہ کہ سائنس کی دنیا میں جو دریافت ایک بار ہوگئی وہ پھر ہوگئی اور بنیاد میں شامل ہوگئی۔ اب اگر وہ کچھ بدل سکتی ہے تو کسی نئی ایجاد ہی سے بدل سکتی ہے، انسانی خواہشات اور جذبات سے نہیں بدل سکتی

انسان تاریخ کے تجربوں سے جو سیکھا ہے بہت تھوڑا سا سیکھا ہے اور جو سیکھتا ہے وہ بھی بہت سی اِدھر اُدھر کی چیزوں میں مل کر بے جان سا ہو جاتا ہے۔ جدھر بھی نظر دوڑائیے اس انسانی کمزوری کی مثالیں مل جائیں گی۔ فرقہ واریت ہی کی وجہ سے ہندستان تقسیم ہوا ہے جس سے ہر فرقہ کو دکھ پہنچا۔ لیکن اس پر بھی فرقہ واریت زندہ ہے۔ ہندوستان میں

جذبۂ آزادی کو اُبھارنے میں جن عناصر نے سب سے زائد کام کیا ہے وہ ہیں غریبی، بے کاری اور اونچ نیچ۔ لیکن یہ چیزیں نہ صرف باقی ہیں، بلکہ بعض گروہ اپنے اغراض کے لئے ان کو مستقل باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ بین اقوامی دنیا کو لیجئے تو وہ عناصر جنھوں نے جرمنی اور اٹلی اور جاپان کو ساری دنیا کے مقابل میں کھڑا کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں وہ ملک زبردست بربادی کا شکار ہو گئے۔ ان ہی عناصر کی بعض ممالک پھر پرورش کر رہے ہیں۔

وہ اسباب جو ملکوں کے عظیم انقلابوں کا باعث بنے تھے، وہ متعدد بڑے اور چھوٹے ملکوں میں آج بھی باقی ہیں۔ مثلاً زبان، قلم اور جماعت سازی پر پابندیاں زندہ ہیں اور دولتوں کے انبار کے سائے میں فاقہ مستیاں پل رہی ہیں۔ یہ سب آخر کیا ہے اور کیوں ہے؟

تاریخی واقعات ہمارے سامنے پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم کچھ اس طرح جذبات اور اغراض سے متاثر ہو کر ان کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے [illegible] خیز نہیں رہتے۔ اس وجہ سے تاریخ انسانی کردار کو ترقی دینے میں ویسا کام نہیں کرتی ہے جیسا سائنس کی ایجادیں، سائنسی دماغ کو ترقی دینے میں کرتی ہیں۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں نکل سکتی ہے جو تاریخ کو نتیجہ خیز بنا کر پیش کیا جا سکے؟

ہندستان کی جدوجہد آزادی ہندستان کی تاریخ کا جز بن چکی ہے اور نصابی کتابوں میں داخل ہو چکی ہے۔ لیکن تاریخ چاہے کبھی جتنی اچھی لکھی ہوئی ہو، وہ زندگی کی نقاشی میں ناکام رہتی ہے۔ ہم تاریخ کے محتاج

ہیں اعداد کو پڑھنے پر مجبور۔ لیکن میں جب کوئی ایسا واقعہ تاریخ کی کتاب میں دیکھتا ہوں جس سے خود گزر چکا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شخص سرجن کی میز پر بیہوش پڑا ہے اور نشتر اس کے اعضا کو کاٹ کر الگ کر چکے ہیں۔ وہ زندہ تو ہے لیکن ثابت جسم اور کردار کے بغیر ۔۔ کیا تاریخ اس طرح نہیں لکھی جا سکتی ہے کہ وہ گوشت پوست کے ساتھ زندہ ہو جائے اور صاحب کردار ہو اس سے سبق آموز نتائج نکالے جا سکیں اور وہ آنے والی نسلوں کے لئے ڈکشنری کا کام دے؟

جب میں فلسفہ کا طالب علم تھا تو میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ گلاب کے پھولوں کو اگر ماہر نباتیات دیکھے گا تو اس کی نظر اور ہوگی عطر کشید کرنے والے کیمسٹ کی نظر اور ہوگی، مصور کی نظر اور، اور شاعر کی اور لیکن فلسفہ گلاب کو بہمہ وجوہ دیکھنا چاہتا ہے ۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر

میں پوچھ

جا سکے

سہن وغیرہ سب کچھ الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ٹھوس اکائی کی طرح سامنے آ جائیں؟ اگر ایسا ہو جائے تو شاید یہ تصویر نتیجہ خیز ثابت ہو۔

... ایک بے حد ضروری عنصر ہے عوام ۔ ان کی تصویر کشی کیوں کر کی جائے؟ عام طور سے ان کی خدمات کا سہرا لیڈر یا ہیرو کے سر باندھ جاتا ہے۔ لیکن یہ چیز صحیح نہیں ہوتی ہے ۔ لیڈر نہ کسی تحریک کو ایجاد کر سکتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے چلا سکتا ہے۔ وہ پابند ہوتا ہے عوام کی مرضی اور رجحانات کا۔ یہ بڑا نازک

مرحلہ ہے تاریخ کے قلم کے لئے !!

اہنسا کی کامیاب جدوجہد اور آزادی حاصل کرنے کے بعد کی ترقیاں بتاتی ہیں کہ ہندستانی قوم باوجود اپنی بے شمار کمزوریوں کے ایک عظیم قوم ہے، لیکن قوم کی عظمت ایسی چیز نہیں ہے جس پر اس طرح کی چیزیں لکھی جاسکیں، جیسی بڑی شخصیتوں کی سیرت پر لکھی جاتی ہیں۔ قوم میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھوں میں برائیاں بھی ہوتی ہیں اور بُروں میں اچھائیاں بھی۔ اچھے اعمال میں سے بعض کے بڑے پہلو بھی ہوتے ہیں اور متعدد بُرے اعمال کے اچھے پہلو بھی۔ بعض نیک کام حماقت سے بھی سرزد ہو جاتے ہیں اور بعض نیک نیتی سے کئے جانے والے کاموں کا نتیجہ بُرا بھی ہوتا ہے۔ ہر قوم میں اعلیٰ سماجی خدمتوں کے پہلو بہ پہلو خود غرضیاں، تنگ نظریاں اور تعصبات بھی نظر آتے ہیں اور انصاف، شرافت اور اخلاق کی بغل میں جرائم، فساد اور خوں ریزیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یہ متضاد حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ جس قوم کو بھی چاہو اُس کی اچھائیاں گنا کر آسمان پر پہنچا دو، اور جب چاہو بُرائیاں لے کر پاتال میں دھکیل ... ں گی یہ دونوں باتیں غلط۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان ہی متضاد کیفیات میں دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ کون قوم نازک حالات میں مضبوط ثابت ہوتی ہے اور کون آزمائش کے وقت ٹوٹ جاتی ہے اور کس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی کتنی سکت ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ اندھیری رات اور تاریک بادلوں کے اندر ہندستانی قوم کی عظمت کی جوت کو دکھایا جاسکے؟ اگر یہ کام ہو سکتا ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے؟

ط

ایک مسئلہ ہے عدم تشدد کے اصول پر قربانی کرنے والے کی عقل اور جذبات کا، کہ قربانی کے وقت اُن کی ساخت کیا ہوتی۔ ظاہر بات ہے کہ بڑی قربانیاں شدت محبت یا شدتِ نفرت سے ظہور میں آتی ہیں۔ مگر کیا، فرض کیجیے، ایک مرن برت رکھنے والا ہے، اس کے بھی جذباتِ محبت اور نفرت ویسے ہی ہوں گے جیسے عام لوگوں کے ہوتے ہیں جن میں ذاتی پن کا عنصر کافی ہوتا ہے؟ لیکن اگر ایسا ہوا تو ستیہ گرہی کا قربانی کا فیصلہ پوری طرح متوازن نہ ہوگا، اس کو کچھ چھوٹی باتیں بڑی اور بڑی باتیں چھوٹی نظر آئیں گی، نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی قربانی کا پرتو لوگوں کے دلوں پر سیدھا نہ پڑے گا۔ بلکہ اس کے ذاتی پن کے بقدر ہٹ کر پڑے گا۔ یعنی اس کے گرد شکوک رہیں گے، اس وجہ سے نہ تو حق اتنا اجاگر ہوگا جتنا ہو سکتا ہے اور نہ جذبہ قربانی اتنا ابھرے گا جتنا ابھرنا چاہیے - اور یہی وہ دو خاص رد عمل ہیں جو ستیہ گرہ سے ظہور میں آتے ہیں۔

ستیہ گرہ ایک ایسا فعل ہے جس کا تعلق بالکل ہی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور اپنے ضمیر

ستیہ گرہی کو بس سے پیر ہو اور ن نیصد نیا ہے، اسے چل کر دوسروں سے یا خود اپنے دل کو ٹٹولنے سے، اپنے فیصلے کی خامی نظر آجائے، اس سے اس کی خود اعتمادی کمزور پڑ جائے گی اور وہ اپنے فیصلہ کو واپس لے کر مرن برت توڑ دے، یا جو اور قربانی کر رہا ہے اس سے واپس آجائے۔

تحریک آزادی کے دور میں ستیہ گرہ کا جو اصول پیش کیا گیا تھا، اس کا

خلاصہ یہ ہے کہ سامراج سے تو نفرت کی جائے لیکن انگریز افراد یا انگریزی قوم کو نفرت کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں سامراج ہو یا کوئی اور برائی ہو اُس کو بلندی سے دیکھنا چاہیئے تاکہ محسوس ہو کہ افراد اس عظیم کارخانے کے بے حقیقت پُرزے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جب نفرت اتنی وسیع ہو جائے کہ افراد سے نکل کر اصولی چیز بن جائے تو وہ نفرت، نفرت نہیں رہتی ہے بلکہ نصب العین کی محبت کا جز بن جاتی ہے۔ مثلاً سامراج سے نفرت اور آزادی سے محبت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ جب تک کسی شخص کے جذبات اور خیالات اس منزل تک نہ آجائیں وہ تشدّد کے میدان کا ہیرو تو چاہے بن جائے، لیکن عدم تشدّد کے میدان میں کوئی بڑی کارگزاری نہیں دکھا سکتا ہے۔

وہ دل کیسا ہوگا جو نفرت سے عاری اور ذاتیات سے بلند اور نصب العین میں کھویا ہوا؟ اس دل کی جذباتی اور عقلی دونوں رخوں سے ایک جھلک دکھانا تو ضروری ہے۔ اگر براہ راست نہ ہو سکے تو بالواسطہ ہی سہی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو غیر ہندستانیوں کے لئے آج اور ہندستانیوں کے لیے کل، جب کہ گاندھی جی کافی دور ہو جائیں گے، عدم [illegible] تحریک، کراماتوں کی طرح ناقابل فہم چیز بن جائے گی اور تاریخ کی تصویر کشی خارجی اور غیر معقول محسوس ہونے لگے گی۔

لیکن ستیہ گرہی کے دل کی کش مکش کے کچھ رُخ اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ برائی کرنے والے سے نفرت کیوں نہ کی جائے؟ کیا وہ اپنے فعل کا ذمّے دار نہیں ہے؟ دوسرا سوال یہ کہ مَرن برت رکھنے والا کیا سماج کے سفر کی سمت کو

کچھ بدل سکتا ہے؟ کیا فرد کا اتنا دخل ہوتا ہے سماج اور دوسرے افراد کے کردار میں؟ ایک سوال یہ بھی ہے کہ لیڈر ہو یا ستیہ گرہی ہو، وہ سماج کے احساسات اور جذبات سے بالکل ہی بے نیاز ہو کر کام کرتا ہے یا تیار شدہ آتش بازی کو صرف چنگاری دکھاتا ہے؟ ان سب سوالوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فرد اور سماج اور لیڈر اور عوام میں کیا رشتہ ہے؟

اس رشتے کو جوہری کے کانٹے پر تولنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ کیوں کہ نہ ہمارے پاس رشتے کی تحلیل کا کوئی اوزار ہے اور نہ ایسی چیز کے تولنے کے لئے کوئی کانٹا۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اس رشتے کا داخلی مشاہدہ تو کیا ہی جا سکتا ہے۔

آرٹ ویسا بے لاگ تو نہیں ہو سکتا ہے جیسی سائنس ہے۔ لیکن پھر بھی یہ تمام کام جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اگر انجام دیے جا سکتے ہیں تو شاعری، ناول اور مصوری کی مدد سے انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ مجھے اس موقع پر ٹالسٹائے کی وار اینڈ پیس اور مارشل پرینسٹ کی "رے مم برنس آف تھنگز پاسٹ" یاد آ گئیں۔ اس کے علاوہ اور بھی [illegible]
معنی خیز بنا کر

کافی ناولیں لکھی جا چکی ہیں اور فلم بھی بن چکے ہیں۔ ان میں سے بعض بعض اچھے بھی ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیوں نہ میں ایک ایسی ناول لکھوں جو میرے نقطۂ نظر سے ہندستان، ہندستانی عوام، جدوجہد آزادی اور لیڈروں کو پیش کر دے؟
ہندستان کے بعض طبقے بدل چکے ہیں یا بدل رہے ہیں، بعض مٹ چکے ہیں

یامٹ رہے ہیں، مثلاً کسانوں کی اکثریت اب وہ نہیں رہی جو عالمی جنگ سے پہلے تھی۔ اب ان کے پاس پیسہ بھی ہے، طاقت بھی اور خودداری ہوشیاری اور علم بھی۔ مزدور تو بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ یہ سوچنا بھی ممکن نہیں کہ اب سے چالیس سال پہلے وہ کیا تھے۔ اسی طرح ہریجن بھی بدل گئے ہیں۔ یہ تو ہوئے پس ماندہ طبقے۔ لیکن ہندستان کے وہ طبقے بھی یا تو ختم ہو چکے ہیں یا ختم ہو رہے ہیں جو تباہی کا باعث تو تھے ضرور لیکن ساتھ ساتھ وہ ہماری تہذیب کے بعض قابلِ قدر پہلوؤں کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ مثلاً نواب، راجا، والیان ریاست اونچی طوائفیں وغیرہ۔ ان کے عروج اور زوال دونوں سبق آموز ہیں۔ کچھ ایسی اہمیت رکھتے تھے یہ طبقے ہماری قومی زندگی میں کہ ان کو سمجھے بغیر نہ تو سیاسی تحریکوں کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہندستان کے اس ماضی کو جس سے حال اُگا ہے اور مستقبل اُگ رہا ہے۔ اس لیے اگر جدوجہد کی تصویرکشی کی جاتی ہے تو ان طبقوں کا قلمی البم بنانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ "لہو کے پھول" کے لکھنے کا خیال میرے دماغ میں کب آیا اور کیوں کر آیا ... کہ مجھے اس کا احساس اس وقت ہوا ہے جب ننھے سے بیج سے پودا بن ... اس سے پہلے وہ ایک ناقابلِ توجہ چبھن کی شکل میں تھا۔ جب یہ خیال پودا بن گیا پھر تو اس میں ایک سورج کی طرح کشش پیدا ہو گئی اور طرح طرح کے سیارے بھی اس کے گرد آ گئے اس کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ میرے لئے اس سے منہ چھپانا ممکن نہ رہا۔

آزادی کی جدوجہد میرے لئے ایک ذاتی سی چیز ہے۔ کیوں کہ میں اُس

میں شامل رہا ہوں۔ کولائی ٹس کا بے حد سخت مریض ہونے کی وجہ سے جیل تو نہ جا سکا
لیکن دماغی طور پر ہر مرحلے میں شامل رہا۔ بچپن ہی میں نے ۱۹۲۱ء کی تحریک دیکھی
اس کے بعد گاندھی جی کی خود نوشت سوانح حیات پڑھ کر پکا کانگریسی ہو گیا۔ اسی
دور میں مارکس پر کچھ مضامین پڑھے اور ان راہوں پر بھی سوچنے لگا۔ جواہر لال جی
مارکسزم کو لے کر آئے، مگر اس طرح کہ انھوں نے اس چیز کو ہندستان کے حالات کی
چھلنی میں خوب چھان لیا تھا اور جو کچھ پیش کیا تھا وہ قابلِ ہضم تھا اُن کے
خیالات سے ایک نئی روشنی ملی۔

اس طرح میں نے غور و فکر کے کافی میدان طے کیے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں ہندستان
ہفتہ وار کا اڈیٹر بن گیا۔ یہ پرچہ کچھ ایسا تھا کہ اس کے ایک طرف بابیے کے
کمیونسٹ مفکر تھے اور دوسری طرف کانگریس کے خیالات اور تحریکیں۔ میرے خاندان
والے مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے اور اس کو مذہب کا جز سمجھتے تھے۔ اس
طرح دماغ کو ہر منزل پر کسی نہ کسی گتھی کو سلجھا کر راستہ نکالنا پڑا اور قلم سے اُسے
واضح کرنا پڑا۔

زمانہ [illegible]

عظیم ہستیوں
نظریوں نے نظروں کے سامنے دم توڑا اور نامقبول نظریے مقبول بنے۔ ان
مشاہدوں کے سہارے میرا نقطۂ نظر بنا اور جب آگے کے واقعات اس کی تائید
کرتے رہے تو اس میں خود اعتمادی بھی آ گئی۔ اس نقطۂ نظر نے جدوجہد انقلاب
اور قومی ترقیوں کو میرے ذہن میں ایک لڑی میں پرو کر ایک اکائی کی شکل

میں ڈھال دیا۔ اس اکائی کا ویسا ہی کردار بن گیا جیسا کسی دوست کا ہوتا ہے جو ایک متحد ہستی بھی ہوتا ہے، ساتھ ساتھ طرح طرح کی خصوصیات کا مالک بھی۔ یعنی وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت ہوتی ہے — لیکن حالات، واقعات اور تاریخی کرداروں کا اکائی بن جانا اور بات ہے اور اس اکائی کا ایک کہانی میں ڈھال لینا اور بات! کہانی بھی ایسی جو سب باتوں کو سمیٹ لے، مربوط ہو، منطق پر مبنی ہو، اس میں زمانے اور کرداروں کی نشو و نما قدرتی انداز میں نظر آئے، اہم سیاسی نظریوں کو اپنے میں سمو لے زمانے کے تمام حزنیہ، طربیہ اور مزاحیہ ڈرامے بھی اس میں آجائیں۔ ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو، یہ بات بے حد ضروری ہے، کیونکہ غیر دلچسپ کہانی جب میں خود نہیں پڑھ سکتا ہوں تو دوسروں سے کیا توقع کروں — میں سوچنے لگا کہ کیا کر پاؤں گا یہ؟!

جدوجہد آزادی کی تصویر کشی اور بات ہے اور عوام اور طبقوں کی تصویر کشی اور چیز۔ میری زندگی تو بہت محدود سی رہی ہے اور بہت کم طبقوں سے سابقہ رہا۔ پھر کیا میں اتنی بڑی ذمے داری اٹھا سکوں گا؟ آخر مشاہدہ، مطالعہ اور تخیل کو کس حد تک کھینچا جا سکے گا؟ ایک طرف یہ ہچکچاہٹ تھی اور دوسری طرف یہ خیال تھا کہ جو ناول بھی لکھوں گا وہ اپنے نقطۂ نظر سے لکھوں گا، اس طرح وہ بہت سے نقطہ ہائے نظر کے خلاف پڑے گا بات یہ ہے کہ جن پارٹیوں اور افراد نے برطانیہ کی حمایت یا قومی جدوجہد کی براہ راست یا بالواسطہ مخالفت کی تھی، ان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے خود غرضیوں کی

خاطر یہ قدم اٹھایا تھا اور ایسے بھی جو سیاسی گمراہی کا شکار تھے، ان میں سے
کچھ لوگ تو بعد کو بھی ہٹ دھرمی سے اپنے کو صحیح کہتے رہے اور کچھ لوگ خاموش
ہو گئے اور کچھ لوگوں نے اپنی غلطی مان لی ۔ لیکن ان طبقوں میں سے کوئی بھی
یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی غلطی کو یاد دلایا جائے ۔ اس وجہ سے وہ چاہتے ہیں
دنیا والے یا تو تاریخ ہی کو بھول جائیں ۔ یا اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو وہ
تاریخ کو ایسے رنگ میں دیکھیں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ ہو۔ اس
پس منظر میں اگر کوئی ناول ایسا آتا ہے جس کی کوشش ہے کہ وہ تاریخ کو
صحیح شکل وصورت میں پیش کردے تو ظاہر ہے اس کی مخالفت کی جائے گی

ایک چیز اور بھی پیش نظر تھی، وہ یہ کہ اردو ادب اور تنقید ہندستان
کے بنیادی مسائل غریبی اور بے کاری اور جہالت وغیرہ سے بہت متاثر
رہے ہیں اور اسی وجہ سے برطانوی سامراج کے خلاف اور آزادی کی جدوجہد
کے حامی رہے

خاص سیاسی سمت رہے ہیں اور وہ اہنسا اور اس کی بنا پر چلنے والی تحریکوں
اور آزادی کے بعد کی تحریکوں سے ذرا دُور رہے ہیں ۔ اگرچہ اس رجحان
کی وجہ سے ان کی سیاسی فکریں غلط ثابت ہوتی رہی ہیں اور خود اعتمادی
مجروح ہوتی رہی ہے، لیکن پھر بھی وہ اسی راہ پر رہے ۔ ایک جھجک میرے
دل میں یہ بھی تھی کہ یہ لوگ جانے ایسے ناول کو کس نظر سے دیکھیں گے، جو
ان کی غلط فکروں کی غلطیوں کا تذکرہ کرے ؟ کیا یہ زبردست آزمائش نہ
ہوگی ان کی رواداری اور ادبی انصاف کی ؟

ادب اردو میں ایک نوجوان گروہ اس وقت ابھر رہا تھا جو اب کافی پھیل گیا ہے، اس کا رجحان مختلف تھا، لیکن اس وقت یہ تحریک نئی نئی تھی اور اس کے اصول اور ضوابط اور ان کے برتنے کے طریقے میرے لئے اتنے واضح نہیں تھے کہ کہا جا سکتا کہ اس طبقہ پر ناول کا ردِ عمل کیا ہوگا۔

پبلک زندگی میں مجھے مسلسل زبردست مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے کیوں کہ سیاسی اور ادبی نظریے جو زمانے کے ساتھ ابھرے وہ مجھے قابلِ قبول نظر نہیں آئے، میں نے ان کی مخالفت کی اور اس طرح نظریوں کے ماننے والوں کو اپنا مخالف بنا لیا۔ پھر جب زمانے نے ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کے نظریے غلط تھے تو انھوں نے یا تو اپنی غلطیوں کی تاویلیں کرلیں یا ان کو بے حد خفیف اور ناقابلِ توجہ قرار دے لیا۔ لیکن، جیسا کہ زمانے کا دستور رہا ہے، یہ یاد رکھا کہ میں نے مخالفت کی تھی۔

مخالفتوں کو برداشت کرتے مجھ میں دو باتیں پیدا ہوگئی ہیں ایک تو ہے نئی مخالفت مول لیتے ہوئے گھبرانا اور دوسرے جب اس کو قبول کرلوں تو شدائد کو خوشی خوشی قبول کر لینا۔ پہلی بات کی وجہ سے مجھے ناول کے کام کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی رہی۔ لیکن جب اس کا بھوت عشق کی طرح سر پر سوار ہوگیا تو دل نے کہا کہ "اب تو جو ہو سو ہو"

ناول شروع اس طرح ہوا کہ کوئی ٹکڑا یہاں کا لکھا گیا اور کوئی وہاں کا۔ سب سے پہلے "نیا کھاتا" جو ناول کا نواں باب ہے، لکھا

گیا تھا۔ یہ ۱۹۵۶ء تھا یا ۱۹۵۷ء۔ پھر پہلا اور تیسرا باب لکھا گیا۔ اس کے بعد کام دماغ میں ہوتا رہا۔ کاغذ پر بہت کم آیا۔ لکھنے کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۶۲ء سے شروع ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں ناول مکمل ہوگیا۔ ۱۹۶۸ء میں نظرثانی کی گئی۔

ناول کی تیاری میں مشاہدے کے لئے میں عجیب عجیب جگہوں پر گیا ہوں اور عجیب عجیب لوگوں سے ملاقات کی ہے۔ میرے دوست سنیں تو یقین نہ آئے اور اب تو مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔

ناول میں اندراجی کا جو تذکرہ ہے وہ ان کے وزیر بننے سے پہلے لکھا گیا تھا کیونکہ آخری حصے کافی پہلے لکھ لیے گئے تھے۔ اندراجی کے بارے میں جو میری رائے رہی ہے اس کا اظہار قومی آواز کے ایک اداریہ میں جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا' میں نے کیا تھا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ یہ سوال جو بار بار پوچھا جاتا ہے کہ "نہرو کے بعد کون" [illegible]

تذکرہ ایک [illegible] ضروری اضافہ نہیں ہے۔

ناول کے کردار سب فرضی ہیں مگر وہ بنائے گئے ہیں۔ حقائق کے مسالے سے کوئی کردار ایک درجن حقیقی آدمیوں سے مل کر بنا ہے تو کوئی ایک ہزار حقیقی آدمیوں سے۔ تصوری کہو یا آئی ڈیل کہو یا آدرشی کہو، نہ تو یہاں ایسا کوئی کردار ہے اور نہ سیاسی نظریہ۔ ہر ایک کی خوبیاں بھی دکھائی گئی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ اس معاملہ میں نہ کسی قسم کی رو رعایت کو دخل

دیا گیا ہے اور نہ مروت کو۔

بڑے لیڈر جو سامنے نہیں آئے ہیں اور جن کے حوالے دیئے ہیں، ان کو اور ان کے نظریوں کو بھی آئی ڈیل بنا کر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ ناول میں آپ کو بڑے ہیرو نہیں ملیں گے۔ یہ معمولی انسانوں کی کہانی ہے، لیکن یہی معمولی انسان وہ لوگ ہیں جو لیڈروں کو بنا کر بلندیوں تک پہنچاتے ہیں، یہی اصل ہندستان ہیں، یہی موضوع ہیں اس ناول کا۔

اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ اتنے بڑے نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر جو کوشش کی گئی ہے وہ کہاں تک کامیاب ہوئی ہے۔

حیات اللہ انصاری

۲۰۷ وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس۔ نئی دہلی

۱۵ر اگست ۱۹۶۹ء

فہرست مضامین
جلد اوّل

ابواب	عنوان	صفحہ
۱	دھرتی میّا	۹
۲	شکار	۵۸
۳	دل کی ہلچل	۱۰۳
۴	بنجر زمین	۱۱۲
۵	شنکر بھگوان کا	۱۴۸
۶	اسھاگرو،	۱۸۷
۸	شہر کا سفر	۲۲۹
۹	نیا کھاتا	۳۴۳
۱۰	ڈاکو بھگتو	۳۰۴
۱۱	پرانے کوہ و صحرا	۳۲۹
۱۲	صراط مستقیم	۳۷۶
۱۳	جوالا مکھی کا نکاس	۴۲۷

۱۴	لوڈلی بچہ ہائے ہائے	۴۵۷
۱۵	گدّو	۴۸۹
۱۶	کالی راتیں	۵۰۱

دھرتی میّا

(۱)

رات چھائی ہوئی تھی اور ابھی صبح کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی کہ امر سنگھ کو مستقبل کی امیدوں نے چونکا دیا اور کہا کہ سویرا قریب ہے۔ امر سنگھ نے اٹھ کر پہلے چیتیا کو اٹھایا اور پھر دونوں بھائیوں کو، اور کہا کہ کوچ کا وقت آگیا ہے، جلدی کرو

چھکڑے میں سامان رات ہی کو رکھ دیا گیا تھا۔ اس وقت بیل جت دیے گئے پھر سوتے ہوئے دونوں بچوں کو اس میں لٹا دیا گیا اور چاروں نے ہاتھ منہ دھو کر، چاچا اور چاچی کو پرنام کر کے چھکڑے میں بیٹھ گئے، اور اس کو مایوسی بھرے حال سے امید و بیم سے بھرے مستقبل کی طرف ہنکا دیا۔ امر سنگھ کی بیوی جو چیت میں پیدا ہوئی تھی اس وجہ سے نام تو چیتیا رکھا گیا تھا لیکن کہلاتی تھی چیتا۔ وہ جب چھکڑے میں جسے یہ لوگ بیل گاڑی کہتے تھے، بیٹھنے لگی تھی تو اس کے ہاتھ میں امر کو ایک پوٹلی نظر

آئی تھی۔ جب گاڑی گاؤں کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے نکل کر پکی سڑک پر آ گئی اور مدن نے اپنے بھیا کے ہاتھ سے بیلوں کی باگ لے کر اس کو ناریل تھما دیا تو امر سنگھ نے ناریل کے دو کش لیے اور پھر چیتیا سے پوچھا :-

" اس پوٹلی میں کیا ہے ؟"

" پھول اور سیندور "

" ان کا کیا کرے گی ؟"

" ان سے اپنے کھیت کی پوجا ہو گی "

" پوجا ! بلا پر دہت کے پوجا ؟"

امر سنگھ چیتیا کا مطلب سمجھ گیا تھا، لیکن اس نے یہ سوال صرف اس کو چھیڑنے کے لیے پوچھا ۔ وہ خوش تھا اور اس کا باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

چیتیا :- "میں نے اس پوجا کا طور طریقہ سمجھ لیا ہے۔ تم کو بھی بتلا دوں گی کہ کیا کرو "

" تو پوجا کرائے گی ؟"

" ہاں میں، میں۔ بہت اچرج نہ کرو۔ یہ پوجا پوجا نہیں، ایک طرح کا ٹوٹکا ہے۔ اس سے کھیت میا خوش ہو جائیں گی اور بہت اناج پیدا کریں گی "

" مگر یہ پھول کیا شام تک ایسے رہیں گے اور کیا وہاں ایسے جنگلی پھول نہ مل جائیں گے ؟"

" بس رہنے دو تم اپنی باتیں۔ کون جانے کہ وہاں وقت پر پھول ملیں

گئے یا نہیں ۔ نہ ٹے تو کیا ہم یوں ہی بلا کھیت متیا کو پرنام کیے اس پہاڑ پر دھرلیں گے؟

امر سنگھ مسکرا دیا اور آگے کی باتیں سوچنے لگا۔

چھکڑے میں پورے پانچ بورے چاول اور جو کے تھے۔ ایک گٹھری میں دو طرح کی دالیں بندھی ہوئی تھیں۔ اتنے میں چار چھ مہینے چلانا ہے۔ لیکن فکر کی کیا بات! اناج کی جو کمی ہے وہ ترکاریاں، پھوٹ، بھٹے اور اس طرح کی اور چیزیں اگا کر پوری کر لی جائے گی۔ جب کسان کے پاس زمین ہو، دو بیل ہوں، کھیت کے پاس پانی ہو اور کام کرنے کو چھ بازو ہوں اس کو پیٹ بھرنے کی کیا فکر؟ بس بھگوان کی کرپا چاہیے۔

مگر وہاں جنگل ہے اور جنگلی جانور بھی تو ہیں ۔ ایسے جانور جن کے دانت کھیت پر بھی لگے رہتے ہیں اور کھیت والوں پر بھی ۔ سا تھ کن لوگوں کا ہو سکتا تو وہ ! نہ کیسے ہوں ۔ امر سنگھ کے دل میں اس ... سا تھ ...

کی طرف دھیان چلا جاتا تو اس کا بھی جی چاہتا کہ گاڑی لوٹا لے چلو، اگر وہ پوری ربیع کی فصل بھر بلا زمین کے نہ رہا ہوتا تو کبھی ایسی خطرناک کھیتی کی طرف نہ جاتا اور وہ بھی بال بچوں سمیت!

اب سورج اونچا ہو گیا تھا اور سڑک پر دھوپ چھاؤں نے ویسی لکیریں بنا دی تھیں جیسی چھوٹے بچے خاک اور دھول پر انگلیوں سے بنایا کرتے ہیں۔ چڑیاں اپنی چوں چرا کی بھیر دیں

ختم کر کے زندگی کے کام میں لگ چکی تھیں۔ ذرا دیر میں پکی سڑک ختم ہو گئی اور بیل گاڑی کچی سڑک پر اتار دی گئی۔ اس میں ایک گھنٹہ چلی تھی کہ ریتیلی زمین آگئی۔ جہاں تک نظر کام کرتی ریت ہی ریت تھی۔ بس یہاں وہاں ایک دو ببول کے درخت تھے یا تھوہر اور پتاور کے پودے۔ گاڑی کے پہیئے بالشت بالشت بھر ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے بیلوں کو بڑی محنت پڑ رہی تھی۔

رفتہ رفتہ درخت اور جھاڑیاں اور کم ہوتی گئیں۔ اور پہیئے زیادہ دھنسنے لگے۔ کہیں کہیں تو اتنے دھنس جاتے کہ امر سنگھ اور سولہ سالہ مدن کو پہیئے کے ساتھ زور لگانا پڑتا اور چودہ سالہ بالو باگ سنبھالتا۔

ریت کے ذرے چمک رہے تھے، ان سے گرمی پھوٹ رہی تھی اور پہیئے دھکیلنے والوں کے بدن سے پسینے چھوٹ رہے تھے، ان کو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں بچے تو بہت ہی پیاسے تھے اور برابر پانی مانگ رہے تھے۔ لیکن پانی کہاں۔ کسی کنوئیں یا تال کا نشان نہ تھا۔ امر سنگھ سے بڑی بھول ہو گئی تھی کہ وہ اپنے ساتھ پانی لے کر نہیں چلا تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہوا کا ایک آدھ جھونکا آجاتا تھا۔ جس سے گاڑی سے دب کر پھیلنے والی ریت ہوا میں اونچی اڑ اڑ کر چمکنے لگتی تھی۔ ریت کے چمکتے ذروں کو پانچ سالہ مالتی اور ڈھائی سالہ رامو چاندی چاندی کہہ کر پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب ان کی پیاس اور بڑھ گئی تو انھوں نے یہ کھیل چھوڑ دیا اور مسلسل پانی پانی کرنے لگے۔

چیتا امید سے تھی لیکن جہاں ضرورت دیکھتی پہیوں کو ڈھکیلنے کے لیے وہ بھی گاڑی سے کود جاتی۔ جب بچے ذرّوں کا کھیل چھوڑ کر پیاس سے بیتاب ہو کر پانی پانی چلّا رہے تھے اس وقت بھی وہ پہیوں کو ڈھکیل رہی تھی اور بہت سخت پیاس محسوس کر رہی تھی۔ ایکا ایکی چیتا کی نظر ایک جھاڑی پر جا پڑی۔ اس نے دونوں بچوں سے کہا: "وہ دیکھو"

بچے چلّانے لگے، "جھڑ بیریاں، جھڑ بیریاں"

دونوں نیچے اترنے کے لیے مچل گئے۔ مالتی تو کود پڑی اور رامو جو کہ کود نہیں سکتا تھا، رونے لگا۔ چیتا نے لپک کر رامو کو اتارا، یہ دونوں جھاڑی کی طرف بھاگے۔ پیچھے پیچھے چیتا بھی گئی۔ جھاڑی میں سو دو سو کے قریب مٹر کے دانوں سے ذرا بڑے بیر تھے۔ وہ تینوں نے چن لیے۔ گاڑی اتنی دیر میں دھیمی رفتار سے کوئی دو سو قدم نکل گئی تھی۔ اس کو دوڑ کر ان تینوں نے پکڑ لیا اس دوڑ دھوپ سے پیاس بڑھ گئی تھی لیکن کھٹ مٹھے بیروں نے دھیان بٹا لیا۔

اب زمین نرم ہو گئی تھی اس لیے چیتا دونوں بچوں کو لے کر گاڑی پر بیٹھ گئی۔ اور بیروں کو چٹخارے لے لے کر کھانے لگی۔

دس پندرہ ہی منٹ کے بعد پھر بچوں نے پانی پانی چلّانا شروع کر دیا۔ ان کا یہ المیہ گیت جاری تھا کہ ایک طرف سے ایک لومڑی نکل کر گاڑی کے سامنے سے بھاگ گئی، چھلانگیں مارتی نکل گئی۔ چیتا نے کہا:

"ارے یہ جھاڑ دیئی کہاں سے نکل پڑی"

کچھ اس کے کہنے پر اور کچھ لوڑھی کے بوکھلا کر بھاگنے پر پہلے بچے ہنسے اور پھر سب ہنسنے لگے۔ یہ ہنسی وہ تھی جو چھ مہینے سے اجب سے امر سنگھ کو اس کے کھیت سے بے دخل کیا گیا تھا، روٹھی ہوئی تھی۔ اور اس دن لوٹی تھی جب امر سنگھ نے گھر واپس آکر جیتا کو یہ خبر سنائی تھی کہ کھیت مل گیا۔ اس روٹھی ہوئی ہنسی نے ایکا ایکی چھم سے آکر گرمی، محنت اور پیاس کی ملکر راہ کی سب کٹھنائیوں کو مزیدار بنا دیا۔

امر سنگھ سامنے کی طرف اشارہ کر کے بولا:

"وہ دیکھو، تاڑ کا پیڑ، وہاں ریتا ختم ہو جاتا ہے اور وہاں پر ایک بہت اچھا کنواں ہے۔"

جیتا بچوں سے کہنے لگی: "دیکھتے ہو، تاڑ کا پیڑ اپنے بڑے بڑے ہاتھی کے ایسے کان ہلا ہلا کر بلا رہا ہے۔"

"جیتا کے اس شاعرانہ جملے سے بالو کو بڑا مزا آیا۔ کہنے لگا:

"ہم آتے ہیں، ہم آتے ہیں تم کو، نہیں تاڑ بھیا۔"

ریتا ختم ہو گیا اور جنگل ... پانی نہیں ملا، اور راستہ بھی آسان نہیں ہوا۔ یہاں کی زمین میں چھوٹے بڑے گڑھے تھے اور کٹے ہوئے درختوں کی جڑیں تھیں جن سے گاڑی اتنی اچھل رہی تھی کہ دانت بجنے لگے تھے۔ بچے اتنی دیر تک پانی نہ ملنے سے بہت ہی بے حال ہو گئے تھے۔ چھوٹا رامو تو رو کے روتے سو گیا تھا لیکن مالتی جاگ رہی تھی اور ذرا ذرا دیر کے بعد پانی پانی کہہ اٹھتی تھی لیکن اس کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ یہ سفر خوش گوار سفر ہے اور اس کے ختم ہونے پر پیاس کا اور بہت سی ناگوار باتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جب دوپہر ڈھل رہی تھی اس وقت ایک بہت بڑے پیڑ کے نیچے سے آوازیں آتی معلوم ہوئیں۔ قریب جانے پر ایک پھولداری نظر آئی۔ مالتی نے کپڑے کا گھر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے نظارے میں ایسی کھو گئی کہ پیاس بھی بھول گئی۔

امر سنگھ کو یہاں پانی مل گیا۔ پہلے بچوں کو پلایا، پھر بڑوں نے پیا اور ان کے بعد بیلوں نے۔ یہ پھولداری ٹھیکے دار صاحب کی تھی۔ انھوں نے امر سنگھ کو مشورہ دیا کہ رات اسی جگہ گذارو، صبح بن کٹ پورہ جانا۔ امر سنگھ کو بھی یہ مشورہ اچھا معلوم ہوا اور اس نے وہیں بیل کھول دیئے۔

دوسرے دن منہ اندھیرے روانہ ہو کر یہ لوگ ذرا دن چڑھے بن کٹ پورہ پہنچ گئے۔ ان کی نظریں دھرتی اور پانی کا جائزہ لینے لگیں۔ امر کے بائیں ہاتھ کی طرف ٹیلا تھا جس پر سایہ دار درخت تھے اور [illegible]

سے ملا تھا ٹیلے [illegible]

جنگل سے گھرے ہوئے تھے۔ ٹیلے کا جو کنارہ تالاب کے پاس تھا وہاں دو تین کچے مکان اور چھپر نظر آرہے تھے۔ امر سنگھ نے گاڑی بائیں طرف موڑ دی۔ گاڑی ٹیلے کے نیچے نیچے کافی دور تک چلتی رہی۔ چلتے چلتے ایک ایسی جگہ آگئی جہاں سے تال بالکل نظر نہیں آتا تھا اور ایک پکا کنواں بنا ہوا تھا اس جگہ امر نے گاڑی روک دی اور کہا:

"اسی جگہ کنوئیں کے پاس گھر بنائیں گے۔ کنواں صاف کریں گے اور اسی کا پانی پیا کریں گے۔"

"مگر جنگل یہاں سے جتنا پاس ہے، کیا کوئی ڈر کی بات نہیں ہے؟"
"جنگل کا کیا، سب جنگل ہی جنگل ہے۔ کسی طرف ذرا پاس ہے تو کسی طرف ذرا دور۔"
"دوسرے رہنے والوں کے گھر کتنی دور رہیں یہاں سے؟"
امر نے ٹیلے کے اوپر کے ایک درخت کو دکھلا کر کہا: "وہاں سے دیکھو تو سب گھر نظر آ جائیں گے، سب پاس ہی ہیں، جو نئے بسنے والے آئیں گے وہ کنواں دیکھ کر اسی جگہ گھر بنائیں گے۔"
چیتا کو یہ جگہ زیادہ پسند نہیں آئی۔ اس کے خیال میں اگر تال کے پاس گھر ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ تب پانی بھرنا، نہانا اور کپڑے دھونا بہت آسان ہو جاتے لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔
بیل کھول دیئے گئے۔ کنوئیں کی پاس کی زمین کو جھاڑیوں، جھنڈیوں سے صاف کیا گیا۔ اس صاف جگہ پر سامان گاڑی سے اتار کر رکھا گیا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر امر سنگھ مدن کو لے کر جنگل چلا گیا۔ چیتا نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو اس میں پانی بالکل نظر نہیں آیا، جانے کب سے سوکھا پڑا تھا۔ چیتا دو گگریاں لے کر پانی لینے تال کو چلی۔ جب وہ [illegible] معلوم ہوا کہ واقعی سب گھر پاس ہی پاس ہیں اور اوپر سے ہو کر جاؤ تو تال بھی زیادہ دور نہیں ہے۔
پانی لا کر چیتا نے زمین لیپی، چولہا بنایا اور گھڑے رکھنے کے لیے ایک چبوترا بنایا۔
دوپہر ڈھلنے کے وقت امر اور مدن واپس آئے۔ مدن کے سر پر لکڑی کا بہت بڑا گٹھا تھا اور امر کانٹوں کے ایک بہت بڑے بوجھ کو کھینچ کر لا رہا تھا۔ کانٹے دار شاخیں اس طرح رکھ دی گئی تھیں کہ وہ ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی

ہیں۔

امر: "کانٹے ڈھونڈنے میں بہت دیر ہوگئی۔ اور پھر ملے بھی تو اس جگہ جو یہاں سے پاس ہی تھی، اور جس سے ہم بہت آگے بڑھ گئے تھے۔"

پھر امر نے چینا سے کہا کہ تم لکڑیوں کی چھال سے رسی بناؤ اور میں اور بابو لکڑیاں کاٹ کر پھر ان کو باندھ کر ٹٹی بناتے ہیں۔ مدن ان کو کھڑا کرنے کے لئے گڑھے کھودے گا۔

سب نے مل کر ٹٹی بنا کر کھڑی کر دی اور پھر اس میں کانٹے باندھ دیے۔ شام ہوتے ہوتے یہ کام ختم ہوگیا اور ایسی چار دیواری بن گئی جس کے اندر اتنی جگہ تھی کہ گھر والے بھی آ گئے اور بیل بھی اور بیچ میں الاؤ بھی جلا دیا گیا۔ پھر امر سنگھ نے چینا سے کہا: "اب تو بھونری بنا۔"

بھیڑیے کا ڈر ہے؟"

امر سنگھ: "ڈر ہو یا نہ ہو، جنگل کا معاملہ ہے۔ اپنی طرف سے تو ہر طرح کی روک تھام کر ہی لینا چاہیئے۔"

چینا: "اگر ایسی ہی بات ہے تو کیا ان گھر والوں میں سے کوئی ہم کو دس بیس دن کے لئے، جب تک اپنا گھر نہ بن جائے، ٹھیرا نہیں سکتا؟ اپنی طرف تو سب ہی ایسا کر لیتے ہیں۔"

امر: "پھر کیوں نہیں لے گا؟ لیکن کوئی ایسی ڈر کی بات ہو تو ایسا کیا جائے۔"

اس جواب سے چیتا کے دل کی کھٹک گئی نہیں، مگر حیرا ہو رہی۔ چیتا اپنے ساتھ چار پانچ سیر پیا ہوا آٹا بھی لائی تھی۔ اس نے اس میں سے آدھا آٹا گوندھا، پھر اس کے مٹھی کے برابر برابر گولے بنا کر الاؤ کی گرم بھوبھل میں دبا دئے اور اوپر سے کچھ چنگاریاں ڈال دیں۔

اس وقت باہر کے اندھیرے میں حرکت کرتی ہوئی ایک روشنی دکھائی دی اور دو تین آوازیں بھی سنائی دیں۔

"مہتو امر سنگھ تم آگئے؟"

امر: "ہاں۔ کون ؟ مہتو رام لال!"

"ہاں۔ رام رام ... بدھ سنگھ اور جرنا بھی ساتھ ہیں ہم ابھی ابھی کھیت سے لوٹے ہیں۔"

بدھ سنگھ اور جرنا نے بھی رام رام کیا۔ امر نے کہا۔

"اندر آؤ تو ٹٹی کھول دیں؟"

"اب اسے کیا کھولو گے۔ کیا بھوجائی بھی ہیں؟"

"ہاں وہ بھی ہیں۔ دونوں بھائی مدن اور بابو بھی ہیں۔"

"تمھارے پاس بلم ولم بھی کچھ ہے؟"

"نہیں۔ مگر گنڈاسا ہے۔"

"اس سے کام نہیں بنے گا۔ ایک لکڑ بھگا دو دن سے بہت تنگ کر رہا ہے۔ لو یہ بلم رکھ لو۔"

رام لال نے ٹٹی کے باہر سے بلم بڑھا دیا۔ امر نے لے لیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد چیتا نے کہا:۔

"اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں' اچھے لوگ ہیں۔ یہاں اگر مل جل کر نہ رہیں تو کام ہی نہ بنے۔"

چیتا نے بھونریاں نکال کر دیکھیں تو وہ لال لال ہو گئیں تھیں وہ سل بھی ساتھ لائی تھی۔ اس پر اس نے نمک مرچ پیسا۔ پھر بھونریاں اور ان کے ساتھ پتوں پر رکھ کر نمک مرچ ہر ایک کو الگ الگ دے دیا۔ بھونریاں

چیتا نے بچوں و یتے پیار نیا اور ہے سی۔

"کیا لکڑ بگھا اندر نہیں گھس سکتا ہے؟"

"اندر گھسنا ایسا آسان نہیں ہے۔ کانٹے چاہے اس کی کھال پر اثر نہ کریں پر آنکھ اور ناک میں تو چبھ ہی سکتے ہیں۔ پھر اگر وہ اندر گھسنے لگا تو کچھ کھڑ بڑ بھی ہو گی۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں جاگتا رہوں گا۔"

چیتا۔ جاگتا ہے تو سب باری باری جاگیں' تم اکیلے کیوں جاگو۔"

ایسا ہی ہوا۔ سب رات کو باری باری جاگتے رہے' البتہ بابو

اپنی باری میں سو گیا۔

(۲)

امر جس گاؤں سے آیا تھا وہ ہوگا کوئی دو سو گھروں کا گاؤں، مگر اس گاؤں میں صرف آٹھ دس کسان ایسے تھے جو مہاجن کے مقروض نہیں تھے۔ ان کسانوں میں سے ایک یہ خود تھا۔ اس کے مقروض نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا باپ رانی صاحبہ کے سپاہیوں میں نوکر تھا۔

رانی صاحبہ نے اس کی خدمتوں سے خوش ہوکر اس کو کھیت بیل اور گھر بنانے کو زمین دے دی تھی۔ اس کو تنخواہ کے علاوہ انعام واکرام بھی ملتا تھا۔ ان آمدنیوں کی وجہ سے امر سنگھ کا گھرانا کسی کا مقروض نہیں ہوا۔ لیکن ادھر رانی کی آنکھ بند ہوئی ان کی گدی پر ان کا بھتیجا بیٹھا ادھر سپاہیوں نے اکرام سنگھ کو بے دخلی کا پروانہ دے دیا۔ رانی صاحبہ کے بھتیجے کو رانی صاحبہ کے سب وفادار سپاہیوں سے نفرت تھی کیوں کہ ان کے سہارے بیوہ عورت بیس سال تک راج پر قبضہ جمائے بیٹھی رہی تھی اور بھتیجے کی ایک نہ چلنے دی تھی جب بھتیجا گدی پر بیٹھا ہے تو امر سنگھ کا باپ تو پرلوک جا چکا تھا۔ اس لئے وہ اس کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا البتہ اس کے بیٹوں کو بے دخل کرکے کچھ بدلہ لے لیا۔

نئے راجا لال سنگھ کا انتقام شاید بے دخلی پر ختم ہو جاتا اور یہ بھی ہو سکتا

تھا کہ وہ امر سنگھ اور اس کے بھائیوں سے کچھ دنوں، سال چھ مہینے، خوشامد کرواتا اور ناک رگڑ وانے کے بعد معاف کر دیتا، لیکن امر سنگھ کو کچھ تو اپنے پیسے کا غرور تھا اور کچھ باپ کی بنائی عزت کی لاج تھی۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے وہ دوسروں کے کہنے سننے میں آ گیا اور راجا پر ناجائز بے دخلی کا مقدمہ چلا دیا۔ مقدمہ جو چلا تو راجا کی آن بان کا معاملہ آ گیا ——— اور ہوا بھی یہی کہ روپیہ پانی کی طرح بہا اور بے دخلی جائز ثابت ہو گئی۔ جس دن عدالت نے فیصلہ سنایا اسی دن راجا کے پیادوں نے آ کر امر سنگھ کو گھر سے، جو ریاست کی زمین پر بنا تھا، نکال دیا۔

امر سنگھ کو پھر اس ریاست میں پناہ نہ مل سکی۔ ایک رشتے دار کے یہاں، جو ریاست سے بارہ پتھر باہر رہتا تھا اور ایک چھوٹا موٹا کسان تھا، پناہ ملی۔ امر چھ سات مہینے آس پاس کے زمین داروں کے پاس زمین کے [illegible]

سے کوئی بھی ان [illegible] بھاری نذرانہ مانگا۔ اس بیکاری کے زمانے میں امر سنگھ کے پاس جو کچھ رہا سہا تھا سب سوائے ایک گوئی بیلوں کے چلا گیا۔ وہ بھاری نذرانہ کہاں سے دیتا۔ اس طرح امر سنگھ [illegible] کی فصل بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔

ایک روز امر سنگھ نے سنا کہ ایک نواب صاحب اپنی اجڑی ہوئی زمین کو ایک ٹھیکے [illegible] کی معرفت بسا رہے ہیں۔ وہ یہ بات سنتے ہی چل کھڑا ہوا اور ایک دن کا سفر کر کے ٹھیکیدار صاحب کے پاس گیا اور بہت خوشامد و درآمد کی۔ انھوں نے چھوٹا سا نذرانہ لے کر اس کو ایک بہت

بڑا تین گونٹی بھر کا کھیت جو ایک جگہ میں تال کے کنارے تھا دے دیا۔ تین
سال کے لئے لگان معاف کر دیا اور جنگل سے ضرورت بھر لکڑی کاٹنے اور
مویشیوں کو چرانے کی اجازت بھی دے دی۔

(۳)

سب سے پہلے چیتا کی آنکھ کھلی۔ اس کی نظر امر پر، پھر مدن
اور بابو پر پڑی۔ جب دیکھا کہ تینوں سو رہے ہیں تو گھبرا کر بچوں اور پھر
بیلوں کو دیکھا۔ سب موجود تھے۔ چیتا نے بھگوان کا شکر ادا کیا اور دونوں
بچوں کو پیار کیا۔

سبھوں نے اٹھ کر تالاب پر آ کر ضروریات سے فراغت حاصل
کی۔ کوئلے چبا کر دانت مانجھے، منھ دھوئے اور پھر اپنا کھیت دیکھنے چلے۔
چیتا کو فکر تھی کہ ان لوگوں کے [illegible] بیار گھر کے اندر سامان اور اناج کے جو
بورے پڑے ہوئے ہیں ان کو [illegible] جائے، لیکن امر نے سب کے چلنے پر اصرار
کیا اور سب ساتھ چلے۔

سب لوگ پہلے ٹیلے کے کنارے کنارے جس سمت ان لوگوں کی گاڑی آئی
تھی اس کے مخالف چلے، پھر میدان کاٹنے لگے۔ آخر تال کے ایک ایسے کنارے
پر آ گئے جہاں اس کا ایک حصہ زمین کے اندر ذرا دور تک گھس آیا تھا۔ اس کے پاس
کھڑے ہو کر امر سنگھ نے کہا۔ "یہاں سے ہمارا کھیت ہے۔ وہ سامنے والی جھاڑی کا
تک ہے۔"

چیتا مدن اور بابو تینوں تین چار منٹ تک دم بخود اس لمبی چوڑی

چورس زمین کو دیکھتے رہے جو آنکھوں کے سامنے ٹھوس شکل میں پھیلی چلی گئی تھی۔ ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ اتنا بڑا ٹکڑا جو ایک چک میں ہے اپنا ہو سکتا ہے۔ دیر تک ان کا ذہن اس زمین میں ہل چلاتا، بیج ڈالتا، آب پاشی کرتا اور فصل کاٹ کر کھلیان بھرتا رہا۔ آخر چیتیا ایک طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

"ادھر جنگل کی طرف کھیت کہاں تک ہے؟"

امر ہنس کر کہنے لگا۔ "تین سال کے اندر جہاں تک کھیتی بڑھا سکو بڑھا لو۔ سب اپنا ہے۔"

اب تک ان لوگوں کے پاس جو زمین تھی وہ ٹیڑھی میڑھی اور دو ٹکڑوں میں تھی۔ آب پاشی کا وسیلہ وہاں سوائے کچے کنوئیں کے اور کچھ نہیں تھا۔ زمین کو پھیلانے کے راستے ہر طرف سے بند تھے۔ مینڈوں کے بارے دشواریوں سے پاک و صاف تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی تمنی تھی۔ چیتیا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے آنچل پھیلا کر کہنے لگی۔

"اے دھرتی میا۔ اب تم ہم لوگوں کا پیٹ بھر دو اور ان ننگے بدنوں کو ڈھانک دو۔ یہ دیکھو میرے پاس یہی ایک ساری ہے اور وہ بھی کتنی پھٹ گئی ہے۔ یہ دونوں بچے تو ننگے پھر رہے ہیں اور یہ تینوں مرد۔ ان کو سال بھر سے نہ گڑ ملا ہے اور نہ دودھ۔ اور گھی خوشبو کے لئے بھی نہیں ملا۔ تم سب کچھ کر سکتی ہو میا۔"

چیتا نے آج تک اتنی لمبی تقریر نہیں کی تھی۔ تینوں مردوں نے اس کو بہت عقیدت سے سر جھکا کر سنا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی اور امید کے آنسو چھلک آئے۔ بچے تک متاثر ہو گئے۔

چیتا نے پوٹلی، جو وہ ساتھ لائی تھی، کھولی۔ اس میں سے مرجھائے پھول، سیندور، دوب اور دیا سلائی نکلیں۔ اس نے چند مٹی کے ڈھیلے اکٹھا کئے، ان پر سیندور ڈالا، پھر پھول چڑھائے اور دوب جلا دی۔ دوب کا دھواں پتلی سی لکیر کی شکل میں اوپر اٹھنے لگا اور اٹھ اٹھ کر ہوا میں تحلیل ہونے لگا۔

چیتا ہاتھ جوڑے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے پیچھے تینوں مرد خاموش ہاتھ جوڑے کھڑے رہے۔ جب دوب جل چکی تو چیتا نے اس کی راکھ اور کھیت کی مٹی کا ٹیکا سب کے ماتھے پر لگایا اور کہا کہ اب کھیت کے اندر چلو۔

چیتا کا رنگ سا۔۔۔ نال پچکے ہوئے تھے، ماتھے کی ہڈیاں زیادہ ابھری ہوئی تھیں اور ہونٹ چہرے کے اعتبار سے موٹے تھے۔ لیکن اس کی کالی چمکتی ہوئی آنکھیں اور ہموار چمکتے ہوئے دانت ایسی دل کشی رکھتے تھے کہ اس کے چہرے کے سب عیب چھپ جاتے تھے۔ جب وہ دلہن بن کر آئی ہے تو منھ دیکھنے والوں نے کہا تھا کہ بھولے مکھڑے پر بڑا نمک ہے۔ بات سچ کہی تھی ان لوگوں نے چیتا کے بدن کو مسلسل محنت نے اور فاقوں اور نیم فاقوں کی غیر موجودگی نے سڈول اور سبک بنا دیا تھا۔ اس وقت جب اس نے عقیدت سے شوہر اور دیوروں اور بچوں کے ماتھے پر راکھ اور مٹی کا

ٹیکا لگایا ہے وہ بہت خوبصورت اور قابل عزت نظر آرہی تھی۔
چاروں کسان کھیت کے اندر داخل ہوئے۔ کھیت ابھی کھیت نہیں بلکہ کٹا ہوا جنگل تھا۔ اس نئی بستی کے بارے میں جواب جنگل کاٹ کر آباد کی جارہی ہے لوگ کہتے تھے کہ تیس چالیس سال ادھر تالاب کے آس پاس جہاں اب ٹیلا ہے اور اس سے کچھ آگے تک ایک ڈیڑھ دو سو گھروں کا گاؤں بسا ہوا تھا جو کسی وجہ سے اجڑ کر جنگل میں تبدیل ہوگیا تھا اب جنگل کو کاٹ کر دور تک صاف کر دیا گیا تھا لیکن زمین کو ہموار نہیں کیا گیا تھا۔ درختوں کی بڑی جڑوں کو کھود کر یا جلا کر نکال دیا گیا تھا لیکن چھوٹی چھوٹی جڑیں باقی تھیں۔ ان کے علاوہ وہ گڑھے باقی تھے جن سے بڑی بڑی جڑیں نکالی گئی تھیں۔ ان سے جو مٹی نکلی تھی وہ بھی جگہ جگہ ڈھیر تھی اور پانی پڑ جانے سے جم گئی تھی۔ یہ ناہموار زمین ایسی تھی جس کو قابو میں لاکر کھیتوں میں تبدیل کرنے کے لئے بہت محنت اور سال دو سال کے زمانے کی ضرورت تھی۔

امر
کہ "دیکھو یہ دومٹ ہے۔ اس میں پودوں کی جڑیں خوب پھیلیں گی اور کھاد اچھی طرح مل جائے گی۔"
چیتا نے سوکھی ہوئی گھاس کا ایک لمبا تنکا توڑ کر دکھلایا اور کہا ــــ
"دیکھو برسات میں پانی پاکر اس ذات کی گھاس یہاں کتنی لمبی ہوجاتی ہے۔ زمین بہت اچھی ہے۔"
چاروں کسانوں نے اپنے کھیت کا چکر اس طرح لگایا کہ انھوں

نے اس کا ہر گڑھا ہر ہر جڑ اور مٹی کا ہر ہر ڈھیر اچھی طرح دیکھ لیا
اور اندازہ کر لیا کہ اس کو درست کرنے کے لئے کتنی محنت کی ضرورت ہوگی۔
چکر لگاتے لگاتے یہ لوگ دوبارہ جھیل کے اس ٹکڑے کے پاس آگئے
جو ایک ہاتھ کی طرح کھیت میں دس بارہ قدم اندر گھس گیا تھا۔ لیکن اس
ہاتھ میں اس وقت پانی نہیں تھا۔ پانی اس کے اس سرے سے، جو جھیل کی طرف
تھا، دو تین گز دور پر تھا۔ امر سنگھ جھیل کے اس ہاتھ کے پاس بیٹھ کر
لاٹھی سے اس کی گہرائی دیکھنے لگا۔ کھیت کے اندر آکر وہ گہرائی ایک گز سے
زیادہ نہیں تھی، لیکن جھیل تک جاتے جاتے آدمی بھر ہو گئی تھی۔ امر سوچنے
لگا کہ اگر کسی طرح پانی کھیت کے اندر تک آجائے تو آب پاشی کا اچھا ذریعہ
مل جائے اور ترکاریاں بوئی جا سکیں۔
جھیل میں پانی اب کافی تھا۔ اس کی سطح کی چھوٹی چھوٹی لہریں
چاندی کی طرح چمک رہی تھیں [illegible] انوں کو چاندی دینے کا وعدہ کر رہی
تھیں۔ کہیں کہیں ایک دو چھوٹی مچھلیاں اچھل اچھل کر بتلا رہی تھیں کہ اس کے
سایے میں بہت سی زندگیاں پرورش پا رہی ہیں۔
مدن امر کے خیالوں کو بھانپ گیا اور کہنے لگا:۔
"اگر ہم تینوں لگ جائیں تو پندرہ بیس دن میں زمین نیچی کر کے
جھیل کا پانی یہاں تک لایا جا سکتا ہے۔"
امر۔ "گھر بھی تو بنانا ہے۔"
مدن۔ "ہاں۔"
"[illegible]"

امر۔ "اگر تال سے مٹی کاٹتے ہوئے ادھر اپنے کھیت کے اندر چلے آئیں تو کیسا رہے گا؟ یہ گڑھا صاف ہو کر نہر بن جائے گا۔

مدن اور بابو نے پوچھا۔

"گھر کے لئے کیا سوکھی مٹی کاٹیں گے؟"

امر۔ "نہیں۔ جب جھیل سے کاٹتے چلیں گے تو مٹی بھیگی جائے گی۔"

مدن۔ "اس طرح بھیگنے میں بڑا وقت لگے گا۔"

امر۔ "ہاں لگے گا۔ مگر ایک دن میں ایک ہی ردا تو رکھا جائے گا۔ اتنی مٹی بھیگی ہوئی مل جائے گی۔ دوسرے دن تک دوسرے ردے بھر کی مٹی پانی سے آپ ہی آپ بھیگ کر تیار ہو جائے گی۔"

مدن اور بابو اور حتا کو [illegible]

وہ امر کی ع۔

امر نے کہا۔ "کل سے مکان بننے کا لگا لگ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ جھیل سے نہر کاٹ کر کھیت میں لائی جائے گی۔"

جب بڑے لوگ جھیل کا جائزہ لے رہے تھے اس وقت مالتی اور رامو بھنبھیریوں کے پکڑنے کی کوشش میں دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ ان کے پرانے کھیت میں تو بھنبھیریاں بس کبھی کبھی نظر آیا کرتی تھی اور دونوں اس کے چار سیدھے سیدھے چمک دار پروں کو بہت غور سے دیکھا کرتے تھے۔ مگر جب بھی پکڑنے کی کوشش کرتے تو وہ اُڑ اُڑ کر نظروں سے غائب ہو جاتی۔ لیکن یہاں ان دونوں کو بھنبھیریوں کا میلہ سا لگا

ادھر بھنبیریاں، ادھر بھنبیریاں۔ وہ ڈنٹھلوں، تنکوں کے سروں، گھاس کے کھڑے پتوں اور مٹی کے اونچے ڈھیلوں پر آکر بیٹھتی تھیں اور جب پکڑنے جاؤ تو اڑ کر دو ایک قدم ہٹ کر پھر بیٹھ جاتی تھیں۔ بھنبیریوں کو آتا، جاتا، اڑتا دیکھ کر دونوں چلاتے۔ "وہ گئی۔ وہ گئی۔ پکڑو۔ پکڑو۔ ارے چھوٹ گئی۔ ارے اڑ گئی۔" دونوں دوڑتے رہے اور ہنستے رہے۔ ہنستے رہے اور دوڑتے رہے۔ مگر سوائے ہنسی کے اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس پر بھی وہ خوش تھے۔ ان کی رائے میں نیا کھیت بہت اچھا کھیت تھا۔ پرانے کھیت سے بہت اچھا، بہت ہی اچھا تھا۔ کیوں کہ بھنبیریوں کے مزے ان کو اس سے پہلے کہیں نہیں ملے تھے۔

(۴)

سورج ڈوبنے ... نے چولھے پر ہانڈی چڑھا دی۔ آج اس کے پڑوسیوں نے طرح طرح کی ترکاریاں بھیجی تھیں۔ لوکی، کدو، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹی سی ڈلیا میں چنے کی دال بھی تھی۔ چھتیا نے ایک ہانڈی میں ترکاریاں کاٹ کر چڑھا دیں اور ایک میں چنے کی دال۔ یہ دونوں کام ختم کر کے وہ آٹا گوندھنے لگی۔

ادھر مدن اور بابو ہاتھ منھ اور پاؤں دھوکر ... بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ ابھی ایک ہی چلم ہوئی تھی کہ ایک پڑوسی نے کہا کہ رام لال کے گھر چلو وہاں سب اکٹھا ہیں۔

رام لال کا گھر چوپال سا تھا۔ یہاں جو لوگ اس وقت اکٹھا تھے

وہ سب، امر کے سوا، ایک ایک فصل اُگا چکے تھے۔ اس لئے وہ ذرا مطمئن تھے اور مستقبل ان کو خوش گوار نظر آتا تھا۔ ان سبھوں نے امر کا سواگت کیا، اس کو بٹھا کر حقہ پیش کیا اور پھر پوچھنے لگے۔

"ریتیا پار کا کچھ حال بتلاؤ۔"

یہ لوگ اپنی بستی کے پار کی ساری دنیا کو ریتیا پار کہتے تھے۔ کیوں کہ ان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ان کے اور باقی دنیا کے درمیان ایک بڑا سا ریت کا سمندر حائل ہے۔ جس طرف ریت کا سمندر نہیں تھا اس طرف جنگل کی دیوار تھی اور اس بستی کا کوئی باشندہ نہیں جانتا تھا کہ اس دیوار کے پار کیا ہے۔ اس لئے یہ لوگ اس طرف کی باتیں تک نہیں کرتے تھے۔ امر نے اس ظلم کی کہانی سنائی جو اس پر اس کے زمیندار نے ڈھایا تھا۔ اس کو سن کر سب کو اس سے ہمدردی ہوگئی۔ مگر اس بستی کے س [illegible]

کا شکار تھے [illegible] ان کو اور ابھی

کھیت نہیں ملے تھے۔

ان لوگوں نے امر کو ایک بالکل نئی بات بتلائی۔ انھوں نے کہا کہ گھر بنانے کے لئے نیو نہ کھودو۔ اس میں بہت محنت لگے گی۔ ٹھیکے دار صاحب نے یہ اجازت تو دے ہی رکھی ہے کہ مکان بنانے اور کھانا پکانے کے لئے جتنی لکڑی کی ضرورت ہو جنگل سے کاٹ لاؤ۔ تم ایسا کرو موٹی موٹی لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے لے کر ہاتھ ہاتھ بھر کی دوری پر زمین میں گاڑ دو۔ پھر ان کے سہارے دیوار اس طرح اٹھاؤ کہ وہ دیوار کے اندر چھپ جائیں۔ اس طرف اسی طرح کی دیواریں

اٹھائی جاتی ہیں اور وہ بہت مضبوط ہوتی ہیں۔

پھر اس بستی کی دشواریوں اور جنگلی جانوروں کی باتیں ہونے لگیں۔ سبھوں نے کہا کہ باگھ آتا رہتا ہے اور دو ایک مرتبہ وہ بکری یا بیل بھی اٹھالے گیا ہے۔ اس کے ڈر سے ہم اپنے جانور گھروں کی چار دیواری کے اندر باندھتے ہیں۔

چیتا عورتوں سے ملی۔ ذرا دیر کی بات چیت میں اس کو اپنی ہم سن جوان شادی شدہ عورتوں کا سب حال معلوم ہوگیا کہ کس کا شوہر کتنی محبت کرتا ہے، کتنے بچے ہیں اور نیا بچہ کب آنے والا ہے۔ ساس اور نند سے کیسی کیسی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ غلہ کب پیدا ہوتا ہے اور شوہروں میں کیا کیا بری عادتیں ہیں۔ ان کسان عورتوں میں کوئی چیز خفیہ نہیں ہوتی، سوائے ایک بات کے۔ وہ یہ کہ کس کے پاس کتنا روپیہ نقد ہے۔ کیوں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے اگر پڑوسیوں کو معلوم ہو تو قرض مانگنے کا سلسلہ بندھ جائے گا اور لوگ حسد کرنے لگیں گے۔

عورتوں کو اپنی نئی بستی سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ کوئی مزے دار چیز کھانے کو نہیں ملتی ہے۔ اور استعمالی چیزیں کبھی نہیں ملتی ہیں۔ بس وہی ملتا ہے جو کھیت میں اگ آتا ہے۔ منگل منگل کو ہاٹ لگتا ہے لیکن وہ بھی چار میل پر ریتیا پار۔ ریتیا پار کرکے جاؤ تو چار میل اٹھ کے برابر ہو جاتے ہیں اور آنے جانے میں سارا دن نکل جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہوتا یہ ہے کہ گڑ اور بتاشے تک کھانے میں نہیں آتے ہیں۔

عورتوں کو دوسری پریشانی یہ تھی کہ رات کو جنگلی جانوروں کا ڈر رہتا ہے۔ اس وجہ سے گرمیوں میں بھی اندر سونا پڑتا ہے۔

(۵)

امر سنگھ نے نیو ڈال دی اور ساتھ ہی ساتھ تال سے کھیت تک نہر لانے کی بھی ابتدا کر دی۔ اس کو افسوس تھا کہ گاؤں میں کوئی پروہت نہیں تھا جو اچھی ساعت بتلاتا۔ لیکن چیتا نے ٹونا کر کے اس کی کچھ تسلی کر دی۔ اس نے تھال میں دیے جلائے، سیندور رکھا اور پھر گھر کی نیو اور نہر کی کھدائی کا ٹوٹکا اتارا۔ اس کے بعد بہت سی تمناؤں، دعاؤں، ہنسی اور قہقہوں کے درمیان ان لوگوں نے ذرا سا گڑ، جو ان کے پاس رکھا تھا، سنی یا تبرک کے طور پر پاس پڑوس والوں میں تقسیم کر دیا، اور پھر کام شروع کر دیا۔

پھر کدال اور پھاوڑے چلنے لگے۔ چار پانچ دن تک یہ کام ہوتا رہا۔ لیکن ایک دن اچانک ایک عجیب جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ چیتا نے پوچھا کہ گھر کا دروازہ کدھر رہے گا۔

امر۔ "پورب کی طرف۔ کنویں کے سامنے۔"

چیتا۔ "پورب کی طرف!! پھر اندر کے کمرے کا منھ کدھر رہے گا؟ وہ تو پورب کی طرف نہیں رہے گا۔"

امر۔ "کیوں نہیں رہ سکے گا؟ جی چاہے تو ادھر ہی رکھنا۔"

چیتا بگڑ گئی۔ کہنے لگی کہ چار دیواری کا دروازہ اتر کی طرف رہنا چاہیئے تاکہ کمرے کا دروازہ پورب کی طرف کھل سکے۔ امر نہ اس کی بات سمجھ سکا اور نہ بات کی دلیل۔ اس نے چاہا کہ اس معاملے کو ٹال دے، کیوں کہ ایسے معاملے تو صرف مردوں سے تعلق رکھتے ہیں اور عورتوں کو ان میں دخل نہ دینا چاہیئے۔ لیکن چیتا کا منھ پھول گیا اور اس نے دن بھر ایک دانہ بھی نہیں کھایا۔ رات کو بھی منھ لپیٹ کر سو رہی۔ صبح امر زور زور سے بگڑنے لگا جس سے پاس پڑوس کی عورتوں اور مردوں کو خبر ہو گئی اور وہ معاملے کو طے کرانے آ پہونچے

چیتا کو اصرار تھا کہ چار دیواری کا دروازہ اتر ہی کی طرف رہے گا اور کمرے کا دروازہ پورب کی طرف۔ امر کو اصرار تھا کہ چار دیواری کا دروازہ پورب کی طرف رہنا چاہیئے کیوں کہ اس طرف کنواں تھا۔ اگر کنویں کو گھر کے اتر کی طرف لینے کے لئے چار دیواری کی جگہ بدلو تو زمین اونچی نیچی ہو جاتی تھی جس کو برابر کرنے میں ... لگے گی۔ اس دن پڑوسیوں نے بہت کوشش کی لیکن چیتا نہ مانی اور اس نے چولھا نہیں جلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام بند رہا۔ شام کو امر سنگھ کو بہت غصہ آیا اور وہ چیتا کو مارنے چلا، لیکن دونوں دیور بھوجی کے سامنے آ گئے اور امر ان کی مروت کر کے بلکتا جھلکتا الگ جا کر بیٹھ رہا۔

جب چیتا کسی طرح نہ مانی تو امر کو ہار ماننا پڑی اور چار دیواری کا دروازہ اتر کی طرف رکھا گیا اور یہ طے پایا کہ کمرے کا دروازہ پورب کی طرف ہوگا۔ اس فیصلے کے بعد چیتا ہنسنے لگی۔ اس نے چولھا جلایا اور جانے کہاں سے گڑ نکال کر میٹھے چاول پکائے۔ گھر میں ایک دم سے رونق آ گئی۔ ہنسی

ہونے لگی اور کام شروع ہوگیا۔

چیتا کی ہٹ کی ہیئت میں ایک بات تھی۔ وہ دس برس کی تھی جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اس نے جس گھر میں زندگی گزاری تھی اس کی بناوٹ ایسی ہی تھی جیسی وہ اپنے نئے گھر کی چاہتی تھی۔ جاڑوں میں وہ اپنے کمرے کے اندر منھ اندھیرے سے چکی پیستی یا دھان کوٹتی تھی۔ صبح ہونے پر جب وہ دروازہ کھولتی تھی تو سورج کی کرنیں اندر آکر اس کو گرم کرتی تھیں باہر کمرے کی بغل میں ایک پیڑ تھا جس پر تروئی کی بیل چڑھی تھی۔ گرمیوں میں وہ اس کے سایے میں کام کرتی تھی۔ چیتا اس پروگرام کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ گھر کے آرام کا تصور ہی اس سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ یہاں بھی وہ یہی چاہتی تھی کہ اسی طرح کا کمرہ ہو اور اسی طرح کا کمرے کی بغل میں پیڑ ہو۔ لیکن یہ باتیں دماغ میں اتنی واضح نہ تھیں کہ وہ دوسروں کو سمجھا سکتی۔

شام تک [illegible] سب مرد ہاتھ منھ دھوکر بستر پہ بیٹھ جاتے تو چیتا سب کا کھانا پکانے میں لگ جاتی۔ جب سب کو کھلا لیتی تو خود کھاتی اور پھر جاکر آرام کرتی۔

جب تال کی مٹی امر کے پھاوڑے سے گہری کٹ جاتی تو پانی بل کھاتا زور مارتا، پیار اور محبت سے امر کے کھیت کی طرف بڑھ آتا۔ اس کو بڑھتا دیکھ دیکھ کر امر اور اس کے گھرانے کے جسموں میں خون بڑھتا۔ اس پانی کو دیکھ کر ان کی زبان پر طرح طرح کی ترکاریوں، ککڑیوں اور لوکیوں کا مزا آجاتا۔ کیسی رسیلی، ملائم اور تازگی پہنچانے والی چیزیں وہ ہوں گی۔ اہاہاہا

لیکن مٹی اور پانی نے امر کی توقع کا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ جوں جوں گیلی مٹی تالاب سے نکلتی جائے گی، سوکھی مٹی گیلی اور ملائم ہوتی جائے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب امر گیلی مٹی ختم کر کے دوسری صبح کو مٹی کھودنے لگا تو اس نے دیکھا کہ تال کا پانی بہت تھوڑی سی مٹی کو ملائم کر سکا ہے۔ جوں جوں نہر کھیت کے اندر آتی گئی مٹی کا دل موٹا ہوتا گیا امر کی محنت بڑھتی گئی۔ اس کو بہت محنت سے سوکھی مٹی کاٹ کاٹ کر پانی میں گرا کر اس کو گوندھنا پڑتا تھا، تب جا کر ردّا بنتا تھا۔ اگر وہ تالاب کے کنارے کی گیلی مٹی لیتا تو اس کی آدھی سے بھی کم محنت میں گھر بن جاتا، لیکن گھر تو بن جاتا پر نہر نہ ملتی۔ اس لئے امر اسی ڈھنگ سے کام کرتا رہا اور گھر اور نہر اک ساتھ بناتا رہا۔

جب مٹی کا دل [illegible] ۔ کافی اونچا ہو گیا تو سوکھی مٹی کو کاٹنے اور کاٹ کر پانی میں گوندھنے [illegible] ور سخت ہو گیا۔ دوسری طرف جب دیواریں اونچی ہو گئیں تو ان کی سیدھ دیکھنے کا کام نازک ہو گیا۔ آخر پندرہ دن کے اندر امر نے اپنی ڈیوٹی بدل لی۔ وہ دیوار بنانے لگا۔ مدن یا بابو میں سے کوئی ایک مٹی کاٹتا اور دوسرا اسے لا لا کر مٹی دیتا اور وہ دیوار پر ردے رکھتا جاتا۔

دیوار ابھی چار ہاتھ اٹھی تھی کہ ایک دوسرا جھگڑا ہو گیا۔ جب امر مٹی کاٹتا تھا تو دوپہر کو جینا اس کے لئے ستو اور چٹنی لے کر جاتی تھی۔ امر سنگھ ان دونوں کو ملا کر کھاتا تھا اور پھر پانی پی کر چلم پیتا تھا۔ اتنی دیر جینا

بیٹھی رہتی تھی۔ جب امر کام میں لگ جاتا تھا تو وہ آکر مدن اور بابو کو
ستو دیتی تھی، پھر دیوار کا کام کرنے میں لگ جاتی تھی۔ لیکن جب سے امر دیوار
اٹھانے کا کام کرنے لگا چیتا نے ستو لے کر جانا بند کر دیا اور مدن اور بابو سے
کہا کہ تم دونوں ستو کے وقت گھر آجایا کرو۔ دو چار روز تک تو وہ دونوں آتے
رہے، پھر دونوں نے شکایت کی کہ تال سے آنا کھل جاتا ہے۔ جب وہاں ہاتھ
منہ دھو لو تو جی چاہتا ہے کہ وہیں جیبر بھی کر لو۔ لیکن اس پر بھی چیتا ان
لوگوں کے لئے ستو لے کر تال پر نہیں گئی۔

ایک دن صبح کو مدن نے کہا کہ اب میں مٹی نہیں کاٹوں گا بلکہ دیوار
اٹھاؤں گا۔ امر نے سمجھایا کہ تم دیوار اٹھاؤ گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی طرف
جھک جائے۔ لیکن مدن نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور ایسی ضد کی کہ منہ لپیٹ کر
پڑ رہا اور دن
گالی دے کر ایک [illegible] دریا
پار جانے کو تیار ہو گیا۔ چیتا نے اس کو روکنا چاہا تو وہ پھوٹ پڑا کہ جب تم کو
میرے کھانے پینے کی پروا نہیں تو کیوں بولتی ہو۔ بابو خاموشی سے یہ سب
کچھ دیکھتا رہا۔ مدن کسی طرح نہ مانا اور جانے پر بالکل آمادہ ہو گیا تو بابو نے
کہا کہ میں بھی مدن کے ساتھ جاؤں گا۔

دن بھر یہی جھگڑا ہوتا رہا۔ پڑوسیوں نے بھی اس معاملے میں کافی
دل چسپی لی۔ مگر اس طرح سے کہ اگر دو چار نے مدن اور بابو کو سمجھایا تو دو چار
نے بھڑکایا بھی۔ شام کے قریب دونوں رخصت ہونے لگے تھے مگر مالتی

اور راموکے پھوٹ پھوٹ کر رونے سے اس وقت تو رک گئے۔ لیکن دونوں نے رات امر کے گھر نہیں ایک پڑوسی کے گھر میں گزاری۔ اور دوسرے دن تڑکے تڑکے دونوں ریتا پار کو چل دیے۔ چلتے وقت وہ لوگ امر یا چیتا کے سلام کو بھی نہیں آئے۔

جب دونوں بستی سے آدھ میل دور نکل گئے تو انھوں نے دیکھا کہ امر راستے میں کھڑا ہوا ہے۔ یہ اچانک ملاقات ایسی تھی کہ دونوں گھبرا گئے اور دونوں نے پرنام کیا۔

امر: "اگر تم دونوں کو جانا ہی ہے تو پہلے برادری کے سامنے معاملات طے کرنا ہوں گے۔ اگر نوکری پر جارہے ہوتے تو بات دوسری تھی مگر تم تو ہم کو چھوڑ کر جارہے ہو۔"

دونوں امر کا منہ دیکھنے لگے اور بولے: "کیسے معاملات؟"

امر: "بیل، ڈھور ... اور برتن سرتن اور یہ کھیت جو ہیں وہ کیا اکیلے میرے ہیں؟ اگر میں ان کو اکیلے دبالوں تو برادری کے لوگ کیا کہیں گے اور بھگوان کو کیا منھ دکھلاؤں گا۔ ہمیشہ کے لئے جارہے ہو تو اپنا حصہ لے لو۔"

"ہمارا حصہ!!"

"ہاں تمھارا حصہ۔ چار آدمیوں کو پنچ بنا دو۔ وہ جو فیصلہ کریں وہ لے لو۔"

مدن اور بابو کو چیتا سے جو شکایت تھی وہ تو اوپر کی بات تھی تہہ میں یہ چیز تھی کہ ان کو محسوس ہو رہا تھا یہ کھیت اور گھر جو کچھ ہے وہ

امر کا ہے۔ وہ صرف کام کرتے ہیں اور اس کے عوض کھانا اور سونے کی جگہ
پاتے ہیں۔ چیتیا کے برتاؤ سے یہ کھٹک اور بھی بڑھ گئی تھی۔

امر نے جو اس طرح کی بات کہی تو بابو نے اس کے پاؤں پکڑ لئے
اور بھیا بھیا کرنے لگا۔ مدن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس ڈونگرے
سے دلوں کی ساری کدورت بہہ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان دونوں نے
بڑے بھائی کو باپ کی جگہ محسوس کیا۔

دونوں آنسو پونچھتے ہوئے امر کے پیچھے چلے آئے۔ گھر آکر مدن نے
ہاتھ جوڑ کر چیتیا سے کہا۔ "بھوجی شما کردو۔"

چیتیا پھیل گئی اور کہنے لگی۔

"چل جا۔ میں ایسے شما وا ہنسا کردوں گی۔"

"میرا کام کرنا ہوگا۔"

"جو کہو۔"

"میں اناج کے لئے دو کٹھیاں بناؤں گی۔ تو روزانہ اس کے لئے
اچھی گوندھی ہوئی مٹی کی چار ڈلیاں لا دیا کر۔"

اب باری تھی مدن کے پھیلنے کی۔ وہ کہنے لگا۔

"میں مٹی لادوں گا۔ مگر تم کو بھی ستو تال پر پہونچانا ہوگا۔"

"اچھا! اچھا پہونچا دیا کروں گی۔ بس اتنی سی بات پر گھر چھوڑے
جا رہے تھے لالا جی۔"

مالتی بابو کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی۔

"مجھ سے بھی تو چھما مانگو چاچا۔"

بابو۔ "تم سے !!"

بابو بہت زور سے ہنسا اور اس نے مالتی کو گود میں اٹھا لیا۔

مالتی۔ "مانگو چھما۔"

بابو۔ "چھما کر دے مہارانی۔"

مالتی۔ "ایک شرط ہے۔"

مالتی بالکل چیتا کے لہجے میں بولی۔

مدن۔ "وہ شرط کیا۔"

مالتی۔ "میرا گڑیا کا گھر بنا دے۔"

بابو اور مدن دونوں نے اک ساتھ جواب دیا۔

"منظور۔ منظور۔"

چیتا نے ا[illegible] ے مزے کا آلو کا بھرتا بنایا اور کہیں سے ذرا سا تیل لاکر اس کو بگھار دیا۔ اس دن رات گئے تک مستقبل کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ لوگ تصور کی آنکھوں سے کھیت کا گوڑا جانا اور اس میں بیج کا ڈالا جانا دیکھتے رہے۔ کھیتوں میں پودے آگے بڑھے اور پھر یہاں سے وہاں تک دھان لہلہانے لگے۔ ان پر گابھن بالیوں نے جنم لیا اور جھوم جھوم کر وہ سنہری ہو گئیں۔ پھر ان بالیوں سے کھلیان پٹ گیا اور اناج کے ڈھیر لگ گئے اور ان تینوں کسانوں کی قسمتیں بدل گئیں۔

دوسرے دن سے گھر، نہر اور کھیتوں کا کام تازے جوش و خروش سے ہونے لگا۔

گھر کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں۔ دوسری طرف تال کا پانی جو اپنی گود میں لاکھوں مچھلیوں کی پرورش کر رہا تھا، چاندی کی طرح دمکتا ہوا کھیت کی طرف بڑھتا گیا، بڑھتا گیا اور ہوتے ہوتے ایک دن کھیت کے دامن میں ہلکورے لینے لگا۔

دیواریں بھی بلندی کو پہونچ چکی تھیں۔ چار دیواری بھی بن گئی تھی اور کمرے کی دیواریں بھی، صرف چھت پٹنے کی کسر تھی۔ لیکن کھیت میں پانی کی آمد نے گھر بنانے والوں کے دلوں میں ترکاریاں بونے کا وہ جوش بھر دیا کہ وہ چھت کو بھول کر کیاریاں بنانے لگے۔ انھوں نے زمین گوڑی اور نالیاں بنائیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر نہر کے کنارے ڈھیلی کھڑی کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چوطھے کی طرح کا خشکی کا جو نیم دائرہ نہر کو گھیرے

جس نے گز بھر چوڑے پانی کو اپنے سایے میں لے لیا۔ اس کے اوپر ڈھیلی کھڑی کر دی گئی، پھر کیاری میں بیج ڈالے گئے اور آبپاشی ہونے لگی۔

جب کمرے کی دیواروں پر چھت پڑ رہی تھی اس وقت کیاریوں سے انکھوؤں نے سر نکالا۔ یعنی دھرتی میا نے امر کو قول دے دیا کہ بچو گھبراؤ نہیں میں تمھارا پیٹ بھرتی رہوں گی۔ صرف تمھارا ہی نہیں، تمھارے بچوں کا بھی اور بچوں کے بچوں کا بھی اور ان کے بچوں کے بچوں کا بھی۔

ادھر کیاریوں میں انکھوے پھوٹے اور ادھر امر، چتیا، مدن

اور بابو کے ارمان ہرے ہو گئے۔ وہ بیلوں کی دوسری گوئی لینے اور
زمین کو اور بڑھانے کے منصوبے بنانے لگے۔

(۶)

اس دن برتن مانجھ کر جب جیتیا تالاب میں نہانے اتری تو
وہ عجب طرح کی آزادی محسوس کر رہی تھی۔ ایسی آزادی جیسی اس نے
کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دیر تک پانی میں الٹے سیدھے ہاتھ مارتی رہی
تھی۔ چھپ چھپ کرتی رہی اور اچکتی اور گنگناتی رہی۔ اس کا جی چاہ
رہا تھا کہ کاش تیرنا آتا ہوتا تو وہ پانی کی سطح پر تتری کی طرح ناچتی
پھرتی۔

جیتیا کی بہت سی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھی تھیں۔ اس کو
اس بات کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ میں تنہا ہوں اور دور دور تک کوئی
نہیں ہے جس طرح چاہوں نہاؤں۔ اور اگر کوئی دیکھنے والا دور پر
چھپا چھپایا ہو بھی تو کیا ۔۔۔ یہاں ذات برادری کی وہ ہتھکڑیاں،
بیڑیاں کہاں جو اپنے گاؤں میں پنچائت کے پنچ لئے لئے گھومتے ہیں۔

اس دن جیتیا نے تال کے کنارے جب اپنی گیلی جنبھڑا ساری جو
پہن کر نہائی تھی، اتار کر سوکھی ساری باندھی تو اس طرح باندھی کہ بدن
کا جو حصہ کھل گیا، کھل گیا۔ اس نے کوئی پروا نہ کی۔ یہ ایسی حرکت تھی
جو اس سے زندگی میں پہلی بار سرزد ہوئی تھی۔

اسی دن ایک اور واقعہ بھی پیش آگیا۔ شام کو کھیت سے واپس آتے وقت وہ دوسروں سے ذرا پیچھے رہ گئی تھی۔ اس نے ایک پیڑ میں بڑی سی سوکھی ٹہنی دیکھی جو کافی نیچے پڑی تھی۔ اس نے ٹہنی کو پکڑ کر توڑنا چاہا مگر بہتیرا زور لگانے پر بھی وہ نہ ٹوٹی۔ مرد اتنی دور جاچکے تھے کہ اس نے پکارنا مناسب نہ سمجھا۔ آخر یہ طے کیا کہ ٹہنی کے توڑنے کو دوسرے دن پر چھوڑ دوں اتنے میں رام لال کی آواز آئی۔

"ٹھیر جاؤ۔ میں آیا۔"

رام لال یکایک ایک طرف سے نکل کر آگیا اور اس نے ٹہنی توڑ دی۔

ٹہنی توڑ کر اس نے جیتا کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے جیتا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"جیتا، تیرے آجانے سے بستی میں رونق آگئی اور میرے من کا تو جانے کیا حال ہوگا۔"

غصہ تو تھا ہی، لیکن ذرا سی خوشی کی گدگدی بھی تھی، مگر وہ کچھ بولی نہیں اور آگے بڑھ گئی۔

رام لال کے اس فقرے کا ایک پس منظر بھی تھا۔ رام لال کے سوا اس بستی کے سب باشندے ان جگہوں کے رہنے والے تھے جو بیس پچیس میل کے اندر تھیں اور جن کا نام سب نے سنا تھا۔ لیکن رام لال کسی دور

کی جگہ کا رہنے والا تھا اور اس نے برسوں بہت دور آسام جا کر وہاں کے چائے کے باغوں میں کام کیا تھا دو سال پہلے دہلی میں جو انگریز بادشاہ کا دربار ہوا تھا وہ بھی اس نے دیکھا تھا اس کا آنکھوں دیکھا حال سنایا کرتا تھا اور اس نے گھر بھی بنا لیا تھا۔ ایک ہی گوئی کی کاشت میں بہت پیدا کر لیا تھا، ترکاریاں بھی بوتا تھا۔ صبح سے شام تک کام میں ان لوگوں کی طرح لگا رہتا تھا جن کے سر بال بچوں کی ذمے داریاں تھیں۔

رات کو جب سب کسان اکٹھا ہوتے تھے اور حقہ چلتا تھا، اس موقع پر بات چیت کے جو بہت دل چسپ موضوع تھے، ان میں سے ایک موضوع تھا رام لال کا بیاہ۔

"بھیا رام لال اب تم لگائی لے آؤ۔"

"دلا دو کہیں سے۔"

"تم چاہو تو کل ہی آ جائے۔"

"ہم تو جانے کتنا چاہتے ہیں۔"

مگر یہ بات اسی طرح ... میں ختم ہو جاتی۔ بات ختم ہونے کی وجہ بھی تھی۔ اول تو رام لال کی ذات پات کا کسی کو کوئی پتہ نہ تھا، دوسرے یہاں کوئی کنواری لڑکی نہ تھی۔ دو ایک بیوائیں تھیں، مگر وہ بھی سن سے اتری ہوئی تھیں۔

رام لال کا سن ۲۶، ۲۷ سال کا ہوگا کنپٹی کے بال پک رہے تھے، گال ذرا پچکے ہوئے تھے اور دیکھنے میں کوئی ایسی کشش نہیں تھی، لیکن بلا کا ہنسوڑ تھا۔ ہر بات میں ہنسی کی بات پیدا کر لیتا تھا، اس وجہ سے اس کو لوگ پسند

کرتے تھے اور اس کے بارے میں بات چیت کرتے رہتے تھے۔ امر کا وہ قریبی پڑوسی تھا اور جب بھی آتا میٹھی باتوں کا ڈھیر لگا دیتا۔

"بھوجی تم ترکاریاں بوکر کیا کرو گی؟ میرے کھیت میں جو اتنی ترکاریاں خراب ہو رہی ہیں ان کو کیوں نہیں سوارت کر ڈالتی ہو؟ میرے اوپر احسان کرو گی۔"

کبھی کہتا۔ "بھوجی یہ لو کدو۔ ابھی بنا ہُوا۔ تازہ تازہ لایا ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔ میں اپنا بھوجن خود چٹکی بجاتے میں بنا لیتا ہوں۔ اپنا بنایا کھانے میں بڑا آنند ہوتا ہے۔ بھوزیاں لگا آیا ہوں۔ بھانٹے بھوبھل میں ڈال دیے ہیں۔ جاتے ہی نمک مرچ لگا کر ان کا بھرتا بناؤں گا اور مزے سے کھاؤں گا۔ آسام میں لوگ کہا کرتے تھے کہ رام لال کا بھوجن آپ ہی آپ پک جاتا ہے۔"

بچوں سے بھی ہنستا رہتا۔

. / " .

جائے گا؟ اچھا جیتے جاؤ۔ اٹھاؤ تمھارا ہے۔ واہ لالا۔ میں نہ نے اٹھائے نہیں اٹھا۔ ارے دوست۔ رومت۔ چلو تم کو بھنبھیری پکڑ دیں۔"

رامو بھی رام لال سے بہت ہل گیا تھا۔ ادھر اس کو دیکھا اور ادھر ناتا! ناتا کہہ کر اس کی طرف بھاگا۔ ناتا اس کے منھ سے چاچا کی جگہ نکلتا تھا۔ رام لال کبھی اس سے چھلی چھلیا کھیلتا، کبھی اس کا گھوڑا بنتا اور کبھی بیل بن کر اس کا ہل چلاتا۔ مالتی بھی رام لال سے بہت ہلی ہوئی تھی —

اس طرح کچھ دنوں سے رام لال دن میں بھی کسی نہ کسی بہانے سے آجاتا۔ مگر جب بھی آتا کام کرنے والوں کی مدد کرتا۔ کبھی بنتی دیواروں میں ہاتھ لگا دیا تو کبھی مالتی کا گھر وندا درست کر دیا اور کبھی چمپا کی کٹھیا کے لئے مٹی میں بھوسا ملا دیا۔

چمپا کی کٹھیا خوب بن رہی تھی۔ بہت بڑی اور خوب گول اور سڈول۔ رام لال جب بھی آتا اس کو بہت حیرت سے دیکھتا اور ہر مرتبہ کہتا کہ میں اب تک سمجھتا تھا کہ کٹھیا چاک پر بنتی ہے۔ کٹھیا کا منہ جیسا جیسا پھیلتا گیا رام لال کی حیرت بڑھتی گئی کہ اس کی مٹی کی دیوار نیچے کیوں نہیں گر پڑتی ہے۔ اس کی حیرت دیکھ دیکھ چمپا کو بڑی خوشی ہوتی۔ جب کٹھیا پورے پھیلاؤ پر آنے کے بعد اوپر جاکر چھوٹی ہونے لگی تو رام لال خوش ہونے لگا کہ اب یہ مکمل ہو جائے گی۔ وہ اس کو دیر تک دیکھتا رہتا اور ایک ادھ فقرہ تعریف میں کہہ دیتا۔ چمپا اس زمانے میں تعریف کی بھوکی تھی؛ کیونکہ وہ بے حد کام کر رہی تھی ... چال میں سب سے زیادہ کام کر رہی تھی، لیکن اس کی تعریف نہ امر کرتا تھا اور نہ مدن نہ بابو۔ یہ کمی اگر پوری ہوتی تھی تو صرف رام لال سے۔

جب رام لال تعریف کرتا تھا تو چمپا کے ہاتھ زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتے تھے۔ اور اس کے ہاتھوں کی موٹی چوڑیاں زیادہ کھنکنے لگتی تھیں۔ یہ چیزیں رام لال کو بتلاتی تھیں کہ تیر نشانے پر بیٹھ رہے تھا۔ ان فقروں سے چمپا کا جوش بڑھتا اور وہ کٹھیا بنانے میں زیادہ کاریگری سے کام لیتی۔ اسکا

نے کھیتا کے مونگھٹ کے پاس تکونے بنا کر ایک جھالر سی بنا دی۔ اس جھالر کو رام لال جانے کس کس رخ سے دیکھتا اور تعریف کے انداز میں گردن ہلاتا۔ اس کی تعریف عام طور سے اس وقت ہوتی جب امر سنگھ وغیرہ سامنے نہ ہوتے۔ وہ دس پانچ منٹ باتیں کر کے چیتا کے پاس سے ہٹ آتا۔ آخر میں یہ ہو گیا تھا کہ جب رام لال چیتا کی تعریف کرتا تو اس کے چہرے پر چمک سی آ جاتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ، لیکن زبان سے تعریف کے جواب میں نہ اس نے کبھی کوئی لفظ کہا اور نہ ایسے موقعے پر آنکھیں چار کیں۔

چیتا کا سن ۲۵ سے کم تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دیہاتوں کی چودہ سال کی عمر میں ماں بن جانے والی عورتیں ادھیڑ کہلائے جانے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ ان کے سامنے ان کی جوان بیٹی بیٹیاں ہوتی ہیں اور خود ان کے چہرے خشک، آنکھیں مرجھائی ہوئی، گال پچکے ہوئے، بدن ڈھیلے اور مسکراہٹیں پھیکی ہو جاتی ہیں لیکن چیتا کی زندگی دوسری کسان عورتوں

طرح کٹھن [illegible] تھی۔ وہ بھی [illegible] تھی اور اس نے گھر کی گائے کا دودھ اور گھی بھی کھایا تھا۔ اس کو زیادہ فکروں اور پریشانیوں سے سابقہ بھی نہیں پڑا تھا۔ اس کے اولاد ضرور دیر میں ہوئی تھی، لیکن جس سن میں بے اولاد ہونے کی فکر شروع ہوتی ہے اس سے پہلے ہو گئی تھی۔ باتوں کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ہنسی، مسکراہٹوں میں تازگی اور چال میں جوانی موجود تھی۔

اس موقع پر رام لال کی زبان سے جب چیتا نے سنا کہ "میرے

من کا جانے کیا حال ہو گیا ہے"، تو اس کو کوئی بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی
اس فقرے کو وہ رام لال کی آنکھوں میں کئی مرتبہ بولتا ہوا دیکھ چکی تھی۔

اس وقت اس فقرے کو سن کر چنیا کچھ اس طرح آگے بڑھ گئی کہ
اس میں اقرار محبت تو نہ تھا لیکن انکار بھی نہ تھا۔

دوسرے دن جب رام لال چنیا کے پاس کھٹیا دیکھنے کے بہانے گیا تو
اس نے محسوس کیا کہ چنیا کے رویے میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے، یعنی کل کی
بات سے وہ ناراض نہیں ہے۔

چار پانچ دن کے بعد پھر ایسا اتفاق ہوا کہ چنیا راہ میں اکیلی رہ
گئی۔ ایک طرف سے اچانک رام لال نکل آیا اور وہ راہ روک کر سینے پر
ہاتھ رکھ کر گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"چنیا، میری جان جاتی ہے"۔

چنیا سمجھ گئی کہ یہ میرے پیچھے لگا رہتا ہے اور موقع کا انتظار
کرتا رہتا ہے۔ کیاری کے اکھوے [illegible] کر پودوں کی شکل اختیار کر لی تھی
اور ان میں کچھ ایسی کشش پیدا ہو [illegible] نہ مالتی اور رامو دونوں نے اپنے
گھروندے کو بھلا دیا تھا اور دن بھر وہیں رہتے تھے اور ہر وقت پوچھا
کرتے تھے۔

"ماں، ککڑیاں کب نکلیں گی؟"

"ماں، خربوزے کب پیدا ہوں گے؟"

"ماں، ککڑیاں میٹھی ہوں گی یا سلونی؟"

کبھی کبھی وقت دونوں پودوں کو اس طرح دیکھنے لگتے جیسے اب پھل سے لد جائیں گے... بڑھیں گے اور بڑھتے بڑھتے کھانے کے قابل ہو جائیں گے ۔
مالتی کہتی ۔

"جیسے ہی ککڑی نکلے گی میں توڑ لوں گی ۔

رامو ۔" نہیں پہلے میں ۔"

مالتی : نہیں پہلے میں ۔"

چیتیا ان تماشوں کو دیکھ کر آ رہی تھی اور ان کے سرور میں ڈوبی ہوئی تھی ۔

رام لال کے منھ سے ایسا فقرہ سن کر چیتیا نے گھونگھٹ کھینچ لیا اور چپ کھڑی ہو گئی ۔

رام لال ۔" ایسا ظلم نہ ڈھاؤ کہ درشن تک نہ دو ۔"

چیتیا کے دل میں اس وقت آزادی کا وہی احساس جو تالاب میں نہانے وقت

ہو چلا ۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جب کوئی دیکھنے والا یا حساب کتاب لینے والا نہیں ہے تو ایسے میں ایک گال ہنس بول لینے میں کیا ہرج ہے ۔ وہ سر جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی اگر اس وقت رام لال ہمت کر کے گھونگھٹ الٹ دیتا تو وہ چیتیا کو جیت لیتا ۔

دو منٹ کے اندر چیتیا میں ایک نئی لہر آ گئی ۔ وہ لڑکیوں کی طرح کود کر ایک طرف ہو گئی اور بھاگ کر راستہ کترا کر رام لال سے آگے نکل گئی ۔

رام لال اس کی یہ پھرتی اور چہل دیکھ کر حیرت اور خوشی سے مسرور ہو گیا۔
چیتا نے ذرا دور جا کر گھونگھٹ کو ایک طرف جھٹک کر رام لال کی طرف دیکھا، یا یوں کہو کہ اس کو درشن دیا، پھر بھاگتی ہوئی چل دی۔

جب دوسرے دن رام لال چیتا کے گھر گیا تو اس نے اس کے رویہ میں ذرا بھی تبدیلی نہیں پائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

(۷)

بن کٹ پورہ میں آج کل لو نہیں چل رہی تھی۔ لیکن گرمی بہت تھی، دن کو بھی اور رات کو بھی۔ جب سورج آسمان پر چڑھتا تو آسمان تانبے کے توے کی طرح تپنے لگتا اور زمین سے آگ نکلنے لگتی۔ کام کرنے والوں کے پاؤں جھلستے تھے اور بدن سے پسینے کے فوارے چھوٹتے تھے لیکن کسان گرمیوں کو کہاں مان سکتے ہیں۔ اس موسم میں بھی امر کیاریوں کی آب پاشی کرتا تھا اور بیلوں کے باندھنے کے لئے جو جگہ چار دیوار [illegible] بنائی تھی اس کی بھی چھت پاٹ رہا تھا۔

کیاریاں اس گرمی میں پانی پی پی کر شاداب ہو رہی تھیں اور ان میں پھول آنے لگے تھے۔ رامو اور مالتی دونوں منہ اندھیرے اپنے باپ اور چچا کے ساتھ کیاریوں کے پاس چلے جاتے اور دن بھر انتظار کیا کرتے کہ اب ککڑیاں نکلیں گی، اب ککڑیاں نکلیں گی۔ اس بستی کے کسانوں نے طرح طرح کی ترکاریاں اپنے اپنے کھیتوں میں بوئی تھیں لیکن ککڑی کسی نے نہیں بوئی تھی اس لئے دوسرے کسان بھی آ آ کر امر کی کیاریوں کو دیکھ جاتے تھے۔

بن کٹ پورہ میں آج کل کام کرنے کے لئے سب سے اچھا وقت

منہ اندھیرے سے سورج کے اوپر چڑھنے تک اور پھر سورج ڈوبنے کے وقت ہوتا تھا۔ اس وقت گرمی بھی کم ہوتی تھی اور ہوا بھی چلتی تھی۔ کام کرنے والے صبح بہت دل لگا کر کام کرتے تھے اور دوپہر کو دو ڈھائی گھنٹے آرام کرتے تھے اور پھر کام شروع کر دیتے تھے۔ دوپہر ڈھلنے پر موسم تو اچھا ہو جاتا تھا مگر کام کرنے والے تھک چکے ہوتے۔

مالتی اور رامو کو ککڑیوں کے علاوہ جو چیز کیاریوں میں کھینچ لاتی تھی وہ تھی جھنجھریاں۔ یہ صبح صبح آ جاتی تھیں اور اس پودے سے اس پر اور اس پر سے اس پر اڑتی پھرتی تھیں بابو اگرچہ لگ بھگ ۱۴ سال کا تھا اور کام چور نہیں تھا لیکن تھا بچوں کی طرح کھلنڈرا۔ وہ پہلے جب بھی مٹی لینے تالاب کے پاس آتا تھا دونوں بچوں کے ساتھ جھنجھری پکڑنے اور اس کو تاگے میں باندھ کر اڑانے میں لگ جاتا۔ اس سے کام میں رکاوٹ پڑتی تھی اور امرا اور مدن ناراض ہوتے تھے لیکن وہ اپنے کھیل سے باز نہیں آتا تھا۔

نکل جاتا۔ امرے کھیت سے ملا ہوا کھیت دھنری کا تھا۔ وہ چوبیس سالہ عورت تھی جس کا شوہر چار مہینے ہوئے سانپ کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ اس کے دو لڑکیاں تھیں جو بیاہی ہوئی تھیں اور دس بارہ میل پر رہتی تھیں یہاں اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا جو کھیتی میں اس کی مدد کرتا۔ اس کے شوہر کے مرنے کے بعد اس کا کھیت بستی والوں نے مل کر کاٹ دیا تھا۔ اب اس نے ترکاریاں بوئی تھیں اور ان کو خود اکیلی پانی دیتی تھی۔ بابو دوپہر کی فرصت میں آب پاشی میں اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا اور جب اس کا جی چاہتا

تھا بلا کسی تکلف کے ان کے بچپن میں سا جھا لگا لیتا تھا۔

ایک دن صبح ایسا ہوا کہ کہیں سے زرد اور سرخ تیتریوں کا ایک جھنڈ آکر کیاریوں پر اڑنے لگا۔ انھوں نے بچوں میں ایسا جوش پیدا کیا کہ رامو کی ساری صبح ان کو پکڑنے میں لگ گئی۔ لیکن بہت دوڑ دھوپ کے بعد وہ دو تیتریاں پکڑ پایا اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے پر بگڑ گئے۔ وہ ابھی اپنا کھیل نہ چھوڑتا، لیکن امر نے بہت ڈانٹا۔ دوپہر کو جب اسے چھٹی ملی تو تیتریوں کے جھنڈ غائب ہو گئے تھے۔ لیکن شام کے قریب تیتریاں پھر آگئیں اور بابو ان کے پکڑنے میں لگ گیا۔ مالتی اور رامو جہاں تک ان کے بس میں تھا بابو کے پیچھے پیچھے دوڑتے رہے۔ مالتی بڑی ہونے کی وجہ سے رامو سے آگے نکل جاتی تھی۔ جب رامو زیادہ پیچھے رہ جاتا تھا تو رونے لگتا تھا۔

جب جھٹ پٹا ہو گیا اور امر، چیتیا اور مدن گھر واپس ہونے لگے تو انھوں نے تینوں بچوں کو واپس ہونے کے لئے آواز دی۔ مگر وہ تینوں کھیل میں بہت مصروف تھے اس لئے ذرا [illegible] ہوئے۔ اس وقت مالتی کے پاس جو بھنبھیری تھی اس کے پر ثابت تھے لیکن رامو کے پاس جو بھنبھیری تھی اس کے پر ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے بگڑ کر اس کو پھینک دیا تھا اور رونے لگا تھا۔ بابو نے رامو کو گود میں اٹھالیا اور کہنے لگا کہ کل صبح تمھارے لئے بہت اچھی بھنبھیری پکڑ دوں گا۔

رامو بابو کو گود میں لئے جا رہا تھا، اس سے کافی دور آگے پر امر، چیتیا اور مدن تھے اور اس سے دس پندرہ قدم پیچھے مالتی تھی جو بھنبھیری سے کھیلتی آرہی تھی۔ اس وقت جھٹ پٹا اندھیرے میں تبدیل ہو رہا تھا اور جھاڑیوں کے اندر

کی چیز نظر آنا بند ہو گئی تھی۔ اتنے میں مالتی کی ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ بابو نے پلٹ کر دیکھا۔ دیکھتے ہی وہ بھی بدحواس ہو کر چیخا' امر کی طرف بھاگا اور بھیا بھیا پکارنے لگا۔ پھر فوراً ہمت کر کے وہ مالتی کی طرف پلٹا لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں تھا اور جہاں وہ کھڑی تھی وہاں کچھ خون کے دھبے تھے۔

امر' چتیا اور مدن بھی گھبرائے ہوئے بابو کے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے۔ لیکن وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ اس کے منھ سے سوائے مالتی مالتی کے اور کچھ نہیں نکلتا تھا اور وہ کانپتے ہاتھ سے ایک جھاڑی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ رامو بے حد خوف زدہ تھا اور بابو سے چمٹا ہوا تھا رو رہا تھا ڈر کے مارے اس کے منھ سے رونے کی آواز نہیں نکل رہی تھی' صرف آنسو بہہ رہے تھے۔

چتیا خون دیکھ کر ہائے ہائے کر کے رونے لگی اور بابو سے کہنے لگی۔

"لاؤ میری مالتی کو۔ لاؤ میری مالتی کو۔"

ا

کے دل سے ان کو دیکھ کر خوف کم ہوا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا۔

"باگھ' باگھ"

کسان لاٹھیاں اور روشنی لے کر جنگل میں دور تک چلے گئے۔ دو چار جگہ خون کے نشان ملے۔ ایک جگہ پنجے کا بھی نشان مل گیا جسے دیکھ کر ان لوگوں کو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ مالتی کو شیر اٹھا لے گیا ہے آخر یہ لوگ چتیا' امر' مدن اور بابو کو زبردستی جنگل سے واپس لے آئے۔

واپس آکر عورتوں بچوں اور جانوروں کو گھروں میں بند کرکے الاؤ جلا دیئے۔ آدھے مرد وہاں رہ گئے اور آدھے مرد اکٹھا ہو کر روشنی' لاٹھیاں اور جلتی لکڑیاں لے کر پیپے اور ڈھول بجاتے ہوئے جنگل میں گھسے اور مالتی کی لاش کی تلاش میں بہت دور تک چلے گئے۔ لیکن ایک تو ان لوگوں کی روشنی جنگل کے اندھیرے کو توڑنے میں ناکام رہی اور دوسرے جوں جوں جنگل میں یہ لوگ آگے بڑھتے جاتے ان کا خوف بڑھتا جاتا۔ آخر آدھی رات کو ناکام واپس آگئے۔

واپسی پر امر اور مدن بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ چھیا تو مسلسل رو رہی تھی۔ کافی تمناؤں کے بعد اس کے تین بچے ہوئے تھے۔ ایک پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا' دو جوڑہ گئے تھے ان میں سے بڑا یوں چلا گیا۔

چھیا ہر ہر شخص کو دوش دے رہی تھی کہ اس نے پہلے سے یہ کیوں نہیں بتلا دیا تھا۔ کہ یہاں لاگو باگھ بھی آتا ہے۔ سب قسمیں کھا رہے تھے کہ اس بات کی خبر نہ تھی کہ یہاں ایسا باگھ بھی ہے۔ اب تک وہ صرف جانوروں پر حملہ کرتا تھا آدمی پر تو اس نے آج تک حملہ نہیں کیا تھا۔

لوگوں کی واپسی ا کو معلوم ہوا کہ مالتی کی لاش تک نہیں ملی تو وہ اور زیادہ بے قراری سے رونے لگی۔ اس کی حالت پہ سب کو ترس آرہا تھا۔ رات بھر وہ روتی رہی۔ امر' مدن اور بابو جاگتے رہے۔ دوسرے کسان بھی خوف زدہ رہے اور ایک دوسرے کو پکارتے رہے اور شور کرتے رہے۔

صبح کو کسان پھر اپنی عورتوں بچوں اور جانوروں کو گھر میں بند کرکے ' کچھ مردوں کو ان کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر' لاٹھیاں لے کر ڈھول بجاتے ہوئے مالتی کی لاش کی تلاش میں نکلے۔ اس وقت دن کی روشنی میں خون کے نشان صاف نظر آرہے

تھے اور جگہ جگہ گھسیٹنے کے بھی نشان تھے۔ ان نشانوں نے رہبری کی۔ آخر بہت تلاش کے بعد، دوپہر کے قریب ایک جگہ جھاڑیوں کے بیچ میں، ایک گڑھے کے اندر مالتی کی لاش مل گئی۔ لاش کیا ملی، کچھ تھوڑا سا گوشت، ہڈیاں اور پھٹے ہوئے کپڑے ملے۔ لوگوں نے ان چیزوں کو ایک دھوتی میں لپیٹا اور لکڑیوں کی ٹکٹی بنا کر اس پر رکھ کر لے آئے۔

چتیا نے جو اپنی مالتی کو اس حال میں دیکھا تو اس کا کلیجہ اور پھٹ گیا اور بہت بے حال ہو کر رونے لگی اور رو رو کر کہنے لگی کہ "کچھ ہو جائے میں اب اس اجاڑ بستی میں نہیں رہوں گی۔"

جب مالتی کی لاش پھونکی جا رہی ہے تو امر کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ بیٹی کا انتم سنسکار کرنے کے لئے پروہت تک نہیں مل سکا۔ اس وجہ سے اس کا جی بھی اس بستی سے اکھڑ گیا۔

چتیا اس بات پر اڑ گئی کہ میں بن کٹ پورہ میں نہیں رہوں گی، نہیں رہوں گی، نہیں رہوں گی۔ رام لال اور دوسرے کسان مردوں اور عورتوں کا کھانا سب بیکار رہا۔

امر سوچتا ہے کہ آگے کھیت کو کیسے چھوڑ دوں۔ اور چھوڑ بھی دوں تو جاؤں کہاں۔ اور اگر نہ جاؤں تو جانوں کا خطرہ ہے۔

دو دن یہی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک طرف چتیا کی ضد تھی کہ میں اب یہاں نہیں رہوں گی اور دوسری طرف امر پریشان تھا کہ کیا کروں۔ آخر امر کو لوگوں نے سمجھایا کہ ابھی تم چتیا کی ہٹ پوری کر دو اور اس کو مائکے پہونچا دو، پھر

بعد کو جیسا مناسب ہو ویسا کرنا۔ اگر یہاں رہنے کی رائے ہو تو چتیا کو سمجھا بجھا کر لے
آنا۔ رہی چتیا کی یہ ہٹ کہ یہاں تم لوگوں میں سے کوئی نہ رہے اور سب ساتھ
چلیں، سو ابھی سب چلے جاؤ۔ جب اس کو مائکے والے سمجھائیں گے کہ بھگوان کی
مرضی ہو کر رہتی ہے۔ کہیں بھیڑیے بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں، کہیں سیتلا مائی
لے جاتی ہیں اور کہیں باگھ لے جاتا ہے۔ اس کی مرضی سے کون بھاگ سکتا ہے
تو پھر چتیا ضرور مان جائے گی۔

آخر تیسرے دن چتیا نے بازی جیت لی اور امر کا سارا گھرانا
تیار ہو گیا کہ اگلی صبح کو گاڑی پر سامان رکھ کر چل کھڑے ہوں گے۔ جس وقت
یہ فیصلہ کیا گیا ہے اس وقت دن ڈھل چکا تھا اور دھوپ کی تیزی اور دھرتی
کے تپنے میں کمی آ چکی تھی۔ یہ فیصلہ سن کر اور اس کی طرف سے اطمینان کر کے
چتیا اٹھی اور چپ چاپ اپنے کھیت کی طرف اکیلی چل دی۔

چتیا کو راستے میں بھنبھیریاں بھی ملیں اور تیتر بالے بھی، اور دونوں
اس کو مالتی کی یاد دلاتی رہیں۔ اس کے آنسو تو بہہ کر ختم ہو چکے تھے اور اب ان کے
بجائے آہیں دل و جگر کا دھواں بن کر نکلتی تھیں۔ وہ ان یادوں پر ایسی آہیں
بھرتی رہی۔ کھیت کو پار کر کے کیاری تک پہونچی تاکہ اس سے گلے مل کر ہمیشہ کے لئے
رخصت ہو لے۔ کیاری کی مینڈ پر وہ بیٹھ گئی اور دھرتی پر ہاتھ مار کر کہنے لگی۔

"میا تم نے مجھے اپنے سنگ رہنے نہ دیا"

ہوا کا وہ ٹھنڈا جھونکا جو شام کے استقبال کو آیا کرتا تھا، آیا۔
کیاری میں پھیلی ہوئی بیلوں کے پتے ہلے اور چتیا کی نظر ایک ککڑی پر پڑ گئی جس کے
منھ میں پھول لگا ہوا تھا۔ اس ککڑی نے ان ہی دونوں کے اندر اندر جنم لیا تھا۔

ہائے مالتی کو گگریوں کی حسرت ہی رہی۔ چتیا نے آگے بڑھ کر گگری کو بہت پیار سے سہلایا۔ سہلاتے ہی خشک ہوجانے والی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ گگری کی چکنی اور گول سطح پر جو ہاتھ چلا تو چتیا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گگری نہیں مالتی کی انگلی ہے۔ اس کے دل نے دھڑک کر کہا۔

"کہیں یہ مالتی ہی تو نہیں ہے؟"

ہندستان کے کسان کی زندگی یہ دیکھتے کٹتی ہے کہ بیج ختم ہو کر پودا بن جاتا ہے اور پھر پودا ختم ہو کر بیج بن جاتا ہے۔ یہ آواگون جانے کب سے چلا آرہا ہے اور کب تک چلا جائے گا۔

چتیا کا غیر تعلیم یافتہ دماغ اپنے ماحول کے پیدا کئے ہوئے فلسفے میں گم ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ دھرتی بھی تو ماں ہے وہ پودوں کو جنم دیتی ہے اور پودے اناج کو جنم دیتے ہیں۔ اسی اناج سے دودھ بنتا ہے اور اسی سے خون بنتا ہے۔ ہم مائیں بھی دھرتی ماتا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے بنتی ہیں اور

ہوتے ہیں بچے پیدا کرتے ہیں۔ پھر ہم سب اس دھرتی ماتا میں مل جاتے ہیں۔ سب دھرتی ماتا کی لیلا ہے۔

چتیا ان خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کے پیٹ کے اندر نئی جان نے کروٹ لی۔ اپنی زندگی کی پہلی کروٹ۔ چتیا بے چین ہو گئی۔ اس نے کیاری سے نظریں ہٹا کر کھیت کی طرف دیکھا۔ وہ کھیت جہاں صرف مٹی ہی مٹی تھی۔ سوکھی اور سخت مٹی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کھیت میرے رامو کو اس کوکھ میں کروٹ بدلنے والے کو جلا ملا گئے اور پروان چڑھا گئے۔ جوان کر کے پورا کسان بنا گئے۔ ان کے

گھر بسا ہیں گے۔ میری بیٹیوں کو جہیز دے کر بیاہیں گے اور پھر ان سب کی اولاد
اور اولادوں کی اولادوں کو پالیں گے۔

چیتا کو اندازہ نہیں ہوا کہ مجھے کتنی دیر ہو گئی ہے۔

اتنے میں آواز آئی۔

"یہاں کب تک بیٹھی رہے گی ـــــــــ دیکھ اندھیرا
ہو رہا ہے۔"

چیتا نے دیکھا کہ امر، مدن اور بابو اور رام لال لاٹھیاں لئے
کھڑے ہیں۔ رام لال کی گود میں رامو دبکا پڑا ہے۔ چیتا کو خیال آیا کہ جب سے
مالتی گئی ہے رام لال ماں کی طرح رامو کو پال رہا ہے۔

چیتا نے کیاری سے مٹی لے کر اپنے ماتھے پر ٹیکا لگایا اور پھر دھرتی
میا کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور کہا۔ "میا! میں تم سے بھاگ کر کہاں جا سکتی
ہوں؟ تجھ ہی سے اپٹی ہوں اور تجھ ہی میں ملوں گی" پھر چیتا نے امر وغیرہ سے کہا۔

"تم لوگ سمجھیا ـــــــ جہاں جاؤ گی اپنا بھاگ لے کر جاؤں گا۔
پھر کہیں جانے سے کیا فائدہ؟ بابو بھیا! اب تم جھینگریوں اور تیتریوں کو نہ
پکڑنا۔ کہیں ان ہی کی ہائے ہم پر نہ پڑی رہو۔"

چیتا نے اپنی ساری سے ایک دھجی پھاڑی اور اس میں کھیت کی مٹی
باندھ کر رام لال سے کہا۔

"بھیا رام لال میں تمہارے راکھی باندھوں گی۔"

"تم مجھ پر بڑی دیا کرتے ہو۔ اب بھی دیا رکھنا۔"

رام لال نے حسرت سے جیتا کی طرف دیکھا مگر انکار کیسے کرتا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کلائی اس کی طرف بڑھا دی۔

"شکار"

مالتی کی لاش پھونکنے کے دوسرے دن آٹھ دس کسان ٹھیکہ دار صاحب کے پاس پہونچ گئے اور ان سے کہا۔

"حجور! ہماری بستی میں لاگو باگھ آگیا ہے۔"

یہ سنتے ہی ٹھیکے صاحب کا جو متفکر سے بیٹھے ہوئے تھے رنگ ہی بدل گیا۔

"سچ؟"

"جی ہاں"

"لاگو ہے وہ"

"جی ہاں"

"تیرے منہ میں گھی شکر۔ ارے بلانا تو قادر خاں کو.... ہاں

بھئی کیسے معلوم ہوا کہ وہ لاگو ہے ؟"

مدن نے جو سب کے پیچھے کھڑا تھا ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"حضور میری بھتیجی کو اٹھا لے گیا۔"

"چہ چہ۔ بہت افسوس ہوا۔ مگر بھیا ملا خوب لاگو شیو تم لوگ گھبراؤ نہیں۔ خود لاٹ صاحب اس کا شکار کھیلنے آئیں گے، اور وہ کم بخت کنوؤں میں بھی چھپے تو مار لیا جائے گا۔"

قادر خاں نے آتے ہی پوچھا۔

"بھتیجی کتنی بڑی تھی۔"

پانچ چھ سال کی۔

"اتنی چھوٹی !! بھیر کہیں وہ بھیڑیا تو نہیں تھا۔ لاش اس کی ملی ؟ تو کس حال میں ؟"

ایک گڑھے میں جھاڑی کے پیچھے۔ کھائی ہوئی۔"

"ہوں۔ اور پنجوں کے نشان ؟"

"کسی نے آنکھوں سے اس کو لے جاتے دیکھا تھا ؟"

(مدن کی طرف اشارہ کرکے) اس کے بھائی نے دیکھا تھا جو سیانا ہے

چوبدار صاحب نے کہا۔ بھئی قادر خاں یوں کام نہیں بنے گا، تم ابھی جاؤ اور پتہ لگاؤ۔"

اسی وقت قادر خاں نے اپنے ساتھ دو سپاہی دو بندوقیں اور ایک رائفل لی اور چل کھڑے ہوئے۔ قادر خاں کی داڑھی

ڈی سے تقسیم ہوکر آدھی ادھر اور آدھی اُدھر چڑھی ہوئی تھی" مونچھوں پر دہ
ؤ دیا کرتے تھے اور شکار کی طرف ذرا حریص نظروں سے دیکھتے تھے۔ ستے بڑے
لئے ۔ ہر وقت جنگل میں جانے اور شکار کرنے کو تیار رہتے تھے۔

قادر خاں نے بن کٹ پورہ آکر لوگوں سے شیر کے بارے میں دو چار باتیں
چھیں اور پھر پانی تک نہیں پیا اور وہاں کے چار کسانوں کو ساتھ لے کر اپنے
پاہیوں سمیت جنگل میں گھس گئے۔ انھوں نے غور سے خون کے قطروں اور پنجوں
نشانوں کو جہاں لاش ملی تھی وہاں تک دیکھا اور پھر کہا۔" یہ شیر ہی ہے،
بستی کے کسانوں کو قادر خاں کی صورت ہی دیکھ کر ڈھارس بندھ
گئی تھی۔ انھوں نے اس صورت سے اپنی جگہ یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ شیر مارنے
ے ہیں اور مار بھی لیں گے اور یہ سمجھ کر اُن کا خوف بھی ذرا کم ہوگیا تھا۔ لیکن
گل سے وہ خالی ہاتھ واپس آئے تو سب کو بڑی مایوسی ہوئی۔

قادر خاں صاحب بستی میں [illegible] باہر بیٹھ گئے اور چنے
رما گرم روٹی چٹنی کے ساتھ کھائی اور کسانوں کو سمجھایا کہ جب تک شیر مارا
جاتا ہر اپنی حفاظت کرو وہ یوں کہ سورج ڈوبنے سے گھنٹہ بھر پہلے کھیت
لوٹ آؤ ..... جنگل کے درختوں سے کم سے کم سو قدم ضرور دور رہو۔
گل سے اگر لکڑیاں لینے جاؤ تو آٹھ دس آدمی ساتھ جاؤ اور ڈھول اور
پیے بجاتے رہو۔ جانور جنگل میں چرآؤ۔ ساتھ ساتھ انھوں نے یقین دلایا
تھے دس دن کے اندر ہی اندر شیر مار لیا جائے گا۔

جب قادر خاں چلے گئے تو کسانوں کے دل میں پہلے سے زیادہ

دہشت بیٹھ گئی۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ خان کا ایسا آدمی جو بندوق بھی رکھتا ہے اور شکاری بھی سمجھا جاتا ہے ۔ ایسی ایسی احتیاطوں کا مشورہ دیتا ہے ۔ ہونہ ہو یہ شیر بے حد خطرناک ہے ۔ اس طرح قادر خاں کے جانے کے بعد بستی میں مردنی سی چھا گئی ۔

رات کو امرا اور سب کسان گھروں کے صحن میں الاؤ جلاتے تھے اور چھتوں پر چڑھ چڑھ کر سوتے تھے اور ایک نہ ایک آدمی رات کو جاگتا رہتا تھا اور ڈھول یا پیپا بجاتا رہتا تھا۔ آج کل چاندنی راتیں تھیں اور کھیت دور تک میدان کی شکل میں پھیلے ہوئے نظر آتے تھے ۔ ان کے بعد ہی جنگل کی کالی دیوار تھی جو اپنے دامن میں جانے کیسی کیسی بلاؤں کو چھپائے ہوئی تھی ۔ ایک دنیا تھی اس کے پیچھے نامعلوم اور بھیدوں سے پر جو جانے کہاں تک چلی گئی تھی ۔ اس دنیا سے پنجوں [illegible]

کھانے والے کی خوف [illegible] ۔

اس طرح تیرہ دن گزر گئے اور مالتی کی تیرھویں بلا کسی خاص رسم کے آئی اور چلی گئی ۔ چنیا جو روزانہ دو تین مرتبہ آنسو بہا لیتی تھی ۔ اس روز دن بھر روتی رہی ۔

ایک دن ایک عورت نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ باگھ جنگل سے نکل کر آیا ' اس نے بستی کی طرف غور سے دیکھا اور پھر چڑیا کی طرح اپنے پنکھ کھولے اور اڑ گیا ۔ پہلے بھی کچھ لوگوں کو شک تھا کہ وہ شے جو مالتی کو لے گئی ہے شیر نہیں ' شیر کے روپ میں کوئی بھوت پریت ہے ۔ اب جو یہ واقعہ سنا تو اس بات کا ان کو یقین آ گیا ۔ افسوس وہاں کوئی اوجھا یا اور کوئی

جھاڑ پھونک کرنے والا نہ تھا جو تبلاتا کہ کیا کرو۔ سب سے زیادہ جس دل پہ اس خبر نے چوٹ پہونچائی۔ وہ جیتیا کا تھا۔ اس خبر کو سن کر وہ پھر اپنے اس فیصلے میں کہ اس بستی کو نہ چھوڑا جائے۔ ڈانواڈول ہوگئی۔

ٹونے ٹوٹکے کے معاملہ میں عورتیں مردوں سے زیادہ واقف کار ہوتی ہیں۔ کسی بوڑھی عورت نے تبلایا کہ تالاب کا پانی لے کر اس پہ رام کا نام لو، اور کسی حاملہ عورت کے ہاتھوں بستی کے چاروں کونوں پہ ڈلوا دو۔

دوسرے دن یہ رسم بہت اہتمام سے ادا کی گئی۔ جیتیا نے اپنے ہاتھ سے سب عورتوں، مردوں اور بچوں کے جلوس سمیت جا جا کر چاروں کونوں پہ پانی ڈالا۔ جب وہ واپس آرہی تھی تو اس کے اندر والی جان نے کروٹ بدلی اور جیتیا ماتھا کے سر در میں دعا کرنے لگی کہ اے بھگوان اس ذات کو تو شیر کے روپ میں آنے والی بلا سے محفوظ رکھنا

اس ٹوٹکے سے ذرا خوف میں کمی ضرور ہوگئی۔

اس عالم میں بیس[۲] روز گزر گئے اور کسانوں کو یہ فکر ہونے لگی کہ اب اللہ دس دن میں پانی برسنا شروع ہو جائے گا۔ پھر ایسے میں کھیت کیسے گوڑے اور بوئے جائیں گے۔ یہ فکر اتنی زیادہ تھی کہ اس میں وہ شیر کو بھی بھول گئے تھے۔ ہر ایک نے اپنی جگہ یہ طے کر لیا تھا کہ اگر پانی برس گیا تو میں اپنے کھیت میں لگ جاؤں گا پھر چاہے شیر آئے یا جو بھی ہو۔

اکیسویں دن ٹھیکیدار صاحب مع خیموں ڈیروں اور ساز وسامان کے چھکڑوں کے آگئے۔ آکر انھوں نے شکار کی تو بات نہیں کی پانی کے لئے

کنویں دیکھنے لگے اور خیمے لگانے کے لئے جگہ تیار کرنے لگے۔ خان صاحب نے امر کا کھیت خیموں کے لئے پسند کیا۔ اس کی صفائی ہونے لگی۔ جھاڑیاں صاف کی جانے لگیں اور زمین ہموار ہونے لگی۔ اور ان میں چھوٹے چھوٹے خیمے اور راؤٹیاں نصب ہونے لگیں۔

چار روز کے بعد گھنٹیاں بجاتے ہوئے دو ہاتھی آئے جن پر بہت ساز و سامان تھا۔ بہت بڑا خیمہ تھا جو بیں بلکہ تختے تھے اور جانے کیا کیا تھا۔ یہ سامان اتارا جانے لگا۔ اور پھر خیموں کے بیچ میں بڑی سی جگہ پر بڑا خیمہ نصب کیا جانے لگا۔ کسانوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس قسم کا خیمہ ہے اور کتنا بڑا ہے۔ لیکن جب دن بھر میں بہت محنت سے میخیں لگانے اور ڈوریاں کسنے کے بعد شام کو اسے اٹھایا گیا تو انھوں نے دیکھا کہ وہ تاڑ کے برابر اونچا ہے اور شہر کے مکانوں کے برابر لمبا اور چوڑا۔ اس خیمے کے اندر چوبوں کے سہارے تختے جڑ کر ایک کوٹھا بنا دیا گیا۔ خیمے کے ہر طرف لکڑی کے دروازے جڑ دیے گئے اور اوپر کے کوٹھے میں کھڑکیاں لگا دی گئیں۔

نیچے ایک بڑا سا ہال نکل آیا جس کے تین طرف تین بڑے بڑے کمرے تھے۔ ہال اور کمروں کے درمیان شیشے دار دروازے فٹ کر دیئے گئے تھے۔ اوپر جانے کے لئے ایک خوبصورت سیڑھی لگائی گئی۔ ہال میں قالین بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ اس کے پیچھے اور کوٹھے پر مسہریاں بچھائی گئیں۔ باہر کا جو راستہ تھا اس کے سامنے خس کی چھت دار چھوٹا سا کمرہ بنا دیا گیا جس کے دونوں طرف دروازے تھے۔

یہ سب کام دوسرے دن دھوپ اور سخت گرمی میں ہوتا رہا۔ کسان بھی جی لگا کر یہ کام کرتے رہے۔ جو کسان کام میں لگے تھے وہ بھی اور دوسرے کسان اور سب کے بیوی بچے بھی اس دھوپ اور گرمی میں کھڑے اس کپڑے کے گھر کو بنتے ہوئے اور ہاتھیوں کو جھوم جھوم کر درختوں کی ملائم شاخیں کھاتے ہوئے دیکھتے رہے ان لوگوں کے لئے یہ دونوں چیزیں بہت حیرت انگیز تھیں۔

سورج ڈوبنے سے پہلے جب کسان اپنے اپنے گھروں کو واپس ہونے لگے تو امر نے چیتا سے کہا۔

امر: "یہ کپڑے کا گھر اور ہاتھی دیکھے؟"

چیتا: "ہاں۔ ان کو دیکھ کر بڑا آنند آتا ہے۔"

امر: "ہاں اور دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اچھا جنم کیا ہوتا ہے اور برا جنم کیا ہوتا ہے"۔

چیتا بھی بات محسوس کر رہی تھی لیکن زبان سے ادا کرنے کو اسے الفاظ نہیں مل سکے تھے۔ امر کی بات سن کر اس نے اس بات کے چند پہلو اور محسوس کئے لیکن ان کو بھی کہہ نہ سکی۔ امر اور چیتا کا شمار بچپن میں اچھے بچوں میں کیا جاتا تھا یعنی ان کو ان کے ماں باپ نے جو جو سکھایا انھوں نے سب اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ محنت سے کبھی جی نہیں چرایا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ آس پاس کے لوگوں میں سمجھدار سمجھے جاتے تھے۔ دونوں اچھے مذہبی بھی تھے۔ کبھی کوئی خاص برا کام زندگی میں نہیں کیا تھا۔ لیکن آج وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان سب باتوں کے باوجود ان کی زندگی میں اور اس خیمے اور ہاتھیوں والوں کی زندگی میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ یہ دوری آخر کیوں ہے؟ پھر وہ خود ہی اپنے آپ جواب دیتے۔ یہ سب جنم کا پھیر ہے۔ ان

لوگوں نے پچھلے جنم میں کوئی پاپ ہی کیا ہوگا جو وہ کسان پیدا ہوئے۔ خیمے اور ہاتھی والوں نے اپنے پچھلے جنم میں نیک کام کئے ہوں گے۔ قسمت کے کھیل کی یہ شہادتیں ان لوگوں کے لئے ٹھوس حقیقتیں تھیں جو وہ پشتوں سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔ چیتا بہت دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر جانے خیالوں میں کتنی دور جاکر وہ واپس آئی۔ اور کہنے لگی: "بس بھگوان ہمارے بچوں اور ہمارے اس کھیت کو رہنے دے، ہم اتنے ہی میں بہت سکھی ہیں۔"

امر کے جی میں سماج کے اونچ نیچ اور بھگوان کے انصاف کے بارے میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ یہ دعا سن کر اس کے دل کو آنند سا آگیا۔

ہاتھی پر جو لوگ آئے تھے۔ انھوں نے خبر دی تھی کہ اس علاقے کے مالک نواب صاحب مع چھوٹے لاٹ صاحب کے آرہے ہیں۔ اور مشہور شکاری خان بہادر مشتاق احمد بھی ساتھ ہوں گے۔

کسان صبح تڑکے سے انتظار کرنے لگے۔ لیکن صبح گزر گئی، دن چڑھتے چڑھتے دوپہر ہوگئی اور پھر سہ پہر ہوگئی۔ مگر کوئی نہیں آیا۔

دوسری صبح کو دن ذرا چڑھا تھا کہ ہاتھی کے گھنٹے سنائی دینے لگے اور تھوڑی دیر میں ہاتھی سامنے آیا۔ اس پر کچھ مسافر تھے اور کھانے پینے کا اور دوسری قسم کا سامان۔

مسافروں میں ایک صاحب ترچھی ٹوپی پہنے تھے ان کو دیکھتے ہی ٹھیکیدار صاحب نے بڑھ کر کہا۔

"آداب عرض ہے بڑے آغا صاحب کو۔۔۔ کیا بات ہوگئی کہ نواب صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے ؟"

بڑے آغا۔۔۔۔ "بھئی عجیب معاملہ ہے۔ وہ جو چھوٹے لاٹ صاحب ہیں نا، وہ چاہتے ہیں کہ لاگو شیر کو شکار کریں۔ اسی کے انتظام میں دیر ہوگئی۔"

ٹھیکیدار صاحب "مگر میں نے تو کہلوا دیا تھا کہ یہ شیر لاگو ہے اور اس گاؤں کی ایک لڑکی کو کھا چکا ہے۔"

بڑے آغا۔ "جب نواب صاحب نے بڑے لاٹ صاحب سے کہا کہ آپ کی فرمائش کے بموجب میں نے ایک لاگو شیر ڈھونڈھ لیا ہے۔ اب جی چاہے آپ خود چلیں اور جی چاہے چھوٹے لاٹ صاحب کو بھیج دیں۔ لاٹ صاحب نے پوچھا کہ اس شیر کے مارنے کے لئے کیا سرکار کی طرف سے کوئی انعام ہے نواب صاحب نے کہا کہ ابھی تو کوئی انعام نہیں ہے۔ لاٹ صاحب نے کہا کہ پھر یہ شیر سند یافتہ لاگو نہیں ہے کوئی سند یافتہ شیر ڈھونڈیے۔"

ٹھیکیدار صاحب "سند یافتہ کی ایک ہی کہی! واہ بھئی۔ یہ صاحب بہادر خاص قسم کے معلوم ہوتے ہیں۔ آم کھانے پر بس نہیں کرتے پیڑ گننا ضروری سمجھتے ہیں۔"

بڑے آغا۔ "مگر ہمارے نواب صاحب نے جو کیا وہ بھی خوب ہی رہا۔

ٹھیکیدار صاحب "کیا کیا انھوں نے ؟"

بڑے آغا۔ "وہ تو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہیں سب طرح

کی باتیں جانتے ہیں اور کہنے لگے کہ میں سمجھ گیا لاٹ صاحب کیا چاہتے ہیں
بس پھر وہ ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس گئے۔ اور کہا کہ میرے علاقہ میں
ایک شیر لاگو ہوگیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کے مارنے پر آپ اپنی طرف
سے ۵ سو کا انعام رکھ دیں اور یہ کہہ کر رقم پیش کردی۔ بس دوسرے ہی
دن انعام کا اخباروں میں اعلان ہوگیا۔ نواب صاحب نے یہ اعلان لاٹ
صاحب کو دکھلا دیا۔ لاٹ صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور پروگرام
طے ہوگیا۔ اب کل یا پرسوں نواب صاحب اور چھوٹے لاٹ صاحب
آجائیں گے۔

کیوں ٹھیکیدار صاحب یہاں کے سب انتظامات تو ٹھیک ہیں؟"

ٹھیکیدار صاحب" سب انتظام چوکس ہے۔"

"بھئی بڑے آغا سچ تو یہ ہے کہ ہمارے نواب افسرالدولہ نے ریاست
کی شان بہت بڑھادی ہے۔ یہ لاٹ صاحب کا آنا، یہ شیر کا شکار اس ٹھاٹ
باٹھ سے۔ یہ سب کہاں تھا پرانی نوابی کے زمانے میں۔"

"بس ان کے زمانے میں تو ناچ گانا اور جلسے ہوتے رہتے تھے۔ مگر
ایمان کی بات یہ ہے کہ ہوتے تھے بڑے زور کے۔ میرا تو اس زمانے میں اس
دربار میں آنا جانا تھا نہیں لیکن بھائی عبدالغفور بتلاتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسے
ایسے جلسے بھی ہوئے ہیں جو لگاتار تین تین دن اور رات چلے ہیں اور جس میں
سو کے قریب طوائفوں اور کشمیریوں اور نقالوں نے حصہ لیا ہے۔ اور لطف
یہ ہے کہ پرانے نواب صاحب یہ سب کام بھی کرتے تھے اور علاقے کو بھی

دیکھتے تھے۔"

"ان کا دیکھنا اور تھا اور ہمارے نواب افسرالدولہ کا دیکھنا اور ہے انھوں نے آتے ہی سال بھر کے اندر اندر بن کٹ پورہ کے دوبارہ بسائے جانے کا حکم دے دیا اور اسامیوں کو بڑی بڑی رعائتیں دیں۔ اور اسامی لانے والے کو انعام الگ۔"

ہاں بھئی اپنے نواب صاحب کا کیا کہنا!! میں کہتا ہوں کہ ان کی طرح انگریزوں سے انگریزی میں بات چیت کرنے والا ہی نہ ملے گا۔ جب وہ انگریزی کپڑے پہن کر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر گٹ پٹ کرتے ہیں، بس لاٹ صاحب معلوم ہوتے ہیں۔

ہاتھی پر ایک بائی جی بھی تھیں اور ان کے ساتھ تین سازندے اور ایک استاد بھی۔ استاد نے اترتے ہی ٹھیکیدار صاحب کو فرشی سلام کیا اور بائی جی سے کہا۔ بیٹی آپ کو آداب بجا لاؤ۔ جنگل پر راج آپ ہی کا ہے اگر آپ چاہیں گے تو ہم لوگ شیر کے منھ سے بچیں گے۔ ورنہ اس کا لقمہ بن جائیں گے۔"

بائی جی نے ذرا ترچھی پیار بھری نظروں سے ٹھیکیدار صاحب کی طرف دیکھا اور جھک کر نزاکت بھرے ہاتھوں سے تسلیم عرض کی۔

ٹھیکیدار صاحب کا رنگ ذرا سانولا تھا۔ مگر ناک و نقشہ بہت متناسب تھا۔ اس پر اکہرا پھرتیلا جسم اور شکاری تیور۔ اس وقت نیکر

اور خاکی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ اور اپنے سن سے دس سال کم معلوم ہو رہے تھے۔

ٹھیکیدار صاحب نے بائی جی کو غور سے دیکھا گویا یاد کر رہے تھے کہ اس سے پہلے ان کو کہاں دیکھا تھا بائی جی اس نگاہ کو تاڑ گئیں لپک کر بولیں۔

بائی جی "بڑے نواب نے اپنا مقدمہ جیتنے پر جو جشن منایا تھا۔ اس میں میں نے آپ کو دیکھا تھا اور تسلیم عرض کی تھی۔"

اچھا۔ ہاں۔ یاد آ گیا۔ کیا غزل گائی تھی تم نے... اہاہا... ابھی تک زبان پر مزہ ہے۔

جانے کیا ساقی کی نظروں نے اشارہ کر دیا
نذرِ ساغر آج ہم نے زہد و تقویٰ کر دیا

یہ ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے یاد رکھا۔"

استاد جی نے اس پر مکھن کی ایک گولی لگائی اور کہا۔

"آپ اس جنگل کے ٹھیکیدار ہیں، اور نواب صاحب کے حکم سے یہ نئی بستی بسا رہے ہیں۔ یہاں راج آپ ہی کا ہے۔

ٹھیکیدار صاحب اس ڈبل مکھن سے ذرا گھبرا گئے اور کہنے لگے۔

کیا سلام کیا ہے واہ بھئی واہ۔ ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

غلط محاورہ سن کے بائی جی مسکرائیں اور کہنے لگیں۔

"آپ نے توتا کیا پالا تھا جو اڑ گیا۔"

ٹھیکیدار صاحب صحبت یافتہ تھے۔ سمجھ گئے کہ پکڑے لئے گئے۔ مسکرا کر

جواب دیا۔ "بھئی تم بڑے لوگوں کی ہو۔۔۔۔ کس منہ سے کہوں کہ کیا از گیا۔
ٹھیکیدار صاحب نے اپنے نزدیک "دل از گیا" کی طرف اشارہ کیا
تھا۔ لیکن بائی جی جھک کر بولیں "اس میں چھپانے کی کون سی بات ہے۔ کہہ
دیجئے رنگ۔"
ٹھیکیدار صاحب گھبرا گئے اور محسوس کرنے لگے کہ اس سے پیش پانا
مشکل ہے۔ بات بدل کر کہنے لگے۔
"کہو مجرا وجرا ہوگا۔"
مجرا تو ہوگا۔ مگر وجرا کیا۔
"مجرا بڑوں کے لئے ہوتا ہے اور وجرا ہم چھوٹے لوگوں کے لئے۔"
(ہنس کر) مجرا تو بائی کرتی ہیں مگر وجرا کون کرتی ہیں؟"
"دائی؟"
خاں صاحب کے لئے ٹکنا مشکل ہو گیا۔ وہ بہانہ نکال کر چل دے۔
استاد۔ جی۔ آدمی کو دیکھ کر فقرے چلاتے ہیں۔
بائی جی" استاد جی۔ ان کی چڑھی ہوئی مونچھیں اور دیکھے تیور اور
کڑاک دار لہجہ دیکھ کر زبان کھلانے لگی تھی۔"
دراصل بائی جی کو یہ بھی غرور تھا کہ وہ نوابوں کی منظور نظر ہیں اور
ان کا درجہ ٹھیکیدار وغیرہ سے بلند ہے۔
ایک سازندے نے ہاتھی سے اتر کر ادھر ادھر پاؤں جھٹکے اور

پھر دوسرے سے کہنے لگا۔

"نبو صاحب سمجھا۔ میرے خیال میں تو موٹر کی سواری سے لاکھ درجے ہاتھی کی سواری اچھی"

نبو صاحب۔ "کیا بات کہی آپ نے میر صاحب!! لاکھ کچھ ہو، ہاتھی پھر جاندار ہے۔ اس وجہ سے سمجھ میں آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بے جان موٹر کا کیا ٹھکانہ جانے کہاں جائے اور کدھر لے جائے"

یہ بات بھی ہے۔ مگر مجھے تو تکلیف یہ ہوتی ہے موٹر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنا پڑتا ہے لیکن ہاتھی ایسی سواری ہے جس طرح چاہے بیٹھو۔

"مگر میر صاحب۔ میں تو موٹر اور ریل دونوں سے گھبراتا ہوں کیوں کہ بے جان کے ہاتھوں اپنی جان سپرد کرتے وحشت ہوتی ہے۔

میر صاحب: "ریل سے تو میں بھی گھبراتا ہوں۔ کیوں کہ وہ ایک منٹ میں کسی کی مروت نہیں کرتی۔ ایک مرتبہ بڑے نواب صاحب سفر کر رہے تھے ان کے حقے کا صرف ایک ہی مہنال ساتھ آیا۔ دوسرا گھر ہی پر رہ گیا تھا۔ جب اسٹیشن پر اس بات کا خیال آیا تو بڑے آغا نے بیارے کو دوڑایا۔ مگر وہ آیا نہیں تھا کہ ریل چھوٹنے کا وقت آگیا۔ بڑے آغا صاحب نے مجھ سے کہا کہ میر صاحب ذرا جا کر ریل والے صاحب بہادر سے کہہ دیجئے کہ ذرا ٹھہر کر چلیں۔ میں چلا آدھر۔ ریل تھی کہ شیطان کی آنت، میں چلتا رہا۔ اگر اپنی سڑک پر ہوتا تو اتنا چلنے سے نکڑ تک پہونچ گیا ہوتا۔ آخر ریل والا صاحب بہادر ملا۔ اس کو میں نے بتلایا کہ بڑے نواب صاحب بنفس خود ریل میں جلوہ افروز ہیں اور ان کی مرضی

خاص یہ ہے کہ تم ذرا آدھ گھنٹہ ختم کر چلو۔ چاہو تو دگنے پیسے لے لو۔ انعام و اکرام الگ سے ملے گا۔ اس نے کہا نہیں۔ میں نے کہا اچھا تگنے دام۔ پھر کہا چوگنے دام۔ ارے صاحب ریل کا رُکنا کیا وہ اور اس کے پاس والے ہنسنے لگے۔ میں نے آکر بڑے آغا سے عرض کی گاڑی جو آگ کھائے، انگارے گرائے اور دھوئیں کی سانس لے۔ اس میں مروت کہاں سے آئے۔ قسم ہے آپ کے سر کی۔ نواب صاحب نے یہ فقرے جو سنے تو جھومنے لگے۔ اور اس وقت مجھے دس روپے انعام کے مرحمت فرمائے۔"

"واہ وا۔ آپ نے شاعری کر دی۔ دیکھئے یہ کیا خیمہ لگا ہے۔ خیمہ ہے کہ بارگاہ۔"

"نبو صاحب" یہ نہ خیمہ ہے اور نہ بارگاہ۔ یہ تو دل بادل کہلاتا ہے کیا کپڑے کا محل ہے۔ ذرا دیکھئے گا اس کے سائبان میں روشن دان بھی ہیں۔ ہو نہ ہو صحبت اندر ہی جمے گی۔"

رات کو تو صحبت اندر نہیں جم سکتی۔ گرمی کس بلا کی ہے۔"

بھئی یہ تو شیر دل کی دنیا ہے۔ یہاں رات کی صحبت باہر جانا جان پر کھیلنا ہوگا۔ جانے کب شیر بھیا نہ پڑے۔

ٹھیکیدار صاحب نے کام کے لئے امر کے ساتھ بابو اور مدنی کو بیگار میں پکڑ لیا تھا۔ یہ دونوں بھی اپنے اس کام سے خوش تھے کیوں کہ ان کی نہر کیاری اور گھر تو پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔ کھیت اس موقع پر صاف ہو گیا تھا اور اب پانی پڑنے سے پہلے ان لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ دوسرے ٹھیکیدار صاحب کے یہاں سے ان

کے لئے چھینا اور رات کے لئے سرحال جاتا تھا۔ بہت سے نئے نئے تماشے دیکھنے میں آرہے تھے۔ وہ گھاتے ہیں:

بڑے آغا اور ٹھیکیدار صاحب نے بائی جی کی بہت خوشامد کی کہ وہ ایک چیز سنا دو لیکن وہ سر پکڑے لیٹی رہی اور کہتی رہی کہ سفر کی تکان کی وجہ سے ایسا درد ہے کہ سر پھٹا جا رہا ہے۔

نواب صاحب اور لاٹ صاحب کے آنے سے پہلے ایک ٹولی اور آئی جس کی صورت دیکھ کر گاؤں والے جو ہر وقت کپڑے کے محل کے گرد اکٹھا رہتے تھے خوف کے مارے کائی کی طرح چھٹ گئے اور اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

یہ سواری تھی چھوٹے کپتان صاحب کی جن کے ساتھ دار وغہ جی اور دو تین پولیس والے بھی تھے۔ یہ سب گھوڑوں پر سوار تھے۔

کپتان صاحب جن کا نام ان کے اردلی نے راحت رسول تبلایا یہ انگریزی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور انگریزوں والی موٹی بیڑی پیتے تھے۔

اس ٹولی نے گاؤں کا چکر لگایا۔ رام لال کو بلا کر پوچھا کہ وہ اس سے پہلے کہاں کہاں رہا تھا۔ اس سے کچھ کاغذ منگا کر دیکھے اور پھر کپتان صاحب نے سب دیہات والوں کو اکٹھا کیا اور کہا۔

"دیکھو لاٹ صاحب کے ایک رشتے دار تم لوگوں کی خاطر شیر مارنے آرہے ہیں۔ جو کچھ وہ لوگ چاہیں وہ کرنا۔ ایسا کروگے تو شیر مارا جائے گا۔ اگر ایسا نہ کروگے تو شیر بھی زندہ بچ جائے گا اور دار وغہ جی کے جوتے بھی پڑیں گے۔"

گاؤں والے یہ سن کر ہاتھ جوڑنے لگے اور کہنے لگے۔

"حضور جو حکم ہوگا ہم بجا لائیں گے ۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں ۔ !"

"ڈرو نہیں ۔ بس ایسا کرنا کہ جو کام تم سے کہا جائے وہ اسی طرح کرنا جیسے اپنا کام کرتے ہو ۔ اور ہاں اگر تمھارا کوئی مہمان آئے تو اسے بلا داروغہ جی کی اجازت کے جب تک لاٹ صاحب اس طرف رہیں ۔ نہ ٹھہرانا ۔"

کپتان صاحب نے ایک بات ایسی کی جس کی کسی افسر سے دیہات والے توقع نہیں کر سکتے ۔ یعنی انھوں نے امر سے اظہار ہمدردی تو کیا ہی ۔ گھر پر جا کر چیتا کو دلاسا دیا ۔ وہ بلک کر رونے لگی تو کپتان صاحب نے کہا ۔

"تم گاؤں نہ چھوڑو ۔ شیر ضرور مارا جائے گا"

پھر کپتان صاحب نے رامو کو پانچ چمکدار سی چیزیں کھیلنے کو دیں ۔ ان کے اردلی نے بتلایا کہ وہ چھوٹے ہوئے کارتوس ہیں ۔

امر اور چیتا کو برسوں تک کپتان راحت رسول یاد رہے ۔

شام کو یہ خبر ہرکارے لائے کہ کل صبح دس بجے تک نواب صاحب مع چھوٹے لاٹ صاحب کے تشریف لا رہے ہیں وہ لکھنؤ سے موٹر پر چلیں گے اور جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے وہاں سے ہاتھی پر آئیں گے ۔ ہاتھی اسی وقت چل دیے ہوں گے وہ رات ریت پر گزاریں گے اور صبح جنگل کے نکڑ پر تیار ملیں گے ۔

دوسرے دن صبح کو ایک بکری اور چار پانچ مرغیاں ذبح کی گئیں ۔ اور باورچی ان کے پکانے میں لگ گئے دور دور تک جھاڑو دلوائی گئی جس کی ٹٹیوں پر پانی چھڑکا گیا جگہ جگہ پھولوں کے گملے رکھ دیے گئے اور گلدانوں میں گلدستے لگا دیے گئے بال کی چھت

سے پنکھا لٹکا دیا گیا۔ یہ سب کام ختم کر کے لوگ آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ دس بجے کے قریب ہاتھیوں کی گھنٹیوں کی آوازیں دھیمی دھیمی آنے لگیں۔ اور چوتھائی گھنٹہ کے بعد چھ ہاتھیوں کا ایک قافلہ آ پہونچا۔ جن کے اوپر گنگا جمنی ہودے تھے۔ ان میں چھوٹے لاٹ صاحب اور نواب صاحب اور خان بہادر مشتاق احمد صاحب تھے دوسرے ہاتھیوں پر دو انگریز اور کچھ سپاہی بندوقوں سے مسلح بیٹھے تھے ان کے آتے ہی میدان میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ دوڑ کر سلام کرنے کو حاضر ہو گئے اور قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔

سب سے پہلے بڑے آغا اور ٹھیکیدار صاحب نے آگے بڑھ کر لاٹ صاحب کو، اور پھر نواب صاحب کو جھک جھک کر تسلیمیں کیں۔ ان کے ساتھ ملازموں کی پوری صف تسلیمیں ادا کرنے لگی۔

ان سب سے پیچھے کافی دور پر کسانوں کی بھیڑ تھی۔ ان لوگوں نے بھی اپنے مائی باپ کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ سب سے زیادہ پرخلوص سلام چھیتا اور رامر کا تھا۔ کیوں کہ ان کے دل نے اس شان و شوکت سے آنے والے شکاریوں سے مرعوب ہو کر صدا لگائی تھی اب ایک شیر کیا دس ہوں گے تو بھی مارے جائیں گے لیکن اس صدا کے اندر بھی ایک ہلکی سی کھٹک تھی کہ اگر وہ کوئی بھوت پریت ہوا تو کیا ہوگا۔

(۴)

چھوٹے لاٹ صاحب کے بارے میں نواب افسرالدولہ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ انگلستان کے کسی بڑے بھاری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بڑے اثر والے آدمی ہیں جو صرف ہندستان کے سیر و شکار کا لطف اٹھانے آئے ہیں — اور

چاہتے ہیں کہ یہاں کی ہر طرح کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوں۔

نواب صاحب موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر طرح کے سامان سے لیس ہو کر آئے تھے۔ اسی ضمن میں انھوں نے بائی جی کو بھی ساتھ رکھ لیا تھا کہ شاید ان کی ضرورت پڑ جائے۔ آج پہلی نشست کھانا کھانے کے بعد ہوئی۔ دل بادل کے ہال میں دو صوفے ڈال دیے گئے۔ ایک پر چھوٹے لاٹ صاحب اور دوسرے پر نواب صاحب اور خان بہادر مشتاق احمد صاحب بیٹھ گئے۔ لاٹ صاحب کے ساتھ کے دونوں انگریز، بڑے آغا اور قادر خاں قالین پر ادب سے بیٹھ گئے۔ نشست جمنے کے بعد سارنگی نے لے چھیڑی، طبلے نے تھاپ دی اور بائی جی نے جو گلابی بادلے کی پیشواز پہنے تھیں، لہرا کر کتھک رقص شروع کیا۔ انھوں نے دکھلایا کہ رادھا جی نے کس طرح سے گھونگھٹ کھول کر کرشن جی کو دیکھا، کیسے کرشن جی نے پچکاری ماری اور پچکاری سے رادھا کیسے بھیگیں۔ رادھا نے گگری اٹھائی اور کس طرح پنگھٹ سے واپس ہوئیں۔ ان حرکات و سکنات میں نازو انداز بھی تھے ادائیں بھی تھیں بے باکیاں بھی تھیں مگر تھیں سب شرافت، پاکیزگی اور لطافت میں بسی ہوئیں۔ نواب صاحب انگریزی میں چھوٹے لاٹ صاحب کو سمجھاتے جاتے تھے۔ لاٹ صاحب بائی جی کی ریاضت کا نیے بھی اور خیال کی نمائندگی کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے۔ یہ حرکات کبھی تو اتنی خفیف ہو جاتی ہیں کہ صرف گردن میں ذرا سی لرزش رہ جاتی تو کبھی اتنی تیز کہ معلوم ہوتا کہ ساری دنیا تال سر در پر رقص کر رہی ہے۔ کبھی تو پاؤں کی طوفانی گردش کے باوجود گھنگھرو خاموش رہتے ہیں تو کبھی ہلکی سی حرکت پر بھی اسی طرح جھنجھنا اٹھتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے اسکاچ وہسکی کے دس پیک ایکبارگی حلق میں انڈیل دیے ہیں۔

اسی ناچ کے بعد بائی جی نے ٹھمری چھیڑی۔ "گوری دھیرے چلو ـــ

کر ٹھیک نہ جائے ۔ نواب صاحب نے پہلے تو لفظوں کے معنی لاٹ صاحب کو سمجھا
دیے اور پھر بائی جی کے بتانے کو سمجھاتے رہے ۔ بائی جی نے بھی کمال کر دیا کہ گوری
کی دھیری اور لچکیلی چال کو بیسوں طرح سے بتایا ۔ اور ہر چال پر قیامت ڈھا دی۔

دو ڈھائی گھنٹہ نشست رہی اور لاٹ صاحب نے بہت لطف اٹھایا
بائی جی کے ناچ کے وقت انھوں نے بے اختیار کہا کہ " لڑکی کا بدن ہے کہ پانی ۔
جدھر دیکھو ادھر بہہ جاتا ہے پھر بہہ کر اس طرح سمٹ آتا ہے جیسے شکاری چڑیا کے باز جھپٹ
کھاتے ہیں۔ بائی جی کے گانے پر کہا آواز پر یہ کنٹرول بہت محنت کے بعد حاصل ہوا ہوگا۔ ان
غیر شاعرانہ تعریفی فقروں سے نواب صاحب کو تو لطف آیا نہیں ۔ لیکن جب ان کا ترجمہ
بائی جی اور استاد جی کو بتلایا گیا تو دونوں کو بہت خوشی ہوئی ۔

گانے کے ختم ہونے پر نواب صاحب نے لاٹ صاحب سے پوچھا کہ
" آپ کیا آرام کریں گے ؟ " انھوں نے کہا کہ " ہندستان کی گرمی مجبور کرتی ہے کہ دوپہر
کو ذرا دیر کے لئے لیٹ جاؤں ۔ "

جب وہ جانے لگے تو بڑے آغا نے نواب صاحب کے اشارہ پر دونوں انگریزوں
میں سے ایک سے اشاروں اشاروں میں پوچھا کہ کیا بائی جی لاٹ صاحب کے ساتھ ان
کی خواب گاہ میں جائیں۔ انگریز نے آگے بڑھ کر لاٹ صاحب سے بات کی اور پھر واپس
آ کر گردن ہلا کر نہیں کر دیا ۔ خان بہادر صاحب نے یہ اشارے بھی دیکھ لئے اور سمجھ بھی گئے ۔

دل بادل سے بیس قدم ہٹ کر دھوپ اور لو میں سارا گاؤں اکٹھا تھا ۔ ان کے
لئے ہر بات نئی تھی اس لئے بہت ہی پر لطف تھی ۔ گانے کی تھوڑی بہت آواز باہر
بھی آ رہی تھی اور بہت سہانی معلوم ہو رہی تھی ۔ گانے سے تو ان کو کوئی خاص لطف

نہیں ملا لیکن اس خیال سے ان کو گانا ضرور لذیذ معلوم ہوا کہ ایک ایسی چیز جو
بہت اونچا جنم لینے والوں کے لئے مخصوص ہے آج ان کو بھی اس سے لطف لینے
کا موقع مل رہا ہے۔

گئے رات کو نشست نہیں ہو سکی کیوں کہ سر شام ہی سے کیمپ کے کناروں پر
الاؤ جلا دیا گیا اور ڈھول بجائے جانے لگے۔ اس کا سلسلہ رات بھر جاری رہا۔ اور
قادر خاں نے صبح سویرے چائے پر یہ مژدہ سنایا کہ رات شیر ان بھینسوں میں سے
جو جنگل کے کنارے باندھے گئے تھے ایک کو اٹھا لے گیا ہے۔ اور انھوں نے دو
آدمی یہ دیکھنے کو بھیج دیے ہیں کہ اس نے بھینس کو کہاں ڈالا ہے۔

دن چڑھے تک لوگوں نے آکر خبر دی کہ بھینسا دو میل دور ندی کے
کنارے پڑا ہوا ہے اس لئے شیر تین چار میل کے اندر ہی سو رہا ہوگا۔ مگر جنگل کی
بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ اس جگہ ہاتھیوں سمیت پہونچنے کے لئے چکر کا راستہ اختیار
کرنا ہوگا۔

قادر خاں نے بہت عجلت سے ضروری تیاریاں کر لیں اور پھر نواب صاحب
نے کوچ کا حکم دے دیا۔ عجلت کی وجہ سے لاٹ صاحب نے اپنا لنچ ہودے پر کھایا۔
خان صاحب نے جو منتظم بنائے گئے تھے چار بندوقچی تو کیمپ اور گاؤں کی
حفاظت کے لئے چھوڑ دیئے باقی اپنے شکار کے قافلے کو اور گاؤں کے جیالے مردوں کو
لے کر ہاتھیوں سمیت جنگل میں گھس گئے۔ ایک ہاتھی پر لاٹ صاحب اور نواب صاحب
اور دوسرے پر خان بہادر صاحب اور دونوں انگریز اور دو ہاتھیوں پر سامان تھا اور
خود قادر خاں تھے۔

چیتا یہ نہیں چاہتی تھی کہ امر بھی اسی قافلے کے ساتھ جائے لیکن جب

نواب صاحب اور لاٹ صاحب کا حکم تھا تو وہ روکتی تو کیسے روکتی۔ مگر اماں اس خیال سے خوش تھا کہ آج ہی کل میں دہشت یاگ سے نجات مل جائے گی پھر چین سے کھیتی کریں گے۔

(۳)

پہلے تو چھوٹے چھوٹے درخت ملے جو ہاتھی کے ہودے سے ذرا ہی بلند تھے پھر اونچے درخت ملنے لگے اور جھاڑیاں اور گھوڑا چھپوان گھاس ملنے لگی۔ ہوتے ہوتے درخت اتنے بلند ہو گئے کہ دھوپ بالکل رک گئی۔ یہاں سے جنگل کی وہ دنیا شروع ہوتی تھی جہاں ابھی تک بن کٹ پورہ کے کسی کسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ یہاں گھنی جھاڑیوں گھاس اور بیلوں نے زمین کو ڈھانپ لیا تھا۔ اور جھتنار درختوں نے آسمان کو چھپا لیا تھا۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ صرف ایک مخصوص راستہ تھا جس سے ہاتھی گزر سکتے تھے ورنہ اس گھنے جنگل سے صرف پیدل آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ اور کہیں کہیں وہ بھی نہیں۔ جنگل بے انتہا آباد تھا۔ چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں اور بندر قیں قیں کر کے درختوں پر کود رہے تھے۔ کسی طرف کی جھاڑی سے خرگوش نکل کر بھاگتا تھا تو کسی طرف گھاس سے چڑیوں کے جھنڈ یکایک نکل کر جھپٹتے پر پھٹ پھٹاتے آسمان پر چکر کاٹنے لگتے۔ زمین کافی ناہموار تھی۔ کہیں ٹیلے تھے تو کہیں گڑھے۔ دفعتاً جنگل کے بیچ میں ایک نالا نظر پڑا۔ جس کا پانی تیزی سے مگر بلا کسی آواز کے بہہ رہا تھا درخت کی شاخیں اور گھاس کے جھنڈ اس کے کناروں کو نظروں سے چھپائے ہوئے تھے۔ نالے کو ہاتھیوں نے اتر کر اور آدمیوں نے پیر کر پار کیا۔ اس کے بعد بڑے درخت ختم ہو گئے اور ہاتھی چھپوان گھاس اور نرکل کا جنگل آگیا۔ یہاں پیدل

چلنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا وہ یہ کہ ہاتھیوں کے پیچھے پیچھے چلا جائے۔

لاٹ صاحب کے لئے جنگل کا یہ نظارہ بالکل نیا تھا۔ وہ ہندستان کی لمبائی چوڑائی کا احساس کرکے بھونچکے ہو رہے تھے۔ جب بمبئی سے چلے تھے تو کئی دن اور ایک راتیں مسلسل چلنے کے بعد دہلی پہونچے تھے۔ راستے میں بڑے بڑے دریا اور پہاڑوں کے سلسلے اور میدان پار کئے تھے اب انھوں نے اس جنگل کو دیکھا جس کا ابھی ذرا ہی سا ٹکڑا دیکھنے کو ملا تھا مگر وہ بتلا رہا تھا کہ جنگل کتنا بڑا ہے۔

اس گھاس کے میدان میں ایک ٹیلا تھا جس پر کچھ جانور چر رہے تھے۔ لاٹ صاحب نے دوربین سے دیکھا تو وہ ہرن تھے جب ہاتھی ذرا اور قریب گئے تو وہ بھاگ گئے۔ ہرنوں کی چوکڑی تو ایسی چیز نکلی جس کا لاٹ صاحب تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہرن اپنے بڑے بڑے سینگوں کو لے کر پاؤں سمیٹ کر جو اونچے اچھلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اڑ رہے ہیں اس پرواز نما جست میں وحشت اور رومان کی عجیب آمیزش تھی۔

گھاس کا میدان ختم ہونے پر بہت بلند درختوں کا گھنا جنگل ملا اس جگہ پہونچ کر ہاتھیوں کے گھنٹوں میں کپڑا باندھ کر ان کو خاموش کر دیا گیا اور ایک درخت کے پاس لاٹ صاحب اور نواب صاحب کے ہاتھی کھڑے کر دیے گئے، اور یہ طے کیا گیا کہ ہکوا کرکے شیر کو اس طرف لایا جائے۔

قادر خاں ہاتھی سے کود پڑے اور رائفل کندھے سے لگا کر لوگوں کو ہکوے کی ڈیوٹیوں پر لگانے لگے۔ انھوں نے تین گروہ بنائے۔ ایک کو امر کی نگرانی میں دیا، دوسرا رام لال کو سونپا اور تیسرا خود لیا پھر سب کو ہدایات دے کر روانہ کر دیا گیا۔ لاٹ صاحب کو جنگل کی عظمت کے بعد جس چیز پر حیرت ہوئی وہ بھی ... نہ تھی ... وہ لوگ ہکوا کرنے کے لئے دے پاؤں جنگل

میں بکھر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیر کو نہیں سیار کو مارنے جا رہے ہیں۔
لاٹ صاحب نے جیب سے ایک سگار نکالا اور ہودے کے مخملی گدے سے ٹیک لگا کر اس کے کش لگانے لگے اور اپنے چھوٹے ملک انگلستان کا اس بے پناہ ملک ہندستان سے مقابلہ کرنے لگے اور اس خیال سے لطف لینے لگے کہ وہ چھوٹا ملک ان سب میدانوں جنگلوں شیروں، نوابوں، اور خان صاحبوں اور بہادر بنتے کسانوں پر راج کرتا ہے۔
آدھ گھنٹہ میں کہیں بہت دور پر سیٹی بجی اس کے ساتھ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ، دھم دھم، اور سیٹیوں اور تالیوں کی آوازیں تین چوتھائی دائرے سے اٹھنے لگیں۔ صرف وہی سمت خالی تھی جدھر ہاتھی کھڑے ہوئے تھے۔
درختوں جھاڑیوں اور گھاس سے آوازیں آ رہی تھیں مگر نظر کوئی نہیں آتا تھا عجیب پر اسرار نظارہ تھا ذرا دیر میں ان آوازوں میں بندروں کی چیخوں اور چڑیوں کی گھبراہٹ بھری صداؤں کا شور بھی شامل ہو گیا۔ بندر ایک درخت سے دوسرے پر اور دوسرے سے تیسرے پر کودتے پھر رہے تھے اور چلا رہے تھے اور چڑیاں جھنڈ کی جھنڈ چلاتی ہوئی ایک کونے سے اڑ کر دوسرے کونے کی طرف جاتی تھیں اور پھر لوٹ آتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جنگل سو رہا تھا کہ اچانک کسی نے جگا دیا۔
سورج ڈھل چکا تھا اس وجہ سے درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے اور دور کے درختوں کے نیچے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ گھاس اور درختوں کے اندر کون کون جانور بھاگ رہے ہیں۔
جس جگہ لاٹ صاحب اور نواب صاحب کے ہاتھی کھڑے تھے۔ وہاں بڑی گھاس کا سلسلہ ختم اور نیچی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا ان دونوں کے بیچ میں بیس پچیس گز کی ایسی پٹی نکل آئی تھی جس میں سے گزرتا ہوا جانور

صاف دکھلائی دیتا تھا۔ جنگل کی اس خاص بناوٹ کو دیکھ کر یہ طے کیا گیا تھا کہ شیر کو گرانے کے لئے یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ اسی لئے ہکوے کا رخ اسی طرف کیا گیا تھا۔ جب ہکوے کا دائرہ کافی چھوٹا ہو گیا تو پہلے تو چند چھوٹے موٹے جانور نکلے اور پھر ایک بہت بھاری ارنا بھینسا آیا۔ وہ جنگل سے سیدھا بھاگتا ہوا آ رہا تھا لیکن اچانک ایسی جگہ سے گزرا کہ اس کی نظر درختوں اور ٹیلے کی آڑ میں کھڑے ہوئے ہاتھیوں پر پڑ گئی۔ وہ ان کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اس نے لاٹ صاحب سے آنکھیں ملائیں اور پھر اگلے پاؤں سے زمین کھودنے لگا۔ اس کا بھاری جسم، بھاری گردن، بھاری منہ، اور اس پر دو بہت بڑے بڑے سینگ اور ان کے بیچ میں خوفناک انتقام سے پر دو بڑی بڑی آنکھیں۔ بہت شاندار تھا وہ جانور!! لاٹ صاحب نے پہلی مرتبہ جنگل کے آزاد بھینسے کی شان دیکھی تھی۔ ان کو اسی وقت محسوس ہوا کہ قدیم روم میں بھینسے کا مقابلہ کرنا کیوں عظمت کی نشانی قرار دیا گیا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر اس بھینسے کا سر ان کے لندن کے ڈرائنگ روم میں لگا دیا جائے تو وہی رعب ڈالے گا۔ جو شیر کا سر ڈال سکتا ہے۔

بھینسے نے ہاتھیوں کی طرف دوسری نظر ڈالی پھر زور سے ڈہکا اور ہاتھی چھپوان گھاس کی طرف بھاگا۔ لاٹ صاحب کی نظر اب پڑی کہ بھینسے کے پیچھے گھاس میں چھپی ہوئی چار پانچ بھینسیں اور دو بچے بھی تھے۔

بھینسوں کے نکلنے کے جاتے ہی چکاروں کا ایک گلہ چھلانگیں مارتا میدان رہوا کو کاٹتا آیا اور خیال کی طرح نکل گیا۔

ہکوے کی آوازیں اب بہت قریب آ گئی تھیں اور لاٹ صاحب اور نواب صاحب رائفلیں لئے منتظر تھے کہ شیر نکلا ہی چاہتا ہے۔

اتنے میں قادر خاں کی سیٹی سنائی دی جس کا مطلب تھا "ہوشیار" لاٹ صاحب

نے اپنے سامنے جھاڑیوں کو بہت غور سے دیکھا مگر کہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک منٹ اور گزرا اور ہکوا کرنے والے اتنے قریب آگئے کہ ان کی پگڑی نظر آنے لگی۔

ایک جھاڑی ہلی ڈہار کی آواز سے جنگل گونج گیا اور شیر نے جھاڑیوں سے نکل کر تیر کی طرح سامنے گھاس کی طرف جست لگائی۔ خان صاحب نے لاٹ صاحب کے ہاتھی کو ایسے موقع پر کھڑا کیا تھا کہ شیر ان سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر نکلا لاٹ صاحب نے فائر کیا۔ مگر شیر نکلا چلا گیا۔ آدھے سکنڈ تک سو دو سو گز تک گھاس میں ایک لہر سی نظر آئی پھر وہ بھی غائب ہو گئی۔ نشانہ بالکل خالی گیا۔ البتہ لاٹ صاحب کے ہاتھی نے کسی بات پر ناراض ہو کر چنگھاڑ ماری۔

پکے شکاری خان بہادر صاحب یا نواب صاحب نے اس شیر پر سے اپنی رائفلیں نہیں چلائی تھیں کہ شیر لاٹ صاحب کا حصہ ہے۔ لاٹ صاحب اس ناکامی پر شرمندہ بھی ہوئے اور غصہ بھی آیا۔ اتنے میں خوں خوں کی آواز سنائی دی اور ایک بھالو بپھرا ہوا جھاڑی سے نکل آیا۔ مگر نکلتے ہی جیسے ہی اس نے ہاتھیوں کو دیکھا اس طرح ٹھٹھک گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ لاٹ صاحب کے ہاتھی پر حملہ کر دوں کہ کترا کر نکل جاؤں۔ لاٹ صاحب نے فوراً فائر کر دیا۔ بھالو تڑپ کر گھاس کی طرف بھاگا۔ دوسرا فائر ہوا اور وہ گر گیا۔ دوسرا فائر خان بہادر صاحب نے کیا تھا اور اس بات کو نواب صاحب نے دیکھ بھی لیا تھا لیکن انھوں نے لاٹ صاحب کو پکار کر مبارک باد دی لاٹ صاحب خوشی اور غرور سے مسکرانے لگے۔ ان کے نزدیک شیر نہ مارنے کی پوری تلافی ہو گئی۔ امر یہ سمجھا کہ شیر مارنے کی مبارک باد دی جا رہی ہے وہ بے تحاشا دوڑتا ہوا لاٹ صاحب کے ہاتھی کے پاس آ گیا وہاں

شیر کی جگہ ریچھ دیکھ کر اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس بات کو تو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ انگریز کا نشانہ بھی خطا ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ سمجھا تو یہ سمجھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبر سچ تھی کہ شیر کوئی بھوت پریت ہے یا یہ کہ اس کے پر ہیں اور وہ بھی اڑ سکتا ہے۔ شیر کے نکل جانے کا کسی کو اتنا غم نہیں ہوا جتنا امر کو ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر شیر نہ مارا گیا تو اس بستی کو چھوڑ ہی دینا پڑے گا کیوں کہ چیتیا ہمیشہ گھبرائی گھبرائی رہے گی اور خود اس کا بھی من نہیں لگے گا۔

شام ہونے والی تھی، اس لئے لوگوں کو فکر ہوئی کہ پڑاؤ کے لئے کون سی جگہ منتخب کی جائے۔ لیکن خان صاحب نے بتایا کہ اس جگہ سے قریب ایک کنائی کا کیمپ ہے۔ وہاں رات گزارنے کا بندوبست کیا گیا ہے اور ان لوگوں کو خبر دی جا چکی ہے۔

قادر خان خود ایک مکنا ہاتھی پر جو چھوٹے قد کا تھا اور سب ہاتھیوں سے تیز جاتا تھا بیٹھ کر آگے نکل گئے۔ باقی قافلہ پیچھے پیچھے چلا۔ تھوڑی دیر بعد گھاس کا میدان ایک ندی پر ختم ہوا، جہاں دھوبی کپڑے دھو رہے تھے اور کچھ دھوبی جو دھو چکے تھے، لادی باندھ رہے تھے۔ لاٹ صاحب ان لوگوں کو حیرت سے دیکھنے لگے اور انھوں نے نواب صاحب سے پوچھا کہ کیا ان لوگوں کو شیر کا خوف نہیں ہے۔ نواب صاحب نے بڑے آغا سے کہا۔ ذرا دھوبیوں سے یہ بات تو پوچھو۔ وہ ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے اترے اور چاروں طرف خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دھوبیوں کے پاس گئے۔ ان سے بات چیت کی اور پھر آ کر کہنے لگے کہ وہ کہتے ہیں کہ آج تک شیر نے کسی دھوبی کو نہیں مارا اور وہ کہتے ہیں کہ قسمت پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

نواب صاحب نے جب لاٹ صاحب کو یہ باتیں بتائیں تو ان کی حیرت میں

کئی گنا اضافہ ہو گیا وہ سوچنے لگے کہ یہ ملک بھی عجیب ہے کہ یہاں لوگ محض ایک وہم کی بنا پر بلا کسی دفاع کے موت کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔

جب بڑے آغا دھوبیوں سے بات کر رہے تھے تو امر بھی وہاں موجود تھا اور ان کے چلے جانے کے بعد اس نے خود بھی دھوبیوں سے بات چیت کی اور ان کی بے خوفی سے سبق سیکھا اور دل میں کہنے لگا کہ اگر شیر نہ مارا گیا تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں بھی دھوبیوں کی طرح اپنی قسمت پر شاکر رہ سکوں۔

(۴)

سورج ڈوب رہا تھا۔ آسمان پر سرخی چھا گئی تھی۔ اس سرخی کے پیچھے سیاہی مائل سبز جنگل، بسیرا لینے والی چڑیوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ جھینگروں نے بھی اپنا گیت زیادہ مستعدی سے الاپنا شروع کر دیا تھا۔ اس شور و شغب کے بیچ میں شکاریوں کا قافلہ ڈھول، پیپا، پیپے اور دوسری چیزیں بجاتا ہاتھیوں کے ساتھ کنائی کی بستی میں داخل ہوا۔ اس بستی کے اردگرد بلیاں کھڑی کر کے خاردار تاروں کا جال لگا دیا گیا تھا۔ جس کا پھاٹک سورج ڈوبتے ہی بند کر دیا جاتا تھا۔ اس بستی میں لکڑی کے بھاری بھاری لٹھے جگہ جگہ ڈھیر تھے اور ان کے پاس ہی مزدوروں کے رہنے کے لئے بڑے بڑے سائبان تھے۔

جس وقت شکاریوں کا قافلہ اس بڑے سے احاطے میں داخل ہوا تو سائبان کے سامنے چھوٹے چھوٹے چولہے جل رہے تھے اور ایک طرف لٹھوں کے اوپر بیس پچیس آدمی بیٹھے ہوئے [illegible] گا رہے تھے۔

بستی کی دیوار کے اندر ایک طرف ایک خوبصورت سا چھوٹا سا سائبان

تھا۔ جس میں لال صاحب جنھوں نے اس جنگل کا ٹھیکہ لیا تھا رہتے تھے۔ یہاں ایک طرف پھلوں کی کیاریاں بھی تھیں اور اس کے پاس پانی کا ہینڈ پمپ لگا تھا جو ابھی حال میں نیا نیا رائج ہوا تھا۔ سائبان کے سامنے ایک میز کے گرد کیمپ کرسیاں جو شکاریوں کے ساتھ ہاتھی پر آئی تھیں اور تین چار سادہ کرسیاں جو لال صاحب کے استعمال میں رہتی تھیں پڑی ہوئی تھیں۔ چائے کا بہت عمدہ سٹ جو ساتھ آیا تھا لگا ہوا تھا۔ بیچ میں شراب کی دو بوتلیں بھی رکھ دی گئی تھیں۔ لاٹ صاحب نے بیٹھتے ہی شراب گلاس میں انڈیلی اور اس میں پانی ملا کر پینے لگے وہ شراب پیتے جاتے تھے اور شکار کئے ہوئے بھالو کو جو ان کی فرمائش پر سامنے لا کر ڈال دیا گیا تھا دیکھتے جاتے تھے۔ نواب صاحب خان بہادر صاحب اور لال صاحب نے بھی شراب کا ایک ایک گلاس لیا پھر قادر خاں اور بڑے آغا کو بھی دیا۔ شراب کے ساتھ بھنے ہوئے پرندے آئے جن کو آج ہی شکار کیا گیا تھا۔

امر رام لال اور سب کسان کٹائی کے مزدوروں سے مل کر اپنا اپنا کھانا پکانے لگے اور باتیں کرنے لگے۔ یہ بستی عارضی بستی تھی جو برسات میں بالکل اجڑ جاتی تھی کیونکہ اس زمانہ میں جاڑے بخار کا بہت زور ہو جاتا تھا۔ یہ بیماری تو تھی ہی جو کسی کو نہیں چھوڑتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ایک مصیبت اور بھی تھی جو اس سے بھی بڑی تھی وہ تھے سانپ جو برسات میں ہر طرف نظر آتے تھے اور ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی کو کاٹ لیتے تھے۔ جاڑا بخار شروع ہو چکا تھا جس نے مزدوروں کی باریاں باندھ دی تھیں۔ کسی کو دوسرے دن بخار آتا تھا کسی کو تیسرے دن۔ جس دن جس کی باری آتی تھی وہ اس دن کام پر نہ جاتا تھا اور جب بخار چڑھ کر اتر جاتا تو پھر کام پر چلا جاتا۔ ایسا نہ کرتا تو پیٹ کیسے بھرتا۔

پورے نوکر پڑے رہتے تھے، جو جیل میں قیدیوں کو ملتے ہیں۔ یعنی دو دھوتیاں ادوکرتے یا مرزائیاں ایک لنگوٹ ایک انگوچھا ایک چادر اور ایک کپڑا سر پر باندھنے کے لئے۔ زیادہ تر ایسے تھے جو ایک یا دو کپڑوں پر گزر کر رہے تھے اور وہ بھی میل اور پسینے میں سڑ چکے تھے۔ لیٹنے کے لئے کسی کے پاس بھی کھٹیا نہیں تھی سب لٹھوں پر لیٹتے تھے کھانے کو نہ ترکاریاں تھیں نہ گڑ وغیرہ۔ عام طور سے موٹا اناج کھایا جاتا تھا۔ جو لوگ خوش تھے وہ دال چاول پکا کر کھا لیتے تھے۔ یہاں سے کچھ دور پر بدھ کو بازار لگتا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس پیسہ ہی کہاں تھا۔ کہ وہاں جاکر چیزوں کو خرید سکتے۔ جو پیسہ ان کو ملتا تھا اسے اپنے گھر والوں کے لئے بچا رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر امر نے سوچا کہ اگر میں نے کھیت چھوڑ دیا تو ایسی ہی زندگی بسر کرنا ہوگی۔ پھر کیا میں خود کھاؤں گا اور کیا چنیا اور بچوں کو کھلاؤں گا۔ مزدوروں کی حالت جو اس نے دیکھی تو دل میں طے کر لیا کہ شیر چاہے مارا جائے چاہے نہ مارا جائے میں اس وقت تک کھیت نہیں چھوڑوں گا جب تک وہاں کے سب کسان اپنے اپنے کھیتوں کو نہ چھوڑ دیں گے۔

صبح چائے پی کر لاٹ صاحب مزدوروں کی زندگی کا معائنہ کرنے لگے۔ ان کو حیرت تھی کہ اتنی سی جگہ میں اور ایسے معمولی انتظام کے ساتھ کس طرح دو سو آدمی رہتے ہیں انھوں نے جاڑے بخار کے لئے مریضوں میں کونین بانٹی اور ان کو سمجھایا کہ ملیریا مچھر سے پھیلتا ہے۔ اس لئے تم لوگ مچھر دانی کے اندر سویا کرو سب نے اس مشورے کو بہت احترام سے سن لیا۔

لاٹ صاحب ان لوگوں کے پھٹے کپڑوں پھٹی ایڑیوں، پھٹے ہونٹوں اور پھٹے حالوں کا معائنہ کر ہی رہے تھے کہ پھاٹک پر شور ہوا اور کچھ لوگ روتے ہوئے فریاد کرتے اندر آگئے۔ خاں صاحب نے ان سے پوچھ گچھ کر کے نواب صاحب

کو بتایا کہ کل جن دھوبیوں سے ہم نے باتیں کی تھیں ان میں سے ایک کو جب وہ گھاٹ سے واپس جا رہا تھا اور کسی وجہ سے بیس قدم پیچھے رہ گیا تھا شیر اٹھا لے گیا۔

قادر خاں نے ایک ہاتھی لیا اور چند آدمی ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے کہ آپ لوگ تیار رہیئے میں لاش پاتے ہی وہاں مچان بندھوانے لگوں گا اور آپ لوگوں کے پاس اطلاع کے لئے کسی کو بھیج دوں گا۔ جیسے ہی خبر ملے فوراً ہی روانہ ہو جائیے گا۔

امر کی امیدیں پھر ابھر آئیں اور وہ پرارتھنا کرنے لگا کہ بھگوان شیر مارا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو میرا مستقبل کیا سنور جائے۔

دوپہر کے قریب قادر خاں ہاتھی لئے ہوئے خود بھاگے ہوئے آئے اور انھوں نے کہا کہ شیر کا کھایا ہوا آدمی تو مل گیا لیکن دھوبیوں کا اس پر ارادہ ہے کہ وہ لاش کو ابھی اٹھا لے جائیں گے۔ اور وہ اس پر کسی طرح راضی نہیں ہو رہے ہیں کہ اس کو وہیں پڑا رہنے دیں۔ اگر کسی طرح لاش وہاں رہ جائے تو رات کو شیر ضرور آئے گا۔ اور پھر مار لیا جائے گا۔ نواب صاحب نے کہا۔

"بھئی دھوبیوں کو ایک بھاری رقم دے دو۔"

قادر خاں نے کہا "آپ کی طرف سے رقم کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن پھر بھی وہ نہ مانے۔ وہ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ اتنی رقم وہ زندگی بھر بھی کپڑے دھو کر نہ بچا سکیں گے۔ لیکن پھر بھی لاش کو اسی جگہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں۔"

لال صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے بھی دھوبیوں کو جو ہاتھی پر بیٹھ کر ساتھ آئے تھے بہت سمجھایا اور رقم دوگنی کر دی۔ اس پر دھوبی ہاتھ جوڑ بیٹھے اور گڑگڑانے لگے اور کہنے لگے کہ اگر ہم لاش کو شیر کے لئے چھوڑ جائیں تو پاپی

برادری میں ناک کٹ جائے گی۔

آخر خاں صاحب نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کو لاش لے جانے دو اب مچان سے شکار نہیں ہوگا بلکہ ہکوا ہوگا۔ اس کے لئے کنائی کے بھی سب آدمیوں کو چلنا ہوگا۔ کیوں کہ ایک تو اس مرتبہ شیر نے کھایا کم ہے اس لئے وہ دور چلا گیا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ جنگل خاص طرح کا واقع ہوا ہے۔ اس لئے کافی بڑے حلقے کو گھیر کر ہکوا کرنا ہوگا۔

قادر خاں سب آدمیوں کو ہکوے کا طریقہ سمجھا کر ساتھ لے کر چلے۔ اور موقع پر پہونچ کر انھوں نے ان کی ٹکڑیاں بنا کر ان کو مناسب جگہوں پر لگا دیا۔ اس مرتبہ لاٹ صاحب کو شکار کرنے کی جگہ بہت اچھی مل گئی تھی۔ یہ جگہ ندی کے کنارے ایک موڑ پر اس طرح واقع تھی کہ شیر بلا ان کو دیکھے دور تک بے خوف و خطر چلا آئے۔ کافی نزدیک آنے پر اس کو ہاتھی نظر آئیگا جس سے وہ ٹھٹک جائے گا۔ وجہ یہ تھی کہ ہاتھیوں کو درختوں کی ایسی آڑ مل گئی تھی کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے آدمی تو پتوں میں چھپ گئے تھے ان باتوں کے علاوہ ہوا کا رخ ایسا تھا کہ شیر بو نہیں پا سکتا تھا۔

سیٹی بجی اور ہکوا شروع ہو گیا۔ لاٹ صاحب کو آوازیں اپنی طرف ہٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ سب سے پہلے ایک لکڑبگھا نکلا جو تیر کی طرح ندی کے کنارے کنارے دو فرلانگ تک بھاگتا چلا گیا اس کے بعد ایک بنڈیلا سور آیا جو بہت موٹا اور گول تھا۔ اسے دیکھ کر لاٹ صاحب کے منھ میں پانی بھر آیا۔ لیکن ان کو فائر کرنے کی خواہش کو ضبط کرنا پڑا۔ ہکوا کرنے والے ابھی کافی دور تھے اور پچھلے تجربے کی بنا پر لاٹ صاحب کا خیال تھا کہ ابھی آدھ گھنٹہ تک شیر کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے اتنے میں ایک طرف مینائیں چلانے لگیں ان کی آوازیں سن کر نواب صاحب نے لاٹ صاحب

کو اشارہ کیا کہ ندی کی طرف تاک لگائے رہیں۔

لاٹ صاحب نے جیسے ہی ندی کی طرف دیکھا ہے ان کو ایسا نظارہ دکھائی دیا کہ وہ ایکدم سے چونک پڑے۔ شیر بہت شان سے ٹہلتا ہوا ندی کے کنارے کنارے چلا آرہا تھا۔ اس وقت اس میں واقعی وہ آن بان تھی کہ جنگل کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔ لاٹ صاحب نے رائفل سنبھالی۔ شیر جیسے ہی زد میں آیا۔ انھوں نے فائر کردیا۔ ادھر بندوق کی آواز سنائی دی اور ادھر شیر گرجا اور گرج کر ہاتھی کی طرف جھپٹا اور بجلی کی طرح اس نے لاٹ صاحب پر جست لگائی۔ لاٹ صاحب کا شکاری ہاتھی شیر کی گرج سن کر چوکنا ہوگیا تھا۔ ادھر شیر اچھلا اور ادھر ہاتھی نے زرا گھوم کر اپنے کو بچا لیا اور پھر شیر کی پسلیوں پر اپنی سونڈ سے دس من کا ایک گھونسا رسید کیا۔ شیر دور جاکر گر پڑا۔ شیر کی پسلیوں کی جگہ اگر فولاد کی بھی کڑیاں ہوتیں تو بھی پچک جاتیں۔ لیکن شیر قلا بازی کھا کر اتنی زور سے دہاڑا کہ جنگل گونج گیا اور دوبارہ جست لگائی۔ لیکن ابھی وہ زمین سے اٹھ نہیں پایا تھا کہ ایک فائر ہوا اور ساتھ ہی دوسرا فائر۔ پہلا فائر لاٹ صاحب کا تھا جس نے اس کا ہاتھ توڑ دیا۔ دوسرا خان بہادر صاحب کی گولی شیر کی بغل سے گزر کر دل کے پار ہوگئی۔ شیر جس نشست سے اچھلا تھا اسی نشست پر گر پڑا اس کا سر زمین سے لگ گیا لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے۔

نواب صاحب کے فیل بان نے ہاتھی کو بڑھایا اس سدھائے ہوئے شکاری ہاتھی نے شیر کے قریب جاکر اپنی سونڈ اٹھائی تاکہ شیر اگر حملہ کرے تو سونڈ محفوظ رہے۔ پھر ہاتھی نے شیر کو ایک ٹھوکر دی۔ شیر چت ہوگیا۔ نواب صاحب نے پکار کر کہا: "کانگ ریچولے شن مائی لارڈ۔ شیر مر گیا۔"

شیر کی دہاڑ اور رائفلوں کی تابڑ توڑ آواز سن کر امریکا دکوابھول گیا اور

موقع کی طرف بھاگا۔ اس کے بھاگنے سے سب بھاگے۔

امر نے بہت دور سے شیر کو زمین پر پڑے ہوئے دیکھ لیا اور وہیں سے چلانے لگا "ہے بھگوان، ہے بھگوان، تو بڑا دیالو ہے۔"

مسحور انسان کی طرح امر شیر کے پاس آکر اس کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد ہی رام لال آیا پھر کسان اور کٹائی کے مزدور اور دھوبی آئے۔ جو بھی آتا وہ زور و شور سے خوشی کے نعرے لگاتا۔ جو ڈھولیں، ہلکوا کے کام میں آرہی تھیں اور بھدی آواز سے بھڑ بھڑ کرتی تھیں۔ وہ ایک دم سے تال پر بجنے لگیں اور گانا ہونے لگا۔ بابو، مدن اور دوسرے نوجوان اور لڑکے گانے کے ساتھ ساتھ تھرکنے بھی لگے۔ آخر شیر کو اٹھایا گیا وہ، جیسا کہ پہلے خیال تھا نر نہیں تھا مادہ تھی۔ اس کے پاؤں باندھ کر اسے ایک بلی سے لٹکا دیا گیا بلی کو آٹھ آدمیوں نے لے کاندھوں پر لٹکا لیا۔ اور پھر جلوس بنا کر اسے لے چلے۔ اس جلوس کے آگے پیچھے گانے والے لگ گئے۔ گانے والوں کے تین غول تھے ایک کسانوں کا جو آلا گا رہے تھے۔ دوسرا مزدوروں کا جو برہا اڑا رہے تھے اور تیسرا دھوبیوں کا جو دھوبیا راگ چلا رہے تھے۔ کئی سو آدمی اس طور اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایسا ڈراما ہو رہا ہے جس کا ریہرسل مہینوں ہوتا رہا ہے۔ جس سے ہر شخص کو اپنا اپنا پارٹ اچھی طرح یاد ہو گیا ہے۔ اسی شان سے یہ جلوس گشائی کی بستی کو روانہ ہوا۔

لاٹ صاحب خوش بھی تھے اور اپنے کارنامہ پر نازاں بھی۔ لیکن دیہات والوں کی خوشی دیکھ کر ان کی اپنی خوشی بہت بڑھ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندستان بھی کیا ملک ہے اتنے بڑے مجمع کا جس میں جگہ جگہ کے آدمی شامل ہیں، جن میں سے بہت سے اس سے پہلے آپس میں کبھی ملے بھی نہ تھے، ان سب

کا بلا کسی لیڈر، اور بلا کسی مقرر پروگرام اور بلا کسی تنظیم کے اس طرح خود بخود جلوس اور خوشی منانے کی منظم شکل اختیار کرلینا، یہ تو ایسی چیز ہے جو صرف بہت ہی مہذب لوگ میں پائی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ جو لٹھوں پر سوتے ہیں، میلے کپڑے پہنتے ہیں، الگ الگ ذرا ذرا سی ہانڈیوں میں اپنا اپنا کھانا پکاتے ہیں، پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں اور خوشی منانے کا ایسا سلیقہ پایا جاتا ہے!!

بیچ بیچ میں جلوس کے ساز و سامان میں کچھ اضافے بھی ہوتے گئے۔ لوگوں نے درختوں کی شاخیں توڑ لیں اور ان کو اچکانے لگے، اور طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے جن کو سن کر ہنسی آتی تھی۔

واپسی کا راستہ ندی کے کنارے کنارے جاتا تھا۔ لاٹ صاحب ندی کے کنارے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک عجیب و غریب سا جانور پر پڑی جو کنارے پڑا ہوا تھا لیکن لوگوں کو آتا دیکھ کر آرام سے بھاری قدموں سے بھدے انداز سے بھاگتا ہوا پانی میں چلا گیا۔

وہ بیر تار مواجب آگے جا رہا تھا تو اس کا ذرا سا سر دکھائی دے رہا تھا۔ باقی بدن پانی کے اندر تھا۔ لاٹ صاحب نے نواب صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا تھا انھوں نے بتلایا کہ یہ مگرمچھ تھا۔ یہ ندی جاکر دریائے گھاگھرا میں گرتی ہے جہاں مگرمچھ اور گھڑیال بہت پائے جاتے ہیں۔ ان کے بچے اکثر دریا سے نکل کر ندی میں آجاتے ہیں۔ یہ بھی ان ہی بچوں میں سے ایک تھا۔

لاٹ صاحب۔ یہاں کے گھڑیال کتنے بڑے ہیں

"ایک درخت کی طرف اشارہ کرکے اتنے بڑے ہوتے ہیں اور بعض بعض تو اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں"

[illegible] کر اپنے سب عجائبات دکھلانے پر تلا ہوا معلوم

جو تا تھا جس درخت کی طرف نواب صاحب نے اشارہ کیا تھا لاٹ صاحب کی نگاہیں اس کی ایک شاخ پر جو پڑیں تو چپک کر رہ گئیں۔ پہلے تو ان کو معلوم ہوا کہ ایک سوکھی شاخ حرکت کر رہی ہے۔ پھر محسوس ہوا شاخ نہیں کوئی اور چیز ہے جو حرکت کر رہی ہے۔ انھوں نے فیل بان سے کہا کہ ہاتھی قریب سے لے چلو۔ پاس جا کر دیکھا تو وہ ایک اژدھا تھا جو بیس پچیس فٹ لمبا ہوگا اور جس کا ڈل سات آٹھ انچ کے قریب ہوگا۔ لاٹ صاحب نے اس جانور کو پہلے میوزیم میں دیکھا تھا۔ پر زندہ پہلی مرتبہ دیکھا۔ انھوں نے اس کو مارنے کو بندوق اٹھائی۔

قادر خان جو نواب صاحب کے ساتھ تھے انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ "اژدھے کا مارنا منحوس ہوتا ہے۔ کسی طرح لاٹ صاحب کو اس سے باز رکھئے" لیکن اتنی دیر میں بندوق چل گئی اور اژدھا نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ لاٹ صاحب نے اس کو بھی اپنے مال غنیمت میں شامل کر لیا۔

قیام گاہ پر واپس آ کے لاٹ صاحب نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ شیرنی کو زمین پر لٹا کر اس پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے ایک انگریز ساتھی نے جس کے بارے میں اس وقت معلوم ہوا کہ وہ فوٹو گرافر تھا اور اسی غرض سے لایا گیا تھا کہ لاٹ صاحب اگر کوئی شکار ماریں تو شکار کے ساتھ لاٹ صاحب کا فوٹو لے لیا جائے۔ اس نے لاٹ صاحب کا اسی پوز میں کہ وہ شیر پر پاؤں رکھے کھڑے ہیں فوٹو لے لیا۔ پھر اسی طرح کا ایک اور فوٹو شیر کے برابر رکھے کو زمین پر ڈال کر اور برابر اژدھے کو لٹا کر لیا گیا۔ اس کے بعد جب شیرنی کا پیٹ چاک کر کے اس کی کھال کھینچی گئی تو پیٹ سے چاندی کا ایک کڑا برآمد ہوا اور لوگوں نے پہچانا کہ یہ وہی کڑا ہے جسے مقتول دھوبی پہنتا تھا۔ اس کڑے کو پا کر یہ تو یقین ہو گیا کہ یہ شیرنی وہی مردم خور لاگو شیرنی تھی جس کی تلاش میں خاک چھانی گئی تھی۔

امرآج بہت خوش تھا صرف دہی نہیں۔ مدن۔ بابو۔ رام لال اور سب
کسان بھی خوش تھے یہاں تک خوشی کے مارے ان لوگوں کو دیر میں نیند آئی۔

رات کے کھانے پر لاٹ صاحب نے نواب صاحب سے کہا۔ "نواب
صاحب بڑے گھڑیال کا بھی شکار ہونا چاہیئے۔"

لاٹ صاحب کی اس فرمائش پر قادر خاں کو بلایا گیا۔ وہ دیر تک
سوچتے رہتے۔ انھوں نے کہا کہ دشواری یہ ہے کہ دریائے گھاگھرا کے اندر تو گھڑیال
کا شکار ممکن نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو اس میں گرنے والی نالک ندی کے کنارے
ہو سکتا ہے کیوں کہ وہاں گھڑیال صبح ریت پر نکلتے ہیں لیکن اس دریا کے گرد جو
جنگل ہے وہ جنگلی ہاتھی کے غولوں سے بھرے ہوئے ہیں اس لئے وہاں جانا اور قیام
کرنا بغیر خاص انتظام کے ممکن نہیں۔ البتہ اگر لاٹ صاحب معمولی کشتی سے چلنے پر
تیار ہوں تو ہو سکتا ہے کہ شکار ہو جائے لیکن یہاں جو کشتیاں ملتی ہیں وہ بہت
معمولی قسم کی ہیں جن کو ٹھیکے دار مزدوروں کے لانے اور لے جانے کے لئے استعمال
کرتے ہیں۔ ان کشتیوں پر لاٹ صاحب کو آرام نہیں ملے گا۔

چھوٹے لاٹ صاحب اپنے شکار کے ذخیرہ میں مگرمچھ کو شامل کرنا
ضروری سمجھتے تھے اس لئے وہ ہر قسم کی تکلیف جھیلنے پر تیار ہو گئے۔ اور کہنے
لگے کہ ایسی کشتیوں میں چلنے پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

دوسرے دن یہ قافلہ جنگل سے گزرتا ہوا۔ پن کٹ پورہ کے مخالف
سمت دریائے گھاگھرا کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ طے پایا کہ جب گھاگھرا کے کنارے
پہونچ جائیں گے۔ اس وقت جو سامان اور جو آدمی ساتھ ہیں ان کے دو حصے
کر دیئے جائیں گے۔ ایک حصہ ضروری سامان اور ضروری آدمیوں کا ہوگا۔ یہ ساتھ
لے جانے کے لئے روک لیا جائے گا۔ باقی سامان اور ملازموں اور کسانوں کو مع

ہاتھیوں کے واپس کر دیا جائے گا۔ لاٹ صاحب اور نواب صاحب کشتی میں گھاگھرا ہو کر نامک ندی پر جا کر گھڑیال کا شکار کھیلیں گے اور پھر اسی طرف سے گھاگھرا کے بہاؤ پر گھاگھرا گھاٹ تک چلے جائیں گے اور وہاں سے ریل پر لکھنؤ روانہ ہو جائیں گے۔

کٹائی سے گھاگھرا تک بیل گاڑیاں لیٹھے لے کر برابر جاتی رہتی تھیں ان کی بنائی ہوئی ایک لیکھ تھی جس کو جنگل والے سڑک کہتے تھے۔ اس سڑک پر قافلہ چل پڑا۔ سڑک کے دونوں طرف بے حد گھنے اور اونچے درخت تھے۔ جن کے نیچے دوپہر کو بھی شام کا سماں رہتا تھا۔ اس اندھیرے گھر میں قافلہ کو دن میں بھی جنگلی جانور بے خوفی سے گھومتے ہوئے نظر آ گئے۔ ایک جگہ پہونچ کر لال صاحب نے جو رہبری کرنے ساتھ آئے تھے قادر خاں سے کہا کہ یہاں ایک چیتا رہتا ہے جو درخت پر سے اپنے شکار پر اچانک کود پڑتا ہے۔ اس لئے ذرا ہوشیار رہنا چاہیئے۔ لیکن خاں صاحب کو اطمینان تھا کہ اتنے ہاتھیوں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنٹوں کی ٹناٹن چیتے کو خوف زدہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن ان کے اس اطمینان کا زور بس تھوڑی ہی دیر رہ سکا۔ آگے جو نظارہ دکھلائی دیا اس نے اس کو ختم کر دیا۔

قافلہ جا رہا تھا کہ آگے والے دو ہاتھیوں کے سواروں کی نظر پڑی کہ صرف تین سو قدم پر سڑک کے بیچ میں ایک شیرنی اپنے بچوں کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ لاٹ صاحب دوربین سے اس کا نظارہ کرنے لگے۔ اور سوچنے لگے کہ اس کے ساتھ بچے نہ ہوتے تو کیسے مزے کا شکار ہو جاتا۔ قافلہ بڑھتے بڑھتے جب دو سو گز پر پہونچ گیا ہے۔ اس وقت تک شیرنی اسی طرح سڑک پر بیٹھی رہی۔ اب تو نواب صاحب، لاٹ صاحب اور خان بہادر نے اپنی اپنی رائفلیں

سنبھالیں۔ خاں صاحب اور قادر خاں نے بھی اپنی اپنی رائفل کا منھ اس طرف موڑ دیا۔ لیکن اتنی دیر میں شیرنی اپنے بچوں کو تنے کر' اس قافلے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر اور ایک انگڑائی لے کر اطمینان بھری رفتار سے ایک جھاڑی کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اب قادر خاں صاحب نے اپنا ہاتھی آگے کر لیا اور رائفل سے درختوں کی شاخوں کا جائزہ لیتے ہوئے بڑھنے لگے۔

کئی جگہ سانپ اور دوسرے جانور راستہ کاٹ گئے' ایک جگہ بن بلاؤ نظر آیا جو کسی بلی سے عشق بازی کر رہا تھا اور اسے راغب کرنے کے لئے طرح طرح کے سروں سے میاؤں میاؤں کر رہا تھا اور غرا رہا تھا۔ جب ہاتھی بہت قریب آ گئے تو بلی بھاگ گئی۔ بلاؤ کو ہاتھیوں کی یہ مداخلت بہت ناگوار گزری اور اس نے ان کی طرف منھ کر کے بہت غصہ سے ایک میاؤں پھینکی اور بھاگ گیا۔

اس کے بعد بندروں کا جنگل ملا جو آخر تک ساتھ دیتا رہا۔ یہاں بندروں کے قبیلے کے قبیلے سڑک پر پھرتے تھے ہر قبیلے میں بچے' مائیں اور نوجوان سب ہی ہوتے تھے۔ جب ہاتھی بہت قریب آ جاتے تھے تو بچے دوڑ کر اپنی ماؤں کے پیٹ سے لٹک جاتے تھے اور مائیں ان کو لے کر بھاگ جاتی تھیں ان کے جانے کے بعد نوجوان بھاگتے تھے۔ لیکن قبیلہ کا سردار جو بڈھا پہلوان ہوتا تھا۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کبھی ہاتھیوں کی طرف اور کبھی آدمیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر خوں خوں کرتا رہتا تھا اور صرف اسی وقت میدان چھوڑتا تھا جب اس پر حملہ کیا جاتا تھا

جنگل جب ختم ہو رہا تھا تو تتلیوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آئے۔ لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں تھیں۔ درختوں کی شاخوں پر تتلیاں' جھاڑیوں اور گھاس پر تتلیاں' چیونٹوں کے بلوں پر تتلیاں' جب وہ ایک جگہ سے اڑ کر دوسری جگہ گرتی تو دس بیس نہیں لاکھوں کی تعداد میں گرتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ٹڈی دل آ گیا ہے۔

رفتہ رفتہ بڑے درختوں کی جگہ چھوٹے درخت آنے لگے پھر چھوٹے درخت جھاڑیوں میں تبدیل ہو گئے اور پھر جھاڑیاں بھی چھوٹی ہونے لگیں اس کے بعد سامنے رتیلا میدان تھا اور اس کے آگے بہت شاندار چوڑے پاٹ کا دریا تھا۔ پھر اس کے پار جنگل ہی جنگل تھا اور جنگل کے بعد بادل یا غبار۔

دریا کے کنارے ایک اونچی جگہ خیمہ لگا دیا گیا اور لاٹ صاحب اور نواب صاحب نے کھانا کھا کر وہاں ذرا دیر آرام کیا۔

سہ پہر کو خیمے کے اندر شراب کا ایک گلاس پی کر لاٹ صاحب باہر نکلے باہر کا منظر ہی دوسرا تھا۔ ایسا منظر جس کا لاٹ صاحب پہلے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

خیمہ جس ٹیلے پر لگایا گیا تھا اس سے ذرا ہی دور پر دریا موجیں مار رہا تھا جس کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ دریا کی دوسری طرف پھر جنگل کا سلسلہ تھا جو بہت دور تک چلا گیا تھا۔ لیکن وہ جتنا جتنا دور ہوتا جاتا تھا اس کی سطح اونچی ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس کے گہرے سبز رنگ پر سیاہی کی تہیں چڑھتی جاتی تھیں۔ افق کے پاس جہاں جنگل کی سبزی سرمئی رنگ سے تبدیل ہو گئی تھی، وہاں جنگل کو بادلوں نے ڈھانک لیا تھا جو مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اس سخت گرمی کے موسم میں اور بادل!! ابھی تک گاؤں اور جنگل میں بادل کی ایک دھجی بھی آسمان پر نظر نہیں آئی تھی اور یہاں ان کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔

ایکا ایکی بادل چھٹنے لگے۔ ہر بادل کے پیچھے سے ایک پہاڑ برآمد ہوا جس کے کگاروں کے پہلو ڈوبتے سورج کی روشنی میں بہت واضح نظر آ رہے تھے۔ جب بادل چھٹ گئے تو کوہ ہمالہ کا پورا سلسلہ سامنے آ گیا جو مشرق سے مغرب تک بہت شان سے قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ یہ سلسلہ درجہ بدرجہ بلند ہوتا ہوا اس طرح

چلا گیا تھا کہ پہاڑوں کے اوپر پہاڑ نظر آرہے تھے اور ان کے اوپر جگہ جگہ برف پوش سفید چوٹیاں تھیں جو چاندی کے تاج کی طرح چمک رہی تھیں اور آسمان کی نیلاہٹ میں گھسی چلی جا رہی تھیں۔

چھوٹے لاٹ صاحب اس ارضی جلال سے بے حد مرعوب ہو گئے۔ وہ دم بخود ہو گئے اور ہر طرف دیکھتے رہے اور یہ بھول گئے کہ کہاں ہیں اور کن لوگوں کے ساتھ ہیں۔

سورج چھپ گیا۔ لیکن عام دنیا کے لئے — ! پہاڑوں کی دنیا کے لئے نہیں۔ پہاڑ اب بھی ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں سے جگمگا رہے تھے۔

کیا سرزمین ہے ہندستان !! اس کے جنگل بجائے خود ایک وسیع دنیا ہیں۔ شیروں، ریچھوں، اژدھوں، ارنا بھینسوں، سانپوں اور ہاتھیوں کے غول سے آباد۔ دوسری طرف یہ عظیم پہاڑ جس کا سلسلہ جانے ایک ہزار میل تک جاتا ہے یا تین چار ہزار میل تک۔ جن کی بلندیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اتنا بڑا ملک یہاں کے باشندے کو دیکھو تو اتنے غریب ہیں اگر فاقہ جس کا تصور بھی انگلستان والے نہیں کر سکتے ہیں۔ مگر بھئی واہ۔ اس پر بھی یہ لوگ خوشی مناتے ہیں۔ گاتے ہیں اور رقص کرتے ہیں اور یہ سب کچھ غیر شعوری ڈسپلن کے ساتھ کرتے ہیں۔

مگر کیا ملک ہے انگلستان بھی جو اتنا چھوٹا اور حقیر ہونے پر بھی اس عظیم دنیا پر جسے انڈیا کہتے ہیں راج کرتا ہے۔

گنگا کے کنارے کنارے ایک بے حقیقت سی کشتی چلی آرہی تھی۔ وہ آکر ٹیلے کے پاس رک گئی۔ اس کشتی میں کچھ سامان اور تین مرد اور دو عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت کشتی سے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کود پڑے اور

پانی کو منجھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

لاٹ صاحب کی نظر جو جوان عورت پر پڑی تو پھر ہٹ نہ سکی۔ وہ کسی طرح سے بھی پہاڑوں اور جنگل کے مناظر سے مختلف نہ تھی۔ اس کی پنڈلیاں، بازو، کمر، کولہے اور سینہ سب معلوم ہوتا تھا کہ چٹانوں سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ اس کی چال کا کچھ وہی انداز تھا جو جھرنی میں اس وقت نظر آیا تھا جب وہ ندی کے کنارے چلتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ عورت کے بال پیچھے جوڑے میں بندھے ہوئے تھے۔ گلے میں چاندی کا طوق تھا اور کلائی میں بہت موٹے موٹے کڑے۔ ان چیزوں نے اس کے بدن پر چٹانوں کا رنگ اور گہرا چڑھا دیا تھا۔ لاٹ صاحب کو عورت کی بناوٹ میں جانے کیا کیا نظر آگیا۔ درندوں کی چستی اور وحشت، جنگلوں کا گھنا پن اور ان کے اندھیرے، پہاڑوں کی تراش خراش اور ان کی آسمان ایسی چوٹیاں سب نظر آگئیں۔ عورت کے کالے ہونٹوں کے پیچھے سفید دانتوں کی لڑی اور سیاہ پلکوں کے اندر سفید اور کالی تیلیاں ان میں لاٹ صاحب کو ایک طرف سامنے پہاڑوں کی دھوپ چھاؤں والے کنگارے اور وادیاں اور برفیلی چوٹیاں نظر آگئیں اور دوسری طرف سفید اور کالی بلیوں والی اسکاچ وہسکی کی بوتلیں یاد آگئیں۔

جب سے چھوٹے لاٹ صاحب ہندستان آئے وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح کوئی ایسی چیز دیکھوں جو اپنے اندر کل ہندستان رکھتی ہو لیکن ان کی یہ آرزو ان کے ساتھ سفر کرتی رہی اور اس کی تکمیل سراب کی طرح آگے آگے بھاگتی رہی۔ اور ادھر چند روز کے نظاروں نے تو اس سراب کو منزلوں دور ہٹا دیا۔ کیونکہ ہندستان کا رخ جو بھی سامنے آیا وہ بالکل نرالا تھا جس کا چھوٹے لاٹ کو پہلے تصور بھی نہ تھا۔ لیکن اس وقت لاٹ صاحب کو اس جنگلی عورت میں وہ سراب حقیقت بنتا نظر آیا۔

یہ عورت گھٹنوں اونچی دھوتی باندھے تھی۔ جسم کا نچلا اور بچھلا پلو اس کے سینے سے اس طرح گزرتا تھا کہ دونوں بازو، پیٹ اور پیٹھ کھلی رہ گئی تھی۔ سینے پر مختصر سے کوئی چیز پہنے ہوئے تھی جو کچھ تنگ اور کچھ نیچا ہونے کی وجہ سے اندر کے رازوں کو چھپانے کے بجائے اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی۔ اور لاٹ صاحب کی نظریں اس پار کی حقیقت کو دیکھ رہی تھیں۔

جب عورت دریا کو منجھا رہی تھی تو پانی کا تختہ اس کی برہنہ رانوں کے سامنے اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے ہتھوڑے سے شیشے کی چادر۔ عورت آگے بڑھتی گئی اور اس کی سنگین تراش اور آہنی گولائیاں زیادہ واضح ہوتی گئیں۔

عورت پانی سے نکل کر ٹیلے کے نیچے آئی اور آگے بڑھی اچانک اس کی اور اس کے ساتھی کی نظریں ٹیلے پر کھڑے ہونے والوں پر پڑیں تو دونوں نے پہلے لال صاحب کو اور پھر نواب صاحب اور پھر لاٹ صاحب کو سلام کیا۔ اس کے بعد آگے بڑھنے لگے۔

لاٹ نے بہت ملتجیانہ نظروں سے نواب کی طرف دیکھ کر کہا "میں اس بیک گراؤنڈ میں اس عورت کا فوٹو لوں گا۔"

"ضرور ضرور۔"

لال صاحب جوان جنگلی لوگوں کی بولی جانتے تھے، انھوں نے عورت کو پکارا۔ وہ ہرن کی طرح دو چھلانگوں میں ٹیلے پر آگئی اور بہت ادب سے بولی۔

"آگیا مہاراج"

"آگے بڑھو۔ اور آگے۔ اور آگے۔"

عورت جوں جوں قریب آتی جاتی خوف زدہ ہوتی جاتی۔ جب کیمرے کے سامنے پہونچی ہے تو وہ بالکل بدل چکی تھی۔

لاٹ صاحب نے کیمرا اس کے کاندھے پر کرکے لال صاحب سے کہا۔
"اس کو ذرا ادھر موڑ دیجئے۔ ادھر نہیں آدھر۔ ادھر نہیں آدھر۔
ذرا اور ادھر۔ ذرا اور آدھر۔"
آخر لال صاحب سمجھ گئے کہ لاٹ صاحب کن چیزوں کو کیمرے میں مقید کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جنگلی عورت کا کندھا پکڑ کر اس کو ایک طرف موڑ دیا اور چالاکی سے اس کی ساری کے پلو کو ایک خاص رخ پر کر دیا۔ عورت گھبرا گئی مگر لال صاحب کی کڑی نظروں سے سہم کر خاموش ہو گئی۔ لاٹ صاحب نے مسکرا کر فوٹو لے لیا۔ پھر عورت سے کہا۔
"تم کھفا تو نہیں ہے۔"
وہ غور سے لاٹ صاحب کی طرف دیکھتی رہی کچھ بولی نہیں لال صاحب نے عورت کی بولی میں اسے سمجھایا۔
"صاحب پوچھتے ہیں کہ تم خفا تو نہیں ہو۔"
"میری کیا مجال جو خفا ہوں" عورت نے سر جھکا کر جواب دیا۔
جب جنگلی عورت دریا کو منچھا رہی تھی اس وقت وہ جنگل کی آزاد ہواؤں اور رسیلی چوٹیوں کی طرح کا ایک مظہر قدرت تھی۔ لیکن جب اس کی ساری کا پلو ہٹا یا گیا تو اس پر عورت پن اور کمتری کے احساس نے ایسا حملہ کیا کہ وہ ان کے بوجھ سے ٹوٹ کر ایک بے حقیقت سی چیز معلوم ہونے لگی۔ لیکن لاٹ صاحب نے جس نظر سے اسے دیکھنا شروع کیا تھا وہ اب بھی اسی نظر سے اس کو دیکھ رہے تھے۔
نواب صاحب لاٹ صاحب کے ذوق حسن پر مسکرا دیئے پھر انھوں نے خاں صاحب سے نظریں ملا کر آنکھ ماری۔ خاں صاحب نے بہت ادب اور سنجیدگی سے لاٹ صاحب سے پوچھا۔

"خیمے کے اندر گیس لائٹ میں اگر آپ اس عورت کا فوٹو لینا چاہیں تو یہ بھی جا سکتا ہے"۔ لاٹ صاحب یوں تو جو کہتے تھے صاف لہجے میں کہتے تھے لیکن اس مرتبہ انھوں نے جو جواب دیا وہ آدھے سے زیادہ ان کے ہونٹوں کو پار نہ کر سکا ۔ البتہ ان کی گردن نے ہل کر بادل ناخواستہ ہنیں کا اظہار کر دیا ۔

باب ۳

(۱)

دل کی ہلچل

خان بہادر شفاعت احمد صاحب کو اس موقع پر لال صاحب اور نواب صاحب کی باتیں بہت بری لگیں مگر جب انھوں نے اپنے سے یہ پوچھا کہ ان دونوں نے کون سی ایسی بات کہی جو مجھے ناگوار ہوئی اور جس پر مجھے احساس ذلت ہو رہا ہے۔ تو یہ چیز سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن یہ سوال ان کے دماغ میں الجھن کر رہ گیا۔ وہ سوچتے رہے اور سوچتے رہے۔

چھوٹے لاٹ صاحب نے انگلستان اور فرانس اور یورپ کے ملکوں کو دیکھا تھا اور ان کے بعد اب ہندستان دیکھا۔ پہلے دونوں ملکوں کے دریا دیکھے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہندستان کے دریا بھی ویسے ہی ہوں گے۔ لیکن گنگا گھاگھرا دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ اور سوچنے لگے کہ یہ تو بہر حال ترقی کی ٹکر کا [illegible] ہوتا ہے [illegible] اس کی چوڑائی اور اس کے دونوں طرف آبادی۔ دریا جو اسی طرح [illegible] جس طرح پانی کا دریا اور آبادی۔ دریا کے پار دونوں طرف بے حد گھنے

جنگل۔ ان کو حیرت تھی کہ ہندستان سے واپس جانے والے انگریز ہندستان کی صرف
دو چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک تاج محل دوسرے شیر۔ وہ یہاں کے پہاڑوں، وسیع
دریاؤں، گھنے جنگلوں اور ان سب سے بڑھ کر اس کے انوکھے اور وحشی حسن کا
تذکرہ کیوں نہیں کرتے۔ یہ چیزیں تو ایسی ہیں جن کا انگلستان کیا یورپ میں بھی جواب
نہیں ملے گا۔

گھاگھرا کی سطح کے نیچے پوری رات کا چاند اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ خوش گوار
ہوا چل رہی تھی اور کشتیاں خاموشی سے بہاؤ پر جا رہی تھیں۔ باربردار کشتی جو فاصلے
پر تھی۔ اس کے ملاح ایسا گانا گا رہے تھے جو دریاؤں اور جنگلوں، ہواؤں اور
چاند کی فضا کا جز معلوم ہو رہا تھا۔ اس فضا سے متاثر ہو کر لاٹ صاحب نے اپنے
ساتھی انگریزوں کو حکم دیا کہ وہ شیمپین کی وہ بوتلیں کھولیں جو بہت ہی خاص موقع
کے لئے ساتھ آئی ہیں۔ وہ کھولی گئیں اور گزک کے لئے مچھلی کے تلے ہوئے قتلے لائے گئے
لاٹ صاحب شیمپین اور گزک کے ساتھ وحشی حسن کو یاد کرتے رہے۔

لیکن افسوس حکومت ہند نے جن چند باتوں کی سختی سے ممانعت کی تھی
ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہندستانی عورت سے کوئی دل چسپی نہ لی جائے۔

چھوٹے لاٹ صاحب خاموش تھے۔ ان کی خاموشی کی وجہ سے نواب صاحب
اور لال صاحب بھی خاموش تھے۔ خان بہادر صاحب بھی خاموش تھے لیکن ان کی
خاموشی میں کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ البتہ اس بات پر ضرور نواب صاحب کو حیرت
تھی کہ انھوں نے چھوٹے لاٹ صاحب کی عطا کی ہوئی اسپیشل شیمپین کو ہاتھ تک
نہیں لگایا تھا۔

خان بہادر کی یہ خاموشی چار چھ روز تک قائم رہی۔ اپنے گھر آ کر بھی جو
قصبہ شہید پور ضلع سوج پور میں تھا۔ انھوں نے سوائے بے حد ضروری باتوں کے اور

کچھ نہیں کیا، اور وہ باتیں بھی کہیں تو بے حد مختصر لفظوں میں۔

خان بہادر کی چھوٹی بیٹی نادرہ ان سے بہت ہلی ہوئی تھی۔ سورج پور میں ایک کانونٹ اسکول تھا، وہاں وہ روزانہ صبح کار سے جاتی تھی اور سہ پہر کو واپس آتی تھی اور آتے ہی باپ کے پاس چلی جاتی تھی۔ خان بہادر کو اس سے انگریزی میں باتیں کرنا بہت بھاتا تھا۔ نادرہ رات تک باپ کے پاس رہتی تھی۔ بس جب کوئی ملاقاتی آجاتا تھا تو وہ گھر میں بھیج دی جاتی تھی۔

لیکن جب سے خان بہادر صاحب شکار سے واپس آئے۔ انھوں نے نادرہ سے بھی بہت کم باتیں کیں اور جو باتیں کیں۔ وہ بھی اردو میں کیں۔ واپسی کے بعد خان بہادر کا بس ایک ہی مشغلہ تھا۔ وہ یہ کہ انھوں نے الہلال کی فائل نکال لی تھی اور دن رات اسی کو پڑھا کرتے تھے۔

چوتھے روز اچانک مولانا عبدالقدوس آگئے۔ مولانا عبدالقدوس رہنے والے لکھنؤ کے تھے اور دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ اس سال یہ ہوا کہ وہ سورج پور وعظ کہنے آئے اور پھر وہیں بس گئے۔ وہاں غریب مسلمانوں کے محلے میں ایک قرآن کی تعلیم کا مدرسہ قائم کر لیا تھا۔ جس میں بعض طالب علموں کو عربی بھی پڑھاتے تھے۔ جمعہ کے دن مولانا اسی محلے کی بڑی مسجد میں وعظ کہتے تھے اور اسی محلے میں جو شادیاں ہوتی تھیں وہاں نکاح پڑھاتے تھے۔ ایک نکاح میں شہید پور سے بارات آئی تھی۔ اس میں خان بہادر بھی شریک ہوئے۔ وہاں وہ مولانا سے ملے اور مذہب کے بارے میں کچھ باتیں بھی کیں۔

جب مولانا عبدالقدوس شہید پور پہنچے ہیں تو خان بہادر کی غیر معمولی خاموشی کا سا تو ان دنوں تھا۔ ان کا چہرہ یا تو کلین شیو رہتا تھا، یا اب اس پر داڑھی اگ آئی تھی۔ خان بہادر جمعہ کی نماز کو ذرا پابندی سے پڑھا کرتے تھے، لیکن

دوسری نمازوں میں کم ہی شریک ہوتے تھے۔ لیکن جب مولانا عبدالقدوس پہونچے ہیں تو خان بہادر اشراق کی نماز ادا کر رہے تھے۔

مولانا عبدالقدوس کو خان بہادر کی نماز کی یہ پابندی دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ لیکن انھوں نے دونوں باتوں میں سے کسی کا بھی کوئی اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

مولانا عبدالقدوس کی آمد کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ایک سابق شاگرد غفور نے جو یکہ چلاتا ہے ایک ہندو بیوہ کو مسلمان کر کے اس سے شادی کر لی تھی جب اس عورت کے عزیزوں نے غفور پر یہ الزام لگایا کہ اس نے عورت کو زبردستی مسلمان کیا ہے تو مولانا کے شاگرد نے عورت کے عزیزوں کے سامنے عورت سے کہلوا دیا کہ میں اپنی خوشی سے مسلمان بنی ہوں۔ اس بیان کے بعد معاملہ ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ جب بھی غفور یکہ لے کر جاتا تو لوگ اس کو دھمکیاں دیتے ہیں کہ کسی موقع پر سمجھ لیں گے۔

خان بہادر صاحب نے کہا کہ "معاملہ میں کوئی خاص الجھن نہیں ہے۔ سہسوپور کے کپتان پولیس راحت رسول میرے دوست ہیں ان میں اسلامی ہمدردی تو نہیں بس نام ہے۔ لیکن انصاف پسند ہیں اور معقول آدمی ہیں اور شریفوں کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں۔ میں ان کو خط لکھے دیتا ہوں وہ اس الجھن کو سلجھا دیں گے۔ آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔"

یہ کہہ کر خان بہادر صاحب نے فوراً خط لکھا۔ لیکن اپنے دستور کے خلاف انگریزی کے بجائے اردو میں خط لکھا۔

خان بہادر صاحب نے مولانا کو بہت اصرار سے روک لیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد انھوں نے مولانا سے کہا۔

"میں برسوں سے آپ کو یاد ہی کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں سوچ پور جاؤں یا مولانا کو بلا بھیجوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ خدا نے از راہ عنایت آپ کو بھیج دیا۔ مولانا میں چاہتا ہوں کہ قرآن مع ترجمے کے پڑھوں اور ساتھ ساتھ تفسیر کی ضروری باتیں بھی سمجھتا جاؤں۔ اس کے لئے کچھ کتابیں بتایئے اور کچھ وقت آپ بھی عنایت کیجئے۔

خان بہادر مشتاق احمد صاحب علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے اسی وقت سے شکار کے شوقین تھے۔ اسی شوق نے ان میں اور نواب افسر الدولہ میں دوستی کرائی۔ اس زمانے میں نواب افسر الدولہ کا نام تو ضرور نواب افسر الدولہ تھا لیکن ان کے پاس ریاست نہیں تھی۔ البتہ ان کے باپ کو ریاست سے بہت معمولی گزارا ملتا تھا۔ اسی میں وہ کسی طرح اپنے بیٹے کو پڑھا رہے تھے۔ مشتاق احمد جوانی ہی میں ایک بڑی زرعی جائداد کے مالک ہو گئے تھے۔ اس لئے شکار کے اخراجات کا کل بار وہی اٹھاتے تھے۔ علی گڑھ میں چھ سال فیل ہونے کے بعد انھوں نے بی۔اے پاس کر لیا اور پھر گھر آ کر جائداد کو دیکھنے لگے اور انگریزوں کو شکار کھلانے لگے۔

ایک مرتبہ وہ اپنے علاقہ کے کمشنر کو شکار کھلانے لے گئے۔ کمشنر نے ایک شیر کو مار گرایا اور پھر اسے مردہ سمجھ کر فوراً ہی مچان سے اتر کر اس کی طرف بھاگے۔ شیر میں کچھ دم باقی تھا۔ کمشنر صاحب جیسے ہی ذرا قریب ہوئے شیر تڑپ کر ان کی طرف بڑھا۔ کمشنر صاحب بدحواس ہو گئے۔ مشتاق نے اس وقت اپنے مچان پر بیٹھے بیٹھے ایسی گولی ماری جو کمشنر کے کانوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی شیر کی گردن کی ہڈی کو بہا کر نکل گئی۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی مہینے کے بعد مشتاق احمد خان بہادر ہو گئے۔

مشتاق احمد انگریزی بہت فراٹے سے بولتے تھے اور انگریزی تہذیب سے مانوس ہو واقف تھے کتنی انگریزوں سے دوستی تھی۔ ایک اینگلو انڈین لڑکی سے

عشق بھی کر چکے تھے جس میں تیس چالیس ہزار روپیہ برباد کر چکے تھے۔ اس عشق سے ان کو شراب کا چسکا لگ گیا تھا۔ اور انھوں نے اتنی پی تھی کہ ان کا شمار شرابوں کے پرکھنے والوں میں ہونے لگا تھا۔

(۴)

مولانا عبدالقدوس کا قیام خان بہادر صاحب کے یہاں ایک ایک دن بڑھتا گیا اور ان میں اور خان بہادر صاحب میں فلسفۂ مذہب اور تاریخ اسلام پر مسلسل تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔

سولھویں دن ایک موقع پر مولانا عبدالقدوس نے خان بہادر صاحب سے رازدارانہ کہا۔

"میں ایک مشن کا پابند ہوں اور قسم کھا چکا ہوں کہ اس کا راز صرف ان ہی لوگوں پر ظاہر کروں گا جو اس کے اہل ہوں گے۔ مجھے اسی وقت یقین ہو گیا ہے کہ آپ اسی کے اہل ہیں اس لئے وہ راز آپ پر ظاہر کرتا ہوں اس خفیہ مشن کا تعلق مولانا قاسم نانوتوی سے ہے۔ مولانا مرحوم نے ۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا لیکن افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔ ناکامی کے بعد مولانا نے اپنے ساتھیوں کو منتشر کر دیا اور خود یہ سوچنے لگے کہ جو شکست ہوئی ہے اس کا تدارک کیسے کیا جائے اور کس طرح بکھرے ہوئے شیرازے کو پھر سے منظم کیا جائے۔ مولانا دیوبند میں ایک جگہ مقیم تھے اور سوائے عبادت اور اس مسئلے پر غور و فکر کے اور کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ایک دن وہ ایک مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد اس کے صحن میں چہل قدمی کر رہے تھے اور تسبیح پڑھ رہے تھے کہ اچانک پولیس آ گئی۔ مولانا سمجھ گئے کہ میری تلاش میں آئی ہے۔ لیکن ان کے سکون میں ذرا

بھی فرق نہ آیا وہ بدستور ٹہل ٹہل کر وظیفہ پڑھتے رہے ایک پولیس افسر نے ان کی طرف بڑھ کر پوچھا۔

"اس جگہ قاسم تو نہیں آیا تھا"

مولانا سے جب وہ بات پوچھ رہا تھا تو وہ کھڑے ہو گئے تھے، یہ سوال سن کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اور پھر اس جگہ کی طرف جہاں وہ کھڑے تھے اشارہ کر کے کہنے لگے "ابھی ابھی اس جگہ وہ کھڑا تھا۔

پولیس کا کوئی آدمی مولانا کو پہچانتا نہیں تھا اور مولانا کے سکون اور اطمینان کی وجہ سے ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا وہم تک نہیں ہوا کہ پتہ بتانے والا اپنے کو چھپا بھی رہا ہے اور ظاہر بھی کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے مولانا کی بات سنتے ہی مسجد کا کونا کونا ڈھونڈ ڈالا۔ پھر ڈھونڈتے ہوئے باہر چلے گئے اس موقع پر مولانا قاسم کے دل میں اس بات کا القا ہوا کہ ان کا فرض ہے کہ جو عالم مارے گئے ہیں ان کی جگہ عالم تیار کریں۔ اور جو مجاہد مارے گئے ہیں ان کی جگہ مجاہد تیار کریں۔ اور ان دونوں کو تعلیم دے کر وہ ہندستان سے انگریزی حکومت کو نکال باہر کریں۔ مولانا نے چار دن کے اندر اندر اپنے معتقدوں کو اکٹھا کر کے دو گروہوں میں بانٹا ایک کے ذمے یہ کام رکھا کہ ملک بھر کا دورہ کریں اور مجاہدوں کی جماعت تیار کریں اور دوسرے گروہ سے کہا کہ میں ایک دینی مدرسہ قائم کروں گا۔ تم لوگ اس میں درس و تدریس کا کام کرو"۔

مولانا نے اسی دن مدرسے کی بنیاد رکھی جو رفتہ رفتہ دارالعلوم دیوبند بن گیا۔ جن لوگوں کے سپرد مولانا نے مجاہد تیار کرنے کا کام کیا تھا ان میں سے ایک میرے والد ماجد بھی تھے انھوں نے اپنے انتقال کے وقت یہ خدمت میرے سپرد کر دی تھی۔ میں بیس سال سے اس میں لگا ہوا ہوں اور جو کچھ بنتا ہے کرتا ہوں "۔

یعنی میری رسائی اوپر نیچے طبقے تک کیا اوسط طبقہ تک بھی نہیں ہے۔ اس لئے نتیجہ قابل اطمینان نہیں۔ اگر آپ اس کام میں کچھ اعانت کریں تو......"

خان بہادر صاحب نے بہت انہماک اور احترام سے یہ واقعہ سنا اور پھر سوچ میں ڈوب گئے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے۔

"میرے ذہن میں مسئلہ ابھی صاف نہیں ہوا۔ یعنی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہیئے اور اس کی طرف عملی راستہ کیا ہوسکتا ہے ــــ مجاہدین جو تیار ہوں گے وہ کس طرح جہاد کریں گے۔ اسلحہ کون سے استعمال کریں گے تنظیم کیسی بنے گی، میں انگریزوں کے فوجی نظام کو سمجھتا ہوں، اس لئے یہ سوال میرے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین کا عرصے سے مطالعہ کر رہا ہوں لیکن ابھی تک کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔"

ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد خان بہادر نے پھر کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ کلام پاک کے مطالعے سے کچھ روشنی ملے۔"

اس کے بعد خان بہادر باقاعدہ مولانا عبدالقدوس سے قرآن پڑھنے لگے اور یہ سلسلہ ڈیڑھ سال تک چلتا رہا۔ لیکن مذکورہ مسئلے پر ان دونوں میں پھر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

ایک دن مولانا نے خان بہادر سے کہا۔

آپ میرے نامناسب تجسس کو معاف فرمائیں۔ جب سے میں نے آپ کو اشراق کی نماز ادا کرتے دیکھا۔ ایک سوال میرے دماغ پر مسلط ہے۔ وہ یہ کہ یہ انقلاب عظیم آپ کی زندگی میں کیسے رونما ہوا۔ ہدایت دینے والا تو وہی ہے لیکن وہ اپنا پیام جب بھیجتا ہے تو کسی وسیلے سے بھیجتا ہے۔ وہ وسیلہ کیا تھا۔ اچانک یہ کیا ہوگیا کہ آپ کا ایسا زبردست بندہ پکا مسلمان بن گیا۔"

"مولانا صاحب۔ اگر یہ سوال آپ ایک سال پہلے پوچھتے تو میں اس کا جواب نہ دے سکتا کیونکہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میرے اندر یہ تبدیلی کہاں سے آئی لیکن ایک سال کے غور و فکر نے مجھے بتلایا کہ یہ کارنامہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا واقعہ یہ ہے کہ ان کے الہلال کے مطالعہ سے رفتہ رفتہ دو تین سال کے اندر میری نگاہ بالکل بدل گئی اور میرے اندر ایک خاص چیز پیدا ہو گئی جسے میں غیرت وطنی اور اسلامی کہوں گا لیکن مجھے اس تبدیلی کا کوئی احساس نہیں ہوا۔"

خان بہادر نے پھر چھوٹے لاٹ صاحب کے ساتھ شکار میں جانے کا حال سنایا اور یہ بتایا کہ کس طرح لاٹ صاحب نے جنگلی عورت کو دیکھا اور کس طرح اس پر لٹو ہو گئے اور پھر کس طرح نواب صاحب نے پیش کش کی کہ اگر لاٹ چاہیں تو وہ عورت ان کے خیمے میں بھیج دیں۔ اس واقعہ سے مجھے بڑی غیرت آئی اور میں نے محسوس کیا کہ دیکھو ہم ہندوستانی کہاں تک گر جاتے ہیں۔ اس احساس کا پیدا ہونا تھا کہ لاٹ صاحب کے ساتھ ایک ایک منٹ جو گزر رہا تھا وہ مجھے پہاڑ معلوم ہونے لگا۔ اسی احساس نے میرے اندر یہ تبدیلیاں پیدا کر دیں۔"

باب ۴

(۱)

بنجر زمین

شیر کی دہشت نے بن کٹ پورہ والوں کی آنکھوں میں ایک بجھا پن سا پیدا کر دیا تھا۔ ہر کسان ڈر رہا تھا کہ جانے کون کل اس کا شکار ہوگا اور جانے یہ مسکراتے ہوئے کھیت اور یہ ہنستی ہوئی بالیاں ہماری رہیں گے۔ یا ہم کو ان سے بچھڑنا پڑے گا؟ جب ایک کسان کی بجھی ہوئی آنکھیں دوسرے کسان کی بجھی ہوئی آنکھوں سے ملتی تھیں تو ان کے دلوں میں ہمدردی کے دیے جل اٹھتے۔ جب شیر کو شکاریوں نے مار لیا اور اس کی دہشت دلوں سے نکل گئی تو ہر کسان کے دل میں بہت زور و شور سے بارش کی تمنا سلگ اٹھی اور سلگتی رہی اچانک ایک دن اس تمنا کو سیراب کرنے کے لئے بادل آئے اور چھینٹا پڑ گیا اور اس سے سلگتی ہوئی چنگاری باہمی تعلقات میں تبدیل ہو گئی۔ رنج و راحت کی چند چوٹوں نے اس نئی بستی کے کسانوں کو اس طرح ایک کر دیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ مدتوں اور پشتوں سے ساتھ رہتے آئے ہوں۔

چھینٹا پڑتے ہی ہل چلنے لگے اور ہو ہو، ہٹ ہٹ کی صدائیں مسلسل
کئی کئی دن میں ڈوبی ہوئی سنائی دینے لگیں۔ چار ہی دن میں امر کو اندازہ ہو گیا
کہ اس کے بیلوں میں اب پہلے کی ایسی طاقت نہیں رہی ہے اس لئے وہ اتنی بڑی زمین
کو کیا اس کے آدھے کو بھی دھان کے قابل نہیں بنا سکتے ہیں۔ پھر کیا کیا جائے؟ گاؤں
کے تجربہ کار کسانوں نے جب رات کو وہ رام لال کے دوار پہ بیٹھ کر حقہ پینے لگے،
تو یہ رائے دی کہ بوؤ دھان ہی، چاہے زمین کو گھٹا کر ایک تہائی کر ڈالو۔ اتنے
میں تم سب کا پیٹ بھر جائے گا، کیونکہ یہ زمین جو قریب قریب نو توڑ ہے
خوب اپجاتی ہے۔ امر کئی روز تک اس فکر میں غوطے کھاتا رہا کہ کیا کروں اور
کیا نہ کروں؟ آخر میں اس نے جو فیصلہ کیا وہ بالکل ہی مختلف تھا۔ اس نے کہا
کہ جیسے بنے پوری زمین کو زیر کاشت لے آؤ۔ تاکہ اس پر قبضہ ہو جائے۔ اس
نئی بستی میں قبضہ سب کاموں پر مقدم ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ ہم چھوٹی جوار
بوئیں گے، کیونکہ اس کے لئے معمولی طور سے زمین کا توڑ نا ہی کافی ہوتا ہے
اس کے بونے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کی جڑوں میں پانی جذب ہوگا اور
پھر کھیت کٹ جانے پر وہ جڑیاں اندر سڑ کر پانس بنا پائیں گی۔ اس طرح دوسری
اور تیسری فصل کے لئے کھیت اچھا تیار ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ سوچ کر امر
نے دھان کے بیج کے بدلے میں چھوٹی جوار کے بیج لے لئے اور پوری زمین کی
تیاری میں لگ گیا۔ گاؤں بھر نے امر کی رائے کو غلط ٹھیرایا، لیکن وہ اپنے من کے
مشوروں پر چلتا رہا۔

لیکن جب وہ بیج ڈال رہا تھا۔ اس وقت چنیا نے آکر کہا۔

یہ سمجھ لو کہ دھان نہ ہو، تو میں سمجھوں گی کہ کچھ نہیں ہوا۔ بلا دھان کے کھیتی
بھی کھیتی ہے۔

امر بات سن کر بھی بولا نہیں۔ ذرا دیر کھڑا رہا۔ پھر اس نے ایک بڑا سا ٹکڑا چھوڑ دیا، جس میں بعد کو دھان بوئے۔

کھیت کی تڑائی، تیاری، بوائی اور سراون میں امر کا اس کے منجھلے بھائی مدن اور بیوی چمپا نے پورا پورا ہاتھ بٹایا، لیکن چھوٹا بھائی بابو دوسرے رنگ پر لگ رہا تھا۔ پہلے وہ امر کی چھوٹی بیٹی مالتی کے ساتھ اس کی گڑیا کا گھر بناتا تھا، ٹھیکریاں اور تتلیاں پکڑتا تھا اور مٹی کی بیل گاڑی بنا کر سفر کرتا تھا، لیکن اب وہ برابر والے کھیت کی مالکہ بیوہ دھنری کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اگر اپنے کھیت میں ایک گھنٹہ کام کرتا تو دھنری کے کھیت میں دو گھنٹے۔ اور کام کرتے کرتے اس کو ساتھ لے کر کھیل میں لگ جاتا۔

"دیکھ دھنری، — الاب کیسا ابھرا ہوا ہے۔"

"ہاں، بہت۔ اب کی جاڑوں میں اس سے اچھی سینچائی ہوگی۔"

"آؤ، تالاب میں ڈھیلے پھینکیں اور دیکھیں کون دور پھینکتا ہے؟"

دھنری ہنس کر ڈھیلے پھینکنے پر تیار ہو جاتی، مگر دو ہی ڈھیلے پھینک کر کہنے لگی۔

"مجھ میں اتنا بوتا نہیں ہے، تم ہی پھینکو۔"

"ہاتھ گھما کر پھینک۔ دیکھ اس طرح۔ دیکھا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

بابو نے لپک کر ایک ہاتھ سے دھنری کا بازو اور دوسرے سے اس کی بائیں کلائی پکڑ کر ہاتھ کو اس طرح گھمایا جیسے کہ وہ چارا کاٹنے کی مشین ہو۔ دھنری کے گدگدی ہوئی اور وہ ہنسنے لگی۔ بابو بھی، بلا سمجھے کہ وہ کیوں ہنس رہا ہے، ہنسنے لگا۔

چیتا بابو کی یہ باتیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی اور امر سے کہتی کہ " اس لونڈے کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنی ماں کی برابر عورت سے اچھل کود کرتا ہے ۔ اور یہ بڑھیا بھی خوب ہے ۔ اپنا بیٹی کے برابر لونڈے کے ساتھ چہلیں کرتی رہتی ہے ۔" لیکن امر اس کی بات پر ہنس دیتا اور کہتا ۔

" ارے بابو ابھی بچہ ہے اور اس کا من چاہتا ہے کہ کھیلے ۔ تیرے اور میرے سنگ تو کھیلنے سے رہا ۔ مالتی کے ساتھ کھیلتا تھا ' وہ رام گھر گئی ۔ یہ عورت دھنریا اس کے ساتھ کچھ کھیل لیتی ہے اور اس طرح اس کے کھیت کا کام بھی بن جاتا ہے ۔ کیوں کہ وہ بچاری تو دھونے بابو کے بنا اکیلی تو کچھ کر ہی نہیں سکتی ہے ۔ چلنے دے اس طرح کیا برائی ہے ؟"

پانی وقت پر برسنے لگا ' اور خوب برسا ۔ وقت پر جو ایسا پانی پڑا تو ایک طرف تالاب میں کوکا بیلی پھولنے لگی اور دوسری طرف کسانوں کے من کے کنول ۔ اب کسانوں کا سوائے اس کے اور کوئی کام نہیں تھا کہ وہ ادھر ادھر کھیتوں کی مینڈھیں درست کرتے رہیں اور پودوں کو پروان چڑھتا ہوا دیکھیں اور دل میں اچھے مستقبل کے قلعے بنائیں ۔

چیتا پودوں کو پروان چڑھتا دیکھتے دیکھتے ' اپنے اندر کی زندگی کو پروان چڑھتا ہوا محسوس کرنے لگی ۔ اور اتنا محسوس کرنے لگی کہ اسی میں مگن رہنے لگی ۔ اب تو وہ رہ رہ کر کروٹ بدلتا اور ہر کروٹ پر چیتا کو اتنا آنند آتا کہ ہر قسم کی فکر دور بھاگ جاتی ۔ اب تو اس کو بابو اور دھنریا کی بھی فکر نہیں تھی ۔ یہاں تک کہ اس نے اس بات کو بھی محسوس نہیں کیا کہ اب بابو مستقل طور سے دوپہر کا جیبرن دھنریا کے ساتھ کرتا ہے اور اسی کے کھیت کی دیکھ بھال میں لگا رہتا ہے ۔

ایک دن سویرے سویرے بابو دھنری کے گھر آ کر کہنے لگا۔

"دھنری، تالاب کے اس پار جو پیڑ ہے، اس پر توتے نے بچے دیے ہیں۔"

"چل! توتے بچے نہیں انڈے دیتے ہیں۔"

"ہاں، مگر انڈوں سے بچے نکلتے ہیں، انڈے نہیں نکلتے ہیں۔"

اس پر دونوں ہنس پڑے۔ دھنری اپنا آنچل سنبھال کر بولی۔

"پھر میں کیا کروں اگر توتے کے انڈوں سے بچے نکلتے ہیں؟"

"اگر تو ساتھ چلے تو میں پیڑ سے بچے اتار لاؤں۔"

"اتار کر کیا کرے گا؟"

"پالوں گا اور کیا کروں گا۔ اگر دو بچے ہوئے تو ایک تجھے بھی دوں گا۔"

"اس طرح جو میں تیرے ساتھ جاؤں گی تو گاؤں والے کیا کہیں گے؟"

"کہیں گے کیا۔ یہی کہیں گے کہ میری طرح تو بھی توتا پالنا چاہتی ہے۔ اچھا چلتا ہو تو فوراً چل، نہیں تو اکیلا چلا میں۔"

"مدن کو ساتھ لے لے۔"

"مدن سے ایسی بات کرو تو وہ بگڑ جاتا ہے۔ اب بھیا اس کی سادی کرنے والا ہے۔"

"تیری سادی کب ہو گی؟"

"سادی وادی کی باتیں پھر کرنا۔ چلتی ہے ساتھ کہ...."

دھنری کو بابو کی ایسی حرکتوں پر مزا آنے لگا تھا—— وہ کہنے لگی:-

"تو اس طرح کی باتیں کرتا ہے جیسے میرے اوپر کوئی زور ہے تیرا۔"

"تو میرا زور دیکھے گی؟"

بابو نے دھنری کا پہنچا پکڑ کر اس کو کھینچا۔ دھنری نے بابو کے فولادی بازوؤں کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور اس کا چہرا سرخ ہو گیا۔

"مار ڈال، مار ڈال۔ اچھا چھوڑ دے۔ چلتی ہوں۔ مگر دیکھ تو میرے ساتھ ایسی حرکتیں نہ کیا کر۔"

"کیسی حرکتیں؟"

دھنری کچھ کچھ لجاتی ہوئی بابو کے ساتھ چلی۔ بابو پیڑ پر بندروں کی طرح چڑھ گیا۔ دھنری اس کی پھرتی کو کنکھیوں سے دیکھتی رہی۔ بابو نے آخر توتے کے دو بچے پا لیے۔ ایک خود رکھ لیا اور ایک دھنری کو دے دیا۔ ان توتوں کا گاؤں بھر میں شہرہ ہو گیا اور گھر گھر ان کی باتیں ہونے لگیں۔ لوگوں کو دھنری اور بابو کا ساتھ بالکل نہیں پسند تھا لیکن صورت حال ایسی تھی کہ بندش بھی نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ بابو ہی کی وجہ سے دوھوا دھنری کی کھیتی ہو رہی تھی۔ وہ دن دن بھر اسی کے کھیت میں لگا رہتا تھا۔ پھر اگر بابو دھنری سے ساتھ کھیلنے کو کہتا تھا تو اس کا حق تھا۔ وہ انکار کیسے کر سکتی تھی۔ اگر ایسا کرتی تو احسان فراموشی بھی ہوتی اور کھیتی بھی چوپٹ ہو جاتی۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر اس معاملے کو ختم کرادیں تو دھنری کی کھیتی کا کیا کریں؟ لیکن ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بات زیادہ بڑھ گئی۔

دھنری نے بابو سے کہا۔

"میں تیرے لئے ایک چیز لائی ہوں۔ پر دوں گی تب جب بتلائے

گا کہ وہ کیا ہے یا یہ کہ وہ کہاں ہے ؟"

"میں کیا جانوں کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے ؟ جہاں بھی ہو اور جو کیا ہو، ابھی مجھے دے دے۔"

"میں تو نہیں دیتی، جو کرنا ہو کر لے۔"

بابو گڑگڑانے لگا۔ دھنری گدگدی سے بے چین ہو کر زمین پر مچل گئی۔ جس جگہ یہ واقعہ پیش آیا وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن اتفاق سے رام لال نے دیکھ لیا۔ اس نے جا کر چیتیا سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔

چیتیا نے جو یہ سنا تو جل کر کہا۔

"ان دونوں کو کیا کہوں ؟ بابو تو گدھا ہے، اس کو لاکھ سمجھاؤ بات سمجھتا ہی نہیں۔ اور وہ موئی ڈھنڈھو تو دوانی ہو گئی ہے۔ اب تو مانگ نکالتی اور آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے۔ بے شرم دودھوا کہیں کی۔ اپنے بھائی سے کہو کہ کچھ روک ٹوک کریں۔ میں کہتی ہوں تو ہنس کر چپ ہو رہتے ہیں۔"

رام لال دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے چیتیا کی طرف اپنی کلائی بڑھائی اور جہاں اس نے راکھی باندھی تھی وہاں انگلی پھیر کر کہنے لگا۔

"چیتیا! یہ تو نے کیا کر دیا ؟ کہیں اس طرح کوئی جلم ڈھاتا ہے ؟"

چیتیا نے اپنے اور رام لال کے چمک کر بجھ جانے والے پریم کو یاد کیا۔ کہنے لگی۔

"چپ رہو بھیا۔ بھگوان نے ناراض ہو کر مجھ سے میری مالتی کو چھین لیا۔"

چیتیا گھوم کر رام لال کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کوئی کام کرنے لگی۔ اس حرکت نے رام لال کو بتلا دیا کہ سوتا جگ چکا ہے۔ اور اب بہتر

میں جونک نہیں لگ سکتی ہے۔

(۲)

پودے کافی اونچے ہو گئے تھے۔ جن کھیتوں میں دو مہینے پہلے دھول
اڑتی تھی اور سبزی کا نام نہ تھا وہاں اب بہار پھیلی پڑی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے
جب دھانی کھیت لہلہاتے تھے تو کسانوں کے دلوں میں جانے کب کی زنگ کھائی
ہوئی آرزوئیں چمکنے لگتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے مانجی ہوئی پیتل کی تھالیاں،
نئی دھوتیاں، نئے شلوکے، نئے لوٹے، نئے برتن اور سب کی سرتاج آرزو۔
دودھ دیتی ہوئی گائے، یہ چیزیں کھیت کے ساتھ ان چیزوں کی آرزوئیں ساون
کے دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتی رہتی ہیں۔ کبھی بہت پاس نظر آرہی ہیں تو
کبھی کالے پردوں کی اوٹ میں کوسوں دور۔ کیوں کہ کبھی اچھی فصل کا یقین ہوتا ہے
تو کبھی اس میں شک کہ کون جانے کہ ابھی کون کون سی آفتیں، کون کون سی ناگہانیاں
بھاگ میں لکھی ہوئی ہیں، سوکھا، کیڑے، چوہے، جانور، ٹڈیاں اور آگ سب
ہی بلائیں تو کھیتوں اور کھلیانوں پر دانت لگائے رہتی ہیں اور جہاں ان کو
موقع ملتا ہے۔ لاکھ کے گھر کو خاک کر دیتی ہیں۔ کسانوں کی امیدوں کا حال خود
کسان خوب جانتے ہیں کہ وہ فصل پر اٹھتی ہیں اور عام طور سے فصل کٹنے پر
مرجھا جاتی ہیں۔

پانی برستا رہا اور پودے پروان چڑھتے رہے۔ پھر وقت پر
دھوپ بھی نکل آتی اور دوا بھی چلتی رہی۔ بس ایک پانی کی کسر اور تھی۔ وہ بھی
وقت پر پڑ جائے تو سب بیڑا ہی پار ہونا ہے۔

بہت دنوں کے بعد ایک تتلی دیکھنے میں آئی۔ یادو منڈیا پر دھنا رہا تھا

وہ کھڑا ہو گیا اور دھنری سے کہنے لگا: "تو ادھر سے جا اور میں ادھر سے جاتا ہوں۔ اس کو ضرور پکڑوں گا۔ چل بھاگ۔"

"نہیں بابو۔ اب میں تیرے سنگ نہیں کھیلوں گی۔ تیری جوتی مجھے بہت لہنے دیتی ہے۔"

بابو نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"اس وقت آس پاس کوئی نہیں ہے اور ہو بھی تو کون جانے گا کہ تو تتلی پکڑ رہی تھی۔"

دھنری ہنس کر چپ ہو رہی اور اٹھی نہیں۔ بابو نے اس کی کلائی پکڑ کر موڑ دی۔ وہ ہائے کہہ کر اٹھ بیٹھی اور بسور کر کہنے لگی۔

"توڑ ڈالو اس موئی کلائی کو۔ ہائے رام!"

بابو نے اس وقت اس کے اٹھلانے کی طرف دھیان نہیں دیا اور جلدی سے اس کو مناسب محاذ پر کھڑا کر کے تتلی پر حملہ کر دیا۔ تتلی اڑی تو دھنری کی طرف سے گزری اور وہ اس کی طرف بے تحاشا بھاگی، لیکن بھاگتے میں منہ کے بل پاؤں جو پھسلا تو دھڑام سے گر گئی اور ہائے ہائے کرنے لگی۔ بابو اس کے اس طرح گرنے پر ہنسنے لگا۔ اس پر دھنری کچھ شرم محسوس کرنے لگی اور چپ ہو کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ ایک پاؤں کام نہیں دے رہا ہے۔

"میں اٹھ نہیں سکتی۔ ہائے رے میرا پاؤں۔"

بابو نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا۔ اس نے دونوں بانہوں سے بابو کے گلے کا سہارا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

"میرا پاؤں گیا۔ اب کیا کروں گی؟"

دھنری بابو کے ہاتھوں کے بیچ میں کانپ رہی تھی اور اس کے گلے سے جھول رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار بابو کی نظروں سے ملتی تھیں، مل کر گر پڑتی تھیں اور اٹھ کر پھر ملتی تھیں۔ اس وقت بابو نے دھنری میں وہ بات دیکھی جس کو چھیا اور گاؤں کے لوگ دس بیس دن سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ دھنری کی بیوگی کا کیس، جو ناقابل گزر تھا، اب ایسے کنوارے میں تبدیل ہو گیا ہے جن کے بیچ میں آس بھر سانس ہے اور دھنری کی بجھی ہوئی آنکھیں اس وقت کاجل کی اوٹ سے ہنسی ہنسی سے بھری ہوئی "ہاں" کہہ رہی ہے۔ بابو کے اندر ایک تیز آندھی کا جھونکا آیا جس سے رگ رگ تھرا گئی اور اس کا بچپن پت جھڑ کے پتے کی طرح اڑ کر غائب ہو گیا اور جوانی کھل کھلا کر گوشے گوشے میں مہک اٹھی۔

بابو نے دھنری کے ہونٹوں کی طرف دیکھا جو نئی پکڑی ہوئی تتلی کی طرح کانپ رہے تھے اور پھر ان کے نیچے گھونسلوں میں چھپے ہوئے توتوں کی طرف دیکھا جو شکاری کے منتظر تھے۔

دھنری نے جو بابو کی نظروں میں بھیڑیے کے دانت دیکھے تو اپنے گوشت کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور لجا کر سر جھکا لیا۔

لیکن اسی وقت ایک ایسا حادثہ ہو گیا جس نے دن اور رات کو مل کر شام نہ بننے دیا۔ ہوا یہ کہ دھنری کچھ ایسی کل سے آ گئی کہ اس کے بدن کا کل بوجھ اس کے موچ کھائے ہوئے پاؤں پر آ گیا اور بابو جوش میں ہوش ایسا کھو بیٹھا کہ سنبھال نہ سکا۔ دھنری لڑکھڑا کر چیخ مار کر گر پڑی اور گر کر اور چیخنے لگی۔ اب موچ پر موچ جو آئی تو بابو جس کل سے بھی اس کو سنبھالتا اس کی چیخوں میں کمی نہ ہوتی۔

آس پاس کے کھیت سے لوگ دوڑ آئے۔ ایک کسان دوڑ کر ایک کھٹیا
لایا، اسی پر ڈال کر دھنری کو اس کے گھر پہونچا دیا۔ اسی وقت دو عورتوں نے آکر
چوٹ کو سینکا اور اس پر ہلدی چونا لگایا۔

دھنری کے ساتھ بابو بھی اس کے گھر آیا، مگر بیٹھے بیٹھے وہ محسوس
کرنے لگا کہ مجھے بھی کچھ ہو رہا ہے۔ آخر اس نے دھنریا سے کہا۔

"دھنری مجھے جانے دے۔ جانے میرا جی کیسا ہو رہا ہے۔"

گھر پہونچتے پہونچتے بابو کو زبردست جاڑا آیا۔ اتنا سخت کہ
گھر بھر کی رضائیاں اور لحاف ڈال دیئے گئے پھر بھی گرمی نہیں آئی۔ اور اس
کے بعد بخار چڑھنے لگا۔ چیتا کو جو معلوم ہوا تو وہ کھیت سے بھاگی بھاگی آئی۔
آتے ہی اس نے نظر گزر اتاری، کچھ ٹونا ٹوٹکا کیا اور پھر بابو کا سر دبانے لگی۔

(۳)

بخار میں بابو بھنتا رہا۔ لیکن اس کو برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ وہ دھنریا
کی بغلوں میں ہاتھ دیئے ہوئے ہے۔ اور وہ دلہنوں کی طرح لجا رہی تھی۔ جب یہ
اسی کا بخار اترا ہے تو وہ اس منظر سے اتنا مانوس ہو چکا تھا گویا کہ یہ بہت دنوں
کی بات ہے۔ لیکن بخار اترنے پر وہ دھنریا کے گھر جا نہیں سکا۔ ایک تو وہ
بہت کمزور تھا اور دوسرے سر چکرا رہا تھا۔ لیکن یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو
بھی وہ نہ جا سکتا۔ کیونکہ جس وقت وہ اٹھا ہے، اسی وقت اس کھیت سے
جاڑے سے کانپتا ہوا آیا تھا اور اب سے بخار چڑھ رہا تھا۔ اور اس کے بخار کے
ساتھ ساتھ مدن کو بھی جاڑا بخار آگیا۔ اب گھر میں سوائے چیتا کے کوئی [illegible] جیا
یہاں تک کہ چیتے بھی جاڑے بخار [illegible] سکے۔

کچھ اسی گھر پر منحصر نہیں، اس زمانے میں گاؤں کا ہر گھر جاڑے بخار کا شکار تھا۔ جس زمانے میں کسانوں کی یہ حالت تھی، اسی زمانے میں کھیتوں کو بھی پانی کی سخت ضرورت تھی اور بلا پانی کے وہ سوکھے جا رہے تھے۔ پر پانی آئے تو کہاں سے آئے؟ آسمان سے بادل غائب اور کسانوں کے جسم جاڑے بخار سے ٹوٹے ہوئے۔ کسان بخار میں پھنکتے ہوئے گھروں سے آکر کھیتوں میں پڑ جاتے تھے اور کبھی سوکھتی کھیتی کو دیکھتے تھے تو کبھی ننگے آسمان کو۔

امر بھی ایک دن بخار کی کمزوری میں اپنے کھیت تک آیا اور بابو بھی اس کے ساتھ تھا مگر وہ بھی بخار ہی میں تھا۔ دھان کے کھیت کی حالت خراب تھی، زمین سخت ہو رہی تھی اور چھاتی تک اونچے اونچے دھان کے پودوں کی پتیاں زرد ہو رہی تھیں۔ اپنے پودوں پر امر پیار سے ہاتھ پھیر کر رو دیا۔ اگر یہ فصل بگڑ گئی تو سوائے فاقوں کے امر کے سامنے اور کوئی راہ نہ تھی۔ وہ بہت کمزور تھا اور ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، لیکن اس نے بیلوں کو لا کر تالاب سے پانی دینا شروع کر دیا۔ بدن کا بخار بہت تیز تھا، لیکن وہ بھی کراہتا ہوا بابو بھی اور اس ادھیڑ عمر کے پاس گٹھری بن کر پڑ گیا۔ جیتا بھی بچوں کو بخار میں چھوڑ کر آگئی۔ کچھ دنوں سے اس کو پیڑ بھی ٹیڑھی حرکتیں کرتے میں تکلیف ہوتی تھی، لیکن اس پر بھی وہ کام کرنے لگی۔

یہ پانی دن بھر جاری رہا۔ پھر تو یہ دستور ہو گیا کہ جو شخص سخت بخار میں ہوتا وہ تو پڑا رہتا، باقی لوگ آکر پانی دینے لگتے۔ لیکن بابو اس میں پہلے دن کے علاوہ کسی دن بھی حصہ نہ لے سکا۔ کیونکہ اس کا بخار جب چڑھتا تو بہت تیز چڑھتا اور جب اترتا تو بہت کمزوری محسوس کرتا۔ اس حالت میں بھی اس نے دو ایک بار دوسروں کا کھیت جا کر دیکھا۔ اس کی حالت اور خراب پائی۔ کیونکہ وہ تو سارا

دھان ہی کا کھیت تھا، جو پانی بہت مانگتا ہے اور اس کھیت کا دیکھنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ دھنری اپنی ٹانگ لئے پڑی تھی اور بابو بخار سے بے حال تھا۔
بابو دو تین مرتبہ دھنری کے پاس بھی گیا۔ لیکن بخار اور کمزوری نے اس کی نظروں میں دھنری کو بدل دیا۔ وہ ایک جانی بوجھی بے کیف سی ادھیڑ عورت ہو کر رہ گئی تھی۔ بابو کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ مجھے کیا ہو گیا کہ ابھی دس روز ہوئے میں کچھ اور تھا اور اب کچھ اور ہوں۔

گاؤں بھر کی کھیتی برباد ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی کھیتی کم برباد ہو رہی تھی۔ کیوں کہ اس نے بہت بڑے ... میں دھان کے بجائے موٹی جوار بوئی تھی۔ اس کے کھیت میں جہاں پانی پہونچتا جاتا پودوں کی حالت سنبھلتی جاتی۔ لیکن دھان کے کھیت جو اس کے چاروں طرف تھے، پانی پا کر سنبھالا لیتے اور سنبھالا لیتے ہی اور پانی مانگنے لگتے تھے۔

بیمار کسانوں کا پانی دیتے دیتے برا حال ہو گیا تھا۔ اس پر بھی وہ موتی کو نہ روک سکے اور دو دن بہت سخت گزرے۔ ان دنوں میں کھیتوں کے چوتھائی پودے مر گئے۔ کسانوں نے اور جی دے کر پانی دینا شروع کر دیا۔ اگر بخار نہ ہوتا تو شاید وہ کھیتوں کو برباد ہونے سے روک لیتے۔ لیکن ایک تو بہت بخار میں مبتلا تھے دوسرے ان کے پاس بخار کا علاج ٹونے ٹوٹکے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی نہ تھی کہ اس کا علاج کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

ایک دن ایک کسان بخار کی حالت میں دھوپ میں چلاتے چلاتے بے ہوش ہو گیا۔ اس کی عورت چیخ چیخ کر رونے لگی کہ "مر گیا — مر گیا" سب دوڑ پڑے۔ یہ دیکھ کر کہ سانس چل رہی ہے سب اس کو گھر اٹھا لائے۔ رات کو جب بے ہوش ہونے والے کو ہوش آیا تو وہ رونے لگا اور کہنے لگا کہ تم لوگوں نے کیوں نہ

مجھے مر جانے دیا۔ یہ اچھا ہوتا کہ کھیت کے مرنے سے پہلے میں مر جاتا۔"

جب پڑوسی والوں کو اس کے رونے کی خبر ملی تو وہ آ گئے اور سمجھانے لگے کہ بھگوان پر بھروسا رکھو، وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

ایک بوڑھا کہنے لگا کہ سنا ہے کہ کسی پچھلے زمانے میں ایسے وقت سوکھا پڑ گیا تھا جب پودے بڑے ہو چکے تھے۔ بڑا سخت سوکھا تھا۔"

"کسان بیچارے دن دن بھر اور رات رات بھر سینچائی کرتے تھے، لیکن دھوپ اور ہوا ان کا پانی پی جاتے تھے اور کھیتوں کو بہت کم ملتا تھا۔ ایسے وقت میں ادھر سے کوئی سادھو آ نکلا۔ کسانوں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا "مہاتما جی، اس گاؤں کے بوڑھوں، بچوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں پر ترس کھا کر اور کسی طرح پانی دلوا دو۔ اگر یہ کھیت سوکھ گئے تو ہم لوگ شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگیں گے اور سڑکوں کے کنارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں گے۔"

"سادھو مہاتما بہت پہونچے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر بادل پانی نہیں دیتا ہے تو کنویں اور تالاب پانی دیں گے۔ ان کے اتنا کہنے سے کنویں اور تالاب ابلنے لگے پھر تو کسان جلدی جلدی نالیاں بنا کر ان سے پانی لینے لگے اور دو دن میں سب کھیت پانی سے بھر گئے۔"

یہ قصہ سن کر سب کسان ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے اور سوچنے لگے کہ کیا ایسا آج کل بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہو کیسے سکتا ہے۔ یہ تو کل جگ ہے کل جگ۔ اب ایسے مہاتما کہاں ہیں۔

اسی رات امر نے سپنے میں دیکھا کہ مالتی پیاسی ہے۔ پانی پانی چلا رہی ہے اور کنویں کی جگت سے نیچے جھانک رہی ہے۔ امر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔ دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر اسی وقت چپ چاپ بیلوں کو کھول کر کھیت پر

چلا گیا اور دھان کو پانی دینے لگا۔ اس نے تالاب کو کاٹ کر جو نہر بنائی تھی اس کا پانی بھی وقت کافی نیچا ہو گیا تھا۔ اس لئے پانی دینے میں بہت محنت لگ رہی تھی۔

ایک گھنٹہ میں چینا بھی اس کے پاس آ گئی۔ وہ امر کی دلی تکلیف سمجھ گئی اور آنکھ میں آنسو بھر کر کہنے لگی۔ "ایسی محنت سے کتنا دھان بچا لو گے۔" اب چھوڑ دو اسے۔ بھاگ میں صرف چھوٹی جوار ہے۔ وہی ملے گی"۔

امر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"بچا تو لیتا بہت کچھ۔ پر کیا کروں کہ کوئی ایک ہی ہے' اس کا بھی ایک بیل کمزور ہے اور بیلوں کو رات کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"اس طرح کام نہیں چلے گا۔ اب ایسا کرو کہ کھیت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چھانٹ کر الگ کر لو۔ اور اس کو پانی دے دے کر زندہ رکھو۔ باقی سب کو بھگوان پر چھوڑ دو۔"

امر بھی کئی روز سے یہی بات سوچ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جو پانی کا اصل نچھتر تھا۔ وہ جا رہا تھا اور جو نچھتر آ رہا تھا وہ ایسا تھا جس کے لئے کہاوت تھی کہ سال میں ایک بار بھی برسا تو مانو بہت برسا۔ اس لئے اس کا کیا ٹھیک۔ کنویں اور تالابوں سے پانی الیوانے والے سادھو مہاتما اس زمانے میں آنے سے رہے۔ ایسے میں کل کیا چوتھائی کھیت کو بچانا بھی ممکن نہیں بس اگر بچ سکتا ہے تو ذرا سا ٹکڑا جس سے دوسری فصل تک لوگوں کو آدھا پیٹ کھانا مل جائے گا۔

یہی ترکیب سب کسانوں کے دماغ میں آئی تھی اور دوسرے دن سے اس پر عمل بھی شروع ہو گیا اور اسی حساب سے نالیاں بنائی جانے لگیں۔ لیکن ادھر ان لوگوں کی نالیاں تیار ہوئیں' اور ادھر اسی سال میں ایک مرتبہ برسنے والا نچھتر

برسا۔ برساتو برستا ہی چلا گیا۔ تالاب بھرنے لگا۔ بھرتے بھرتے وہ کھیتوں کی سطح تک آ پہونچا۔ پھر اس سے بھی اونچا ہونے لگا۔ اب کسانوں کو اور اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یہ پانی گھر اور نہ کر دے۔ لیکن کسانوں کے گھر اونچے پر تھے۔ اس لئے وہ محفوظ تھے۔

پھر موسم کے بدلنے کے ساتھ ساتھ جاڑے بخار کا زور بھی ٹوٹ گیا۔ اب کسان کمزور تھے لیکن چلتے پھرتے تھے اور جہاں جہاں ضرورت ہوتی تھی اپنے کھیتوں کی مینڈوں کو بھی درست کر لیتے تھے۔

اب پھر بابو دھنری کے کھیت کو دیکھنے لگا تھا۔ دھنری کی ٹانگ کی موچ ابھی اچھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بھی جاڑے بخار میں پڑ گئی۔ اور ابھی تک اس کے جاڑے بخار کا زور ٹوٹا نہیں تھا۔ اس کو دیکھنے پڑوس کی کوئی نہ کوئی عورت آجاتی تھی اور پاس بیٹھی رہتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے بخار کی تیزی کے وقت کوئی نہیں آیا۔ اور دھنری کو بہت پیاس لگی۔ وہ لوگوں کو پکارنے لگی۔ اس وقت بابو پہونچ گیا۔ اس نے دھنری کے لئے پانی انڈیلا اور اس کو گود میں بٹھا کر پلایا۔ پانی پی کر دھنری نے بخار کی گرم گرم آنکھوں سے بابو کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"وہ یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے دھنری۔"

"کس طرح تو نے مجھے اٹھایا تھا۔"

بابو نے بے اختیار دھنری کے جلتے ہوئے گالوں پر پیار کر لیا لیکن اسی وقت چاپ سنائی دی اور پڑوس کی ایک بڑھیا جسے بہت کم سوجھتا تھا اندر آکر پوچھنے لگی۔

"کاہے دھنری۔ کاہے کو پکار رہی تھی؟"

پڑوسیوں کو دھنری کا کھیت جو دس مینڈرہ روز دیکھنا پڑا تو وہ دھنری
اور بابو پر جو اعتراض کرتے تھے ان کو بالکل بھول گئے۔ ایک کسان نے بابو کو
دھنریا کے گھر سے نکلتے ہوئے جو دیکھا تو کہنے لگا۔

"بابو بھیا! تم اچھے ہو گئے ہو! اب تم دھنری کا کھیت دیکھا کرو، ہم
لوگوں کا اس کی وجہ سے بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ ہمارے کھیت کی مینڈیں ٹوٹی
پڑی ہیں۔ بھیا تم نے دھنری کا کھیت دیکھ کر بڑاپن کا کام کیا ہے۔

(۴)

دوسرے دن صبح کو بابو دھنری کے گھر گیا تو اس کو ایک نئی شکل نظر آئی۔
ایک جوان عورت کالے کنارے کی لال ساری باندھے موٹی موٹی چوڑیاں پہنے بیٹھی
تھی۔ کسانوں کی یہ بستی ایسی تھی جہاں نہ کوئی آتا تھا نہ جاتا۔ اس کی صورت دیکھ کر
بابو ٹھٹھک گیا۔

دھنری نے کہا "آؤ بابو لال، یہ تمھاری بھانجی ہے۔ رام دئی۔ رات
آئی ہے۔"

رام دئی نے بابو لال کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر نمستے کیا۔ اس کے ہاتھ
جوڑ کر نمستے کرنے میں شہر والوں کا انداز تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھی دل کش تھی۔ بابو
لال نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دھنری کی طرف۔ رام دئی کو دیکھتے
ہی دھنری اس کو بوڑھیا معلوم ہونے لگی اور اس کو یہ ناگوار ہوا کہ دھنریا نے رام دئی
کو اس کی بھانجی بنا کر اس کو اپنے سن کا بنا لیا۔

بابو لال نے پھر ایک بار دھنری اور رام دئی کو دیکھا، اس کے وہ جذبات
جو دھنری کی طرف تھے اک دم ختم ہو گئے

رام دئی۔ "کیا دیکھ رہے ہو بابو جی؟ یہ کہ ہم دونوں کی صورتیں ملتی
جلتی ہیں یا نہیں؟"

بابو۔ "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس پانی میں تم کیسے آگئیں؟ ادھر
سوکھی ساکھی۔"

رام دئی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی۔ "پانی میں آنا تو آسان ہے
مزے سے بہتے ہوئے چلے آئے۔"

"کیا تم اکیلی آئی ہو؟"

"میرے ساتھ بہنے پر کون راضی ہوتا۔"

دھنری کہنے لگی۔ "یہ ایسے ہی بک رہی ہے، اس کی ساتھ اس کا
مرد آیا تھا۔ مگر وہ رات ہی کو چھوڑ کر چلا گیا۔"

دھنری کی بات بابو کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ
سارا رستا اور راستے کے ندی نالے جو اب برسات میں بھر گئے تھے تیر کر بھیگتا
ہوا آئے، اور فوراً ہی بھیگتا ہوا چلا جائے۔ اور نہ یہ سمجھ میں آیا کہ دو آدمی
پردیس سے آئیں اور کسی کی نہ آتے وقت نظر پڑے اور نہ جاتے وقت، اور نظر
پڑے تو اس کا چرچا نہ ہو۔ گاؤں کی زندگی اتنی بے واقعہ ہوتی ہے کہ وہاں جو
بات بھی نئی ہوتی ہے وہ لوگوں کے لئے بے حد سنسنی خیز بن جاتی ہے اتنی کہ
وہ جس کو بھی مل جاتی ہے اس پہ اتراتا ہوا آتا ہے اور دوسروں کو فخر کے ساتھ
دکھلاتا ہے کہ دیکھو ایسی ایسی بات میرے پاس ہے۔ اسی طرح ہر نئی بات بندوق
کی صدا کی طرح ایک سرے سے دوسرے تک بات کی بات میں گونج جاتی ہے۔

بابو حیرت سے رام دئی کو دیکھتا رہا۔

بابو رام دئی کی طرف دیکھ رہا تھا اور دھنری بے حسی سے بابو کی طرف

دیکھ رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ اس کے دل میں اندھیرا چھاتا چلا جارہا تھا۔ اس نے اپنے بہترین ناز بھرے انداز میں کہا۔

"ارے بابو دیکھ تو تیرا توتا کتنا بڑا ہو گیا ہے۔"

بابو سے پہلے رام دئی بول اٹھی۔

"صبح میں نے اسے آٹا دیا تو 'دال بھات' 'دال بھات' کہنے لگا۔"

یہ کہہ کر وہ اس طرح ہنسی گویا بہت سی گھنٹیاں ایک ساتھ بول پڑیں اور اس کی ہنسی نے بابو کو بھی گدگدا کر ہنسا دیا۔

دھنری کو اس کا اس طرح بول پڑنا اور پھر ہنسنا برا لگا۔ مگر رنگ رلیوں میں اپنی جگہ قائم رکھنے کے لئے وہ بھی ہنسنے لگی۔ لیکن اس کی ہنسی اوپر اٹھنے کی کوشش ہی میں گر پڑی اور کوئی خاص کھنک نہیں پیدا ہوئی۔ اپنی ہنسی کی ناکامی کا احساس کرکے دھنری مرجھا گئی۔ اور اس کو غصہ بھی آگیا۔

رام دئی نے اس کا مرجھانا بھی دیکھ لیا اور غصہ بھی سمجھ لیا، لیکن وہ کود کر توتے کے پاس پہونچ گئی اور کہنے لگی "مٹھو بابو۔ مٹھو بابو۔"

مٹھو نے جواب دیا۔ "دال بھات، دال بھات، دال بھات۔"

اس پر سب ہنس پڑے۔ لیکن پھر رام دئی کی ہنسی زیادہ چلبلی رہی۔

بابو اس کے برابر بیٹھ کر مٹھو بابو مٹھو بابو کرنے لگا۔

دھنری نے کراہ کر کہا۔ "ہائے میری ٹانگ، میں کروٹ بدلوں گی۔"

بابو اس طرف مڑا تھا لیکن جب تک وہ اٹھے اٹھے رام دئی بل کھا کر دھنری کے پاس پہونچ گئی، اور اس نے دھنری کو کروٹ بدلا دی ——— دھنری نے ایسی کروٹ لی کہ مٹھو، رام دئی اور بابو کی طرف پیٹھ ہو گئی۔ اس کے منھ پر اس وقت صرف مرجھایا پن ہی نہ تھا بلکہ بیدرد، جو اودھر کچھ دنوں سے مرجھائی ہوئی رہتی تھی،

اپنے پورے شباب پر آگئی تھی۔

رام دئی نے کہا

"کیوں ماں، ہم جاکے کھیت نہ دیکھ آئیں؟ دیکھیں کہ بے دیکھے بھالے کھیت میں کیا باقی بچا ہے۔" بلا جواب کا انتظار کئے رام دئی بابو کو لے کر کھیت کو چل دی۔

بابو۔ "تم ابھی یہاں رہوگی نا؟"

رام دئی۔ "کیوں؟ تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"رہوگی تو میرے ساتھ تتلیاں پکڑنا ہوں گی؟"

"بس یا اور بھی کچھ کرنا ہوگا"

"پیڑوں پر چڑھ کر چڑیوں کے بچے اتارنا ہوں گے۔"

"یہ دونوں کام پاپ کے ہیں۔ میں نہیں کروں گی۔ چڑیوں کے بچے تو جرمنی مار لاتے ہیں۔ ان سے لے لو۔"

"بڑی آئی ہو پاپ والی۔"

بابو نے دیکھا کہ رام دئی کی چال دھرتی ہما سے سبک نہیں ہے بلکہ خود اس کے مقابلے میں بھاسبک ہے۔ وہ تو اس طرح چلتی ہے جیسے دھرتی پر صرف رسمی طور پر پاؤں دھرتی ہو۔ بابو کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی گاؤں والا ملے اور پوچھے کہ یہ کون ہے؟ اور پھر میں تعارف کراؤں۔

"تم کس گاؤں میں رہتی ہو۔"

"کیا میں سسرال کے گاؤں کا نام لوں؟"

"میرے سامنے نام لے دو۔"

"بڑے وہ آئے ہو، ابھی دو گھنٹہ تو ہوئے جاتے ہوئے۔"

جب یہ لوگ کھیت میں پہونچے تو دونوں ایک چیز دیکھ کر چونک پڑے
وہ یہ کہ دھان کی بالیوں پر پتلی پتلی ٹانگوں والے پتنگے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ
دونوں ان کو پہچانتے تھے۔ یہ گندھی کی طرح کے دھانوں کے قاتل تو نہ تھے لیکن
پھر بھی نقصان پہونچانے میں اس سے کچھ ایسے کم بھی نہ تھے۔ یہ وہ بلا تھی جو
بالیوں میں پڑنے والے نوخیز دانوں کا دودھ چوس کر ان کو چھوٹا کر دیتی تھی۔
اور کبھی کبھی تو صرف چھلکا چھوڑ دیتی ہے۔

دوپہر تک یہ کیڑے سب کھیتوں میں نظر آنے لگے۔ اور اتنے تھے
کہ اگر ان کو ایک جگہ سے اڑاؤ تو جھنڈ کے جھنڈ دوسری جگہ بیٹھ جاتے تھے۔
کروڑوں بلکہ اربوں کیڑوں کو کوئی مارے تو کیسے مارے۔

کیڑوں سے اگر بچا تھا تو صرف امر کے کھیت کا ایک حصہ بچا تھا۔ کیوں کہ
ان کیڑوں کو چھوٹی جوار پسند نہیں تھی۔ آج امر تو بخار میں پڑا ہوا تھا لیکن مدن
کھیت پر موجود تھا۔ کیڑوں کے لئے جو دوڑ بھاگ ہوئی اور شور ہوا تو کچھ
اس کی وجہ سے اور کچھ رام دئی کی نئی شکل دیکھ کر وہ دھنری کے کھیت میں آ کر
پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے اور رام دئی کو بھی پوچھا جو اس وقت درخت کی ایک
شاخ سے کیڑوں کو اڑا رہی تھی کہ وہ کون ہے۔

بابو نے رام دئی کا تعارف ذرا جوش سے کیا۔ مدن نے کچھ کہا تو نہیں
مگر جن نظروں سے بابو کو دیکھا اس کا مطلب یہ تھا کہ تم ان ہی باتوں میں پڑے
رہو گے۔

شام تک کسانوں نے کیڑوں کو بھگانے اور مارنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن
آخر سمجھ گئے کہ اس سے حاصل کچھ نہ ہوگا۔ ٹڈی دل کے ایسے اس بڑے دل کو نہ
کوئی مار سکتا ہے اور نہ بھگا سکتا ہے۔ اس نتیجے پر پہونچنے کے بعد کسانوں

کی باتوں سے وہی مایوسی ٹپکنے لگی جو سوکھا پڑ جانے کے وقت ٹپکنے لگی تھی۔ اب
کی بار بھی برس چکا تھا اور پودے بھی شاداب ہو گئے تھے لیکن حاصل کیا ہوا۔
بالیوں میں دانے جو پڑ گئے ہیں ان کو کیڑے کھا جائیں گے۔ تھوڑے بہت کیڑے تو ہر
سال آتے تھے لیکن اس سال تو ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ کھیت میں کچھ بچتا نظر نہ آتا تھا۔

اگر مسلسل بارش ہونے لگے تو کیڑوں سے نجات ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ
مسلسل بارش سے ان کے بازو شل ہو جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ لیکن اب
جو نچھتر تھا اس میں مسلسل بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس رات کسان دیر تک کیڑوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بالو
کہنے لگا۔

"دھنری کی بٹیا جو آئی ہے وہ ایک ترکیب بتلاتی ہے۔"

"وہ کیا؟" سبھوں نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

"درختوں سے جو گاد نکلتا ہے وہ۔"

"اس سے کیا کیا جائے؟"

"سوکھی ٹہنیوں پر اسے لگا لو۔ اس سے کیڑوں کو اڑاؤ۔ وہ اڑتے
ہوئے گاد سے چمٹ کر رہ جائیں گے۔"

"پھر کیا کرو؟"

"پھر کیڑوں کو مار ڈالو اور اس ٹہنی سے اور پکڑ لو۔ اتنا حرج کرتے
رہو۔" جہاں کچھ کسانوں نے اس ترکیب کو غور سے سنا وہاں بہت سے کسان
بے اعتباری سے ہنسنے لگے۔

"تنا گاد کہاں سے آئے گا؟"

"دن بھر کیڑے کون اڑائے گا؟"

"کیڑے لکڑی سے کیوں چپٹیں گے؟"
"جیو ہتیا کتنی ہوگی؟"

دوسرے دن رام دئی اور بابو نے اس ترکیب پر عمل کیا۔ اس سے لاکھوں کیڑے مر گئے۔ لیکن جتنے اس کے کھیت میں مرتے اتنے ہی اور طرف سے آجاتے۔ لیکن دوسرے دن اور کھیتوں میں بھی یہ ہونے لگا۔ اور چار دن کے بعد ہر کھیت میں اس ترکیب پر عمل ہونے لگا۔ جنگل پاس ہی تھا۔ وہاں لس دار پانی والے بہت سے درخت موجود تھے۔ اس لئے اس پر عمل کرنے میں کوئی خاص دشواری بھی نہیں ہوئی۔

جب سب کسان نے اس ترکیب پر عمل کیا تو دو روز میں کیڑے بہت کم ہو گئے۔ لوگوں نے رام دئی کی بہت تعریفیں کیں اور اس کے آنے پر بھگوان کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

(۵)

دھان پکنے لگے۔ امر کے کھیت میں چھوٹی جوار تو ایسی تیار ہوگئی کہ چڑیا ان کی بالیاں لال کر الاؤ میں بھونے گی۔ چھوٹا راموجو اب کافی باتیں کرنے لگا تھا اس چیز کا بہت شوقین تھا۔ دن بھر چلایا کرتا "بو، بو، وانا، بو، بو، دانا۔"

امر اور چتیا نے ترکاریوں کی جو کیاریاں لگائی تھیں، ان سے اتنا پیدا ہونے لگا تھا کہ ان لوگوں کے خرچ کے خرچ نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت کھیرا، ککڑی، پھوٹ اور ترکاریوں کے ڈھیر لگے رہتے۔ یہ ان دونوں کے گھر پر منحصر نہیں۔ گاؤں میں کوئی ایسا گھر نہیں تھا جس کے گھر میں ان چیزوں کی افراط نہ ہو۔

بابو کو افسوس تھا کہ کسی نے بھٹے نہیں بوئے۔ اس لئے یہ فصل بلا بھٹے کھائے گزری جارہی ہے۔ آخر اس نے طے کیا کہ میں ریتا پار کے بازار کے دن وہاں جاؤں گا اور ترکاریوں کے عوض بھٹے لاؤں گا۔

دو دن کے بعد بابو نے ترکاریاں ایک ٹوکری میں رکھ لیں اور منھ اندھیرے ریتا پار کی طرف چل دیا۔ چراغ جلے جب وہ واپس آیا تو اس کے انگوچھے میں بہت سے بھٹے تھے اور تھوڑا سا گڑ بھی تھا۔ ان چیزوں کو اس نے چیتا کو دے دیا۔ اور پھر اس کی اجازت سے کچھ بھٹے اور ذرا سا گڑ لے جاکر دھنری کو دیا۔ دھنری ان چیزوں کو پاکر بہت خوش ہوئی اور اس نے بہت محبت سے بابو کی طرف دیکھا۔ نظر ملنے پر بابو نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا اور بالوں میں مانگ۔ دھنری کی یہ مسکراہٹ اور یہ بناؤ سنگار بابو کو اچھا نہیں لگا۔ وہ ساماں دے کر وہاں ٹھیرا نہیں۔ اس نے رام دئی سے بھی بات نہیں کی۔

دوسرے دن صبح بابو جب رام دئی سے کھیت پر ملا تو رام دئی نے کہا۔

"کیا مجھ سے خفا ہو۔ کل تم نے مجھ سے بات بھی نہیں کی۔"

"بہت خفا ہوں۔ دیکھو تمھارے لئے کیا لایا ہوں۔"

بابو نے کمر سے ایک چھوٹی سی تیل کی شیشی نکالی۔ اور کہنے لگا۔

"ذرا سونگھو۔"

رام دئی سونگھ کر بولی۔ "کیسی اچھی سوگند ہے۔ اہاہا۔ ہا۔ پیاری پیاری سی مہک ہے۔"

یہ کہہ کر رام دئی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش

کی۔ لیکن ممکن نہ ہوا اور وہ رونے لگی۔

بابو گھبرا گیا اور پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے، کچھ کہو تو، کچھ بتاؤ تو، کیا اس شیشی میں کوئی برائی ہے؟"

رام دئی اپنے کو سنبھال کر کہنے لگی۔

"نہیں۔ سوگند بہت اچھی ہے۔ دوشش اس کا نہیں ہے۔ میرا دوشن ہے۔"

"کچھ بتلاؤ تو سہی۔"

"پھر بتلاؤں گی۔" یہ کہہ کر رام دئی بھاگ گئی۔

بابو کو اب اپنے جذبات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ جب وہ دھنری کی رات والی نظر یاد کرتا تو اس کا جی متلانے لگتا۔ لیکن جب رام دئی کے رونے کو یاد کرتا تو دل میں ترس بھرا پیار امنڈنے لگتا۔

بابو کی دیکھا دیکھی ہر کسان فاضل ترکاریاں لے لے کر ہر ہفتے بازار جانے لگا اور وہاں سے طرح طرح کی چیزیں لانے لگا۔ ایک مرتبہ کسانوں کے ساتھ امر بھی گیا۔ وہ واپسی میں اپنے ساتھ ترکاریوں کے عوض سفید سفید گولیاں لایا۔ جن کا نام اس نے کونین بتلایا۔ ان گولیوں سے اس کے گھر والوں کا باری کا بخار ٹوٹ گیا۔ اس کو دیکھ کر اور کسان بھی ان گولیوں کو لائے۔

بابو جب بازار جاتا تو کوئی نہ کوئی چیز رام دئی کے لئے ضرور لاتا۔ وہ چیز تو لے لیتی لیکن اس کو استعمال نہ کرتی۔ دوسری بات اب اس میں یہ پیدا ہو گئی تھی کہ بابو سے اکیلے میں نہیں ملتی تھی۔

آخر ایک دن بابو نے موقع پاکر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔

"تم مجھ سے بھاگتی کیوں ہو؟"

"میں پرائی ہو ہوں۔ ایسی بات کیوں کروں جو لوگ نام دھریں۔"

بابو کا منھ یہ سن کر بند ہو گیا، چہرا اتر گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سر جھکا کر رام دئی کو راستہ دے دیا۔

اس دن کے بعد سے بابو کھویا کھویا رہنے لگا۔ وہ دھنری کے کھیت پر بھی بہت کم جاتا۔ وہ کبھی کسی درخت کی جڑ پر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں بیٹھا رہتا، یا تالاب کے کنارے جا کر اس میں ڈھیلے پھینکتا رہتا۔ دو روز کے بعد امر نے اس کو ٹوکا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ اپنے یا دھنری کے کھیت پر کام کرو اور وقت برباد نہ کرو۔ لیکن اس نے کچھ شنوائی نہ کی۔ امر کے دل میں بابو کے لئے وہی پیار تھا جو چھوٹے بچے کے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے ایک مرتبہ کے بعد پھر نہ ٹوکا۔

لیکن چند دنوں کے بعد بابو کو ایک دل بہلاوا مل گیا۔ ایک دن چالیس پچاس مزدوروں اور کئی بیل گاڑیوں کو لے کر ایک ٹھیکے دار صاحب آ گئے۔ مزدوروں سے بابو کو معلوم ہوا کہ جنگل کو کانٹے دار تاروں سے گھیر دیا جائے گا۔ تاکہ جانور وہاں سے نکل کر بھاگ نہ جائیں اور ان کا شکار کیا جا سکے۔ دوسرے دن سے زمین کھود کر بلیوں کے ٹکڑے لگائے جانے لگے۔ بابو کو یہ کام ایسا مزے دار معلوم ہوا کہ وہ اسے بیٹھا ہوا دن بھر دیکھا کرتا اور مزدوروں کے بہت سے چھوٹے موٹے کام مفت کر دیا کرتا۔ جب بلیوں میں ہک لگائے جانے لگے اور پھر کانٹے دار تار اس میں جڑے جانے لگے تو اسے بہت ہی عجیب عجیب لگنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی میرے ساتھ بھی ہوتا جس سے میں باتیں کرتا۔ لیکن رام دئی اب دور دور رہتی تھی اور دھنری سے خود اسے اب دل چسپی نہیں رہی تھی۔

تار لگانے والے پندرہ دن میں بن کٹ پورے سے چار میل دور نکل

گئے اور پھر دن بدن دور ہوتے گئے۔ اتنی دور جانا بابو کو کھل جاتا تھا
لیکن کوئی اور کام نہیں تھا اس لئے پھر بھی جاتا رہا۔

جنگل کے گرد تار لگ جانے سے کسانوں کی ایک مصیبت ختم ہوگئی۔
وحشی جانوروں کا حملہ ۔ ہرن یا نیل گائے، یا سور یا پاڑے غول کے غول
کھیتوں پر حملے کرتے تھے اور ان کو ہنکانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ایک طرف سے
بھگاؤ تو وہ دوسری طرف گھس جاتے تھے۔ ایک ہی حملے میں وہ کھیتوں کو کافی صاف
کر دیتے تھے۔ کسانوں کا جی چاہتا تھا کہ کاش جنگل کو ایسے تاروں سے گھیرا
جاتا کہ چڑیوں کے حملے بھی بند ہو جاتے جو اکثر ہوتے رہتے تھے۔

کھیت پکتے پکتے ایک اور مصیبت آگئی۔ وہ یہ کہ وہ ایک بیماری کا
شکار ہوگئے۔ دھان کی بالیوں میں لال لال چتیاں پڑ گئیں۔ اس بیماری کا نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ چاول چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ کسان اس بیماری کو پہچانتے تھے۔
لیکن علاج نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے ٹونے ٹوٹکے کئے۔ لیکن اس سے کچھ
ہوا نہیں۔ کسان رام دئی سے پوچھتے "کیڑوں کا علاج بتلایا تھا تو اس کا
بھی بتلاؤ"۔ رام دئی ہر ایک سے کہتی "مجھے کیا آتا جاتا ہے۔ ایک بات جانتی
تھی۔ سو بتادی۔"

(۶)

کھیت قریب قریب تیار تھے اور دو چار روز میں کٹنے والے تھے۔
اس موقع پر ایک چھوٹا موٹا جھگڑا ہوگیا۔

امر نے اپنے گھر کے برابر کا کنواں جو صاف کیا تھا۔ اس کا پانی بہت
ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس وجہ سے اس کی جگت پر صبح اور شام پانی بھرنے والوں

کی بھیڑ لگی رہتی تھی ۔ لیکن کنویں کا منہ اتنا چھوٹا تھا کہ ایک وقت میں
دو ہی ڈول ڈالے جا سکتے تھے ۔ اس وجہ سے اکثر پانی بھرنے والیوں میں
تکرار ہو جاتی تھی ۔ جیتیا اس کنویں کو اپنا سمجھتی تھی اس لئے وہ کبھی کبھی پانی بھرنے
والیوں کو حکم دے دیا کرتی تھی کہ " تم ٹھہر جاؤ ۔ پہلے اس کو بھر لینے دو "
کچھ عورتیں اس حکم کو مان لیتی تھیں اور کچھ اس کو سنا ان سنا کر دیتی تھیں
ایک ، دن ایک عورت جو بہت تیز تھی جیتیا کا حکم سن کر اس سے لڑ پڑی جیتیا
نے اس کو سخت جواب دیا ۔ وہ گالیاں دینے لگی اور مارنے دوڑی ۔ بلکہ
ایک ہاتھ مار بھی دیا مگر وہ جیتیا کے لگا نہیں ۔ جیتیا اس پر بہت بگڑی اور
کہنے لگی کہ " کل سے تم پانی بھرنے نہ آنا " اس کا یہ حکم سن کر سب عورتیں
بگڑ گئیں اور کہنے لگیں کہ کنواں تمہارا نہیں ہے جو ایسا حکم دیتی ہو ۔ وہ بہت
پرانا بنا ہوا ہے اور سارے گاؤں کا ہے اس کے بعد بھی جیتیا اپنا حکم چلانے
کی کوشش کرتی رہی اور عورتیں اس کو توڑنے کی ۔ یہ لڑائی دو تین دن تک چلتی
رہی ۔ ایک دن ایک مرد نے کہہ دیا کہ جیتیا تو کنویں پر غلط قبضہ جتاتی ہے
ایسا ہی ہے تو کل تو تالاب پر قبضہ جتانے لگے گی ۔ جیتیا اس کی بات
سن کر روتی ہوئی گھر میں چلی آئی ۔ گھر میں امر تو نہیں تھا ، مگر مدن تھا
اس نے جو یہ بات سنی تو لاٹھی لے کر کنویں پر کھڑا ہو گیا کہ دیکھیں اب
کون مائی کا لال کنویں پر قبضہ کرتا ہے ۔ اس نے عورتوں سے کہا کہ جاؤ
اور اپنے اپنے مردوں کو بھیج دو ۔

یہ خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی کہ عورتوں کی لڑائی مردوں
میں آگئی ہے ۔ دو تین من چلے لاٹھیاں لے کر مدن کا مقابلہ کرنے چلے
لیکن بڑے بوڑھوں نے ان کو روکا اور کہا کہ پہلے امر کو معاملے کا فیصلہ

کر لینے دو۔ امر کھیت میں تھا۔ اسے جو واقعہ معلوم ہوا تو دوڑا ہوا کنوئیں پر آیا۔ یہاں تین چار نوجوان لاٹھیاں لیے مدن کے مقابل میں کھڑے تھے اور میدان ہونے ہی والا تھا۔

امر: "بھیا مدن کیا بات ہے؟"

مدن: "یہ کنواں ہمارا ہے۔"

"تیرا ہے؟"

"ہاں ہمارا ہے۔ ہمارا ہے۔ ہمارا ہے۔ اور ہمارا ہی رہے گا۔"

"ایسی بات ہے؟"

"ہاں ایسی ہی بات ہے۔ جو اسے نہیں مانے گا اسے لاٹھی سے منوا لوں گا۔"

"اگر یہ کنواں تیرا ہے تو لاٹھی پھینک دے اور ان سب کے ڈول بھر۔"

"کیوں۔ میں ایسا کیوں کروں؟"

"اگر تیرے گھر میں گھڑا پانی ہو، اور چار بھائی پانی پینے آجائیں تو، تو کیا کرے گا؟"

"اگر پانی پینے جو آئیں تو وہ کہنے لگیں کہ گھڑا ان کا ہے، اور میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے تو؟"

"تو، تو ہی بتا کہ کیا کرے گا؟ ان کو پانی پلائے گا۔ یا ان کا خون بہائے گا بول!"

مدن کی لاٹھی جھک گئی۔

"پھینک لاٹھی۔"

مدن تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر لاٹھی لے کر گھر چلا گیا۔

امر نے کسانوں سے کہا۔

"مہتوں، کنواں تو ایسی چیز ہوتا ہے کہ اپنا ہو یا پرایا ہو، وہ ہوتا ہے گاؤں بھر کا۔ نہ کسی کا زیادہ نہ کم۔ یہ تو دستور ہے جو پرکھوں سے چلا آرہا ہے۔"

باہر کا جھگڑا تو ختم ہوگیا لیکن امر کے گھر کے اندر بہت دنوں تک چلتا رہا۔ چمپا نے کنوئیں سے پانی بھرنا بھی چھوڑ دیا اور امر سے باتیں کرنا بھی۔ مگر گاؤں والے اس دن کے بعد سے امر کو بڑا ماننے لگے دس بارہ دن کے بعد امر نے چمپا کے سامنے جاکر کہا "کیا تیرے گاؤں میں کنوئیں کے معاملے میں میرا تیرا ہوتا ہے جو یہاں چلا ئے گی؟"

چمپا یہ سن کر کچھ نہیں بولی لیکن اس کا غصہ اتر گیا۔

ایک دن سہ پہر کو بابو تار لگانے والوں کا تماشا دیکھ کر واپس آتے وقت دھنری کے کھیت کی طرف چلا گیا۔ وہاں رام دئی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ آنکھ ملتے ہی رام دئی کے چہرے پر سرخی آگئی اور کہنے لگی۔

"رام رام لالا۔ کیا ہم سے بہت ناراض ہو؟"

"ہم کیا ناراض ہونے، تم ہی کٹی کٹی رہتی ہو۔"

"کیا کروں بابو۔"

بابو نے رام دئی کی نظروں سے نظریں ملائیں اور پھر اس کی کلائی پکڑ لی۔ رام دئی نے ایک نظر بابو کے چہرے پر ڈالی اور پھر اپنی کلائی پر۔ رام دئی۔ "بابو جی۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"کیا ؟ سمجھا دو ۔"

"زندگی بھر نبھانا ہوگا ۔"

بابو کے دل کا عجیب حال ہوگیا ۔ اس نے رام دئی کا ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہنے لگا ۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ایسا نہ کروں گا ۔"

"میں تو سچی بات کہوں گی ۔ تم مجھے جانتے کب ہو جو جانو کہ نبھانے میں کیا کیا جھیلنا پڑے گا ۔"

رام دئی یہ کہہ کر افسردہ ہوگئی ۔ اور پھر ذرا دیر میں رونے لگی ۔ بابو کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی خاص بات اس سے چھپا رہی ہے ۔ اس کو یاد آگیا کہ جب میں نے رام دئی کو تیل کی شیشی دی تھی تو وہ ہنستے ہنستے رونے لگی تھی ۔

بابو کہنے لگا ۔ "میری دئی سچ سچ بتا دے کہ کیا بات ہے ۔" یہ سنتے ہی رام دئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اس کے دل پر کوئی بھاری پتھر تھا ۔

بابو نے اپنے انگوچھے سے اس کے آنسو پوچھے اور اصرار سے پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے ۔

رام دئی نے ہچکیوں میں کہا ۔

"اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے ۔"

"تو کیا غم ہے ۔ میں تو ہوں ۔"

"تم ہو تو ۔ پر تم بھی چھوڑ دو گے ۔"

"کیا کہتی ہو دئی ۔ میں قسم کھا سکتا ہوں ۔"

"ٹھیرو۔ پوری بات سن لو پھر قسم کھانا۔ بات یہ کہ ......"
رونے اور ہچکیوں میں اس کی آواز ڈوب گئی۔
"ہاں ہاں کہو کہو۔ مری دئی۔ کہو۔"
دئی نے پھر کوشش کی، لیکن پھر نہ کہہ سکی۔
دل کو سنبھالو اور کہہ دو... میں تمھارے لئے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"
رام دئی نے بابو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہا۔
"آٹھ برس ہو گئے میری شادی کو اور کوئی بچہ نہیں۔"
دئی دھاڑیں مار کر رونے لگی اور کہنے لگی۔
"لوگ کہتے ہیں کہ میرے بچہ نہیں ہو سکتا ہے ......"
یعنی یہ عورت بنجر ہے۔ ایسی زمین جس میں بیج ڈالو، کھاد ڈالو
پانی دو، جو چاہے کرو مگر انکھوا نہیں پھوٹے گا۔ اب بابو نے اصل
معاملے کو سمجھا اور اس کی شدت کو محسوس کیا۔ ایک طرف اس کا پریم تھا اور
دوسری طرف بنجر زمین۔ اس سوال نے بابو کے لڑکپن کو دو منٹ میں ختم
کر دیا اور وہ پورا کسان بن گیا۔ وہ کسان کی نظروں سے بنجر زمین کو دیکھنے
لگا۔ اس کے ہاتھ سے دئی کی کلائی چھوٹ گئی۔ وہ روتی ہوئی بھاگ گئی۔
بابو اسی جگہ بیٹھ گیا اور دھرتی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کیا وہ بنجر
زمین کو اپنا لے۔ یہ جان کر بھی کہ وہاں کچھ نہ اُگے گا؟

(۷)

اس واقعہ کے آٹھ دن کے بعد کسانوں میں پھر لاٹھیاں تن گئیں۔
کھیت جو تیاری پر تھے تو ذرا ہمتوں میں بھی جوانی تھی۔ اس مرتبہ پھر

مدن اکیلا ایک طرف تھا اور گاؤں کے سارے مرد دوسری طرف۔

کھیتوں کے بیچ میں درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی ایک صاف ستھری جگہ کھلیانوں کے لئے تھی۔ وہیں سب اپنا اپنا اناج لاکر صاف کرتے تھے۔ جب وہاں امر بھی اپنا اناج لانے لگا تو دو چار کسانوں نے کہا کہ یہ جگہ پرانے کسانوں ہی کے لئے چھوٹی پڑتی ہے۔ اگر نئے لوگ آگئے تو کام کیسے بنے گا۔ اس لئے تم کو کوئی اور جگہ بنا لینا چاہیئے۔ یہ باتیں مدن نے سنیں تو کہا کہ کنواں جو ہمارا تھا وہ تو تم نے ہٹا لیا اب کھلیان کی جگہ جو سب کی ہے اس سے تم ہم کو نکال دینا چاہتے ہو۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا ہے۔

بات اس وقت بڑھ گئی جب امر کے کھیت سے آنے والے سامان سے میدان کا بہت سا حصہ بھر گیا۔ اور پھر بھی اس کی آدھی پیداوار نہیں آئی تھی۔ کسانوں کو امر کی ایسی کامیابی پر رشک و حسد تھا ہی ہوا اور وہ اور بھی سخت پڑ گئے اور کہنے لگے کہ جگہ اتنی چھوٹی ہے کہ یہاں تو امر کا اناج آسکتا ہے یا ہم سب کا۔ ہم لوگ یہاں کے پرانے آدمی ہیں اس لئے ہمارا حق مقدم ہے جب یہ تکرار ہونے لگی تھی کہ اس وقت مدن اور بابو تھے، امر نہیں تھا۔ مدن لاٹھی تان کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھیں کون ہم کو اس جگہ سے ہٹاتا ہے۔

اس چیلنج پر ایک منچلے نے مدن پر لاٹھی چھوڑ دی۔ جو اس کے کندھے پر پڑی۔ ... کا یہ کرنا تھا کہ بابو تلملا کر سامنے آگیا اور مدن کو مارنے والے کو لاٹھی ماردی، وہ تو کہو کچھ لوگوں نے بابو کو گھسیٹ لیا اس لئے لاٹھی اچٹی ہوئی پڑی ورنہ وہ لاٹھی اگر سیدھی پڑتی تو وہ ختم ہو ہی جاتا۔ یہ تناتنی تھی کہ امر بھاگتا ہوا آگیا۔ اور بیچ میں گھس کر اس نے بابو کو روکا جب وہ نہ مانا تو اس کے ایک تھپیڑ مار دیا۔ اور پھر اپنی پگڑی اتار کر دوسروں کے قدموں پر ڈال دی

اور کہا کہ ان بے وقوف لڑکوں کو معاف کر دو جو تم لوگ کہتے ہو وہی ہوگا۔ جب تمھارا اناج یہاں سے چلا جائے گا۔ تب ہمارا آئے گا۔"

یہ دیکھ کر مدن امر پر بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ تم نے کنوئیں کے معاملہ میں جو بزدلی دکھلائی تھی اس کا نتیجہ اس وقت بھگت رہے ہو اور آج جو بزدلی دکھلا رہے ہو اس کا نتیجہ کل سامنے آئے گا۔

بابو مار کھا کر ایسا شرمندہ ہوا کہ اس وقت کھلیان سے چلا گیا اور گھر آکر رونے لگا۔

لیکن امر کی صلح صفائی سے دوسرے کسان بہت متاثر ہوئے ایک نے شرمندہ ہو کر کہا۔" امر۔ میں اپنا اناج نہیں لاؤں گا۔

دوسرا۔ میرا جتنا آچکا ہے۔ آچکا ہے۔ اب اس وقت آئے گا جب امر کا اناج یہاں سے چلا جائے گا۔"

بوڑھوں اور جوانوں نے مدن اور بابو کو منایا۔ اور پھر سب نے مل کر ایک اور جگہ صاف کی۔ جسے رام دئی، چمپا اور دوسری عورتوں نے گوبر سے لیپ پوت کر دو روز میں بہت اچھا بنا دیا۔ امر کا اناج تو پرانے ہی کھلیان میں گیا اور نئی جگہ ان لوگوں کا اناج آنے لگا جو وہاں نہیں جا سکا تھا۔

دھنری ابھی تک اٹھنے کے قابل نہیں ہوئی تھی اس لئے اس کے کھیت کو رام دئی اور بابو نے مل کر کاٹا تھا اور یہی دونوں اٹھا اٹھا کر کھلیان میں لائے تھے۔ ان ہی دونوں نے دھان کو بالیوں سے الگ کر کے ایک طرف ڈھیر لگایا تھا۔ جب رام دئی کا اناج ایک طرف چوٹی دار ٹیلے کی شکل میں لگ گیا تو اس نے ان کسانوں سے جو موجود تھے کہا۔

"پنچو۔ ایک عرض ہماری سنو۔"

"کہو"

اگر بابو ہاتھ نہ بٹاتا تو یہ کھیتی نہیں ہو سکتی تھی"

"سچ ہے"

"سچ ہے"

"سچ ہے"

رام دئی "تم لوگ جو مناسب سمجھو اس میں سے اس کو حصہ دے دو۔

بابو "حصہ!! میں نے حصہ لینے کے لئے کچھ نہیں کیا ہے"

رام دئی "کون کہتا ہے کہ تم نے حصہ لینے کے لئے کیا ہے۔ تم نے وہ کیا جو تمہارا دھرم تھا اب ہم کو وہ کرنا چاہیئے جو ہمارا دھرم ہے"

بابو "میں کچھ نہیں لوں گا"

رام دئی "میں نہ مانوں گی۔ تم ہاتھ نہ لگاتے تو ایک دانہ بھی اس وقت نہ دکھلائی دیتا۔ تم جو کچھ بھی ہمارے لئے چھوڑ دو گے کر یا ہو گی"

سب کی رائے ہوئی کہ بابو کو حصہ لینا چاہیئے۔ سب نے یوں سوچا کہ بیل اور زمین دھنری کی اور آدھی محنت دھنری کی اور آدھی رام دئی کی۔ اس حساب سے بابو کو چوتھائی اناج ملنا چاہیئے۔

چوتھائی اناج الگ کر دیا گیا۔ اس کی سب سے زیادہ خوشی چتیا کو ہوئی کیونکہ اس کے گھر میں اب چاول کا ایک دانا بھی نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اب دھان جو مل گیا ہے وہ کھانے کے لئے کافی ہو گا۔

بابو نے اناج کو دھنری کے گھر میں بھرنے میں رام دئی کا ہاتھ بٹایا جب یہ دونوں اناج کی آخری ٹوکریاں لے کر آ رہے تھے۔ بابو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "رام دئی تم نے آج اپنے کو بالکل آزاد کر لیا"

"کا ہے سے؟"

"مجھ سے"

"کیا کہتے ہو۔ تم نہ ہاتھ بٹاتے تو کیا یہ اناج میں اکیلے بھر پاتی۔"

"ایک دن میں نہیں تو دو دن میں سہی۔"

"ایسا نہ کہو۔ تم سے آزاد ہو کر کہاں جا سکتی ہوں۔ دیکھو وہ کھیت دوسری فصل کے لئے پھر تم کو پکار رہا ہے۔ گھر میں دو عورتیں ہیں، ایک ماؤں اور بیمار اور دوسری میں۔ بھلا ہم دونوں کیا کر سکتے ہیں دیکھ ہم کو بے سہارا نہ چھوڑ دینا۔

بابو نے محسوس کیا کہ دئی کی آواز بھرائی ہوئی ہے۔

دئی۔

ہاں۔

"اس دن کی بات سے تم ناراض تو نہیں ہو"

میں ناراض!! میں ناراض کیوں ہوتی۔ میں ڈر رہی تھی کہ تم ناراض ہو گئے ہوگے۔ بابو، میں بہت دکھی ہوں مجھے چھوڑنا نہیں۔"

دئی رونے لگی۔ اور ٹوکری رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ بابو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بابو کے کندھے سے لگ گئی تو بابو نے اسے چمٹا لیا۔ ادھر طلب تھی تو ادھر انکار نہیں تھا۔

باب ۵

شکر بھگوان کا

(۱)

کھیت کٹنے سے پہلے سنہرے ہو گئے تھے اور جب وہ کٹ کر کھلیانوں میں آگئے تو کسانوں کے چہرے سنہرے ہو گئے۔ کیا کیا نہیں بیتا تھا ان کھیتوں پر پانی کی کمی سے بہت سے پودے مر گئے۔ پھر کیڑوں نے جانے بالیوں کے اندر کتنے دانے کھا لئے۔ اس کے بعد بندروں اور چڑیوں کا حملہ ہوا۔ جانے ان سے کتنا نقصان ہوا لیکن اب بھی جو پیدا ہوا تھا وہ اتنا تھا کہ چھ مہینے کے لئے کسانوں کا تن ڈھانک سکتا تھا اور پیٹ بھر سکتا تھا۔

بچے اناج کے ڈھیروں پر لوٹ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے اور بڑے ریتا پار ہونے والے میلے میں جانے اور ضروریات کی خریداری کا پروگرام بنا رہے تھے اس رات امر کے گھر پر یہ باتیں ہوئیں۔

چھیتا: "میں بھارام دی کی طرح کی ایک چادر خریدوں گی۔"

امر: "اور ساری! دیکھ تو کیسے چیتھڑے لگائے ہے تو۔"

"اپنی نہیں کہتے ۔ اس طرح بات کرتے ہو جیسے پانچوں پوشاک سے سجے بنے بیٹھے ہو۔"

"اپنی طرف جب دیکھتا ہوں تو مدن اور بابو یاد آتے ہیں۔"

چیتا بابو کا نام سن کر ہنس پڑی ۔

"بابو کو تو سمجھ لو کہ ہم نے لڑکی بنا کر رخصت کر دیا ہے ۔ اتنی رات ہو گئی ہے ابھی تک آیا نہیں ہے ۔ اور آئے گا تو بہت تھکا آئے گا۔"

"یہ نہیں دیکھتی ہو کہ اتنا دھان اپنے ساتھ لایا ہے۔"

"یہ بھی دیکھتی ہوں اور یہ بھی دیکھتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن وہ اسی موئی رانڈ رام دئی کو بھی گھر لے آئے گا ۔ وہ تو کہو اس گاؤں کی ہر بات ابھی کچی ہے اپنا گاؤں ہوتا تو برادری نے اس بات پر کب کا ذات باہر کر دیا ہوتا ۔

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رام دئی یہاں آئی کیوں اور جاتی کیوں نہیں ہے۔"

"مگر یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ یہاں رہ رہی ہے اور بابو سے ہر وقت چمٹی رہتی ہے اور یہ کہ ان دونوں باتوں کا نتیجہ کیا ہوگا ۔"

"اگر بابو کو ان لوگوں کا کام کرنے سے روک دوں تو سب کہیں گے کہ بیوہ کو بلا سہارے چھوڑ دیا ۔"

"کہنے والے خود کیوں نہیں کچھ کرتے ہیں ۔ میری مانو تو اب مدن اور بابو کی کسی اچھی جگہ شادی کر دو۔"

"ذرا دم لے لو ۔ اپنا کھیت ہے تو سب کچھ ہو جائے گا ۔ ان دونوں کی شادی بھی ہوگی اور راموکی بھی ۔ اور مالتی ہوتی تو اس کی بھی ہوتی اور دان دہیز سے ہوتی ۔"

دونوں نے مالتی کو یاد کر کے ٹھنڈی سانس بھری ۔

"امر نے اپنے اناج کے ڈھیر پر لاٹھی سے نشان ڈال کر دو حصے کئے ایک بڑا اور ایک چھوٹا اور دونوں کو بہت اشتیاق سے دیکھنے لگا۔"

چینا کیا دیکھ رہے ہو۔"

"دیکھو وہ بڑا ڈھیر جدھر ہے وہ بیلوں کی جوڑی ہے۔"

چینا یہ سن کر خوشی سے ہنس پڑی۔ پھر امر کہنے لگا "مگر سنو تو ابھی تو اناج کا بھاؤ بھی نہیں معلوم۔ اور ٹھیک سے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سب اناج کتنا ہوگا۔"

"چلو بھی۔ بس سمجھ لو کہ یہ دونوں باتیں مجھے معلوم ہیں۔ اس لئے بس کہتی ہوں کہ تم جو سوچ رہے ہو ٹھیک ہے۔"

"اچھا!" چینو مان لیا۔ اب سنو اس دوسرے ڈھیر کا حال۔

اس ڈھیر میں ہم سب کے کپڑے ہیں تمھارے لئے چاندی کا ہار اور برتن اور ہم سب کا چار مہینے کا کھانا۔"

چینا خوشی سے جھومنے لگی۔ پھر نیچی آواز سے کہنے لگی۔

"اور چاندی کی ایک کٹوری بھی بچے کے لئے۔"

امر نے ذرا ادھر ادھر دیکھ کر چینا کے گالوں پر ہاتھ پھیر دیا۔

اناج گاڑیوں پر لد لد کر بازار جانے لگا۔ دوسری طرف بنئے گاڑیاں لے لے کر اناج خریدنے خود بن کٹ پورہ آنے لگے۔ ان کے ساتھ تانبے اور پیتل کے برتن والے گلٹ کے زیور والے "مسی" سرمہ اور کھلونے بیچنے والے "پھیرے" اور نٹ یہ سب آنے لگے۔ اناج نقد داموں میں بھی بکنے لگا۔ اور ضروریات کے تبادلے میں بھی بانٹنے لگا اناج کے ساتھ ساتھ ترکاری ... بہت اچھی ... بچے تخمیں ... مدت نکل آیا۔ وہ یہ کہ آنے والے

ان کو بھی خرید لے جاتے۔

آخر امر کے گھر میں برتن آ ہی گئے۔ چمپا کی ساری اور امر، مدن اور بابو کے لئے دو دھوتیاں بھی آ گئیں۔ صرف چمپا کے لئے چادر رہ گئی۔ لیکن اس کے لئے یہ طے پایا تھا کہ میلے سے خریدی جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک کھٹیا کی بھی ضرورت تھی کیونکہ امر کی کھٹیا ٹوٹ گئی تھی۔

میلے کے لئے یہ طے پایا کہ ہر گھر کی دو ٹولیاں بنائی جائیں پہلے ایک جا کر دو روز میلہ گھوم کر واپس آ جائے پھر دوسری جائے۔ ایسے میلے سال میں ایک دو بار ہوتے ہیں اس لئے ہر شخص جانے کے لئے بیتاب تھا۔ یہاں تک کہ ایک کسان کی اسّی سال کی ماں بھی اس میں شرکت کرنے کے لئے مچل رہی تھی۔

گاؤں میں بیل گاڑیاں اور چھکڑے جو تھے ان پر عورتیں، بوڑھے، اور بچے ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھ گئے اور جوان مرد ان کے پیچھے پیچھے پیدل چلنے لگے۔

عورتیں ساریوں میں اور نئے گلٹ کے زیوروں میں تھیں اور مرد نئی دھوتیوں اور نئے انگوچھوں میں۔ جانے والے اپنے نئے کپڑوں میں مگن تھے اور ان کو اپنے ساتھیوں اور اپنے جلوس کی سنگت میں خاص مزا آ رہا تھا اور میلے میں نئے نئے تماشے دیکھنے کے خیال سے بہت سرور آ رہا تھا۔ اپنے ماضی اور حال سے مطمئن تھے اور مستقبل کی طرف سے فکروں سے خالی عورتیں آواز ملا کر گاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے گا رہی تھیں اور مرد ان کے پیچھے ٹولی بنائے بیڑیاں پیتے چل رہے تھے۔ اور بانکا ہنسی باتوں سے اپنی پسند کی عورتوں کو اس طرح چھیڑ رہے تھے کہ جو بات ان سے کہنا ہوتا تھا ایک دوسرے سے کہتا۔

"بھئی تم کو تو گانا پسند ہے اور مجھے تو ادھر والی گڑیا"

اور باتوں کو سن کر مسکرا کر دل میں خوش ہوتیں اور ہنسا ہنسی ان سنی کر دیتیں۔

بچے اس چہل پہل رونق اور گانے سے بہت خوش تھے۔ ہر چیز جوان کو
چھکڑے پر سے نظر آتی، مزا دے جاتی۔ درختوں کو کاٹنے والے مزدور، ان کے چلتے
ہوئے آرے، ٹھیکہ دار صاحب کی چھولداری، یہ سب چیزیں مزا دے رہی تھیں۔ سب سے
زیادہ حیرت ان لوگوں کو اس وقت ہوئی جب راستے میں ان لوگوں نے ایک سائیکل دیکھی
اس پر آدمی سوار تھا لیکن یہ ادھر گرتا تھا نہ ادھر۔ اس سواری کو چلتا ہوا دیکھ کر یہ لوگ
بہت ہی حیرت زدہ ہو گئے۔

"یہ کیا ہے؟"

"پیر گاڑی۔"

"کیسے چلتی ہے؟"

"بیٹھنے والا پیر سے چلاتا ہے۔"

"یہ گر کیوں نہیں جاتی ہے۔"

"کیا جانے۔ انگریزوں نے اس کو بنایا ہے۔ ان ہی کی کرتب بازی ہے یہ۔"

آخر میلہ آگیا۔ یہاں شور تھا، چہل پہل تھی۔ دکانیں تھیں، تماشے تھے۔
ہنسی اور قہقہے تھے۔ گانے اور ناچ تھے۔ بھیڑیں تنہائیاں اور تنہائیوں میں بھیڑ تھی۔
میلے میں ہنڈولے بھی تھے اور چکر بھی۔ ان دونوں پر کچھ لوگ بیٹھے۔
اور کچھ ڈر کر رہ گئے۔ جب لوگ بیٹھے ان کو اپنے اس کارنامے پر فخر محسوس ہوا۔ بعض
ڈرنے والے تھے بیٹھ گئے نہ کیسے بیٹھتے۔ کیا میلے کے ایک مزے سے جو آسانی سے حاصل
ہو سکتا تھا محروم رہ جاتے۔ کسانوں نے دیوالی کے لئے جوڑے۔ کھیلیں، چینی کے کھلونے
اور مرمرے خریدے۔ بچوں نے مٹی کے اور کاغذ کے کھلونے خریدے۔
ان لوگوں کو ہر طرف بارات کا ایسا سماں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ
کر بات کرتے اور کوئی بات نہ ہوتی تو بھی بات کرتے بلا مطلب کے بھی بات کرتے

اور ہنستے بھی تھے۔ بچے بلا وجہ شور مچاتے گھومتے تھے۔ لیکن جہاں کسی ایسے آدمی کو دیکھتے جو کسانوں کے کپڑوں میں نہ ہو وہ خوف زدہ ہوکر خاموش ہو جاتے۔

(۳)

چیتا نے ایک جوتا پسند کیا۔ اور خرید کر فوراً پہن لیا۔

امر نے بیلوں کی ایک گوئی پسند کی لیکن اس کے دام زیادہ تھے اس لئے وہ ٹھنڈی سانس بھر کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں اس کو زراعتی نمائش نظر آئی تو اس میں چلا گیا۔ اس نمائش میں ایک شخص ہر آگے بڑھے کی باتیں بتلا رہا تھا۔ امر کھڑا ہوکر یہ باتیں سننے لگا۔ اس شخص نے ایک ہل دکھلایا اور کہا کہ اس سے چوگنی چوڑی نالی کھدتی ہے۔ اس نے ہل چلا کر دکھلایا۔ امر نے خود بھی اس کو چلایا۔ اور دل میں کہنے لگا کہ چیز تو بڑے کام کی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے یہ سوچ کر خریدنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کے اندر جو کسانی احساس تھا اس نے امر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ کہیں اس میں کوئی چال نہ ہو۔

کسانوں کو صدیوں سے پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ بے وقوف بناتے آئے ہیں۔ اس وجہ سے کسانوں میں ایک چھٹی حس پیدا ہوگئی ہے جو ان کے دل میں جہاں ان کا کسی اپنے سے زیادہ لائق آدمی سے سابقہ پڑا ابھر کر یہ شک پیدا کر دیتی ہے کہ کہیں دھوکا تو نہیں ہے۔ لیکن امر کو اپنی زرعی سمجھ پر کچھ ایسا بھروسا تھا کہ اس نے اس شک کو الگ کر دیا۔ اور ہل کا دو تین بار اور جائزہ لیا۔ اب تو ہل کی خوبیاں دیکھ کر اس کی طبیعت لوٹ پوٹ ہوگئی۔ امر بھی کسان کی طرح پیسہ خرچ کرنے سے پہلے دس بار سوچ لیتا تھا اور جہاں تک بنے خرچ کو ٹال جاتا تھا۔ لیکن اس وقت اس سے نہیں رہا گیا۔ اس نے ہل کے پھل کو خرید

لیا۔ تو نمائش والے صاحب بہادر نے یہ بھی بتلایا کہ کیسے بیل زراعت کے لئے اچھے ہوتے ہیں۔ کہنے لگے کہ اچھے بیلوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کھاتا تو اتنا ہی ہے۔ جتنا کم ذات کے بیل مگر کام زیادہ کرتے ہیں اور جیتے بھی زیادہ ہیں۔ صاحب نے اچھے بیل بھی دکھائے تھے۔

اس دن امر کو ایک جگہ میلے میں ویسے ہی بیل بھی نظر آ گئے۔ لیکن ان کی قیمت زیادہ تھی۔ مگر اس نے طے کر لیا کہ خرید وں گا تو ان ہی کو خرید وں گا اس فصل میں نہیں تو اگلی فصل میں سہی۔

میلے میں امر کی اپنے خاندانی پروہت برج نرائن تواری سے بھی بھینٹ ہوئی۔ انھوں نے امر کو بہت دعائیں دیں اور کہا کہ میں جنم پٹری لے کر جلد ہی آؤں گا۔ پروہت جی ابھی گئے نہیں تھے کہ امر کی پرانے مہاجن انوکھے رام سے بھینٹ ہو گئی۔ مہاجن نے بہت محبت سے امر کو سلام کیا اور کہا کہ میں تم کو بہت یاد کرتا تھا تم ان چند لوگوں سے ہو جنھوں نے جب روپیہ لیا وعدہ پر ادا کر دیا۔

امر مہاجن کو اپنے کیمپ لے گیا جہاں ان لوگوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور گاؤں والے کھانا پکا رہے تھے مہاجن نے ایک نظر میں محسوس کر لیا کہ یہ ٹولی کھاتے پیتے کسانوں کی ہے۔ امر نے انوکھے رام کو مٹھائی کھلائی۔ اور دودھ میں بنی ہوئی ٹھنڈک پلائی جب مہاجن چلنے لگا تو اس سے وہی بات کہہ دی جو امر اس سے کہلانا چاہتا تھا۔

"کبھی روپیہ پیسے کی ضرورت ہو تو بھولنا مت۔ تم کو تو کہ بیاج پر بھی دے سکتا ہوں۔"

"سچ ؟"

"ہاں! ہاں۔ کہو کیا اس وقت کچھ ضرورت ہے؟"

مہاجن نے یہ جواب جس مستعدی سے دیا وہ مہاجنی کے اصول کے خلاف تھا۔ لیکن اس مستعدی میں بھی ایک کاروباری نقطہ پیش نظر تھا۔ وہ یہ کہ مہاجن جانتا تھا کہ جن کٹ پورہ کی نئی بستی میں کوئی مہاجن نہیں ہے۔ اس لئے وہاں اپنا دھندہ پھیلانے کا کافی موقع ہے اور دھندہ پھیلانے کی سب سے اچھی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ پہلے کسی مضبوط اسامی کو معمولی شرطوں پر رقم دے دی جائے۔ اس کو دیکھ کر اور لوگ بھی میری طرف جھکیں گے۔ اور کام چل نکلے گا۔ پھر رفتہ رفتہ شرطوں کو سخت کر دیا جائے گا۔ مہاجن کی مستعدی دیکھ کر امر نے بلا کسی جھجک کے کہہ دیا۔

"ہاں۔ بیل خریدنا ہیں۔ کچھ روپیہ کم پڑ گئے ہیں"۔

"ایسی بات ہے تو چلو ذرا میں بھی بیل دیکھ لوں۔ اچھے ہوئے تو کمی پوری کر دی جائے گی۔"

بیلوں کی جوڑی ایک درخت سے بندھی ہوئی بھوسا کھا رہی تھی۔ ان کا قد اور چمکتی ہوئی کھال دیکھ کر مہاجن سے رہا نہیں گیا۔ پیار سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور پھر بیچنے والے سے ان کے سن اور خوراک کے بارے میں کچھ باتیں پوچھیں پھر یہ دیکھ کر کہ امر کے پاس واقعی تین چوتھائی دام موجود ہیں۔ مہاجن نے انگوٹھا لگوا کر باقی رقم مناسب بیاج پر امر سنگھ کو دے دی

جب امر واپس ہوا تو اس کی گاڑی میں نئے ہل کا پھل رکھا ہوا تھا جو دھوپ میں شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور گاڑی کے ساتھ ساتھ ایسے بھاری بھرکم دو دو بیل چل رہے تھے جو دوسرے بیلوں کے مقابلہ میں ہاتھی معلوم ہوتے تھے۔ اب تو امر کی نظروں میں مستقبل ناچ رہا تھا اور زندگی تابناک بن رہی تھی۔

اپنے گاؤں کے کسانوں میں سب سے بڑی خریداری اسی نے کی تھی ۔ اس کے بعد جس نے بڑی خریداری کی تھی وہ تھا ایک بوڑھا کسان جس نے ایک گائے خریدی تھی ۔

ابھی امر گھر پہونچا ہی تھا کہ جیتا کو درد اٹھنے لگے ۔ اور دو گھنٹوں کے اندر ایک تندرست لڑکی پیدا ہو گئی ۔ فوراً ہی ڈھولک بجنے لگی اور سہیلے گائے جانے لگے ۔

رات گئے جب امر نے اپنی نئی لڑکی درگا کو پیار کیا تو کسی اندرونی تقاضے کے ماتحت چپ چاپ بیلوں کے پاس چلا آیا اور ان کے گلوں میں باہیں ڈال کر ان کو بھی باری باری پیار کر لیا ۔

نئے بیل ، نیا ہل اور پیارے پیارے سے بچے کی آمد امر کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھگوان کا کس طرح شکریہ ادا کرے ۔

"میرے مالک تو نے مجھے کیسا اٹھایا ہے صرف ایک فصل سے " ۔

بن کٹ پورہ میں اس سال دیوالی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی کیونکہ ہر گھر میں اناج بھی تھا اور پیسہ بھی ۔

باب ۶
ابھاگن

(۱)

بات تھی تو انہونی مگر ہو گئی۔ وہ یہ کہ ایک دن اچانک رام لال نے چوپال میں آکر، اس وقت جب کہ بہت سے کسان اکٹھا تھے، کہہ دیا کہ "بھائیو آج سے دھنری میری مہرارو رہے"۔

اس خبر کو سن کر سب ہی کو حیرت ہوئی۔ کیوں کہ کسی نے آج تک ان دونوں کو باتیں کرتے بھی نہ دیکھا تھا اور اب بھی دونوں الگ الگ تھے۔ دھنری اپنے گھر میں تھی اور رام لال سیدھا اپنے گھر سے آرہا تھا۔

ایک کسان نے مسکرا کر پوچھا۔

"مہتو رام لال تم نے اپنے فیصلے کی خبر دھنری کو بھی دے دی ہے؟"

دو چار کسان اس فقرے کو سمجھے اور ہنس پڑے ان میں سے چار نے رام لال کی طرف چلم بڑھا کر کہا "خبر ہو اس کو یا نہ ہو۔ مگر اسے تو راضی ہی سمجھو۔"

رام لال نے نہ تو کسانوں کی باتوں کی طرف دھیان دیا اور نہ چلم کی طرف۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے آواز کانپ رہی تھی لیکن اس نے اسی سلسلہ میں دوسری بات یہ بھی کہہ دی۔

"ہم دونوں نے یہ طے کیا ہے کہ رام دئی کو اس کی سسرال بھیج دیں گے کیونکہ لڑکی تو پرایا دھن ہوتی ہے جہاں اس کو بیاہ دیا گیا پھر میکے سے اس کو کیا مطلب۔ سسرال اچھا ہو یا برا لڑکی کو وہیں رہنا چاہیئے۔"

رام دئی اور بابو کے بارے میں عرصہ سے کسانوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن امرا اور مدن کے دباؤ کی وجہ سے یہ بات لوگوں کی زبانوں پر نہیں آئی تھی۔ دوسری بات یہ کہ ابھی تک یہ نئی بستی پنڈتوں اور حکمرانوں کے دباؤ سے آزاد تھی۔ اس لئے کسان ہر معاملہ کو اپنی عملی نظر سے دیکھتے تھے۔ رام دئی اور بابو کے معاملہ میں ان کو اگر کوئی چیز کھٹکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ جب رام دئی شوہر والی ہے تو اس کا غیر مرد سے میل جول کیا معنی۔

چوپال میں اس وقت امرا مدن اور بابو تینوں موجود تھے اس وجہ سے رام دئی کا معاملہ آگے نہیں بڑھا۔

مگر اس دن سے دھنی کا گھر مہا بھارت کا میدان بن گیا ہر وقت وہاں سے شور اور گالی گلوج سننے میں آتا رہتا۔

"تو چلی جا۔"

"میں نہیں جاؤں گی' نہیں جاؤں گی۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔"

"تیری شادی ہو گئی۔ اب تیرا کیا حق ہے"

"تجھ بیوہ کا حق ہے اور مجھ بیٹی کا نہیں۔"

لیکن یہ تو ہوئیں سیدھی سادھی دلیلیں۔ بہ نکلتی تھیں سینکڑوں گونو

اور گالیوں میں الجھ کر اور صبح تڑکے سے ان کا سلسلہ جو چلتا تھا تو رات کو
بارہ ایک بجے تک چلتا رہتا تھا۔

رام لال جب دھنریا کے گھر میں آتا تو اس کو آس پاس بابو ضرور
نظر آتا جو لاٹھی لئے ٹہلتا ہوتا۔

جب دونوں عورتوں کی کچ کچ بڑھ گئی تو چند کسانوں نے رام لال
اور بابو کو بلا کر کہا کہ پانچ کسانوں کو پنچ بنا کر معاملہ ان کے سپرد کر دو اور جو
وہ فیصلہ کر دیں وہ چپ چاپ مان لو۔ اتفاق سے دونوں کو اپنا اپنا معاملہ بہت
مضبوط نظر آتا تھا اس لئے دونوں تیار ہو گئے۔

پنچوں نے سب سے پہلے رام دئی کو بلا کر پوچھا تو اپنے گھر کیوں
نہیں جاتی ہے۔ رام دئی نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

"میں ابھاگن بانجھ ہوں اس لئے میرے پتی نے مجھے چھوڑ دیا اس
کے چھوڑنے کے دو مہینے کے بعد سسر نے گھر سے نکال دیا۔ اب میرے لئے
دو راستے تھے۔ ایک میکے آنا، دوسرے کسی کے گھر بیٹھ جانا۔ اب بتاؤ
پنچوں میں نے جو کیا وہ اچھا کیا یا برا کیا۔

اب تک سب کی رائے رام دئی کے خلاف تھی، لیکن اب اک دم
سے وہ ان کی نظروں میں قابل رحم بن گئی۔

پنچوں نے بہت دیر بحث کرنے کے بعد جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ اگر
بابو رام دئی کو اپنے گھر رکھ لے تو دھنریا کا کھیت اور گھر رام دئی کو مل جائے
گا، اور بیل کی گوئی رام لال کو۔ کیوں کہ رام لال کے پاس خود اتنی بڑی زمین ہے
کہ اس سے زیادہ پر وہ کاشت ہی نہیں کر سکتا۔ زمین اسی کو ملنا چاہیئے جو
خود کاشت کر سکے بابو اگر رام دئی کو گھر رکھنے سے انکار کرتا ہے تو پھر رام دئی

دھنری اور رام لال کے ساتھ زندگی بھر رہے گی۔ اور کھیت اور گھر اور گوئی یہ سب دھنری کو ملیں گے۔

جب پنچوں نے یہ فیصلہ سنایا تو بابو موجود تھا اس کا خیال یہ تھا کہ لوگوں کو اس کے اور رام دئی کے تعلق کے بارے میں کسی قسم کا علم نہیں ہے لیکن یہ دو ٹوک فیصلہ سن کر وہ شرمندہ بھی ہوا اور پریشان بھی۔ شرمندگی اس بات پر کہ جس چیز کو وہ راز سمجھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ سب کو معلوم ہے' اور پریشانی اس بات پر کہ میں اب کروں تو کیا کروں۔ رام دئی کو گھر کی رانی بنالوں یا، دودھ کی مکھی کی طرح پھینک دوں۔ جب اس نے رام دئی سے نبھانے کا وعدہ کیا تب اس کے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں تھی کہ کبھی اس سے بیاہ بھی کرنا ہوگا۔

جب فیصلہ سن کر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے تو آخر میں بابو اٹھا اور سر جھکائے ہوئے اپنے گھر چلا آیا اور آ کر ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ جیتیا مسکرا مسکرا کر اس کو دیکھتی رہی۔ پھر طنز بھرے لہجے میں' اپنا ہاتھ چمکا کر اور لاکھ کی چوڑیاں بجا کر کہنے لگی۔

"کہو لالاجی۔ بنجر زمین کا پٹہ اپنے نام زندگی بھر کے لئے کراؤ گے یا نہیں ــــ؟"

یہ بات امر نے بھی سنی۔ لیکن وہ جس طرح چلم پی رہا تھا اسی طرح پیتا رہا اور اس بات کو سنا ان سنا کر دیا۔

لیکن مدن نے بابو کی ہمدردی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بھوجی۔ دھنری کا کھیت تو بنجر نہیں۔ ایسا اچھا ہے کہ کیا کہوں!"

"تو تم نہ کر لو رام دئی سے۔"

"بھوجی، بابو نے اس عورت کی بانہہ پکڑی ہے۔"

"چپ بھی رہو۔ بابو نے اس عورت کی بانہہ پکڑی ہے۔ یا اس عورت نے بابو کی بانہہ پکڑی ہے۔ یہ بابو تو بالکل ہی بدھو ہے۔ پہلے رام دئی کی ماں نے اس کی بانہہ پکڑی تھی، تو اس سے چپکا چپکا پھرتا رہا۔ پھر آ گئی رام دئی اس نے اپنی ماں کو الگ دھکیل دیا اور خود بابو کی بانہہ پکڑ لی۔ بتاؤ یہی ہوا کہ نہیں۔ تم خود ہی کہتے تھے کہ دھنی بابو کو بگاڑ رہی ہے۔"

بابو کو چنیا کی باتیں بہت ناگوار گزر رہی تھیں، اس لئے وہ اٹھ کر گھر کے باہر جانے لگا۔ ایک مرتبہ وہ رام دئی کو اسی بنا پر کہ وہ بنجر ہے چھوڑ چکا تھا۔ لیکن پھر کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنے فیصلے کو بدل کر اسے قبول کر لیا۔ لیکن وہ قبول کرنا اور تھا اور یہ ساری برادری کے سامنے قبول کرنا اور۔ بابو کے لئے رام دئی میں اب کوئی نیا پن نہیں رہ گیا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ کل کی لاج رکھنی چاہیئے۔ کیا کروں ؟ بنجر زمین کو زندگی بھر کے لئے اپنا لوں ؟ بنجر زمین۔ بنجر زمین۔ ایسی زمین جس میں کبھی نہ اگے۔ کچھ بھی نہیں بابو کا کسان کا دل اتنی بڑی ہاں کہنے۔ اس لئے کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ مدن کی بات سن کر بھی اس میں ہاں کہنے کی طاقت نہیں پیدا ہوئی کیونکہ مدن صرف کھیت ہی کی زمین کو دیکھ رہا تھا اور اس میں بھی اس بات کو کہ وہ اپجاؤ ہے۔ لیکن بنجر عورت ....

بابو گھر کے باہر جا ہی رہا تھا کہ اچانک تیر کی طرح بھاگتی ہوئی رام دئی آئی، اور بابو کو ایک طرف ہٹا کر اندر چلی گئی۔ اور جا کر چنیا کے قدموں پر گر پڑی۔

"تم میری ماں ہو، مجھے اپنا بنا لو۔ اور اپنے گھر سے نکالو نہیں۔ میں

زندگی بھر تمھاری لونڈی بن کر رہوں گی۔ اگر بابو جی انھوں نے مجھے چھوڑ دیا تو پھر میرا کہیں کوئی ٹھکانا نہیں۔ پھر میں کنوئیں میں ڈوب مروں گی۔ ماں۔ اتنا میں قسم کھا کر کہے دیتی ہوں کہ جب تم چاہنا اپنے دیور کا بیاہ کر دینا۔ میں کچھ نہ کہوں گی۔ بلکہ جو بہو آئے گی اس کو بڑا مان کر اس کی سیوا کروں گی۔ اس سمے اگر مجھے گھر سے نکال دو گی تو بھی کچھ نہ کہوں گی۔"

رام دئی کا رنگ کالا تھا۔ مگر آنکھیں کافی بڑی بڑی تھیں اور ان میں بہت سفید دائرے بے حد کالی پتلیاں تھیں۔ اس وقت وہ آنکھیں آنسوؤں میں کچھ اس طرح ڈوبی ہوئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سارا چہرہ مظلوم آنکھوں ہی سے بنا ہے اور اس کے چہرے پر آنکھوں کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ روتی ہوئی مظلوم آنکھیں جب چمپا کے سامنے آ گئیں تو چمپا کی آنکھوں سے بھی بڑے بڑے آنسو گرنے لگے اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رام دئی کا سر اپنے قدموں سے اٹھا کر اس کو سینے سے چمٹا دیا مگر منھ سے کچھ نہیں بولی۔

رام دئی سسکتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔" میں جو کہتی ہوں وہی کروں گی، اگر تم بہو لائیں اور اس پر میں ذرا بھی کڑھی، تو بھگوان مجھے کوڑھی بنا دے۔ میں گھر کا اتنا کام کروں گی جتنا دو عورتیں بھی نہ کر سکیں۔"

پھر بھی چمپا خاموش رہی۔

"ماں تم نے کچھ کہا نہیں۔"

میں کیا کہوں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ تو جو کچھ ہے، اس میں تیرا کوئی دوش نہیں۔ یہ بھگوان کی لیلا ہے اب بابو جانے اور تو جانے۔"

رام دئی جا کر بابو کے قدموں پر گر پڑی۔"

"نیرست بابو کیوں آئی ہے۔ پھوپھی ہی کے پاس جا۔ جو وہ چاہے

گی وہی ہوگا ۔"

جب بابو نے یہ کہا ہے تو اس کی آنسو بھری آنکھوں کے نیچے ہونٹوں
سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی تھی۔ کیوں کر جیتا کے جواب نے، جو دراصل اس کی
ہاں تھی۔ بابو کو تذبذب کی دلدل سے نکال لیا تھا۔

اس دن سے رام دئی جیتا کے گھر کی بہو بن گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ رام دئی نے جب بابو کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے اس
وقت سے اس کے بازوؤں کے بیچ میں آنے کے لئے بے چین تھی۔ اور اسی لئے
اس نے جان بوجھ کر بابو کو اپنی ماں سے چھین لیا۔ اس کے نزدیک جوان بیٹی کے
ہوتے ہوئے ماں کو ایسی باتوں کا کوئی حق نہیں تھا۔ پھر جس دن بابو نے اشاروں
اشاروں میں اس سے اظہار محبت کیا ہے۔ اس دن اس کے لبوں پر ہاں
آ چکی تھی۔ مگر جانے کہاں سے اچانک اس کو اپنی بدنصیبی پر اور بر خلاف
توقع خوش نصیبی پر رونا آ گیا۔ اس رونے نے اس میں اور بابو میں بہت دوری
پیدا کرا دی۔ رام دئی اس دوری پر بہت افسردہ رہنے لگی اور اپنے اس
رونے کو، جب بھی وہ یاد آتا کوستی رہتی۔ دل میں کہتی کہ دئی مجھے یوں تپانے
کے لئے کوئی نہ کوئی سہارا تو چاہیئے ہی تھا۔ پھر ملتے ہوئے سہارے کو کیوں
ٹھکرا دیا میں کیسی ابھاگن ہوں میں کم بخت !!

پھر جب بابو نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا تو اس میں نا کرنے کی سکت ہی
نہیں تھی۔

بابو کے مل جانے کو وہ بہت غنیمت سمجھتی تھی اور اس کی آغوش میں سر کر وہ
اپنے سارے غم بھول جاتی تھی۔ اب اس کے دل میں جو بڑی سے بڑی تمنا تھی، وہ
یہ تھی کہ یہ چپکے چپکے ملنا ختم نہ ہو اور اسی طرح چلتا رہے۔

لیکن اب جو اچانک رام دئی بابو کے ایسے سندر جوان کی پتنی اور ایک بڑے اور با عزت کسان کے گھر کی بہو بن گئی۔ تو اس کی حالت یہ ہوگئی کہ خوشی کے مارے وہ پھولی نہیں سماتی تھی وہ دل سے کہتی کہ اے منواسن! جو کچھ بن مانگے مل گیا ہے وہ تو اتنی بڑی دولت ہے کہ جس کا تو نیں خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسا خوبصورت شوہر اور ایسا بڑا گھر۔ رام دئی تو نے اپنے پچھلے شوہر اور سسرال کو تو کھو دیا یہ ٹھیک ہے پر اب جو کچھ پایا ہے وہ تو پہلے کے مقابل میں سوا ہے۔

ہے بھگوان کیا لیلا ہے تیری۔ تو نے کس طرح بات کی بات میں مجھ بنجر زمین کو ہرے بھرے کھیت کی عزت دے دی۔

(۳)

رام دئی کو جتنی خوشی تھی۔ رام لال کو اتنی ہی کوفت۔ اس کو پنچوں کے فیصلے پر بہت غصہ آیا۔ لیکن اس وقت اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ دو چار دن کے بعد وہ ان لوگوں سے جو امر کے خلاف تھے کھسر پھسر کرنے لگا۔ پھر ایک دن ان ہی لوگوں کے مشورہ سے وہ ریتیا پار پٹواری جی کے یہاں پہونچ گیا۔

یہاں کے پٹواری لالہ بیج ناتھ تھے۔ ان کو ٹھیکے دار صاحب سے جن کے پاس جنگل کٹوانے اور بسوانے کے ٹھیکے کے ساتھ ساتھ ریاست کی طرف سے بہت سے نظم و نسق کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ ہر فصل پر کافی رقم مل جایا کرتی تھی۔ اس وجہ سے وہ بن کٹ پورہ کے معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ لیکن اب پٹواری جی دیکھ رہے تھے کہ بن کٹ پورہ کی آبادی خوب

بڑھ چکی ہے اور اس کے کھیت بڑھتے بڑھتے ریتا کے قریب تک آ گئے ہیں۔
یہ بھرا پرا گاؤں اور یہ کسان ، یہ سب تو بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔
اس لئے یہ سب کچھ دیکھ کر پٹواری جی سوچنے لگتے تھے کہ اب تو کوئی کوشش ایسی کرنی چاہیئے کہ اس سے گاؤں میں بھی عمل دخل ہو اور یہ بھی آمدنی کا ذریعہ بنے۔

جب پٹواری جی نے رام لال کی شکایت سنی کہ پنچوں نے اس کا کھیت پٹواری کو خبر دے اور کاغذات میں اندراج کرائے بغیر دوسروں کو دے دیا ہے تو انھوں نے خوش ہو کر رام لال کو گڑ کی چائے پلائی اور پان اور سپاری بھی کھلائی اور باتوں باتوں میں گاؤں کا اور امر کا سب حال پوچھ لیا۔ پھر رام لال کو رخصت کر دیا اور کہا کہ میں جلد ہی آؤں گا اور تم کو کھیت دلا دوں گا۔

رام لال انتظار کرتا رہا لیکن لالا پیچ ناتھ نہیں آئے کچھ دنوں کے بعد بابو نے کھیت جوتا۔ بیج ڈالے لیکن پٹواری جی پھر بھی نہیں آئے۔ بابو کے کھیت میں انکھوے پھوٹ آئے اور پودے ہاتھ ہاتھ بھر اونچے ہو گئے پھر بھی پٹواری جی نہیں آئے۔ آخر تنگ آ کر رام لال موقع نکال کر ایک دن پھر پٹواری جی کے پاس گیا۔ پٹواری جی نے پھر اس کی خاطر تواضع کی اور گاؤں کی بہت سی باتیں پوچھ ڈالیں۔ پھر کہنے لگے کہ " سردی بہت پڑ رہی ہے۔ ذرا دھوپ تیز ہو جائے تو آؤں گا "

کھیت لہلہانے لگے اور ساتھ ساتھ کسانوں کی امیدیں بھی لہلہانے لگیں ایسا اتفاق کسانوں کی زندگی میں بہت کم ہوتا تھا۔ کہ دو فصلیں لگاتار اچھی ہو جائیں۔ اس مرتبہ پہلی فصل تو اچھی ہو ہی چکی تھی اور اب یہ دوسری

بھی اچھی ہونے جا رہی تھی۔ اس فصل پر بھی پہلے کی طرح ہر طرح کی مصیبتیں آچکی تھیں۔ اگر کبھی پانی وقت پر نہیں پڑا۔ تو کبھی بے وقت بھی پڑ گیا۔ پالا بھی پڑا۔ کیڑوں نے بھی حملے کئے۔ چڑیوں نے بھی پھول کھائے لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ دوسری فصل بھی اچھی تھی۔

اور رام کی تو یہ دوسری فصل پہلے سے بھی زیادہ اچھی رہی تھی۔ ایک تو اس کا کھیت چوڑے پھل والے ہل کی وجہ سے اچھا جُت گیا تھا اور دوسرے دو گوئیاں ہونے کی وجہ سے جب بھی کھیتوں کو ضرورت ہوئی تو وقت پر پانی بھی مل گیا۔

رام لال اور دھنی کی رام دئی اور بابو سے بول چال بند تھی اور رام لال خاموشی سے پٹواری جی کا انتظار کر رہا تھا۔

جب کھیت میں فصل کٹ کر کھلیان میں آ گئی اور اناج صاف ہو کر کٹھیوں میں بھرا جانے لگا اس وقت پٹواری جی مع اپنے سپاہی کے آپہونچے۔

پٹواری جی نے ایک دو گوئی والے کسان کے دروازے لگے ہوئے پیپل کے درخت کے نیچے آکر اپنی گھوڑی روکی اور اس کسان سے کہنے لگے کہ بھیا میں تو تھک گیا۔

کسان دوڑ کر گھر سے کھٹیا نکال لایا اس پر دری بچھا کر تکیہ رکھ دیا۔ سپاہی کے لئے ایک چٹائی آگئی۔ گھوڑیا کے لئے ذرا دیر میں کسان کا لڑکا گھاس چھیل لایا۔

پٹواری جی نے کھٹیا پر لیٹتے ہی ایک نوجوان لڑکے سے کہا "ارے کیا دیکھ رہا ہے۔ ذرا میرے گوڑ تو داب دیئے" پھر کسان سے کہا "دیکھ گڑ کا شربت نہ بنانا۔ دودھ میں شکر ڈال لا۔ بس وہی پیوں گا۔" سپاہی جی

نے اس پر یہ ٹکڑا لگایا۔

"میں بھی پیوں گا۔ اور کچھ کھاؤں گا بھی"

سب کسان جانتے تھے کہ پٹواری جی کیا ہوتے ہیں اس لئے ان کی آمد کی خبر سنتے ہی سنسنی دوڑ گئی تھی لوگ دوڑ دوڑ کر ان کو سلام کرنے آنے لگے اور جو بھی آتا اپنے ساتھ اناج کی ایک پوٹلی نذر کے لئے بھی لیتا آتا۔ پٹواری جی پلنگ پر پاؤں پھیلائے لیٹے لیٹے نذرانوں کی پوٹلیاں قبول کرتے رہے۔ دم بھر میں ان کے لئے گرم گرم دودھ بھی آگیا، اور کھانے کے لئے کچھ مٹھائیاں بھی۔ اس آمد پر پٹواری جی اٹھ کر بیٹھ گئے اور دودھ کو مزے لے لے کر شور کے ساتھ پینے لگے۔ بیچ بیچ میں مٹھائی کی ڈلیاں منھ میں ڈال کر لوگوں سے فصل کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔

"اب کی بھی فصل اچھی ہوئی۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے تم لوگوں کی خوشی سے ہم خوش نہ ہوں گے تو کون ہوگا ہم ٹھہرے تمھارے مائی باپ۔ اچھا تو یہ ہے بابو۔ بہت خوب۔ اس کو رام لال اور دھنی کا کھیت ملا ہے۔ واہ بھی خوب رہا۔ ایک بھائی نے پنچوں سے کہہ سن کر دوسرے کا کھیت اپنے بھائی کو دلوا دیا۔ نہ پٹواری کے کاغذوں سے مطلب اور نہ ضلع داری کے کھاتے سے یا داخل خارج سے کچھ غرض۔ اپنی بادشاہت سمجھ لی ہے تم لوگوں نے۔"

پٹواری کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی اور لہجہ تیز۔

"اسے کہتے ہیں قانون اپنے ہاتھوں میں لے لینا۔ کچھ معلوم ہے کہ اس جرم پر عدالت سے کم سے کم سات سال کی سزا ہوتی ہے۔ باپ رے ہماری زندگی بھر یہ ہمت نہیں پڑی کہ کسی کی جائداد اپنے بھائی یا بھتیجے کو دلا دیں

مگر دارے امر تو کر گزرا ایسا۔

"تم سمجھتے ہو گے کہ ٹھیکے دار صاحب بچا لیں گے۔ مگر کچھ معلوم ہے کہ یہاں کے حاکم وہ نہیں ہیں۔ یہاں کی حاکم انگریزی سرکار ہے اور اس نے ہم کو یہاں کا انتظام سونپا ہے۔ اور ہم ؟ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ کہ کسی کا حق مارا جائے۔ بے انصافی تو ہم کو کسی حال میں بھی گوارا نہیں۔ سمجھے تم لوگ۔ اب کان کھول کر سن لو کہ انصاف ہو کے رہے گا۔ رام لال اور دھنزی کو ان کا مال بھی ملے گا اور برائی کرنے والوں کو ڈنڈ بھی بھگتنا پڑے گا۔"

سننے والوں کی جان سوکھ گئی۔ پانچوں پنچوں نے اپنی اپنی پگڑی ٹھواری جی کے قدموں پر سب کے سامنے ڈال دی۔ کہا حجور بڑی بھول ہوئی۔ ہم نے جو فیصلہ کیا وہ اپنے نزدیک انصاف سے کیا۔ کہا کہ "کھیت اس کو ملنا چاہیئے جو بو سکے۔" اگر آپ سمجھتے ہیں کہ فیصلہ غلط تھا تو بدل دیجئے۔ مگر سرکار قصور معاف کر دیجئے۔"

"ہاں ہاں قصور کرو اور معاف کروا لو۔ کیسا آسان طریقہ ہے یہ! تم سمجھتے ہو گے کہ یہ طریقہ چل جائے گا۔ مگر یہ فیصلہ کرنا تو میرے ہاتھ میں ہے اور میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہونے کا۔ سمجھے! جو کرو گے سو بھرو گے بھی۔ کیا یہ سنا نہیں ہے؟"

بابو یہ سب باتیں سن کر شرم اور خوف سے سفید پڑ گیا تھا مگر اس نے ہمت کر کے کہا۔

"حجور۔ جو ڈنڈ ہو وہ مجھ پر لگایا جائے اوروں کا کیا قصور۔"

"تم بولے؟ تم؟ تم تو ضرور سات سال کے لئے جیل جاؤ گے تم نے

تو پرائی عورت بھی بھگائی ہے۔"

بابو نے دبی زبان سے کہا۔

"اس بات کے لئے ضلع دار صاحب سے اجازت لے لی تھی۔"

پٹواری جی زور سے ہنسے ' ضلع دار صاحب۔ وہ تو بڑا ہی شوقین مزاج تھا۔ اس نے تو امک تک کی رنڈی پر نظر ڈالی تھی اور اب اس جرم پر معطل بھی کر دیا گیا ہے۔ کچھ خبر ہے اس کی؟ اب وہ جلد ہی برخواست بھی ہو جائے گا۔ بڑے چلے ہو ضلع دار کی بات کرنے۔ اب تو حاکم بلکہ سب سے بڑا حاکم میں ہوں۔ اوپر بھگوان ہے' اسے کون بھول سکتا ہے مگر نیچے تو میں ہی میں ہوں۔ میں۔"

سب سمجھ گئے کہ برے پھنس گئے ہیں اور بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ پٹواری جی کو خوش کیا جائے۔ کسانوں نے پٹواری جی کے سپاہی کو الگ بلایا اور اس کی خوشامد درآمد کرنے لگے اور کچھ روپے رشوت کی بانگی کے طور پر اس کے ہاتھ میں بھی رکھ دیے۔ سپاہی نے کہا کہ "پٹواری جی بہت ناراض ہیں کہتے ہیں کہ دو فصلیں جو اچھی ہو گئیں تو کسانوں کے دماغ چڑھ گئے اور انھوں نے قانون اپنے ہاتھوں لے لیا۔ اور پرائی عورتوں کو بھگانے کو جائز کر دیا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر وہ ہمیشہ سے بہت آگ ہو جاتے ہیں۔ اب ایسا کرو کہ ان کا غصہ نہ بڑھاؤ۔ جو حکم دیں مان لو۔"

اتنے میں گھونگھٹ لٹکائے ہوئے رام دئی آئی اور آتے ہی پٹواری جی کے جوتوں پر یا تھا ٹیک کر رونے لگی۔

"قصور وار میں ہوں تو میں ہوں اور دوشی ہوں تو میں ہوں۔ مجھے جوتوں سے مارو' چاہے بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو۔ مگر ان بچارے بے قصوروں کو چھوڑ دو۔ اگر میں بھیا جی کے گھر جا کر بھوجی کے پاؤں نہ پکڑ لیتی تو نہ وہ مجھے رکھتے اور نہ

کھیت میری ماں کے ہاتھ سے نکلتے ۔"

پٹواری نے لپک کر بابو کو دو جوتے مارے اور کہا کہ لے جاؤ اپنی عورت کو۔ اس کی ہمت کہ آکر حاکم سے بحث کرے۔ پھر پٹواری جی پلٹ کر سب کو سخت وست کہنے لگے اور کہا کہ تم سب کو بندھوا دوں گا اور حوالات میں سڑا ڈالوں گا۔"

سپاہی ان کا غصہ دیکھ کر گھبرا گیا اور اس نے بابو سے کہا تمھاری عورت نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اب پٹواری جی جو نہ کریں سو تھوڑا ہے۔

یہ سن کر بابو کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا اس نے جوتا اتارا اور لپک کر رام دئی کا ایک ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے مارنے لگا اور مارتا چلا گیا۔ پٹواری جی یہ تماشا ٹھنڈی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ ان کے سامنے کسی کسان کی ہمت نہ پڑی جو بیچ بچاؤ کرتا۔ رام دئی پٹتی رہی اور صرف یہ کہتی رہی۔

مار ڈالو۔ مار ڈالو۔ مار ڈالو۔"

آخر امر سے نہ رہا گیا اس نے اٹھ کر بابو کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابھا کر مورکھ کیا پھانسی پر چڑھے گا۔"

بابو نے آج پہلا مرتبہ رام دئی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اپنی مار ختم کرتے ہی اس کو پچھتاوا ہونے لگا اور وہ سر جھکا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ رام دئی بھی وہاں سے غائب ہو گئی۔

مار پیٹ کا ڈراما دیکھنے کے بعد پٹواری جی نے زرا سی سپاری کا منھ میں ڈالی اور پھر گرج کر اپنا فیصلہ یہ سنایا۔

" پنچوں کا آدھا آدھا اناج اور بابو کا کل اناج ضبط کیا جاتا

ہے۔ کل اناج بیچ کر اس کی قیمت ممبر کے پاس بھیج دی جائے۔ دھنری کے نام جو کھیت کھاتے میں درج ہے وہ رام لال اور دھنری کو دے دیئے جائیں گے۔

یہ فیصلہ سن کر صرف وہی لوگ نہیں جن پر جرمانہ کیا گیا تھا بلکہ جتنے بھی کسان تھے سب کانپ گئے اور ہاتھ جوڑنے اور پاؤں پکڑنے لگے یہاں تک کہ رام لال بھی خوشامد کرنے لگا کہ اس سزا کو کم کر دیا جائے۔ اتنا اناج دینے کے بعد یہ لوگ بیٹھیں گے کیسے۔ لیکن پٹواری جی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

دیہات میں آنے والی ہولی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تین جگہ گانا شروع ہو چکا تھا جو شام سے چھڑتا اور رات گئے تک چلتا۔ اس دن شام بھی ہوئی اور رات بھی اور پھر رات چڑھ گئی۔ لیکن تینوں جگہوں میں سے ایک جگہ بھی نہ ڈمرو بجا، نہ ڈھولک بجی اور نہ گانا ہوا۔ سب کے دلوں میں مستقبل کا خوف تھا کہ اب پٹواری جی کا عمل دخل شروع ہوا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ کیا کیا ہوتا ہے۔

(۲۴)

پٹواری جی نے طے کیا کہ وہ رات کو وہیں رہیں گے۔ ان کے بھوجن اور آرام کا انتظام ہونے لگا اور لوگ سپاہی جی کی خوشامد اور زور سے کرنے لگے کہ سزا ادھ کم کرا دو۔

رات گئے امر کو معلوم ہوا کہ رام دئی گاؤں کے کسی بھی گھر میں نہیں ہے اس کو ہر طرف ڈھونڈا گیا لیکن کہیں بھی نہ ملی۔ جب آدھی رات گزر گئی اور رام دئی نہیں ملی تو بالو رونے لگا اس نے کہا۔

وہ جہاں بھی گئی اب گئی؟

صبح جب لوگ کنوئیں پر پانی بھرنے گئے تو ان کو اندر ایک کپڑا نظر آیا
پہلے انھوں نے کپڑے کو ڈول میں الجھانے کی کوشش کی جب یوں کام نہ بنا تو
کانٹا ڈالا گیا۔ کانٹے میں کپڑا جو پھنس کر ابھرا تو وہ بے حد بھاری نکلا اور سطح
پر جب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف کپڑا ہی کپڑا نہیں ہے بلکہ کپڑے کے ساتھ
ایک لاش بھی ہے۔

جب لاش اوپر آئی تو لوگوں نے پہچانا کہ یہ تو رام دئی ہے۔

صبح کی دودھ جیسی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں رام دئی کی بڑی بڑی مظلوم آنکھیں
بند تھیں اور اس کے چہرے پر وہ سادگی اور معصومیت چھائی ہوئی تھی، جو بچوں
کے چہروں پر اس وقت ہوتی ہے جب وہ دل بھر کر ماں کی چھاتی سے دودھ
پی کر سو جاتے ہیں۔ اس وقت رام دئی کا گٹھیلا جسم بھی بے حد سڈول معلوم ہو رہا تھا
جیسے میلے میں بکنے والی مٹی کی گوالن۔

رام دئی کی بھیگی ساری سے عجیب سی مہک آ رہی تھی۔ وہ مہک کہہ
رہی تھی کہ میں زندہ جسم نہیں ہوں۔ مجھے دنیا چھوڑے ہوئے کافی وقت گزر چکا
ہے۔ لاش کو باہر لا کر ابھی درخت کے نیچے زمین پر رکھا ہی گیا تھا کہ بے تحاشا
بھاگتا ہوا بابو آ پہونچا۔ آتے ہی لاش کے سامنے ٹھٹھک گیا اور اسے گھورنے لگا
رام دئی اتنی بھیگی ہوئی تھی کہ ہاتھ پاؤں کے ساتھ ہونٹ بھی کیوڑے ہو گئے تھے۔ یہ
ہونٹ کچھ کہہ رہے تھے۔ کیا کہہ رہے تھے؟ بابو کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہہ رہے
ہیں کہ مجھ ابھاگن کے لئے کون روئے گا۔ کون روئے گا۔ کون روئے گا۔

بابو کے ہاتھ میں جو لاٹھی تھی اس نے وہ دونوں مٹھیوں سے اس
طرح پکڑ لی جیسے ڈوبتا ہوا شخص کسی سہارے کو تھام لے۔ ذرا دیر بعد بابو نے

اپنا سر بھی لاش اور مٹھیوں سے اڑا کر اس طرح ٹکا دیا جیسے کہ گردن پر سے گرا جا رہا ہو۔ اس حالت میں وہ ٹکٹکی باندھ کر نیند کی ماتی رام دئی کو تکنے لگا۔ اور تکتا رہا۔ نہ اس کے ہونٹ ہلے اور نہ آنکھیں تلملائیں۔ بس وہ رام دئی کو تکتا رہا۔

ذرا دیر میں رام دئی کی لاش کے گرد سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ بابو کو چھوڑ کر ہر آنکھ میں آنسو تھے اور ہر لب پر آہ۔ سب افسوس کر رہے تھے کہ انھوں نے وقت پر رام دئی کو دلاسا کیوں نہیں دے دیا۔ اگر ذرا سا بھی سہارا دے دیتے تو وہ یوں جان نہ دے دیتی۔

امر تو اس حادثے پر اس طرح پھوٹ پھوٹ رونے لگا کہ ماں کی موت پر بھی نہیں رویا تھا۔ ایک کنارے پر رامو بلک بلک کر رو رہا تھا کہ "میں چاچی کی گود میں جاؤں گا۔"

پٹواری جی کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو انھوں نے خبر لانے والے کو اور اپنے سپاہی کو مخاطب کر کے کہا۔
"دیکھا گاؤں والوں نے شہادت چھپانے کے لئے عورت کو مار ڈالا۔ ابھی خبر لیتا ہوں ان سب کی۔"

جب خبر دینے والا چلا گیا تو پٹواری کے سپاہی نے کہا۔
"حضور خبر ان لوگوں کی ضرور لی جائے لیکن ابھی نہیں۔ اس وقت تو حضور کے ساتھ میں ایک سپاہی ہوں اور دوسری طرف سب گاؤں والے ہیں۔ جن میں زبردست ایکا ہو گیا ہے۔ اور اس وقت سب غصے سے پاگل ہو رہے ہیں۔ ایسے میں تو رام لال تک بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس وقت چلے چلیں پھر موقع پا کر ان لوگوں سے نپٹ لیا جائے گا۔"
پٹواری جی نے سپاہی کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

"ایسا ہی سہی چلو واپس چلیں۔"

اس وقت پٹواری جی مع سپاہی کے غائب ہو گئے اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ بابو بھی نظر نہ آیا۔

بابو کی ہر طرف تلاش ہوئی۔ آخر لوگوں کا دماغ اس بات کی طرف گیا کہ کہیں اس کو پٹواری جی نے نہ پکڑوا دیا ہو۔ یہ سوچ کر امرا اور مدن گاؤں کے دو چار بڑے بڑے کسانوں کو لے کر پٹواری جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کو نذرانہ بھی دیا اور امرا اور مدن نے ان کے قدموں پر سر بھی رکھ دیا اور کہا کہ بابو جہاں بھی ہو بتا دو۔ اس کی رہائی کے لئے جو بھی خرچ ہو اس کے لئے ہم لوگ تیار ہیں۔

پٹواری جی نے جواب میں ایسی گول گول باتیں کہیں کہ کسانوں کو نہ تو اس بات کا یقین ہوا کہ پٹواری جی کو بابو کی خبر معلوم ہے اور نہ اس بات کا کہ ان کو خبر نہیں معلوم ہے۔

امرا اور مدن کئی مہینے تک آٹھویں، دسویں دن پٹواری جی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور نذرانے اور تحفے دیتے رہے لیکن پٹواری جی کی گول گول باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔

باب ۷

لام سے واپسی

(۱)

ایک دن شام کی ملگجی روشنی میں جب مدن اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو اس کے ہاتھوں میں اپنے نئے بیلوں کی باگ تھی اور کندھے پر نیا ہل بیلوں کی گھنٹیاں ٹن ٹنا رہی تھیں۔ مدن ان کی آواز کو بھی سن رہا تھا اور بیلوں کی چال کو بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی "ایسا تو ہوا ہی" تھا وہ بات جس پر رمضان کھٹکا وہ یہ تھی کہ مدن ان دونوں چیزوں کو... رام کے گھر کے بجائے اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔ رمضان چلتے چلتے رک گیا اور مدن ہل اور بیلوں کو دیکھتا رہا اور پھر مدن کی نظروں کو بھانپتا رہا آخر ایک لمبی سی ہوں کر کے بولا۔

"تو یہ کہو، مدن بھیا کہ اب بٹوارہ کرنے کے ارادے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اچھی اچھی چیزیں اپنے پاس رکھ لو۔"

رمضان کے چہرہ پر دو انچ کی داڑھی تھی اور مونچھیں کتری ہوئی تھیں۔ اونچی تہمد اور شلوکا پہنتا تھا اس کا سینہ باہر نکلا ہوا بتلا رہا تھا کہ اس کو ڈنڈ بیٹھک سے برسوں سنوارا گیا ہے۔

رمضان نے مدن سے جو بات کہی تھی وہ تھی تو بڑی کڑوی۔ مگر اس نے مسکرا کر اور میٹھے لہجہ میں کہی تھی۔

مدن بات سن کر اندر ہی اندر کھول گیا۔ لیکن یہ سوچ کر اس نے اپنی زبان بند رکھی کہ اگر اس وقت میں رمضان سے الجھ گیا۔ تو اور لوگ بھی اکٹھا ہو جائیں گے اور پھر بیلوں کو اپنے گھر لے جانے کا موقع نہ ملے گا۔ کیوں کہ پھر تو سب چودھری بن کر فیصلہ کرنے لگیں گے۔ کہ اگر بٹوارہ کرنا ہے تو یہ لے لو اور یہ نہ لو۔ اب ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے بٹوارہ میں مجھے بیل نہ ملیں۔

جب مدن بیل لاکر اپنے گھر کے اندر باندھنے لگا تو اس کی بیوی پریا نے پوچھا۔ "بیلوں کو کیسے لے آئے ؟"

"بس لے آیا۔ سوچتا ہوں کہ انھیں بھیا سے لے لوں اور اب اپنا ہل الگ کر لوں ۔"

پریا بھی خاموش رہی۔ اس خاموشی میں اس کی پوری رضامندی شامل تھی۔ وہ تو جس دن سے بیاہ کے آئی تھی یہی کہہ رہی تھی کہ تم اپنے بھائی بھاوج کے ساتھ رہ کر کبھی خوش نہیں رہو گے اور یہ کہ سارے سنسار میں یہی ہوتا ہے جہاں چھوٹا بھائی بڑا ہو گیا اور اس کی شادی بیاہ ہو گئی تو بڑے بھائی اس کا حصہ بٹوارا دے کر الگ کر دیتے ہیں۔ اب وہ جس طرح کی چاہے کھیتی کرے۔ چاہے اناج بوئے۔ چاہے ایکھ بوئے جو چاہے سو کرے۔

مدن شروع شروع میں تو ان باتوں پر بہت بگڑتا رہا لیکن ڈیڑھ

ہی سال کے بعد جب رمضان کے یہاں بچہ پیدا ہوا، تو اس کے دل میں جانے کیا آئی کہ اس نے امر یا چیا سے کچھ کہے بغیر ایک جگہ اپنا چھپر ڈال لیا، اور پریا کو لے کر وہاں اٹھ آیا۔ گھر تو الگ ہو گیا۔ چولھا بھی الگ ہو گیا، لیکن کھیتی بدستور ساجھے میں رہی اور اس طرح ایک فصل بھی گزر گئی۔ مگر آج مدن نے یہ نیا قدم اٹھایا کہ نئے بیلوں کی گوئی لے کر اپنے گھر چلا آیا۔

مدن نے بیل لاکر اپنے چھپر کے نیچے باندھ بھی لئے تھے اور اپنی اس حرکت پر خوش بھی تھا۔ لیکن اس کے دل میں بار بار رمضان کی بات چٹکیاں لے رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ان بیلوں کو اپنے پاس رکھوں یا بھیا کو واپس دے آؤں۔

مدن یہ بھی چاہتا تھا کہ بیلوں پر قبضہ کر لوں اور یہ بھی چاہتا تھا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مدن نے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔ بلکہ یہ سمجھیں کہ بیل اگر امر کے گھر بندھتے تھے تو وہی بات تھی اور اب مدن کے گھر بندھنے لگے تو بھی وہی بات ہے۔ یہ تو بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ لیکن رمضان نے جو دو ٹوک بات کہہ دی تو مدن سوچنے لگا کہ کہیں سارا گاؤں اس معاملہ کو اسی نظر سے نہ دیکھنے لگے۔ آخر مدن نے کافی سوچنے کے بعد پریا سے کہا۔

"گاؤں بھر کیا کہے گا۔ سوچتا ہوں کہ جوڑی واپس کر آؤں۔"

"ایسا کرو گے تو وہی مثل ہو گی کہ کہا مان نے خصم کیا، کہا برا کیا — کہا کر کے چھوڑ دیا۔ کہا یہ اور بھی برا کیا۔"

پریا کی چل گئی اور بیل مدن ہی کے گھر رہے لیکن مدن کو رمضان کی کڑوی بات مدتوں یاد رہی۔

(۴)

یہ رمضان خاں بھی عجیب آدمی تھا۔ جو بات بھی اس کے من میں آتی کہہ گزرتا۔ اور کہتا کہ سچ کہنے میں کیا چوری۔ اس کا یہ بے دھڑک پن دوسروں کو چاہیے ناگوار نہ گزرے لیکن اس شخص کو ضرور ناگوار گزر جاتا تھا جس کے بارے میں بات کہی جاتی تھی۔ اس طرح دس بیس کسان رمضان خاں کو ناپسند کرنے لگے تھے اور جب بھی موقع ملتا وہ آپس میں اس کو برا بھلا کہہ لیتے تھے۔

لیکن بن کٹ پورہ میں رمضان خاں کی ایک خاص عزت بھی تھی۔ اور لوگ اس کی نڈرپن کی باتیں کیا کرتے تھے۔

رمضان خاں اور کسانوں کے برخلاف ایک دھماکے کے ساتھ آیا تھا۔ ہوا یہ کہ وہ اس وقت آیا جب بن کٹ پورہ کی حدبندی ہو چکی تھی اور اس کی سب زمین اٹھ چکی تھی۔ صرف وہ ٹکڑا رہ گیا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بھوتوں کا گھر ہے اور جس کے سلسلے میں بہت سے قصے مشہور تھے۔ بن کٹ پورہ کے بارے میں یہ تو سب ہی کہتے تھے کہ یہ بستی نئی نہیں ہے بلکہ تیس چالیس سال پہلے بھی آباد تھی۔ لیکن ڈاکوؤں نے لوٹ مار کرکے اسے اجاڑ دیا تھا۔ جو جگہ بھوتوں کا گھر کہلاتی تھی اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہاں پر ایک ڈاکو مار کر جلا دیا گیا تھا۔ اب اس کی بری روح بھٹکتی پھرتی ہے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں گاؤں کی بعض عورتوں نے لاگوشیر کو اٹھتا ہوا دیکھا تھا۔ اس طرح کے اور بھی قصے مشہور تھے۔ یہ سب تھا ہی کہ ایک برسات میں اس جگہ کھڑے بھاری برگد پر بجلی گر گئی۔ جس سے وہ جل گیا اور صرف کالا کالا تنا اور چند کالی کالی شاخیں رہ گئیں۔ ان شاخوں کی وجہ سے دور سے دیکھنے

میں وہ ایک ایسا کالا بھجنگ ہاتھ لگتا تھا جیسے آسمان کی طرف کوئی گولہ پھینکا ہو۔ لڑائی سے واپس آنے والے نوجوان تک نے اس زمین پر بسنا پسند نہیں کیا تھا۔

"بھوت کس وقت دکھلائی دیتے ہیں؟"

جب گاؤں کے ہوشیار کسانوں نے رمضان خاں کو اس جگہ کا حال بتلایا اور مشورہ دیا کہ چاہے بے زمین کے رہ جاؤ مگر وہاں نہ بسو۔ تو رمضان خاں نے سب کچھ سن کر یہ سوال کیا تھا۔

اس سوال کے جواب میں سب خاموش ہو گئے۔ کیوں کہ بھوتوں کا صحیح ٹائم ٹیبل کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن ایک عورت جو کنارے اندھیرے میں خاموش بیٹھی تھی بولی۔

آدھی رات کو۔"

"کسی کے پاس گھڑی ہے"

"میرے پاس ہے۔"

مہاراج نے جواب دیا۔

"تو پھر ہم اس پیڑ کے کاٹنے کا لگا گھڑی دیکھ کر ٹھیک آدھی رات سے لگائیں گے۔ یہ سالے بھوت بھی یاد کریں گے کہ کس سے سابقہ پڑا تھا۔

کیا مہاراج اور کیا تجربہ کار کسان سب ہی کو رمضان خاں کی یہ گرج ناگوار گزری۔ کیوں کہ یہ کہہ کر اس نے صرف بھوتوں ہی کا نہیں گاؤں بھر کے عقیدے کا مذاق اڑا دیا تھا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ رمضان خاں نے ایسا کہا تو ہے لیکن کرنے کی اس کو ہمت نہ پڑے گی۔ لیکن دو روز کے بعد رمضان خاں چپ چاپ جا کر اپنے پیر سے جو شہر میں رہتے تھے ایک تعویز لے آیا اور پھر

مہاراج سے گھڑی مانگ لایا اور اس کے حساب سے آدھی رات بیتے درخت کاٹنے لگا جو ستاروں کی روشنی میں رات بھر کٹتا رہا ۔ اور صبح تک کٹ بھی گیا اور زمین بھی صاف ہو گئی ۔ اور وہ کالا ٹھونٹھ کلہاڑیوں سے ایندھن میں تبدیل کر دیا گیا ۔ پھر اسی دن ہل بھی چلنے لگا ۔ دو تین روز کے بعد بیج بھی ڈال دیئے گئے ۔ جب فصل پکنے پر سب کسانوں کے ساتھ رمضان خاں نے اپنا کھیت کاٹا تو سب کو پتہ چلا کہ اس کی پیداوار دوسرے کھیتوں سے کچھ اچھی ہی ہوئی ہے ۔ اور بھوت کا حال تو یہ ہو گیا تھا کہ اب اگر کوئی بتانا بھی چاہے کہ بھوت والا درخت کہاں تھا تو بتا بھی نہیں سکتا تھا ۔

گاؤں والے رمضان خاں سے رعب تو کھانے لگے لیکن اس کی یہ بات لوگوں کو پسند نہیں آئی کہ وہ دوسروں کے دکھ میں برابر کا شریک نہیں ہے ۔ ایسا اکیلا پن کہیں بھی تو پسند نہیں کیا جاتا ۔

مہاراج یعنی پنڈت دیا شنکر دوبے جن کی گھڑی دیکھ کر رمضان خاں نے درخت کاٹنے کا لگا یا تھا وہ رمضان خاں سے تین سال پہلے اس وقت جب بن کٹ پورہ کے پاس بننے والی شکر مل کی سڑک نکل رہی تھی، آکر بس گئے تھے اور انھوں نے زمین کا اتنا بڑا ٹکڑا لے لیا تھا کہ وہ چھوٹے موٹے زمیندار بن گئے تھے ۔ ان کو رمضان خاں کی یہ قانون شکنی کہ وہ گاؤں کی مانی ہوئی باتوں کے خلاف چلے ایک آنکھ نہیں بھائی ۔ لیکن آدمی تھے ہوشیار اس لئے اس بات کو صاف پی گئے ۔ اب یہ رمضان خاں کا ہلکا پن تھا کہ وہ ان سے پوچھا کرتا تھا کہ مہاراج وہ آپ کے بھوت کہاں چل دیے ۔ مگر مہاراج ہمیشہ اس بات کو ٹال دیا کرتے تھے البتہ جب موقع ہوتا تو مہاراج گاؤں والوں سے کہتے تھے کہ رمضان خاں نے بھوتوں کو جو ستایا ہے اچھا نہیں کیا ہو سکتا ہے کہ اب بھوت گاؤں بھر سے بدلہ لیں لیکن رمضان خاں کہا کرتا تھا کہ اگر ان بھوتوں میں کچھ بھی زور ہے تو

وہ پہلے مجھ سے بدلہ لیں گے پھر کسی اور سے۔ یہ بات گاؤں والوں کے جی کو لگتی تھی۔

لیکن مہاراج کو رمضان خاں کی ایک اور حرکت پر جو نید کو سرزد ہوئی بہت سخت غصہ آگیا اور انھوں نے بیچ گاؤں میں کھڑے ہو کر رمضان خاں کو بلا اس کا نام لئے بہت برا بھلا کہا۔ لیکن یا تو ان کی اس بات کی منھ پھٹ رمضان خاں کو خبر نہیں ہوئی یا اس نے وہ ضبط دکھلایا جس کی اس سے کوئی بھی توقع نہیں کرتا تھا۔ بہر حال رمضان خاں نے مہاراج سے کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ جب اپنے لڑکے کا عقیقہ کیا اور اس میں مولوی کو بلا کر ایک بکرا کاٹا تو وہ مہاراج کے لئے بہت اچھا سیدھا جس میں آدھ سیر گھی اور ایک سیر شکر تھی، لے گیا۔ اور مہاراج نے اسے خوشی خوشی قبول بھی کر لیا۔

رمضان خاں کا دوسرا واقعہ جو ہوا تھا اس کا پس منظر یہ ہے کہ بن کٹ پورہ کے اور جنگل کے بیچ میں تار لگ جانے کی وجہ سے جنگلی جانوروں کا آنا تو بند ہو گیا تھا لیکن بندر درختوں کی شاخوں سے اچک اچک کر آتے رہتے تھے اور ان کے غول کھیتوں پر حملے کرتے رہتے تھے ان غولوں میں سے دو ایک تو بن کٹ پورہ میں مستقل بس گئے تھے۔ کسان ان بسے ہوئے بندروں سے بہت عاجز تھے۔ لیکن نہ تو کسان کے پاس بندوق تھی جان کو مارتے اور نہ مہاراج کی آگیا تھی جو ایسی ہمت کرتے۔ جب کسان مہاراج کے سامنے بندروں سے ہونے والے نقصان کی باتیں کرتے تو مہاراج اس طرح مسکرا مسکرا کر ان کی باتوں کو سنتے گویا ان کے اپنے لڑکوں اور پوتوں کی معصوم شرارتوں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس مسکراہٹ میں کچھ دھرم کی ایسی جھلک آجاتی تھی کہ اس سے کسانوں کا غصہ دب جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی جب بندر ان کے کھلیانوں یا کھیتوں یا گھروں میں گھستے تھے تو اس وقت جو چیز بھی کسانوں کے ہاتھ

لگی تھی۔ وہ اس سے بندروں کو مارنے کی کوشش کرتے تھے لیکن نہ تو کسانوں کا نشانہ کبھی ٹھیک بیٹھتا تھا اور نہ کبھی وہ اس ارادے سے مارتے تھے کہ بندر گر جائے۔ لیکن اسے اتفاق کہو یا بدنصیبی کہ ایک کسان نے ہنسیا جو کھینچ کر ماری تو وہ اچک کر ایک بندر کے گردن پر لگ گئی اور اس سے بندر مر گیا اس پر گاؤں بھر میں سناٹا چھا گیا۔ مہاراج نے سب کسانوں کو بلا کر کہا کہ اگر اس ہتیا کا پرائسچت نہ کیا گیا تو سارا گاؤں ناس ہو جائے گا۔ پھر انھوں نے مجرم کسان پر اسی سخت یاترائیں کرنے کی سزا لگا دی جس میں ایک سال سے کم تو لگ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس بچارے کسان نے بہت ہاتھ پیر جوڑے اور کہا میں بہت غریب ہوں نہ اتنا سفر کر سکتا ہوں اور نہ اتنا خرچ کر سکتا ہوں۔ اور جاؤں گا تو بیوی بچوں کو کس پر چھوڑ جاؤں گا۔ لیکن مہاراج نے دھرم کے کام میں ڈھیل دینا صحیح نہ سمجھا اور اپنے فیصلہ پر اڑ گئے۔ اس کے بعد وہ کسان جو اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر غائب ہوا تو ڈیڑھ سال گزر گیا اور اس کی صورت نہیں دکھلائی دی۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد رمضان خاں آکر بن کٹ پورہ میں بسا۔ اس کو آئے دو تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک بندر لاگو ہو گیا اور عورتوں اور بچوں پر حملے کرنے لگا۔ اس نے ایک عورت کا لہنگا اس طرح نوچا کہ اس کی ران چھل گئی۔ اور ایک لڑکی کا منہ اس طرح نوچا کہ ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ کسان اس بندر سے بہت ہی عاجز آ چکے تھے۔ اتنے عاجز کہ مہاراج کی آگیا کے خلاف بھی اس کو مار ڈالنے کی کوششیں کر چکے تھے۔ لیکن اس پر بس نہیں چلتا تھا۔ اول تو بندر بہت چالاک تھا اور دوسرے کسانوں کے پاس کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا جس سے نشانہ لگا کر دور سے مارا جا سکے۔

رمضان خاں صرف کسان ہی نہیں تھا وہ لاٹھی اور کشتی کا بھی
واقف تھا۔ بانس کی غلیل بھی بناتا تھا اور اس کا اچھا نشانہ باز بھی تھا۔
اس نے بندر کا لڑکا پر حملہ کرنا جو اپنی آنکھ سے دیکھا تو اس دن سے وہ
تاک میں لگ گیا اور جہاں بھی بندر دیکھا غلیل لے کر پیچھے لگ جاتا۔ کئی
دن تک وہ اسی طرح بندر کی تاک میں لگا رہا۔ لیکن وہ داؤں پر نہیں آیا۔

ایک دن بندر ایک کسان کا انگوچھا جس میں ستو بندھے تھے
لے کر بھاگا اور درخت پر چڑھ کر اسے دکھلا دکھلا کر انگوچھا پھاڑنے
اور ستو گرانے لگا۔ وہ کچھ تو اپنے اس دلچسپ کام میں اور کچھ انگوچھے
والے کسان کی فریاد میں اتنا منہمک ہو گیا کہ اس نے رمضان خاں کو آتے اور
نشانہ لیتے نہیں دیکھا پھر تو غلہ بندر کی کنپٹی پر ایسا بیٹھا کہ وہ چکرا کر شاخوں
سے ٹکریں کھاتا ہوا گردن کے بل زمین پر آ گرا۔

بندر اتنا موٹا تھا کہ جب زمین پر ڈھیر ہوا ہے تو معلوم ہوتا تھا
کہ ایک چھوٹے اور گٹھیلے جسم کا انسان پڑا ہوا ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں
اس وقت بھوکے بھیڑیے کی طرح کھلی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے چنگاریاں
نکل رہی تھیں دم بھر میں وہ سنبھل گیا لیکن ابھی وہ اٹھ نہیں پایا تھا کہ
رمضان نے ایک اور غلہ تاک کر رسید کر دیا۔ اتنی دیر میں بہت سے
کسان آ کر اکٹھا ہو گئے اور رمضان خاں کی تعریفیں کرنے لگے اور بندر کو
بری بری گالیاں دیتے اور کہنے لگے کہ آخر مل ہی گئی ہتیارے کو اپنے کیے
کی سزا۔ اور ایک نے تو ایک دو ڈھیلے بھی اس پر پوری طاقت سے مار
دیے۔ رمضان خاں نے پھر غلیل ہی کی تین چار ضربیں اس کے سر پر ایسی

لگا تیجہ کہ وہ مر گیا۔

مہاراج نے بندر کے مارے جانے کی خبر جو سنی تو وہ آگ بگولا ہو گئے اور بیچ گاؤں میں کھڑے ہو کر انھوں نے بندر کی ہتیا کے خلاف بہت کچھ کہا۔ لیکن کسان سب کے سب اپنے دل میں بہت خوش تھے اور اب رمضان کی زیادہ عزت کرنے لگے تھے۔ گاؤں کے لونڈوں نے تو بندر کی موت پر گیت گائے اور ناچے کودے۔

مہاراج کو اسی بات کی سخت تکلیف تھی کہ وہ رمضان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ وہ ان کی برہمنی حکومت سے بالکل باہر تھا۔ مہاراج اپنی حکمرانی کی اس ذلت پر جھنجھلا جھنجھلا کر رہ جاتے تھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ لیکن انھوں نے دل میں یہ تو طے کر لیا تھا کہ جیسے بھی بنے گا اس رمضان خاں کو اس کی حرکتوں کی سزا ضرور دی جائے گی۔ ورنہ وہ اپنی ایسی حرکتوں کی وجہ سے کسانوں میں بھی برے برے کام کرنے کی خواہش پیدا کر دے گا یعنی ان کو بھی اپنی طرح بے دھرم بنا دے گا۔ اب دیکھو بھوتوں والا پیڑ جب سے کٹا ہے لوگوں کا عقیدہ کم زور پڑ گیا ہے۔ اب اگر وہ بھوتوں سے ڈرتے بھی ہیں تو جھاڑ پھونک کے لئے مہاراج کے پاس آنے کے بجائے رمضان خاں اور ان کے مسلمان پیر کے پاس جو شہر میں رہتا ہے، جاتے ہیں۔ اب رمضان نے بندر جو مارا ہے تو اس سے بھولے بھالے کسانوں کو مسلمان پیر پر اور زیادہ عقیدہ ہو جائے گا۔ اسی لئے رمضان کا توڑ کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔

دوسرے دن مہاراج نے کٹ پورہ کے مہاجن لالا دھنی رام سے خود جا کر کہا۔

"کچھ خبر ہے کہ رمضان خاں کا غلیل کا نشانہ بہت اچھا ہے وہ سو گز سے جانور کی آنکھ پھوڑ دیتا ہے"۔

لالا جی اپنی گول توند پر جو دھوتی سے باہر نکلی ہوئی جھوم رہی تھی' ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔

"ہاں مہاراج۔ کل اس نے ایک گلے میں بندر کو گرا دیا وہ ایسا گرا کہ اس نے پھر سانس بھی نہ لی مگر یہ تو بڑا پاپ کیا اس نے۔"

کیوں مہاراج یہ مسلمان لوگ بھی کیسے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے دل میں ذرا بھی تو دیا نہیں ہوتی۔ عجب ملش ہیں یہ لوگ!!"

"ہاں لالا جی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اب تمھاری کیسے چلے گی۔ یہ جو تم ایک ایک کے چار چار وصول کرتے ہو کیا اب رمضان خاں کی موجودگی میں ایسا ہو سکے گا؟"

"ارے مہاراج کیا کہتے ہیں آپ۔ ہم ایسا کہاں کرتے ہیں۔ ہم تو بس اتنا کرتے ہیں کہ وقت پڑنے پر اپنی بستی کے کسانوں کے کام آ جاتے ہیں۔ کیا یہ بات کچھ بری ہے؟"

پھر فوراً ہی لالا جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"بری ہو یا اچھی' اب تو یہ کام بھی بند ہو گیا۔ کیوں کہ سب پیسہ پھنس چکا ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ نہ تو وہ وصول ہو گا اور نہ یہ کام چلے گا۔ مگر یہ تو بتاؤ مہاراج کہ رمضان خاں اپنی غلیل لے کر میری راہ میں کیوں آنے لگا؟ اسے مجھ سے کیا غرض؟"

"غرض اگر نہیں ہے تو ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ اب کسان سب

اس کے کہنے پر چلتے ہیں۔ اب ہماری تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ رمضان تمہارے خلاف
کسانوں کو ضرور بھڑکائے گا اور پھر سمجھ لو کہ کیا ہوگا؟

"اگر کسان رمضان خاں کے کہنے پر چلنے لگے ہیں یہ تو بہت بری بات
ہے، ان کو تو تمہاری آگیا کا پالن کرنا چاہئیے اگر نہیں پالن کرتے ہیں تو برا کرتے
ہیں۔ انھیں کا جنم بگڑے گا۔ مگر مجھے آگیا دو کہ میں تمہاری کیا سیوا کروں۔"

مہاراج ذرا چکرا گئے کہ لالا جی کا کیا مطلب ہے وہ مجھے کچھ لے دے
رہا ہے یا واقعی میرا ساتھ دینا چاہتا ہے۔

مہاراج نے ادھر ادھر دیکھا۔ کھنکھار کر حلق صاف کیا اور سانس بھر
کر "ہے بھگوان" کہا پھر رازدارانہ کہنے لگے۔

"بات یہ ہے کہ اس نے بندر کی ہتیا کی ہے اور تم جانو کہ بندر کے
ہتیارے کی مدد کرنا پاپ ہے۔ میں اگر چاہتا ہوں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ
تم دھرم سے نہ جاؤ۔ بس اتنی سی بات ہے سمجھے؟"

"نہیں سمجھا۔ رمجان نے مجھ سے کسی معاملے میں سہائتا مانگی ہی کیا
ہے جو میں نا کروں؟"

"اگر آج نہیں مانگی ہے تو کل ضرور مانگے گا کیوں کہ اسے پیسے کی
ضرورت ہے۔"

"ارے مہاراج کیا کہتے ہو یہاں پیسہ ہے ہی کہاں جو بانٹوں
گا۔"

"مہاراج جب لالا جی سے باتیں کرکے گھر کی طرف واپس ہوئے تو
وہ راستے بھر سوچتے رہے کہ میری باتوں کا نتیجہ کیا نکلا۔ بہت غور کرنے پر سمجھا

وہ طے نہیں کر پائے کہ لالا جی کو وہ اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔

(۲۳)

دوسرے ہی دن رمضان خاں اور لالا جی کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ لالا جی ایسی جگہ آکر کھڑے ہو گئے اور ایسے وقت کھڑے ہو گئے کہ مڈبھیڑ کا ہونا ضروری ہو گیا۔

لالا جی نے کہا "رمجان جی۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگ بادشاہ کی ہتیا کو تو پاپ بلکہ مہاپاپ سمجھتے ہیں، مگر بھائی، اتنی بات ضرور ہے کہ تم نے یہ پاپ کر کے کسانوں کو آرام پہونچا دیا۔ کوئی سیوا ہمارے لائق ہو تو نہ بھولنا۔"

رمضان کے پاس جو زمین تھی وہ دو گوئی مانگتی تھی لیکن اس کے پاس تھا ایک ہی گوئی۔ دوسری گوئی خریدنے بھر کے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ لیکن وہ تھا پکا مذہبی آدمی اسی وجہ سے سود دینا برا سمجھتا تھا اور اسی وجہ سے ابھی تک لالا جی کے پاس نہیں گیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

"روپیہ تو چاہیئے لیکن تم لوگے بیاج اور اس کا دینا ہمارے مذہب میں منا ہے۔"

"بیاج میں کہاں لیتا ہوں بھائی۔ پہلے تو کچھ لے بھی لیتا تھا مگر اب تو سیدھا سادھا بیوپار کرتا ہوں کل رات ہمارے گھر آجاؤ تو پھر دونوں مل کر کچھ اپائے نکال لیں گے"۔

اور ہوا بھی یہی کہ جب دوسرے دن رمضان لالا جی کے گھر گیا تو نکالا اپائے۔ لالا جی نے کہا کہ سیدھا راستہ یہ ہے کہ تم اپنی اگلی دو فصلیں ابھی میرے ہاتھ بیچ ڈالو یعنی جتنا بھی اناج ہو وہ میرا ہی ہو جانے کے بجائے اتنی رقم تم کو دے دوں گا کہ تم گوئی خرید لو۔ بس تم قیمت میں میرے ساتھ ذرا رعایت کر دو پھر لالا جی نے غلے کے جو دام تبلائے وہ رمضان کی نظر میں روپیہ کی جگہ دس آنے تھے۔ رمضان نے کہا "لالا جی یہ تو بیاج کا بھی باپ ہے۔ بیاج دوں تو شاید اس کی آدھی رقم دینا پڑے" لالا جی نے کہا "ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن اب تو میں بیاج پر روپیہ چلاتا ہی نہیں ہوں۔ پھر بات یہ بھی ہے کہ تم بیاج دو گے تو کیا بے دھرم نہ ہو جاؤ گے"۔

رمضان واقعہ یہ ہے کہ دوسری گوئی کے لئے بہت متفکر تھا اس لئے اس کو لالا جی کی پیش کش غنیمت معلوم ہوئی اور اس نے اسے منظور کر کے کاغذ پر انگوٹھا لگا دیا۔

برسات کے ابتدائی دن تھے زمین اور درخت طرح طرح کے ہرے رنگوں سے رنگ برنگی گلدستے بنے ہوئے تھے۔ ایسے میں مہاراج بھگوان کی مہا کرتے ہوئے سندھیا کی پوجا کے لئے ادھر ادھر سے پھول توڑتے ہوئے کہیں جا رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ رمضان ایک نئی گوئی لئے شہر کی طرف سے چلا آرہا ہے۔ مہاراج نے بہت غور سے گوئی کی طرف دیکھا۔ پھر بہت شفقت سے پوچھا "کیا بھئی نئی خریدلا

ہے ہے۔؟" رمضان نے کہا" ہاں مہاراج۔ دعا کرو کہ برکت ہو" مہاراج نے بہت پریم سے دعا دی اور پھر بہت گمبھیر ہو کر گھر چلے گئے۔

مہاراج کو رمضان کی نئی گوئی دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے گرمی کے موسم میں ان کے گھی سے بھرے ہوئے گھڑے میں چھید کر دیا ہے اور گھی ہے کہ بہا چلا جا رہا ہے۔ لے آیا دشٹ نئی گوئی۔ مگر اسے پیسے کہاں سے ملے؟ کیا کہیں کوئی رقم لالا جی نے تو نہیں دے دی! ہاں وہ لالچی دو آنہ روپیہ بیاج کے خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔ بندر کی جان کیا چیز ہے۔ سارا دھرم اور سب کچھ بیچ سکتا ہے۔ مگر یہ رمضان اس کا کیا اپائے کیا جائے۔ یہ تو برابر چڑھتا ہی چلا آ رہا ہے۔ یہ مسلمان کہاں گھس آیا میرے راج میں۔ مہاراج کو اس وقت صرف رمضان ہی سے نہیں سارے مسلمانوں سے نفرت ہو رہی تھی۔

مہاراج گھر کی طرف آ رہے تھے اور ان کا غصہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی کھڑاؤں کے سُر اونچے ہوتے جا رہے تھے۔ جب مہاراج غصہ میں چلتے تھے تو ان کی رفتار میں تو کوئی خاص تیزی نہیں آتی تھی۔ لیکن غصہ کے ساتھ ساتھ ان کی کھڑاؤں کا سُر ضرور چڑھتا چلا جاتا تھا۔ مہاراج جوں ہی اپنے باڑے میں داخل ہوئے ان کی نظر ایک ایسی چیز پر پڑ گئی کہ غصہ کا طوفان اک دم سے ابل پڑا اور وہ فوراً بلا کچھ کہے سنے ایک طرف پڑی ہوئی لکڑی کو جھپٹ کر اٹھا لائے اور سانولی چمارن کو مارنے لگے۔

حرام جادی۔ یہ ساری!! اس ترنگ بھڑک سے ہمارے گھر آئے گی؟ ہمارے گھر؟ تیرا مرد اور دیور فوج میں کیا چلے گئے کہ تیرا دماغ ہی بگڑ گیا اور اپنی حیثیت بھول گئی۔ رانی بن کر نکلی ہے رانی"!

دھم دھم۔ مہاراج نے سانولی کو پانچ سات ہاتھ ایسے جمائے کہ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگی اور کتیا کی طرح چلانے لگی۔ اتنے میں مہاراج کا اکلوتا بیٹا شیامو لپکتا ہوا آگیا اور اس نے مہاراج سے سفارش کی کہ سانولی کو چھوڑ دو۔ اب وہ ایسا نہیں کرے گی۔

ایسی سفارش تو زمیندارانہ حکومت کرنے کے طور طریقوں کا ضروری جز تھی۔ کیوں کہ اس سے یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ مارنے والا حاکم تو مار مار کر جان نکال لیتا اور یہی اس کا ارادہ بھی تھا لیکن وہ تو یہ کہو کہ فلاں شخص نے سفارش کر دی۔ اس کی وجہ سے ہاتھ رک گیا۔ اس طرح رعایا زیادہ دباؤ میں رہتی تھی کیوں کہ وہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ مالک کی مار کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔ اس لئے ان کے غصے سے جہاں تک ممکن ہو بچے رہو۔ سفارش زمیندارانہ طور طریقوں میں داخل ضرور تھی لیکن مہاراج کو شیامو کی سفارش کا انداز پسند نہیں آیا— کیوں کہ اس نے صرف سفارش ہی نہیں کی تھی بلکہ سامنے آکر ایک طرح سے مہاراج کا ہاتھ روک لیا تھا۔ لیکن مہاراج اپنے اکلوتے بیٹے کا کچھ دباؤ بھی مانتے تھے کیونکہ ان کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے شیامو کی شادی بالکل ہی اپنی مرضی سے کر کے اس پر زیادتی کی تھی ایک تو اس دباؤ نے ان کے غصے کو دبا دیا تھا اور دوسرے ان کا غصہ خود بھی سانولی کو بے طرح تڑپتا دیکھ کر اس ڈر سے کچھ اتر گیا کہ کہیں مر نہ جائے۔ ان کی مار معمول سے زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ یہ سختی یوں آگئی تھی کہ انھوں نے سانولی کو مارتے وقت اپنے تصور میں رمضان کے بھی دو چار کرارے ہاتھ جھاڑے تھے۔

سانولی چمارن ہمیشہ لہنگا پہن کر آتی تھی اس طرف کے نیچ لوگوں کا

پہنا دیا بھی ہی تھا۔ لیکن آج وہ ایا نک چوڑے کنارے کی ساری باندھ کر آگئی تھی بالکل ویسی ہی ساری جیسی اگنی بیندرہ دن ہوئے مہاراج اپنی بہو اور بیوی کے لئے لائے تھے۔ اگر چمار نیں بھی ویسا ہی کپڑا پہننے لگیں جیسا ان کے مالک پہنتے ہیں تو پھر دیکھنے والوں کو ان میں اور مالکوں میں فرق کیا معلوم ہوگا۔ مگر یہ بات بھی درست تھی کہ سانولی کا دماغ اس وجہ سے کہ اس کا شوہر اور دیور فوج میں باجے والوں کے دستے میں تھے کچھ بگڑ ضرور گیا تھا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ ابھی چند ہی روز ہوئے اس کا شوہر جب چھٹی پر گھر آیا تو بڑی بھیلی وردی پہنے ہوئے تھا۔ دیکھو تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پولیس والا چلا آرہا ہے۔ پھر آکر وہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگا۔ لڑائی کی باتیں۔ صاحب لوگوں کی باتیں۔ دیس بدیس کی باتیں۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ شہری لوگ تک غور سے سنتے تھے اور سن سن کر سب لوگ پہلے سے بہت زیادہ اس کا مان دان کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ سلام کرنے مہاراج کے دوارے گیا تو انھوں نے اسے بٹھلایا تو بدستور چبوترے کے نیچے ہی، لیکن بڑھ بڑھ کر کافی باتیں کیں۔ پہلے نہ تو وہ اتنی باتیں کرتے تھے اور نہ اتنا اس کا نام لیتے تھے۔

جب تک برجو گاؤں میں رہا، سانولی کی آؤ بھگت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ جب عورتوں میں جاتی تو وہ کہتیں۔

"تیرا مرد آیا ہے؟ سنا ہے کہ وہ بڑا ہوشیار ہوگیا ہے۔ وہ لام کی اور بہت سے دیسوں کی باتیں سناتا ہے۔"

ایسی باتوں سے سانولی کو ایسا لگتا جیسے جات پات کی جو دیواریں ہیں ان میں کہیں کسی جگہ کچھ کمی سی آگئی ہے۔ وہ اونچ کی طرف جانے والی سیڑھی کے

سو دو سو ڈنڈوں میں سے ایک۔ دو ڈنڈے ضرور ہی اوپر چڑھ گیا ہے۔ سونے
پر سہاگہ یہ ہوا کہ برجو نے کہا۔

"کیوں ری۔ تو چوڑے کنارے کی ساری کیوں نہیں پہنتی؟ کیا
ساری کا کنارا بھی اونچی ذات والوں کی ٹھیکے داری ہے"۔

جب برجو نے بہت اکسایا تو سانولی نے پہن لی چوڑے کنارے والی
ساڑی۔ پھر جو وہ باہر نکلی تو سب نے دیکھا تو عجیب عجیب نظروں سے لیکن کہا
کسی نے بھی کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ شیا مو مہاراج نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کہنا
کیسا وہ تو اور نگھل گئے۔ کہنے لگے۔

"تو تو اس سمے ایسی معلوم ہو رہی ہے سانولیا جیسے اپسرا ہائے
ہائے۔ یہ تیرا جوبنا۔

لیکن اب تک اس لباس میں مہاراج کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کی
نوبت آج آئی اور نوبت آتے ہی سانولی کو ایسی ساری باندھنے کی وہ سزا ملی
جو مرتے دم تک یاد رہے گی۔ اگر برجو چھٹیاں پوری کر کے چلا نہ گیا ہوتا تو سانولی
جا کر اس پر غصہ اتارتی اور کہتی کہ "لو اپنی ساری۔ بڑے بہادر ہو تو جا کر مہاراج
کی خبر لو۔ تم کہتے تھے کہ کیا چوڑے کنارے کی ساری بھی اونچی جات والوں کی ٹھیکہ داری
ہے۔ دیکھ لی ٹھیکہ داری؟ اب یا تو مجھے مار کر آج ہی پھونک دو یا لے چلو
اپنے ساتھ لام پر"۔ مگر اب سانولی غصہ اتارے تو کس پر اتارے اور دکھڑا روئے
تو کس کے سامنے روئے۔ برجو جا چکا تھا۔ رہے گھر والے تو انھوں نے تو کہا ہی
تھا کہ یہ ساری باندھ کر باہر نہ جانا۔

سانولی کو لگ رہا تھا کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلی ہے نہ کوئی اس کی عزت

بچلنے والا ہے اور نہ کوئی جان کا رکھوالا ہے۔ مار کھانے کے بعد وہ صحن سے ذرا ہٹ کر منو شیوں کے پاس چلی گئی اور وہاں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس مار سے جسم سے زیادہ اس کی خودداری کو چوٹ لگی تھی۔ ادھر ہفتہ دس دن اس نے کچھ ذرا سی اونچائی کا جو مزا لوٹا تھا اس سے کچھ سرشاری بھی آ گئی تھی۔ اب جو مہاراج نے اس بلندی سے اسے گرایا تو اسے سخت چوٹ آئی۔ یہ گراوٹ اسے بہت ہی بڑی گراوٹ محسوس ہوئی گویا کہ وہ جس درجے پر تھی اس سے بھی نیچے گر گئی اس احساس نے کلیجہ میں چھید کر دیا۔ اس وقت اسے اپنے ہی سے یعنی چمار کی جات ہی سے نفرت ہو رہی تھی۔ ہائے کیسے پاپ کئے تھے میں نے پچھلے جنم میں جو اس دشٹ جات میں پیدا ہوئی۔ اس سے تو اچھا ہوتا کہ میں کتے بلی کا جنم لے لیتی۔

سانولی روتی رہی اور کڑھتی رہی کہ اتنے میں اسے ایک پیار بھری آواز سنائی دی۔

سانولی سمجھ گئی کہ کون ہے۔ سورج ڈوب چکا تھا اور چھپر کے نیچے اندھیرا چھا گیا تھا جس میں جلنے والے کنڈوں کے دھوئیں کی بو بسی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے اس جگہ تنہائی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ شیامو مہاراج کونے میں اندھیرے کی آڑ لئے کھڑے تھے اور پیار سے اسے ڈھارس دے رہے تھے۔ "اب نہ رو سانولی"

اس وقت شیامو کی ڈھارس سانولی کو بہت ہی بڑی چیز لگی۔ جیسے وہ کنوئیں میں گر رہی ہو اور کسی نے سنبھال لیا ہو۔

ایک ہاتھ نے سانولی کو کم اندھیرے سے زیادہ اندھیرے کی طرف کھینچا۔ سانولی کی ڈبڈبائی آنکھوں کو جو اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں، شیامو کی آنکھوں میں طرح طرح کے بلاوے نظر آئے۔ ان کی چمک میں دیا اور پیار دونوں تھے۔ شیامو کو

سانولی کی آنکھوں میں زخمی پرندے کی پکار اور ڈوبتے انسان کے ہاتھ پاؤں مارنے کی جھلک نظر آتی۔ انتظار کی گزرگاہ نے اس کے نشۂ عشق کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا۔ سانولی مہینوں سے شیامو کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ تھی تو ذات کی چمارن لیکن اس پر بھی اس میں اکڑ تھی۔ وہ کہتی تھی "مہاراج تم عزت والے اور میں مردو والی تم برہمن اور میں اچھوت۔ کہاں سونے کی تھال اور کہاں نالی کی کیچڑ۔ میرا اور آپ کا کیا جوڑ۔ شیامو گڑگڑا کر کہتا" سانولیا۔ پریم میں یہ باتیں کہاں چلتی ہیں" وہ لاکھ خوشامد کرتا لیکن سانولیا ہرن کی طرح چوکڑی بھر کر نکل جاتی۔

شیامو ان باتوں سے اگر کچھ سمجھا تو یہ سمجھا کہ سانولی ترسانا چاہتی ہے ورنہ چمارنی اور ایسی باتیں کرے!! ہو نہ ہو یہ عورت ہے بہت کڑھی ہوئی۔ پھر تو شیامو نے اس کا شکرے کی سی آنکھوں اور بھیڑیے کے سے پنجوں سے پیچھا کیا۔ اور اسی طرح پیچھا کرتا ہوا دو مہینوں تک میں لگا رہا۔ لیکن آج تک پھل ہاتھ نہ لگا۔

شیامو کی طرح کے اور نوجوان بھی سانولی کے پیچھے لگے رہتے اور جب موقع ملتا آوازے کستے۔

جیسے "مرکھی گائے۔ ارے روپیہ لے گی"

"ہائے جانی جیکو" "چلاؤ چکو"

سانولی ان آوازوں کو سنی ان سنی کر دیتی۔ نہ خوش ہوتی نہ غصہ دکھلاتی۔ سب کو حیرت تھی کہ یہ رکھ رکھاؤ اور ایک چمارن میں!! بھلا یقین آنے والی بات ہے!! ایسا لگتا ہے کہ اس جگ میں گدھے بھی مردار کھانا چھوڑ دیں گے۔

سانولی واقعی سانولی تھی وہ گوری تو بالکل نہ تھی لیکن کالی بھی نہ
تھی اس کے ناک نقشہ میں بظاہر کوئی خاص بات نہ تھی لیکن اس میں جلت بھرت
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں گردن پاؤں اور کمر اسی تیزی سے
حرکت کرتے تھے گویا کہ وہ پھرکی ہو جو اونچی نیچی زمین پر ناچ رہی ہو۔ ایک بوڑھے
شوقین نے اسے دیکھ کر کہا تھا کہ اسی میں ایک عورت کی نہیں چار عورتوں کی زندگی
بھر دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو جی
چاہتا ہے۔

شیامو، سانولی کا اپنی بیوی چندرا سے دل میں مقابلہ کیا کرتا تھا چندرا
گوری چٹی تھی مگر تھی مٹی کا چھوت۔ وہ تھی ایسا جو زمین پر ہاتھ سے دھرا نہ
گیا ہو بلکہ اس کو پندرہ سولہ ہاتھ اوپر سے گرا دیا گیا ہو۔ جہاں وہ بیٹھتی معلوم
ہوتا ڈھیر ہو گئی ہے۔ جب بولتی تو معلوم ہوتا کہ نیند میں ہے اور گول مٹول تو
اتنی تھی کہ شیامو کے بازوؤں میں نہیں سماتی تھی۔

جب سانولی مہاراج کے گھر میں گوبر کی ڈلیا سر پر رکھ کر چلتی یا کنڈے
پاتھتی تو اس کے ہاتھ پاؤں سر اور گردن اور بدن کی دلکشی جیسے اس طرح
پھرتی سے ادھر ادھر اوپر نیچے اور اغل بغل ڈولتے تھے کہ شیامو کے بازو کی مچھلیاں
پھڑکنے لگتیں تھیں۔ شیامو سے پریم کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی کہ سانولی کنڈیاں کاٹ
رہی تھی۔ اس وقت اس کے جسم کی جلت بھرت میں کچھ ایسی کشش شیامو کو محسوس
ہوئی کہ وہ اسے گھورنے لگا۔ جب دیکھنا شروع کر دیا تو پھر دیکھتا ہی چلا گیا۔ اور
دیکھتے دیکھتے اس جلت بھرت اور کشش میں ڈوب گیا۔

سانولی کنڈیا کاٹتی چلی گئی۔ شیامو کو لگنے لگا کہ سانولی کا سارا بدن

تھکن سے چور چور ہو گیا ہے۔ لیکن اس وقت سانولی کسی کی بات پر ہنس دی اور ایسی تازہ دم سنسی ہنسی جیسے اس نے ابھی ابھی کام شروع کیا ہے پھر تھکنا کیا۔ سانولی جب بھی ہنستی تو شیامو کو ایسا لگتا جیسے کسی نے ہرے بھرے بھٹے کے ایک طرف کا پتہ جھٹکے سے نوچ لیا ہے اور سب دانے ایک دم سے جھلملا اٹھے ہیں۔

روتی ہوئی سانولی کو اپنی طرف کھینچ کر شیامو نے کہا

"سانولیا! بھگوان قسم اس ساری میں تو سچ مچ رانی لگتی ہے تیری صورت بھی ہے رانیوں ایسی۔"

شیامو نے یہ بات اسی طرح کہی جیسے وہ کہا کرتا تھا لیکن اس وقت تو ان لفظوں نے موہنی کے منتر کا کام کیا۔ ان میں ڈوبتی ہوئی سانولی کو سہارا نظر آیا اور اس نے اس سہارے کو تھام لیا۔ شیامو کے ان لفظوں نے سانولی کو گڑھے سے نکالا اور اوپر اٹھایا اور اٹھائے چلے گئے۔ سانولی کو اس سہارے سے ایسی خوشی ہوئی کہ وہ اپنے من سے کہنے لگی "سن رے منوا میں ٹھہری چمارن اور چمارن کو وہ آنند نہیں مل سکتا ہے جو اونچی ذات والوں کے بھاگ میں ہے۔ چمارن کو جو آنند مل سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ چاہے تو دس مردوں کی بن جائے۔ لوگ کیا کہیں گے یہی ناکہ ہے چمارن"۔ اس وقت سانولی کو شیامو میں کافی دل کشی نظر آئی اور وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے اس کی گود میں پکے آم کی طرح ٹپک پڑی اور پھر سپردگی کی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مہاراج تم نے مجھ سے پریم کیا ہے تو اس پریم کی لاج بھی رکھنا۔"

پھر تو شیامو کی کوئی بھی ایسی حسرت نہ تھی جو پوری نہ ہو گئی ہو۔

ایک گھنٹے کے بعد دبی ہوئی آواز سے سانولی نے کہا

"دیکھ لو باہر کوئی ہے تو نہیں؟"

"دیکھتا ہوں"۔

شیامو نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر دبی ہوئی آواز سے کہا کوئی نہیں ہے۔

سانولی نکل آئی اس کے بالوں میں بھوسا اور تنکے تھے اور چوڑے کنارے والی ساڑھی پر ہر طرف مٹی کے دھبے لیکن چہرہ پر تازگی تھی۔

شام کا جھٹ پٹا رات میں تبدیل ہو رہا تھا۔ آسمان پر ابھی صرف دو چار تارے ابھرے تھے ایسے میں دور سے چھپر کے اندر کی کوئی چیز نظر نہیں آسکتی تھی۔ پھر باڑے میں سناٹا بھی تھا اور سوائے ایک کتے کے اور کوئی جاندار سامنے نہ تھا۔ لیکن ایسا سناٹا ہونے پر بھی ایک بات ایسی ہو گئی جس سے یہ خبر گاؤں کے لونڈوں میں اڑ گئی کہ شیامو مہاراج کو دیکھتے پر رات ہو گئی۔ گاؤں کی زندگی ہوتی ہی ایسی ہے کہ کبھی تو وہاں کی تنہائیوں میں بھی آنکھیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کبھی گلیوں اور کھیتوں میں بھی تنہائی پیدا ہو جاتی ہے۔

شیامو نے باہر نکل کر ہر طرف دیکھا لیکن اس کی نظر باڑے کے باہر کے درخت پر نہیں گئی جس پر ایک لونڈا ایک گھر میں کودنے کے لئے چڑھا ہوا تھا۔ ابھی سانولی چھپر سے ذرا ہی دور آئی تھی۔ اور اپنی بکھری ہوئی لٹوں کو چوڑے کنارے والی ساڑی کے پلو کے نیچے ٹھونس ہی رہی تھی کہ شیامو نے بیڑی سلگانے کو دیا سلائی جلائی۔ دیا سلائی چمکی اور اس سے درخت والے کی نظریں اس طرف مڑ گئیں اس نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ کیا معاملہ ہے۔

شیامو خوش تھا اور بہت خوش۔ بات یہ تھی کہ آج اسے وہ چیز مل گئی تھی جو شادی سے بھی نہیں ملی تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کے باپ نے اس کی شادی ایک سیر سونے کے ساتھ کر دی تھی۔ اس سونے کے ساتھ جہیز میں گوشت کا ایک ڈھیر بھی آگیا تھا۔ اس ڈھیر سے شیامو کو کسی طرح دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔ لیکن آج شیامو کو ایک ایسی بیوی مل گئی جیسی کہ وہ چاہتا تھا۔ اس طرح ہزاروں آرزوؤں کی ایک آرزو جو تھی وہ پوری ہو گئی۔

سانولی میری ہو گئی بالکل میری" مگر جیسے ہی شیامو کے اندر سے یہ صدا نکلی' اس کا دل جو ہمیشہ سے یہ دھڑکا رکھنے کا عادی تھا کہیں کوئی میری اچھی چیز کو لے نہ اڑے ' اچھل کر بولا "اور یہ جو تیری سانولی کو اچک لے گیا تو؟" شیامو نے اپنے کو سمجھایا کہ میں برسوں سے اس خوف میں مبتلا ہوں کہ کہیں ڈاکو بھگتو جو اس طرف کے دیہاتوں پر حملہ کرتا رہتا ہے میرا ایک سیر سونا نہ لے اڑے لیکن آج تک یہ خوف خوف ہی رہا۔ پھر یہ یقین کیوں نہ کر دوں کہ اسی طرح یہ دوسرا خوف بھی خوف ہی رہے گا۔

(۴)

امر سخت سے سخت زمین کو اپنے ہل اور پسینے سے توڑ سکتا تھا۔ گہرے سے گہرے کنوئیں سے اپنے فولادی بازوؤں سے پانی نکال کر کھیت کو سیراب کر سکتا تھا۔ لیکن

قسمت کی خرابیوں سے مقابلہ کرے سوا اس بات کی اب اس میں ذرا بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے باپ دادا جانے کب سے ذات پات اور سماج کی سختیوں، حاکموں اور دھرم کے رکھوالوں کی زیادتیوں اور ہواؤں اور بادلوں کی بدوفائیوں کو سہاگ کی خرابی سمجھتے اور اپنی ہمتوں کو ان کے قدموں پر جھکاتے چلے آئے تھے۔ ایک پکے کسان کی طرح امر نے بھی یہی سیکھا تھا۔ اور مصیبتوں کے خلاف جمنا اور احتجاج کرنا، تو دور دور بھی اس کے مزاج میں نہ تھا جب مدن اس کی نئی گوئی لے گیا تو اس نے روایتی کسانی مزاج نے اس سے کہا کہ یہ بھی سہاگ کی خرابی ہے اس لئے چپ ہو رہو۔ لڑائی جھگڑا کرنے سے یا تھانہ کچہری کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس نے یہی جیتا کو بھی سمجھانا چاہا۔ لیکن جیتا میں کچھ بغاوت سی بھی تھی اور دیور اور دیورانی کی ایسی بے وفائی کو خاموشی سے برداشت کرنا اس کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ اس لئے امر کے مسلسل غصے اور خوشامد کی وجہ سے وہ خاموش تو رہی لیکن اندر اندر کڑھتی رہی۔

امر نے پرانی گوئی سے کھیتی شروع کردی۔ اس گوئی کا داہنا بیل بار بار بیٹھ جاتا تھا۔ جب بھی وہ بیٹھتا تو امر بھی ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے بھاگ کو برا بھلا کہہ کر ذرا دیر کے لئے بیٹھ جاتا اور پھر بیل کو مار مار کر چلانے لگتا۔

ایک دن مہاراج نے کھیت پر آ کر یہ معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس سے پہلے وہ کانوں سے سن چکے تھے دیکھ کر بہت بگڑے۔

بوڑھے بیل سے کام لیتے ہوئے شرم نہیں آتی ہے ایسے کٹھور سپوت ہو کہ بوڑھے باپ کو ایسے بڑھاپے میں بھی آرام نہیں کرنے دیتے ہو۔

اگر بیل مر گیا تو سات سال کا پرائسچت کرنا ہوگا مجھے کچھ ؟

مہاراج کے قبضے میں غضہ بھی تھا اور سزا دینے کی طاقت بھی۔ اس لئے امر جپ چاپ کھیت سے اپنے بیل لیکر چلا آیا۔ جیتیا اس وقت کھیت جانے کی تیاری کر رہی تھی امر کو اس طرح آتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ کیا معاملہ ہے۔ امر نے مہاراج کی بات بتائی۔ جیتیا نے جو نی تو اس کے چہرے سے شعلے نکلنے لگے اور بولی۔

تم اگر اسی طرح ساری دنیا سے دبتے رہوئے تو خود کیسے جیو گے اور کیسے اپنے ان دونوں بچوں کو جلاؤ گے تم سہو یہ ظلم میں تو نہیں سہہ سکتی۔

اس کے بعد جیتیا کسی طرف چلی گئی اور اس نے امر کو بگڑنے یا سمجھانے کا ذرا بھی موقع نہیں دیا۔

شام کو مدن نے آکر اپنے بیل باندھے ہی تھے اور اس کی بیوی پرنیا ہاتھ میں لوٹا لئے اس کے پاؤں دھلا رہی تھی کہ جیتیا بھری ہوئی آئی اور مدن سے بولی۔

" دیکھو لالاجی میں لے جاتی ہوں اپنی گوئی۔ اب ہمت ہو تو اٹھاؤ ہنیا اور کاٹ ڈالو میرا گلا۔"

مدن سٹپٹا کر کہنے لگا۔

" بھوجی ....!"

اس کے آگے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ مگر پرنیا لوٹا پھینک کر بیلوں کے سامنے اچک کر کھڑی ہو گئی اور غصے سے آگ ہو کر کہنے لگی۔

"بیل لے جانا ہے تو ہمو جی تم ہی نہ ہنیا اٹھا کر میرا گلا کاٹ ڈالو میرا بھی اور بچہ کا بھی اس کے بغیر تم بیلوں کو تو نہ لے جا سکو گی۔"

"تو ہٹ مردار"

جیتیا آگے بڑھی تو پریما نے اس کو دھکا دے دیا۔

دھکے سے جیتیا دیوار پر جا گری اور اس کے سر میں چوٹ آ گئی۔ پھر جیتیا نے اپنے کو سنبھالا اور لپک کر پریما کو ایک تھپڑ مار دیا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے گتھ گئیں اور بال اور چہرے نوچنے لگیں دونوں کی زبانیں دو چکیوں کی طرح گھر گھر چلنے لگیں۔ گالیوں اور کوسنوں میں پریما پہلے ہی سے بہت آگے تھی اور جیتیا اس میدان میں پیر بڑھایا کرتی تھی۔ مدنا یہ جنگ دیکھ کر چرپائی کر کھڑا ہو گیا اور چلانے اور ڈانٹنے لگا۔ آس پاس کے مرد اور عورتیں اور بچوں نے آ کر گھیرا سا ڈال دیا اور یہ سب دونوں کو سمجھانے بجھانے لگے۔

"ارے جیتیا رانی تو ہی چھوڑ دے۔"

"میں چھوڑ دوں تو کیسے چھوڑ دوں۔ یہ مردار تو جونک کی طرح چمٹ گئی ہے" "ہٹ ہٹ!"

"میں ہٹوں۔ میں تجھ سے بہت دب چکی ہوں۔ اب نہیں دبنے کی۔"

جیتیا نے اپنے کو چھڑانے کی جو کوشش کی تو اس کی لاکھ کی ایک چوڑی ٹوٹ کر پریما کے گال میں ذرا سی لگ گئی اور خون نکلنے لگا۔ اس پر پریما نے جو جلبلا کر جیتیا کے ہاتھ میں کاٹا ہے تو اس کے دانت اندر اتر گئے اور خون کی دھار بہنے لگی۔ دونوں کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور دونوں نیم برہنہ سی ہو گئیں

تھیں۔ سر کے بال الجھے ہوئے تاگوں کی طرح چہرے پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ چہرے چوٹوں اور خراشوں سے کٹھل بن چکے تھے۔ اب تک ان کو چھڑانے کی ساری کوشش بیکار ہو چکی تھی۔ ایسے میں امر آ پہونچا۔ آتے ہی اس نے چیتا کو اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ پریا بھی جس نے چیتا کو چھوڑا نہیں تھا کھنچتی ہوئی چلی آئی۔ اسی وقت مدن نے پریا کے دونوں بازو پیچھے سے پکڑ لئے اس طرح جب ادھر ادھر دونوں طرف سے زور لگا تب پریا کے ہاتھوں سے چیتا چھوٹی۔

امر اسی طرح کھینچتا ہوا چیتا کو گھر کی طرف لے چلا۔

"بھر پایا نہ تو نے۔ مٹی میں ملا دی نا اپنی ساری بڑائی۔ چلی تھی ادھر چھ کا بات چت کرنے"

"چیتا" ہاں تجھی کو کہو گے۔ اپنے پیارے بھائی اور پیاری بھاوج کو نہ کہو گے"

لیکن چیتا تھی دل ہی دل میں شرمندہ اپنی اس حرکت پر۔ اسی وجہ سے وہ پریا کے ان کوسنوں اور گالیوں کا جواب نہیں دے رہی تھی جو اس کا تعاقب کرتے ہوئے گھر تک چلے آئے اور پھر گھنٹوں وہاں تک آتے رہے۔

مدن نے جوتا اتار کر پریا کو بہت پیٹا۔ لیکن وہ جوں جوں پیٹتا جا رہا تھا پریا کی گالیوں اور کوسنوں کا زور بڑھتا جاتا۔ آدھی رات تک یہی عالم رہا آخر جب پریا کا بچہ اتنا بلکنے لگا کہ پریا کے ممتا کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا تب وہ دودھ پلانے میں لگ گئی اور اس وقت اس کی زبان رک گئی۔

ابھی پریا کی زبان پوری طاقت سے چل رہی تھی کہ رمضان اپنے ساتھ دو چار کسانوں کو لے کر پہلے امر کے پاس آیا اور پھر مدن کے پاس گیا اور دونوں سے

اس نے یہی کہا کہ آپس میں دونوں سمجھوتا کر لو۔ ورنہ ضلیع دار، پٹواری، چوکیدار، اور مہاراج یہ سب مل کر تم دونوں کا خون چوس لیں گے۔ اور آنا جرمانہ لگائیں گے کہ جس گوئی کے لیے جھگڑا ہے وہ نیلام ہو جائے گی۔ اور دونوں کے ہاتھ سے چلی جائے گی۔ امر نے تو معاملہ ان ہی کسانوں پر چھوڑ دیا اور کہا کہ ... کر جو بھی فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہوگا۔ لیکن مدن نے اپنا مقدمہ دوسری طرح ... دیا۔

"بھیا جب سے کٹ پورہ آئے ہیں یہی کہہ رہے ہیں کہ کھیت گوئی اور گھر یہ تینوں بھائیوں کے بٹوارے کا غذ میں بھی انھوں نے یہی لکھوایا ہے۔ لیکن ان پانچ برسوں میں میں محنت کرنے میں بھیا سے کسی طرح ... پیچھے نہیں رہا۔ لیکن مجھے ایک وقت کے چبینے اور دوسرے وقت کی روٹی کے ... اور لیا ملا۔ جب میں الگ ہوا تو اپنا گھر الگ بنا لیا اور پہلے والا گھر بھیا ہی کے لیے چھوڑ دیا۔ اب کیا میں ایک گوئی بھی نہ لوں۔ اب اگر بھیا یا بھوجی کچھ ... نا چاہیں تو کر لیں میں یہ گوئی نہیں دوں گا۔"

مدن کسی طرح معاملے کو پنچوں پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

تیسرے دن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا یعنی نائب تحصیل دار صاحب آ گئے اور انھوں نے سپاہی بھیج کر امر اور مدن دونوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم لوگ دنگا فساد کیوں کر رہے ہو۔ پھر انھوں نے امر کی طرف مہربان نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"کہو تم کو کیا شکایت ہے مدن سے؟"

امر نے ہاتھ جوڑ کر کہا

"حضور کوئی شکایت ہوتی تو میں آپ کے پاس کیوں نہ جاتا۔

مجھے کوئی شکایت نہیں ہے ۔"

یہ بات تحصیل دار صاحب کی توقع کے بالکل خلاف ہوئی کیوں کہ اس کے جواب سے سارا مقدمہ ہی ختم ہو گیا۔ وہ گرج کر بولے ۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر پرسوں تم لوگوں نے رات بھر کیا شور مچایا تھا ۔"

مدن نے جواب دینے کے لئے منھ کھولا ہی تھا کہ امر نے ڈانٹ کر کہا۔

"تو چپ رہ بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے تو جواب دینے والا کون ۔ حضور پرسوں جو دنگا ہوا تھا وہ ہم دونوں کی عورتوں میں ہوا تھا ۔ ہم دونوں ان کو پکڑ لے گئے اور میں نے اپنی عورت کو جوتے سے خوب پیٹا اور مدن نے بھی اپنی عورت کی ایسی ہی خبر لی ۔ اب آپ جانیں کہ عورتوں کی باتیں تو ایسی ہوتی ہی ہیں ۔"

"نائب صاحب نے اب مدن سے گرج کر کہا کہ تو بتا کہ امر نے تیرے ساتھ کیا زیادتی کی ہے میں انصاف ضرور کروں گا ۔"

"حضور بات وہی ہوئی تھی جو بھیا نے بتائی ۔ عورتوں عورتوں میں کچھ کہا سنی ہو گئی تھی ۔"

نائب صاحب نے لاکھ زور لگایا مگر نہ تو امر نے مدن کی شکایت کی اور نہ مدن نے امر کی ۔ آخر نائب صاحب نے مقدمہ اس طرح خارج کر دیا ۔ کہ امر اور مدن کے اس جرم پر کہ انھوں نے اپنی عورتوں کو اتنا موقع کیوں دیا کہ وہ اس طرح لڑ پڑیں ان دونوں پر تھوڑا تھوڑا جرمانہ بھی لگا دیا اور سب کے سامنے اپنے

سپاہی سے پانچ پانچ جوتے بھی لگوا دیئے۔

۵

امر اور جیتیا یا تو دو گوئی کے کسان تھے یا وہ مہاراج کے کھیت مزدور بن گئے۔ نائب تحصیل دار صاحب کے جانے کے بعد امر لالاجی کے پاس گیا اور اپنی پگڑی ان کے قدموں پر ڈال کر کہنے لگا کہ اتنے پیسے دے دو تو ایک گوئی بیل لے لوں۔ زندہ رہا تو مع بیاج کے ادا کر دوں گا۔

امر کی ایک زمانے میں بڑی ساکھ تھی کیوں کہ اس کے پاس کام کرنے کے لیے چھ بازو تھے اور دو گوئی بیل تھے۔ لیکن اب وہ ساکھ ختم ہو چکی تھی اس کے پاس صرف دو بازو تھے اور گوئی کوئی بھی نہیں تھا اس ساکھ کو دیکھتے ہوئے جو رقم امر مانگ رہا تھا وہ بہت ہی زیادہ تھی۔ اس لیے لالاجی نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ امر نے رمضان اور دوسرے بڑے بڑے کسانوں کی سفارشیں بھی کرائیں لیکن لالاجی ذرا بھی نہ پسیجے۔

آخر امر اور جیتیا چھوٹے راموسمیت اچھے مستقبل کی امیدوں کو دل میں دفن کر کے مہاراج کے کھیت میں کام کرنے لگے۔ چار سالہ چھوٹی بچی کھیت کی مینڈ پر کھیلتی رہتی اور وہیں روتی اور وہیں روتے روتے سو جاتی۔ رامو چھوٹا

مزدور بن کر دن بھر چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا۔ امر اور جیتا تو گدھے کی طرح جتے رہتے۔ اس طرح ان لوگوں کے دن گزرنے لگے۔

اپنے کھیت میں کام کرنا اور چیز ہوتا ہے اور دوسرے کے کھیت میں کام کرنا اور چیز۔ اگر اپنے کھیت پر کم یا زیادہ کام کرو تو صرف دھرتی شکایت کرتی ہے اور کوئی کچھ نہیں کہتا ہے۔ لیکن یہاں دھرتی کے سینے پر مہاراج بیٹھے تھے اس لئے یہاں ہر وقت کڑوی باتیں تھیں۔ جھڑکیاں تھیں، ڈانٹ تھی اور کام اتنا تھا اتنا تھا کہ ختم ہونے ہی کو نہیں آتا تھا۔

مہاراج نے نوکر رکھتے سمے کہا تھا کہ مزدوری کے ساتھ کھانے کو بھی دیں گے اور پھر انھوں نے ایسا کیا بھی اور کھانے کو دیا۔ مگر کیا دیا؟ وہ کھانا دیا جیسے ان لوگوں نے اب تک بہت گھٹیا سمجھا تھا۔ یعنی جوار، باجرہ اور کودوں۔ گیہوں دینے کا کیا سوال۔ مہاراج نے تو چوتک نہ دیئے۔ سال بھر ہوگیا اور ان لوگوں کو گڑ چکھنے کو بھی نہ ملا۔ یہ لوگ تھکے تھکے آتے۔ تین موٹی موٹی روٹیاں ایسا کہ چٹنی سے کھالیتے پھر صبح بھیجے بھیجے جاکر کھیت میں کام کرنے لگتے۔

"اتنا تو کھانا ہی کرتا ہے یا کام بھی کرتا ہے؟"

"ایسا تو نہ کہو مہاراج، دیکھو ادھر کے کھیت میں پانی پہونچا دیا کہ نہیں۔ اتنا کام کچھ کم ہے؟"

"یہ تو آدھے دن کا کام ہے۔"

یہ سن کر جیتا سے نہ رہا گیا

"ایسی باتیں تو نہ کرو مہاراج۔ ہم نے زندگی بھر کھیت بویا ہے اور جانتے ہیں کہ آدھے دن میں کتنا پانی لگتا ہے۔"

اتنا کہہ کر جیتیا خاموش ہو گئی اب جیتیا پرانی جیتیا نہ تھی، اب تو اس کی پرانی تیزی رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی اگلی کڑک جاتی رہی تھی اور غصہ کی آواز میں بھی لجاجت آ گئی تھی۔

جب سردی بڑھی تو پالے بھی آ گئے اور پانی بھی برسنے لگا۔ اس کے ساتھ کلیجے کو کاٹ دینے والی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ جب پانی اور ہوا سے امر تنگ آ جاتا اور ان کی وجہ سے کھانسی زیادہ تکلیف دینے لگتی تو منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل جاتی یا ساتھ یہ صدا آتی۔

"ہے بھگوان اب تو پانی روک دے۔"

امر کے کھیت میں دانہ نہیں پڑا تھا اور اس کے اپنے جسم پر سردی سے بچانے کو کچھ نہیں تھا۔ لیکن تھا آخر وہ کسان ہی۔ اپنی آہ سن کر خود اس کا دل چلا کر کہتا کہ کس چیز پر آہ بھر رہے ہو؟ اس پانی پر؟ جانتے ہو کہ یہ وہ رس کی بوندیں ہیں جو کھیت میں سونا اگا دیتی ہیں۔

امر کے منہ سے دوسری بار آواز یہ نکلتی۔

"شکر ہے بھگوان تو نے ہمیں پر پانی دے دیا۔"

امر اور جیتیا کو اس طرح تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے دو سال گزر چکے تھے لیکن اس کا کسان والا دل تھا کہ ابھی تک جوان تھا۔ اس دل نے سوکھا، جاڑے اور پالے کی تباہیوں کے سامنے اگر سر جھکانا سیکھا تھا تو یہ بھی سیکھا تھا کہ اچھی بارش اور بھرپور فصل کی آس اور صرف آس لے کر کسی طرح زندگی تباہی جاتی ہے۔ اس لئے نہ تو ان دونوں کے بازوؤں میں محنت چوری آئی تھی اور نہ اچھے دنوں کی آس مرجھائی تھی۔ یہاں تک اپنے کھیت کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنا بھی

انھوں نے ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔

پانی برس رہا ہو یا لو چل رہی ہو، دانت کٹ کٹاتی سردی ہو یا اولے پڑ چکے ہوں، جو بھی ہو، چینیا دن میں ایک مرتبہ اپنے کھیت پر جاتی ضرور تھی اور بہت درد اور محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہتی تھی۔

"میا یہ نہ سمجھنا کہ ہم نے تجھے چھوڑ دیا ہے، دن رات اپنا من تجھی میں لگا رہتا ہے"۔

جب کبھی وقت مل جاتا تو چینیا اپنے کھیت کی گھاس اس طرح چنتی۔ جیسے کنوارپن میں اپنی ماں کے سر سے جوئیں چنتی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے یہاں تک کیا کہ اپنے کھیت میں دس بیس پودے دھان کے بو بھی دیئے اور ان کی خبر بھی لیتی رہی۔ لیکن رکھوالی نہ کر سکی اس وجہ سے ان کو کوئی جانور چر گیا۔ چینیا یہ بربادی دیکھ کر آنسو پونچھ کر رہ گئی اور مہینوں اس نقصان کا افسوس رہا۔

امر چینیا کے ان کاموں میں الگوا تو نہیں بنتا تھا لیکن ساتھ برابر دیتا تھا۔ جب بھی وہ کھیت پر جانے لگتی تو یہ ضرور ساتھ جاتا اور جب تک چینیا ٹھہرتی یہ بھی ٹھہرتا۔ کبھی یہ نہ کہتا کہ "اب چل"۔

"کیسی اپنی سوگندھ آرہی ہے اپنے کھیت سے"

"ہاں اب بیج پڑے تب دیکھنا کیسی اپجاؤ بن چکی ہے"۔

زمین کو اپجاؤ رکھنے کے لئے امر اور چینیا دونوں برسات میں اس کی میڑوں کو ضرور درست رکھتے تھے۔ اور لوگوں سے کہتے تھے کہ اپنے گائے بیل چرنے کے لئے وہاں چھوڑ دیں۔

سب سے بڑا مسئلہ تھا کھیت کے لگان کا۔ گو کہ ابھی تک وہ اتنا نہیں بڑھایا گیا تھا جتنا آس پاس کے دیہاتوں کی زمینوں کا بڑھا دیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ان دونوں کے بس سے باہر تھا اس کا ادا کرنا۔ پر جس طرح بھی بن پڑا یہ لوگ ادا کرتے رہے۔ خود بھی آدھا پیٹ کھایا اور بچوں کو بھی آدھا پیٹ کھلایا۔ خود بھی سردی سے ٹھٹھرتے رہے اور بچوں کو بھی ٹھٹھرنے دیا، پر لگان برابر ادا کرتے رہے۔ لیکن اس سال ایسا نہ کر سکے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ان دونوں کو مہاراج نے جو اناج دیا تھا۔ وہ بہت کم پڑ گیا۔ کیوں کہ بچے بڑے ہو گئے تھے اور ان کی غذا کافی بڑھ گئی تھی۔ اس لئے امر کو تھوڑا بہت اناج بازار سے خریدنا پڑا۔ بازار میں دام اتنے چڑھے ہوئے تھے کہ دو ہی مرتبہ کی خریداری میں ساری رقم نکل گئی۔

امر اور چمپا نے مہاراج سے خوشامد کی کہ کچھ روپیہ قرض دے دو تاکہ لگان ادا کر دیا جائے۔ پھر دونوں نے لالا جی سے بھی کہا۔ لیکن ان مہاراج اور لالا دونوں کے لئے پیسہ کمانے کے نئے نئے ذریعے نکل رہے تھے اس لئے دونوں نے انکار کر دیا۔

ایک دن جب امر سر جھکائے اپنے کھیت سے اس طرح روتا آ رہا تھا کہ آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ اس کو دھنری مل گئی۔ اس نے خود ہی سلام کیا۔

"پاؤں لاگی مہتو۔ کہو کھیت کب تک چھوڑے رکھو گے؟"

"کیا بتاؤں۔ اب دیکھو کھیت رہتا بھی ہے یا نہیں؟"

"کیوں؟"

"اب تک جیسے تیسے لگان ادا کیا۔ پر اب کی بار ادا ہو سکا اور کوئی قرض بھی نہیں دے رہا ہے۔ سنا ہے کہ قرقی آنے والی ہے جو کھیت نکال لے جائے گی۔

"تو کیا کھیت نکل جائے گا بھیا؟"

"اور نہیں تو کیا ہوگا؟"

"ہائے یہ تو برا ہوگا۔"

امر نے دھنیا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر واقعی رنج تھا۔ امر کو وہ دن یاد آ گئے۔ جب اس نے بابو کو چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ دودھوا دھنیا کے کھیت کی دیکھ بھال کیا کرے۔

اس واقعہ کے چار روز بعد ایک دن دھنیا بہت سویرے سویرے امرا اور جیتا کے گھر آئی۔ اور کہنے لگی۔

"میں وہ دن بھولی نہیں ہوں جب تم نے مجھ دودھوا کی خبر لینے کے لئے بابو کو میرے کھیت پر کام کرنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ تم لوگوں کی یہ شرافت میں نہ بھولی ہوں اور نہ بھول سکتی ہوں۔ لو بھیا امر۔ کھیت کا لگان تم ادا کر دو۔ اور دیکھو نا نہ کرنا۔ نہیں تو میں سمجھوں گی کہ تم نے مجھے اپنا نہیں سمجھا۔"

جیتا حیرت سے دھنیا کی طرف دیکھنے لگی۔

جیتا آج کل کے دکھ بھرے کالے دنوں سے گھبرا کر جب کبھی پچھلے سکھ کے دن یاد کرتی تھی تو اس کو رام لال کی محبت بھی یاد آتی تھی کہ کس طرح وہ پیچھے لگا رہتا تھا سایہ کی طرح۔ بات کرنے کے کیسے کیسے

طریقے نکالتا تھا۔ بہت مرتبہ تو ایسا ہوا کہ اس کو جو کچھ چیتا سے کہنا ہوا وہ بانو یا مدن سے آکر کہہ دیا۔ کبھی کہتا کہ "کل صبح صبح میں جنگل لکڑیاں لینے جاؤں گا اور دوپہر کو تال پر آکر اپنی بھوتری بناؤں گا۔

کبھی کہتا "آموں پر بور کیسا اچھا آیا ہے اس کی چٹنی بناؤ تو لا دوں" پھر خود ہی کہتا۔

"اچھا کل لے آؤں گا"

کبھی کہتا۔" تمہارے گھر سبزی کیسے مزے کی بنتی ہے ایک دن کھا لو تو مہینوں مزا یاد رہے۔ کسی نہ کسی دن میں اپنی سبزی لاکر بنواؤں گا۔"

چیتا جانتی تھی کہ یہ سب باتیں اسی سے کہی جا رہی ہیں درا صل رام لال چاہتا یہ ہے کہ میں اس سے تال کے کنارے آکر ملوں اور وہ جب دوپہر کو آم کا بور لے کر آئے تو اس وقت گھر ہی میں موجود رہوں۔ کیوں کہ اس وقت بچوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ چیتا ان باتوں کو سوچ کر اب بھی خوش ہوتی تھی۔ لیکن اسے یہ کوفت تھی کہ اب رام لال نے مجھے اس طرح بھلا دیا گویا کہ اس گاؤں میں میں ایسا ہوں ہی نہیں۔ کم سے کم دو چار لفظ ہمدردی ہی کے کہہ دیا کرتا کیا راکھی باندھنے کے بعد سب قسم کی ہمدردیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اب تو وہ بس دھنری میں مگن ہے۔ چیتا کو دھنری سے نفرت تھی۔ اسی وقت سے تھی جب کہ اس نے بانو کو پھانسا تھا۔ اور جب اس نے رام لال کو بھی پھانس لیا تو وہ نفرت بہت بڑھ گئی۔

اس وقت جیتا نے جو دھنری کی طرف دیکھا تو دھنری کی آنکھوں میں محبت اور شکر گزاری نظر آئی۔ پھر دھنری کہنے لگی۔

"میں تو بہت دنوں سے تمہارے پاس آنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ ایسے کالے دل کا ہے کہ جب چلنے کے لئے پوچھو تو کہتا تھا ان لوگوں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ایسے میں ملنے جاؤ گی، تو ضرور قرض مانگیں گے۔ لیکن کل امر بھیا کے مکھڑے پر بپتا کا اندھیرا دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ کیا بات ہے۔

پھر دھنری کہنے لگی۔

بھیا اور بھوجی تم دونوں ان پیسوں کی فکر نہ کرنا۔ ان کی اس کو کوئی خبر نہیں۔ یہ میرے اپنے جوڑے ہوئے ہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ رام دئی کی خودکشی سے دھنری بالکل بدل گئی تھی اور اس کے دل میں بابو اور امر کے گھرانے کے لئے ایک نرم سی جگہ پیدا ہو گئی تھی لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا اظہار کیسے کر دوں اور نہ رام لال اس کا موقع دیتا تھا۔

دھنری کی آمد نے جیتا کو بہت کچھ دے بھی دیا اور اس سے بہت کچھ چھین بھی لیا۔ اس نے جیتا کو کھیت دے دیا جو اسے جان سے زیادہ پیارا تھا، اور اس نے رام لال والے ردمان کی یاد چھین لی جس سے اس کی موجودہ زندگی کی سیاہی اور چڑھ گئی تھی۔

اس سال سردیاں بھی بہت سخت تھیں جاننے والے

کہتے تھے کہ تیس سال سے اس طرف ایسی سردی نہیں پڑی ہے۔
پھر اس پر ستم یہ ہوا کہ امر کے گھر کی یعنی اس کے کمرے کی چھت کا ایک
حصہ جس میں اس پورے گھرانے کی بودو باش تھی، اس سال برسات
میں گر گیا تھا۔ چھت بارہا سال بہت کمزور ہوگئی تھی اور صاف نظر
آتا تھا کہ دو تین دھنیاں بالکل گل گئی ہیں اور ان کا بدلنا ضروری
ہے۔ لیکن بدلنے کے لئے لکڑی کی ضرورت تھی اور لکڑی آئے کہاں سے۔
جنگل کو تو اب تاروں سے گھیرا جا چکا تھا۔ وہاں سے آ نہیں سکتی تھی
مہاراج سے امر نے لکڑی بہت مانگی بار بار مانگی لیکن ہر بار مہاراج
نے یہی جواب دیا کہ آج کل لکڑی کی لام پر مانگ بہت ہے وہاں جارہی
ہے۔ اگر بچ گئی تو دے دوں گا۔ مگر کبھی لکڑی نہ بچی اور نہ مہاراج
نے امر کو دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برسات میں ایک تہائی چھت گر گئی اور پانی
وہاں سے برابر آتا رہا۔ امر پر اور جیتا پر کام کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ گری
ہوئی چھت کے ملبے تک کو صاف نہ کر سکے جو کمرے میں ڈھیر ہو گیا تھا۔
بس انھوں نے اتنا کیا کہ ٹوٹی جگہ پر تیاور کی ایک پرچھتی بنا کر
ڈال دی اور اس میں ڈھال پیدا کرنے کے لئے ایک طرف ذرا سی دیوار
اٹھا دی۔ مگر اس طرح بھی اس کو کافی ڈھال نہیں ملی۔ اس وجہ سے
پانی برابر اس سے ٹپکتا رہا اور نیچے کے ملبے میں مرتا رہا۔ برسات بھر اس
کی سڑی سڑی بو اٹھتی رہی۔

جاڑوں میں امر اور جیتا نے پرچھتی کے دونوں طرف اس جگہ
کو جو ڈھال نکالنے کی وجہ سے کھل گئی تھی۔ پتوں اور تیاور سے ڈھانک

دیا۔ لیکن اس پر بھی کافی سانس رہ گئی اس طرف سے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آجاتے تھے۔

امر اور جیتا کی دھوتیاں چیتھڑا ہو گئی تھیں اور جاڑوں والی مرزئی تو اب ایسی تھی کہ پہنو تو اور نہ پہنو تو ایک سی سردی لگتی۔ رامو کے پاس پہننے کو کچھ بھی نہ تھا جیتا نے اپنی دھوتی پھاڑ کر ایک چیتھڑا لنگوٹی کی طرح باندھ دیا تھا وہی اسے ہوا سے بھی بچاتا تھا اور سردی سے بھی۔ اس لنگوٹی میں اس نے برسات کاٹی اور اسی سے اب جاڑے کاٹ رہا تھا۔

امر اور جیتا کے پاس پانچ سال پرانی ایک رضائی تھی لیکن اس میں اتنے چھید ہو گئے تھے کہ اس کو اوڑھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ کئی مرتبہ جیتا نے اسے سوئی تاگے سے درست کرنا چاہا لیکن یہ کام اس سے نہ ہو سکا۔ اسے سوئی چلانا تو آتا تھا، لیکن کپڑے میں جوڑ بٹھانا اور کتر بیونت کرنا، پیوند لگانا، پھٹے پرانے کپڑے کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا کہ اس کی مرمت کیسے کی جائے، یہ باتیں اسے آتی ہی نہیں تھیں۔ اس لئے رضائی کی کھڑکیاں اس کے بند کئے بند نہیں ہوتی تھیں۔

برسات بھر جیتا کو جاڑا بخار آتا رہا اور جاڑوں میں امر کو کھانسی نے آدبایا۔ دن بھر کھیت تھکاتا اور رات کو کھانسی تھکاتی۔

جیتا سوئی کی طرف سے ناکام ہونے کے بعد یہ کوشش کرنے لگی کہ امر کو اپنی فکر سے گرم رکھے۔ وہ رات کو بار بار اٹھ کر امر کے اوپر کا پیال درست کرتی اور رضائی کو اس کے اور بچوں کے سر اور بازوؤں پر کھینچتی رہتا۔

لیکن بچوں کی نیند بےچین کی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتے رہتے اور کبھی پاؤں ادھر تو کبھی ہاتھ ادھر مارتے تھے جس سے کمبل کھل جاتا اور جیتیا کو پیال درست کرنا پڑتا۔ اس طرح جیتیا بار بار جاگ کر صبح کر دیتی۔

مگر جب کبھی امر کی آنکھ کھل جاتی اور وہ جیتیا کو پیال درست کرتے ہوئے دیکھتا تو اس پر بگڑتا "دو ڈھائی مہینے کے بعد جاکر تیرا بخار ٹوٹا ہے اب اس طرح جو بار بار اٹھ اٹھ کر سردی کھائے گی تو کیا وہ پھر لوٹ نہ آئے گا۔"

جیتیا کہتی "ذرا اپنے کو تو دیکھو رات بھر کھوں کھوں کرتے رہتے ہو۔ اگر سردی کھانے کی وجہ سے کھانسی ٹھہر گئی تو؟"

دو دن سے امر سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا کیوں کہ جہاں دو چار نوالے حلق سے اترتے اس کو کھانسی کا دورہ پڑ جاتا۔ الٹی ہو جاتی اور سب کچھ نکل جاتا۔ کھانسی یوں اور بڑھ گئی تھی کہ ان لوگوں کا بدن ایک ہفتہ سے ایک گھنٹہ کے لئے بھی گرم نہیں ہوا تھا۔ رات بھر سردی کھاتے تھے اور دن بھر سردی کھاتے تھے۔ بارش ہو چکی تھی اور اب کئی روز سے برفیلی ہوا چل رہی تھی جو سینہ کو توڑ کر کلیجے کو برما دیتی تھی۔ دن کو سورج یا تو منھ دکھاتا ہی نہ تھا یا اگر دکھاتا بھی تھا تو کہرے کی ایسی موٹی چادر اوڑھ کر کہ اگر دن کو اس کی لال لال آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ تو ذرا بھی ان میں ٹھنڈک نہ پیدا ہو۔

رات کچھ اولے بھی پڑ گئے تھے اور ابھی تک آسمان ان بدلی کے گالوں سے پٹا پڑا تھا جن سے سردی برستی ہے۔ سورج ان ہی میں چھپا ہوا تھا اور سردی برسانے میں ان کا شریک تھا۔ آسمان تو آسمان۔ سبز درختوں سے

بھگا سردی ٹھیک رہی تھی اور نم زمین سے بھی اُبل رہی تھی۔ ہوا بھی ایسی ٹھنڈی تھی کہ پاؤں اس کی وجہ سے ایسے سُن ہو گئے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں ہیں —

آج امر جب کھیت سے آ رہا تھا تو وہ بہت تھکا تھکا سا تھا۔ آتنا کہ خلاف معمول ایک جگہ اسے آرام لینے کے لئے ٹھہرنا بھی پڑا۔ چیتا کو امر کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس حالت میں ترس کھانا بھی تکلیف پہونچانا ہے نہ میں امر کی تکلیف کو کم کر سکتی ہوں اور نہ وہ میری تکلیف کو۔ ایسی حالت کہ بس بھگوان ہی کچھ کرے تو کرے اور کسی کے بس کا کچھ نہیں ہے۔

امر گھر کی طرف لوٹ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ رات کیسے کاٹے کٹے گی۔ وہی کھانسی، وہی سردی اور وہی بچوں کی فکر کہ کہیں وہ سردی نہ کھا جائیں۔ بھگوان ایسی زندگی سے کیا حاصل۔ میری ذات سے نہ تو چیتا کو کوئی خوشی مل رہی ہے اور نہ بچوں کو۔ اور میرے لئے تو ہر دن پہاڑ ہو رہا ہے۔ پھر میں کیوں زندہ ہوں۔ میں نہ رہوں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے بھاگ کھل جائیں۔

گھر پہونچ کر امر کو ایک بے حد عجیب چیز دکھائی دی۔ وہ یہ کہ رامو نیا کرتا پہنے گھوم رہا ہے۔ اور ایک چمکیلا باجا زور زور سے بجا رہا ہے۔ امر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ کھڑا ہو کر دیکھنے لگا اور ذرا دیر تک دیکھتا رہا

"رامو یہ سب کس نے دیا ہے ؟"

"نہیں بتاتے، نہیں بتاتے !"

رامو پھر کود کود کر باجا بجانے لگا۔ اب تو اس میں ایک شرارت بھرا

جوش بھی پیدا ہو گیا تھا۔

امر تو بیٹھ بیٹھے کر آیا تھا اور چنیا اس کے ساتھ ساتھ۔ لیکن رامو کھیت سے سیدھا بھاگتا ہوا گھر آ گیا تھا اس وجہ سے ان دونوں سے پہلے پہونچ گیا تھا۔

چنیا بھاگتی ہوئی گھر میں گھس گئی اور وہاں سے اس کی خوشی کی چیخ سنائی دی ۔" مورا بابو"۔

امر بھی بھاگ کر اندر آ گیا۔ چنیا خوشی سے رونے لگی امر نے بڑھ کر بابو کو زور سے اتنے زور سے جتنا کہ اب امر کے جسم میں رہ گیا تھا، چمٹا لیا اور اس کی آنکھوں سے موسلا دھار آنسو بہنے لگے ۔ بابو بھی رونے لگا۔ رامو ان تینوں کو روتا دیکھ کر گھبرا گیا اور باجا بجانا بھول کر سب کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔

امر نے کئی مرتبہ بابو کو لپٹا لپٹا لیا ۔ امر کو بابو کے جسم میں وہی بو ملی جو اس وقت ملتی تھی جب بابو بچپن میں امر کے ساتھ اس کے کھاٹ پر سویا کرتا تھا۔

" ہم لوگوں کو تو تو نے بھلا دیا بابو۔ کتنے سال ہو گئے بچھڑے ہوئے۔"

بابو جب گیا ہے تو امر اور چنیا کے چہروں پر جوانی کی چمکنا ہٹ تھی۔ لیکن اب چودہ پانچ سال کے بعد آیا تو اس نے دیکھا کہ دونوں بوڑھے ہو رہے ہیں بال آدھے سفید ہو گئے ہیں۔ چہروں پر جھریاں بھی آ گئیں ہیں اور بے رونقی بھی۔ امر کی کمر میں ذرا سا خم بھی آ گیا ہے جو کہہ رہا ہے کہ زندگی کے بوجھ نے کمر توڑ دی۔

" بھیا بھوجی، بھیا بھوجی"

بابو نے اسی طرح ان دونوں کو پکارا جیسے وہ بچپن میں، جب وہ تتلیاں پکڑا کرتا تھا، اس وقت پکارتا تھا ـــــ بابو کی آنکھوں کے آنسوؤں کو رامو بہت

پریم سے اپنے نئے کرتے بارے بار پوچھ رہا تھا۔ چھوٹی لڑکی رانی جو امرا اور جتیا کے ساتھ ساتھ کھیت سے آئی تھی اور جسے بابو نے اپنی گود میں بٹھا کر ایک کھلونا دے دیا تھا وہ اس کام میں راموکا مقابلہ کرنے لگی۔ بچوں کی ان باتوں سے بابو ہنس پڑا۔ پھر وہ جتیا سے کہنے لگا۔

"بھوجی۔ میں لام پر چلا گیا تھا اور اب لڑائی کے ختم ہونے پر آیا ہوں۔ تم لوگ دیکھ لو کر لڑائی سے میرا کچھ نہیں بگڑا۔ میں زندہ بھی ہوں اور تگڑا بھی۔"

بابو لمبا تڑنگا اور سجیلا جوان نکلا تھا اس کے چہرے پر فوجی مونچھیں بہت کھبتی تھیں۔

ادھر جتیا کے آنسو بند ہوئے ادھر راموجا کر جتیا سے چمٹ گیا۔ اور اس بات کی رٹ لگا دی کہ دیکھو تو چاچا تمھارے لئے کیا لایا ہے۔

دیہاتی زندگی میں غریبی عام چیز تھی اور یہاں بڑھاپا بھی جلد آ جاتا تھا بابو نے اور اس کے ساتھ کے سب ہی لوگوں نے بچپن سے یہ سب باتیں اسی طرح دیکھی تھیں کہ ان کے لئے زندگی کی بناوٹ ہی ایسی تھی۔ اسی وجہ سے بابو کو اپنے بھائی اور بھاوج کی حالت پر جلد ہی صبر آ گیا اور وہ اپنے سامان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بابو کے ساتھ ایک لمبا سا تھیلا تھا اور ایک بڑا سا لوہے کا بکس۔ جتیا ان دونوں چیزوں کو حیرت اور خوشی سے دیکھ کر سوچنے لگی کہ ان میں کتنا سامان ہوگا۔ یہ سامان اگر پھیلا یا جائے تو میرے گھر میں تو ذرا سی بھی جگہ نہ بچے۔ وہ خوش تھی کہ بابو اتنی دولت کما کر لایا ہے۔

امرا اور جتیا کے لئے بابو دھوتیاں بھی لایا تھا اور دو گرم سوئٹر بھی جو اس نے لام سے بچا لئے تھے۔ بابو نے اسی وقت دھوتیاں اور سوئٹر بھائی اور بھاوج

کو پہنا دیئے۔

چینیا نے خوشی خوشی چراغ جلایا لیکن چراغ جلنے پر بھی بجھا بجھا سا تھا۔ اور چولھا آنچ دینے پر بھی گرمی سے خالی تھا۔ چینیا نے اچھے سے اچھا کھانا جو اس سے ہو سکتا تھا وہ پکا کر امر اور بابو کے سامنے رکھ دیا۔ امر بابو کو اپنے گھر میں کھانا کھاتا ہوا دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کو اس وقت کا دھیما چراغ روشن ستارہ معلوم ہو رہا تھا اور کمرے کی سڑی ہوئی بو میں وہ مہک محسوس ہو رہی تھی جو تپتے اساڑھ میں پہلا چھینٹا پڑنے پر پیاسی زمین سے اٹھتی ہے۔

بابو نے مدن کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ امر سمجھ گیا کہ اس کو حال کسی سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ چینیا نے کھانا کھلانے کے بعد مدن کی تو نہیں لیکن اس کی بیوی پریا کی شکایت کرنا شروع کر دی اور پھر کرتی ہی چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ مدن جو اتنا کٹھور ہو گیا ہے تو اس کی اصل وجہ پریا ہی ہے۔ کہنے لگی کہ دیکھو اس سے بڑا کٹھورپن اور کیا ہوگا کہ میں مہینوں سے بیمار ہوں اور اب تمہارے بھیا کو اتنی کھانسی آتی ہے۔ ہماری چھت ٹوٹ گئی اور ہم اور بچے سردی کھاتے رہے لیکن مدن یا پریا نے ایک بار بھی تو خبر نہیں لی۔ خون کیسا سفید ہو گیا ہے بابو۔"

بابو بالکل بدل گیا تھا۔ اس میں بڑی سنجیدگی آ گئی تھی۔ وہ یہ سب باتیں توجہ سے سنتا رہا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ جب رات آ گئی تو اس نے امر کو لٹا کر اس پر اپنے دو کمبلوں میں سے ایک ڈال دیا۔ پھر ایک پرانی سی رضائی نکالی وہ چینیا اور بچوں پر بہت پیار سے اوڑھا دی۔

(۷)

مدن بھی بابو کو دیکھ کر خوشی سے رو پڑا اور بہت
بٹھایا، کھانے کو پوچھا اسی وقت چلم بھر کر دی۔ بابو نے چلم کی جگہ بیڑی ہی پسند
کیا اور وہی پیتا رہا۔ بابو کو ایک ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ مدن اور پریا
کی بھی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ ان کے پاس کپڑے تو تھے مگر سب پرانے۔ اور کسی
کے بدن پر کوئی گرم چیز نہیں تھی۔

"کوئی روزگار کی چیز تم لوگوں نے نہیں بنائی؟"

کیسے بناتے بابو ہم نے اپنی کھیتی تو الگ کر لی مگر پیسہ نہ بچا سکے۔"

"کاہے کو نہ بچا سکے۔؟"

کیا بتائیں بابو۔ اب یہاں کی بات پہلے کی سی نہیں رہی تال سوکھ
گیا ہے۔ کیوں کہ اب تو اس کے چاروں طرف کھیت ہی کھیت ہیں جو پانی پہلے بہہ
بہا کر تال میں آجاتا تھا وہ اب کھیتوں ہی میں رہ جاتا ہے۔ اب تو آب پاشی
کے لئے پانی یا تو بادلوں سے ملتا ہے یا کنوئیں سے۔ میں نے اپنا کھیت تو الگ کر لیا پر
اس کے لئے اچھا کنواں نہ بنا سکا اس وجہ سے فصل آدھی ہوئی۔"

پھر بات یہ ہے بابو! کہ اب ہر ایک پیسے مانگتا ہے اور بہت
بہت مانگتا ہے۔ لگان بڑھا دیا گیا ہے اس پر زمیندار جی کے یہاں شادی ہو تو

ہر بیگہ پر ایک روپیہ شادیانہ لگ جاتا ہے۔ ہاتھی خریدا جائے تو ہاتھیانہ اور موٹر خریدا جائے تو موٹرانہ یہ سب برابر لگتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف نائب تحصیلدار صاحب۔ قانون گو۔ پٹواری۔ ضلع دار۔ داروغہ جی۔ چپراسی اور چوکیدار ان سب کے حق الگ۔ بس ایسا لگتا ہے جیسے کھیتی پر ہمارے بال بچوں کا کوئی حق نہیں ہے باقی سب کے حق ہیں۔ ان سب لوگوں کے حق بھرتے بھرتے مرے جاتے ہیں۔"

"مگر اناج کا بھاؤ تو اب پہلے سے اچھا ہے۔"

"ہاں۔ اناج کا بھاؤ اچھا ہے مگر اس کا فائدہ ہم کو نہیں دوسرے لوگوں کو مل رہا ہے۔ کیونکہ پیسہ کی کمی کی وجہ سے ہم کو اپنی فصلیں کٹنے سے بہت پہلے سستے داموں پر بیچ دینا پڑتی ہیں۔ یہ نہ کریں تو نہ بیج ملے اور نہ کنوئیں درست ہوں، نہ کھیتوں میں کھاد پڑے اور نہ حق والوں کا پیٹ بھر سکیں۔"

پھر بدن بہت درد سے کہنے لگا۔

"سچ کہتا ہوں بابو یہ بات کئی مرتبہ من میں آئی کہ ایسی نکمی اور کانٹوں بھری کھیتی کرنے سے اچھا ہے کہ اپنا کھیت بھیا کو واپس کر دیں اور خود کھیت مزدور بن جائیں۔ لیکن کیا کریں پریا کا بچہ چھوٹا ہے اور اب اور ہونے والا ہے۔ دوسری عورتیں ایسی حالت میں بھی کام کر لیتی ہیں لیکن یہ ایسی نکمی ہے کہ جہاں پیٹ بڑھا یہ کھاٹ پر پڑ جاتی ہے۔"

کھیتی کی دشواریوں کی بات پہلے سے کیوں نہ سوچی اور کیوں الگ ہوئے؟

"اس حرام جادی سے اور بھوجی سے روز جھگڑا ہوتا تھا۔ میں ان برائے

روز مارتا تھا۔ بہت مارا بہت مارا آخر تھک کر اپنا گھر الگ بنا لیا اور انھیں لاکر اسے ڈال دیا۔ جھگڑا جس بات پر ہوتا تھا وہ یہ تھی کہ بھوجی تو ہر حالت میں کھیت میں کام کرے اور یہ نواب جادی کھاٹ کے بانڈ توڑے۔ یہ سب بجا نہیں۔ پر کیا کروں یہی باتیں تھیں جن کی وجہ سے میں نے کھیتی الگ کر لی۔"

"بھوجی بھی برابر سے لڑتی تھی؟"

"ہاں۔ باتیں بھی ایسی ہو گئیں تھیں۔ بڑی بات تو یہ ہوئی کہ جنگل کے گرد تار لگ گیا اور وہاں سے لکڑی لانے والوں کو جیل ہونے لگی۔ اب ایندھن کہاں سے آئے جو کھانا پکے۔ سوکھی ساکھی ٹہنیاں یا کھر پتوار کھیت سے یا ادھر ادھر سے جو مل جاتا وہ بھوجی سمیٹ سمیٹ کر لے آتی۔ اور اسی سے کسی طرح بھوبڑا بن جاتی۔ بھوجی گوبر جلانے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی۔ کہتی یہ تو کھیت کا دھن ہے اس کو اسی کے بھینٹ ہونا چاہیئے۔ بھوبڑا تو کسی نہ کسی طرح کھر پتوار سے بن جاتی تھی۔ مگر اس نواب جادی کو توے پر کی روٹی چاہیئے۔ اس کے بغیر ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اور ان کو جاڑوں میں تاپنے کے لئے آگ بھی چاہیئے۔ اس کے بنا یہ رہ نہیں سکتی۔ اور توے کی روٹی اور تاپنے والی آگ تو بنا گوبر کے کنڈے جلائے کہاں سے ملتی۔ اس پر بڑے بڑے جھگڑے ہوتے تھے۔ پھر یہ نواب جادی دیہات میں رہ کر بھی صابن مانگتی ہے۔ گاؤں کی سب عورتیں اپنا پارا ہوا کاجل لگاتی ہیں اور یہ سرمہ سلائی مانگتی ہے۔ پھر ایک دن ایسا ہو گیا کہ لالائن کی دیکھا دیکھی اس نے رنگ کی پڑیا لاکر اپنے پاؤں رنگ لئے۔ تم تو جانتے ہو کہ بھوجی کھیت کا چیزوں کو تو راجہ ہریش چندر کی طرح باٹتی پھرتی ہے۔ لیکن نقد ایک ایک پیسہ پر اس کی جان نکلتی ہے۔ اس کا یہ بات ہم لوگ تو سمجھتے تھے کیوں کر جانتے تھے کہ پیسہ کا ملنا

کسان کے لئے کیسا مشکل کام ہے ۔ اس نے رنگ جو خریدا پیسے دے کر تو اس پر بھوجی آگ ہو گئی اور پھر جو روزانہ رات کو لڑائی چلنے لگی ہے تو میں ایسا اکتا گیا کہ جی چاہا کہ یا تو لام پر چلے چلو یا کنوئیں میں ڈوب مرو۔ لیکن اس کا پیٹ بڑھ چلا تھا۔ یہ دیکھ کر میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہ کر سکا۔ پر اتنی بات ہے بابو کہ میں نے جو کچھ کیا بہت بہت دکھی ہو کر کیا۔"

جب بابو چلنے لگا تو مدن نے بہت خوشامد سے گڑگڑا کر کہا۔

"بھیا میری ایک منتی ہے۔ ہم دونوں نے جو کیا ہے بہت برا کیا ہے۔ اور سچ پوچھو تو اس کی وجہ سے بھیا سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اس وجہ سے میں نہ ان کے پاس جا سکا اور نہ کچھ کر سکا۔ تم اتنا کر دو کہ ایک ٹوکرا گیہوں اور ایک ٹوکرا چاول لیتے جاؤ۔ تم بھی کھاؤ اور بھیا اور بھاوج کو بھی کھلاؤ۔"

"اتنا کہہ کر مدن کی آواز رندھ گئی۔"

"بابو بھیا میں بڑا دوشی ہوں اس حرام جادی کے کہے میں آ کر میں کیا کیا کر گزرا۔"

بابو نے پریا کی طرف دیکھا تو وہ بھی آنچل سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

مدن نے جلدی جلدی دو ٹوکرے بھرے ایک خود اٹھایا اور ایک پریا کو دیا بابو نے چاہا کہ پریا سے لے لے مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ دونوں اسی طرح ٹوکرے لئے ہوئے جب ان کے گھر کے پاس آ گئے تو رک گئے اور کہنے لگے۔

"بس بابو۔ اب میں آگے نہیں جاؤں گا۔ تم ایک ایک کر کے دونوں لے

جاؤ اور جومن میں آئے بھیا سے کہہ دینا۔"
دونوں اتنا کہہ کر فوراً چلے گئے کہ کہیں امر یا جیتیا کا سامنا نہ ہو جائے۔

(۸)

"بھیا اب کل سے ہم اپنی کھیتی کریں گے۔"
بابو کہیں سے ایک اوسط درجہ کی گوئی خرید لایا اور اس کی ڈوری امر کے ہاتھ میں پکڑا کر اس نے یہ بات کہی۔
امر اور جیتیا دونوں ٹکٹکی باندھ کر بیلوں کو دیکھنے لگے پھر جیتیا نے دوڑ کر بابو کو گلے لگا لیا اور رونے لگی۔
امر اپنے بیل لے کر کھیت میں جب آیا تو ایک آنکھ میں خوشی کے آنسو تھے اور ایک میں خودداری کے مجروح ہونے کے آنسو۔ خوشی یوں کہ آج تین سال کے بعد اس نے پھر کھیت میں اس قابل ہو کر قدم رکھا تھا کہ وہ کچھ کر سکے اور خودداری یوں مجروح ہوئی کہ ایک کسان ایک فوجی کی مدد سے کھیتی کرنے کے قابل ہوا۔ ابھی تک اس نے باپ دادا سے یہ سنا تھا کہ ساری دنیا کا ان داتا کسان ہوتا ہے جو مٹی سے تمام انسانوں کے لئے بھوجن تیار کرتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اب تک یہ دیکھا

تھا کہ کسان جہاں بگڑا یا تو دوسرے کسانوں نے اس کو سہارا دیا یا پھر مہاجن نے سہارا دیا۔ مہاجن کا سہارا اس شرط پر ہوتا تھا کہ کسان اسے ایک کے دو ادا کرے۔ اس طرح پہلا سہارا بھی زمین سے ملتا تھا اور دوسرا سہارا بھی زمین ہی سے ملتا تھا۔ اگر بابو کسان ہوتا تو امر اس کے پیسہ کو کسان ہی کی طرح قبول کرتا۔ لیکن بابو اب فوجی تھا جو فوج میں نوکری کر کے پیسہ لایا تھا آج امر کو اس پیسہ سے کھیتی کرنا پڑ رہی تھی۔ یہ چیز اس کے کسان دماغ پر بار بنی ہوئی تھی۔ پھر امر سوچتا کہ بابو فوجی ہو چاہے جو بھی ہو مگر ہے تو اپنا بھائی۔ ایسا جیسے اولاد کی طرح لاڈ اور پیار سے میں نے پالا ہے۔ جب چھوٹا تھا تو چیتا سے کیسی کیسی ضدیں کیا کرتا تھا۔ اس کی وہ ضد کہ کھیت پر میرے لئے کھانا لاؤ۔

یہ ضد یاد کر کے امر کے ہونٹوں پر پدرانہ شفقت کی سی مسکراہٹ آ گئی اس مسکراہٹ سے وہ چوٹ جو ایک فوجی سے رقم لینے سے پہونچی تھی اس میں ذرا کمی آ گئی۔

بابو کی ضد یاد کر کے امر کو پھر مدن کی یاد آئی۔ امر روزانہ مدن کو یاد کرتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ بیل لے گیا تو لے گیا مگر اس نے مجھے کیوں اس طرح بھلا دیا گویا کہ میں اس کا کوئی ہوں ہی نہیں۔ ایک بھائی وہ ہے اور ایک بھائی ہے بابو۔

امر نے بیلوں کی پیٹھ پر بے حد محبت سے ہاتھ پھیرا۔ اس کو بیلوں کی گردن اور دم کی حرکتوں میں عجیب موسیقی اور رقص نظر آنے لگا۔

"بھگوان بیلوں کی جوڑی کو بنائے رکھنا۔ بڑے نازک وقت پر تو نے مدد کی۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میں بس اب دو ہی چار روز کا اور مہمان ہوں۔"

جس دن امر نے نئی گوئی کے ساتھ کھیت میں قدم رکھا ہے چیتا نے لپٹ کر اپنی کھیت میا کو گلے لگا لیا۔

"میا اب ہم کو اپنے خرتوں سے نہ ٹھانڈا ۓ اندر دیو ہمارے دھرتی کو پیاسا نہ رکھنا۔ اب ایسا کرو کہ ایک ہی فصل میں ہمارے تن ڈھک جائیں۔ اور پیٹ بھر جائیں۔"

فصل بہت دیر کر کے بوئی گئی تھی لیکن پھر بھی پودے جلدی نکل آئے اور نکلنے کے دو ہی چار دنوں کے اندر وہ ننھے منے بچوں کی طرح غوں غاں کرنے لگے اور ہوا سے اٹھکیلیاں کرتے تھے۔

چیتا محبت سے ان کی طرف دیکھتی اور مسلسل دیکھتی چلی جاتی۔ اس کا دل اس نظارے سے بھرتا ہی نہیں تھا۔

(۹)

بابو جب سورج پور اسٹیشن سے اتر کر اپنے گاؤں اکیلے پر آ رہا تھا تو دھیرے دھیرے اسے پتہ چل گیا کہ اب اس کا گاؤں بالکل ہی بدل گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اب اس کا نام بن کٹ پورہ سے کٹ پور پڑ گیا تھا۔ کیا اکیے والے۔ کیا دکاندار اور کیا وہاں کے باشندے سب اسی نام سے پکارتے تھے۔ دوسرے اب پکی سڑک رینا پور تک چلی گئی تھی اور وہاں تک اکیلے چلے جاتے تھے۔ سورج پور سے کٹ پور تک راستے میں دو چھوٹے چھوٹے نئے گاؤں بھی بس گئے تھے، جہاں دو کانیں کھلیں اور

شراب خانے تھے۔ ان گاؤں میں اس شکر مل کے مزدور رہتے تھے جو کٹ پور سے پانچ میل پر واقع تھی۔ کٹ پور کے اندر بھی اب طرح طرح کی چیزوں کی دوکانیں کھل گئی تھیں۔ اور گاؤں کی عورتوں اور مردوں میں طرح طرح کی چیزوں کا رواج ہو گیا تھا۔ اب چلم کا رواج گھٹ رہا تھا اور بیڑی کا بڑھ رہا تھا۔ رمضان کے گھرانے میں چائے بھی بننے لگی تھی۔ ایک طرف غریبی بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف یہ عادتیں۔ زندگی کچھ ایسے ڈھرے پر چل رہی تھی کہ دونوں باتوں میں سے کسی سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا اپنے بس کی بات نہیں تھی۔

بابو نے پرانے کسانوں میں سے ایک کو نہیں چھوڑا کہ جہاں جا کر اس نے سلام نہ کیا ہو۔ بس اگر نہیں گیا تو دھنزی اور رام لال کے گھر۔ حالاں کہ امر نے بتا دیا تھا کہ دھنزی کس طرح آڑے وقت اس کے کام آئی تھی۔ لیکن پھر بھی بابو وہاں نہیں گیا۔ چار روز کے اندر اندر بابو کو معلوم ہو گیا کہ گاؤں کی حالت واقعی ویسی ہی تھی جیسی مدن نے بتلائی تھی۔ گاؤں کا تال سوکھ گیا تھا اور کھیتوں کو کنوؤں سے پانی دیا جا رہا تھا۔ ان میں سے بعض کنویں ایسے تھے کہ پانی دیتے دیتے دوپہر تک ان کا پانی تہہ سے مل جاتا تھا۔ گوبر سے کھانا پک رہا تھا اور کھیت بلا کھاد کے بے جان ہوئے چلے جا رہے تھے۔ کسانوں کی دو دو اور بعضوں کی تین تین آنے والی فصلیں لالہ جی نے پیشگی خرید لی تھیں۔ جن کو وہ ڈیوڑھے بلکہ اس سے بھی زیادہ داموں پر بیچ رہے تھے۔ اس وجہ سے بھاؤ کے چڑھنے سے جو بھی فائدہ ہوتا تھا وہ لالہ جی یا اور بیوپاریوں کو ہوتا تھا ــــ کسان محروم رہتے تھے۔

بابو اب کھیت پر امر اور چیتا کے ساتھ کام کرتا اور رات کو

کسانوں کے ساتھ بیٹھ کر ان لوگوں کو کام کی باتیں بتاتا ۔ نئے نئے دیسوں کا حال، وہاں کے آدمیوں کا رہن سہن، جہازوں کا سفر، کئی کئی دن تک چلنے والی ریلوں پر سفر، آسمان تک جانے والے غبارے، میلوں تک گولے پھینکنے والی توپیں اور طرح طرح کی ان ہونی باتیں ۔

باب (۸)

شہر کا سفر

(۱)

بابو کے آنے کے بعد گاؤں کے اور لوگ بھی جو لام پر گئے تھے واپس آنے لگے ۔ بابو کے بعد ہی جو لوگ آئے وہ رمضان خاں کے دو بھائی بہادر خاں اور قربان خاں تھے جو خانساماں بن کر فوج میں گئے تھے ۔ چوں کہ یہ لوگ ترکی عراق اور کچھ اسلامی ملکوں میں بھی ہو آئے تھے اس لئے ان لوگوں کی رمضان کے گھرانے میں اور گاؤں کے مسلمانوں میں بہت آؤ بھگت ہوئی ۔ ہر ایک نے باری باری ان کو کھانے پر بلایا اور ہر جگہ ان سے اسلامی ملکوں کا حال پوچھا گیا ۔ یہ دونوں عربوں میں رہتے تھے ۔ عربی کے چند جملے بھی جان گئے تھے ۔ اس بات سے مسلمانوں میں ان کی عزت بہت بڑھ گئی ۔ بہادر خاں اور قربان خاں

خود بھی بڑے باتونی تھے اس لئے جہاں بھی وہ اپنے قصے بیان کرنے پر آتے تو رات کے گیارہ بارہ بجا دیتے اور سرِ شام سے سو جانے کے عادی کسان اونگھتے جاتے اور قصے سنتے جاتے۔

ان دونوں کا کہنا تھا کہ مسلمان چاہے وہ ترکی کے ہوں یا عراق کے، ہیں وہ سب غریب بلکہ بعید غریب لیکن ان کے ساتھ ساتھ مہمان نواز بلا کے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود بھوکے رہ کر مہمان کو بہتر سے بہتر کھلا دیتے ہیں۔

بہادر اور قربان کے آنے کے چھ مہینے بعد برجو جمار آیا۔ لیکن وہ بے حد رنجیدہ تھا کیونکہ اس کا چھوٹا بھائی گولی لگ جانے سے مر چکا تھا۔ اس کی موت کی خبر سے صرف عزیزوں ہی کو نہیں گاؤں بھر کو افسوس ہوا تھا کیونکہ وہ بڑا کرڈیل جوان تھا جو ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا تھا اور بلا کسی عذر کے ہر ایک کا کام کر دیا کرتا تھا۔ خاص کر کسی کے گھر شادی بیاہ ہو یا گاؤں میں رام لیلا کی تیاریاں ہوں تب تو وہ اکیلا ایک فوج کا کام کر کے رکھ دیتا تھا۔

برجو بھی بابو کی طرح بدل چکا تھا۔ اس نے ایک ہفتہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بتلایا کہ وہ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا اور پھر بھاگ نکلا۔ اس بھاگنے میں وہ بالشویکوں کے دیس روس جا پہنچا اور پھر وہاں سے ملکوں ملکوں ہوتا ہوا واپس آ گیا۔ برجو نے دو سال میں پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا تھا اور وہ کچھ انگریزی بھی بولنے لگا تھا۔

بھولا جو برجو اور سانولی کا پلوٹھی کا لڑکا تھا اس کی دونوں آنکھیں چیچک نے کھالی تھیں۔ یہ اپنے دادا کے پاس رہتا تھا لیکن جب سے برجو آیا اس کے پاس رہنے لگا تھا اور انگریزی سیکھنے لگا۔ برجو کہتا تھا کہ لام پر سب سے زیادہ

جو یاد آتا تھا وہ بھولا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میں نہ رہا تو اس اپاہج کا کیا ہوگا۔
برجو کو افسوس تھا کہ اس نے بھولا کے لئے ایک ایسا کھلونا خریدا تھا جسے بے آنکھوں والے بچے بھی کھیل سکتے تھے، اور پھر اس کھلونے کو اپنے ایک ساتھی کو جو کٹ پور کے آس پاس کا رہنے والا تھا اور چھٹی پر یہاں آرہا تھا یہ وعدہ لے کر دے دیا تھا کہ وہ میرے بیٹے کو پہونچا دے گا۔ لیکن اس کا جہاز ڈوب گیا۔ اور وہ کھلونا نہ پہونچ سکا۔

برجو اور بالو کی وجہ سے کٹ پور کی راتوں کی صحبتیں بہت پر رونق ہو گئی تھیں۔ جہاں یہ دونوں آکر بیٹھے وہاں سب کسان اکٹھا ہو جاتے۔ لڑکے لڑکیاں اور عورتیں بھی دبے پاؤں آکر اندھیرے میں کسی گوشہ میں بیٹھ جاتیں۔ دھیرے دھیرے اتنی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی تھی کہ اگر کوئی شخص باہر سے آتا تو بھیڑ دیکھ کر اس کو یہی خیال ہوتا کہ کوئی کتھا ہونے والی ہے۔

برجو کی باتوں میں سب سے عجیب باتیں وہ ہوتی تھیں جو وہ خاص خاص لوگوں میں بیٹھ کر روس کے دیس کے بارے میں بتلاتا تھا۔ کہ وہاں کوئی راجا نہیں سب ہی پرجا ہیں۔ اور پرجا ہی نے اس دیس کا راج بنایا ہے۔

"پرجا کیسے راجا بن سکتی ہے؟"
لوگ حیرت سے سوچنے لگے۔

پھر کوئی بول اٹھتا کہ "جب روس میں پرجا راجا بن سکتی ہے تو سب جگہ بن سکتی ہے مگر ہے بڑا کٹھن کام۔"

برجو نے اپنے خاص خاص ساتھیوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ جب میرے ساتھیوں کو میری واپسی پر معلوم ہوا کہ میں روس کے دیس بھی پہونچ گیا تھا تو

انھوں نے کہا کہ اگر تم یہ بات اپنے افسروں کو بتاؤ گے تو گرفتار کر لیے جاؤ گے اور زندگی بھر انڈیا نہ دیکھ سکو گے۔

برجو نے کیا کہا اپنے افسروں سے۔ کیا اس نے بتادیا کہ وہ روس گیا تھا؟ کسانوں کے دل میں یہ سوال بار بار اٹھا تو، لیکن کسی نے اس سے پوچھا نہیں۔ کیوں کہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ زمیندار، پولیس، ضلع دار، پٹواری اور اس قسم کے لوگوں سے کتنا سچ بولا جاتا ہے۔ کسانوں پر جس سوال کا بوجھ تھا وہ یہ سوال تھا۔

"کسان نہ پڑھے نہ لکھے وہ راج کیسے کرتے ہیں؟"

"ہاں وہاں کے کسان بھی ہم لوگوں کی طرح ان پڑھ ہیں۔ مگر وہ راج کر لیتے ہیں۔"

پھر کسان کہتے۔ "اگر پرجا راجا بن گئی تو پھر راجا کون رہا اور پرجا کون رہا"۔ اور جب کوئی راجا نہیں اور کوئی پرجا نہیں تو کام کیسے چلتا ہے؟

کسان اس طرح کے بیسوں سوال پوچھتے جو برجو کی سمجھ میں نہ آتے اس وجہ سے وہ ان کا جواب نہ دے پاتا۔ لیکن وہ ٹیڑھے ٹیڑھے سوالوں کا جواب دے یا نہ دے۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسی کشش تھی کہ وہ لگاتار کئی مہینے تک چلتی رہیں۔

سننے والے سنتے رہے۔

اس بیچ میں رام لال شہر گیا اور وہاں سے سن سنا کر وہ بھی کچھ اسی طرح کی باتیں لے آیا جیسی برجو اور بابو کیا کرتے تھے۔ رام لال کو ایک سال ہوا مہاراج نے کسی بات پر ناراض ہو کر بے دخل کر دیا تھا۔ اس نے ہر طرف سے زمین

ڈھونڈی لیکن وہ نہ ملی۔ پھر تو اس نے ایک ایسا کارنامہ کیا جو شاید ہی کسی کسان سے ہو سکے۔ وہ یہ کہ اس نے اپنی گوئی بیچ کر ایک چھوٹی سی دوکان رکھ لی جہاں نمک اور تیل سے لے کر دھوتی اور ساری تک ملتی تھیں۔ سال بھر کے اندر ہی اندر یہ دوکان چلنے لگی۔

رام لال نے شہر سے آکر بتایا کہ وہاں جگہ جگہ سبھائیں ہو رہی ہیں اور "ایکا کرو" کی پکار سننے میں آ رہی ہے۔

"تم بھی کسی سبھا میں گئے اور تقریر سنی؟"

"ہاں مگر تقریر سے بس یہی سمجھ میں آیا کہ سب ایک ہو جاؤ اور یہ کہ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں۔"

واقعہ تو یہ ہے کہ جب سے بابو برجو آئے اور آکر دونوں بدیسیوں کی اور اس کے دیس کی باتیں کرنے لگے۔ اس وقت سے دھیرے دھیرے کسانوں میں عجب طرح کا غیر محسوس طور پر اتحاد ہونے لگا تھا۔ ان کی آپس کی پارٹی بازیاں اور لاگ ڈانٹ کم زور پڑ گئی تھی اور جو لوگ ایک دوسرے کے مخالف تھے وہ بھی آپس میں ملنے لگے تھے پھر اس بیچ میں جو جھگڑے اٹھے ان میں بھی کچھ ایسی فضا رہی کہ وہ بیچ بچاؤ سے طے ہو گئے۔

گاؤں میں اتحاد کا یہی عالم تھا کہ ضلع دار صاحب کے ہرکارے نے آکر خبر دی کہ اس مرتبہ ہر ہل پر شادیانہ لگے گا۔ کیوں کہ نواب صاحب کے یہاں شادی ہو رہی ہے۔ ایسے محصول کسانوں کو یوں بھی بہت کھلتے تھے لیکن اس موقع پر تو شادیانہ تو بہت ہی کھل گیا۔ کیوں کہ ابھی ابھی یہ لوگ اسی طرح کی ایک رقم پٹواری جی کے حکم پر سرکار کو دے چکے تھے۔ اب کس کس کو دیں

اور کہاں تک دیں۔ اسی رات سب لوگ رام لال کے مکان پر اکٹھا ہوئے اور
سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے:

بابو نے رائے دی کہ چلو بیس پچیس کسان مل کر لکھنؤ چلیں اور اپنے
زمیندار نواب صاحب سے فریاد کریں کہ ہماری حالت یہ ہے کہ تالاب سے
پانی ملتا تھا وہ گیا' جنگل سے ایندھن ملتا تھا وہ گیا' کھیتوں میں کہیں بھی پکے
کنویں نہیں ہیں' پر ان باتوں کی وجہ سے پیداوار آدھی رہ گئی ہے' اس پر شکرانہ
اور ہاتھیانہ بھی لگ رہا ہے۔ اور پٹواری اور دروگہ اور کس کس کے حق بھی۔
ہم کیا کریں۔ کیسے جئیں۔

ایک تجربہ کار کسان نے کہا اور وہاں اس کے جواب میں اگر جوتے
پڑنے لگے تو کیا کرو گے؟"

بابو نے کہا: "جب اتنے آدمی مل کر جائیں گے تو جوتے دو تے نہیں
پڑیں گے۔"

یہ سن کر ایک نے کہا۔

"اتنے آدمی اکٹھا ہو کر جائیں یہ تو بالکل ہی نئی بات ہوگی۔ آج
تک ایسا نہیں ہوا کہ زمیندار کے سامنے کسان اس طرح جتھا بنا کر گئے ہوں۔
نواب صاحب یہ دیکھ کر کیا سوچیں گے؟"

دوسرے نے جواب دیا۔

سوچیں گے کیا اب تو ہر طرف نئی نئی باتیں ہو رہی ہیں۔ سڑکیں بن
رہی ہیں۔ نئے نئے پل بننے لگے ہیں۔ شکر ملیں چلنے لگیں ہیں جہاں اتنی نئی باتیں
ہیں وہاں ایک نئی بات یہ بھی سہی۔"

ان کسانوں میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ نواب صاحب کا محل لکھنؤ میں کہاں ہے۔ جو کسان شہر جا چکے تھے وہ جانتے تھے کہ شہر ایک قسم کی بھول بھلیاں ہوتی ہے۔ جس میں کسی کا پتہ لگانا آسان نہیں۔

ایک کسان رام اوتار، جو کشن پور میں بسنے والوں کے بالکل پہلے گروہ میں سے تھا، اپنے گھر سے ایک پرانا پرچہ اٹھا لایا اور کہنے لگا اس میں نواب صاحب کا نام بھی ہے اور پتہ بھی۔ اس طرح یہ رکاوٹ بھی دور ہو گئی۔ اب پروگرام مکمل تھا۔

جس صبح کو یہ قافلہ روانہ ہونے والا تھا اس رات خوب خوب تیاریاں ہوئیں۔ بیل گاڑیوں کے پہیوں میں تیل ڈالا گیا۔ کھانے کے لئے ستو اور سید ھا اور برتن رکھے گئے۔ کچھ روپے بھی دھر لئے گئے۔ ان کاموں سے فرصت پا کر کسانوں کے جتھے ادھر ادھر اکٹھا ہو کر کھسر پھسر کرنے لگے۔ لیکن یہ سب کچھ چپ چپاتے اس طرح ہوا کہ لالہ جی اور مہاراج اور گاؤں کے چوکیدار کو خبر تک نہ ہوئی۔ چوں کہ بسنت کا زمانہ قریب تھا اور اس موقع پر کچھ چہل پہل ہو ہی جایا کرتی ہے۔ کچھ گانا بجانا بھی ہوا کرتا ہے اور کچھ سوانگ بھی بھرا جاتا ہے اور ان کاموں کی باتیں اور تیاریاں پہلے سے شروع ہو جاتی ہیں۔ اور کرشن پور میں ان باتوں کی شروعات ہو بھی چکی تھی۔ اس لئے لالہ جی، مہاراج اور چوکیدار بھی سمجھے کہ یہ سب چہل پہل اسی قسم کی ہے۔ لیکن جب دن چڑھے ان لوگوں نے کچی سڑک پر چار پانچ بیل گاڑیوں کی نئی لیکیں دیکھیں تب ان کو پتہ چلا کہ منھ اندھیرے ایک قافلہ شہر چلا گیا ہے۔ کیوں گیا ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ یہ لوگ پوچھ گچھ میں لگ گئے۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی اس قافلے نے پکی سڑک پکڑ لی اور پھر گانا گاتے، ہنسی مذاق کرتے، چنے چباتے اور کنارے کے کنوؤں سے پانی پیتے یہ لوگ سفر طے کرنے لگے۔ راستہ میں چنے کے کھیت بھی ملے جہاں سے ان لوگوں نے بلا تکلف ایک ایک پودا اکھاڑ لیا اور ہرے چنے کھانے لگے۔ کئی جگہ ایکھ کے کھیت ملے ان سے کھانے کے لئے ایک ایک ایکھ اکھاڑ لی۔ کھانے پینے کے لئے اس طرح تھوڑی تھوڑی چیزیں کھیت سے لے لینا یہ تو ایسا رواج تھا جو ہمیشہ سے چلا آرہا تھا۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

(۳)

ان دیہاتیوں میں سے بہت سے ایسے تھے جنھوں نے اپنے ضلع کا صدر مقام سیوح پور تک نہیں دیکھا تھا، لکھنؤ کا کیا سوال۔ ان لوگوں کے لئے اتنے ایک پکے مکان اور وہ بھی دو منزلہ اور سہ منزلہ، پکی دوکانیں اور وہ بھی قطار در قطار، سفید پوش آدمی وہ بھی غول کے غول، پھر صدائیں لگانے والے خوانچے والے، سواریوں کو پکارنے والے، اکّے والے اور طرح طرح کے بھیس میں طرح طرح سے مانگنے والے فقیر، سڑک کے کنارے گاتی ہوئی نٹنیاں، ریچھ اور بندر کا تماشا دکھانے والے مداری، تماشائیوں کی جگہ جگہ بھیڑ۔ اس شور و شغف

میں لوگوں کی آزادانہ حرکتیں ۔

ان سب چیزوں کو دیکھ کر وہ سب بھوچکے ہوگئے ۔ ایک نے بابو سے پوچھا ۔

"یہی ہے لکھنؤ نا ۔ پورے کا پورا ۔"

"پورا کہاں ؟ یہاں سے تو شروع ہوتا ہے اور جانے کئی میل تک برابر چلا گیا ہے اتر سے دکھن اور پورب سے پچھم تک ہر طرف کئی کئی میل ہے ۔"

بابو نے سب بیل گاڑیاں ناکے پر کھڑی کرادیں ۔ ان پر دو آدمیوں کا پہرہ لگادیا اور پھر خود ساری فوج کو لے کر نواب صاحب کا نام جو پرچے پر لکھا ہوا تھا اسے لے کر ان کا پتہ پوچھتا ہوا چلا ۔ ان لوگوں کو کئی مرتبہ نام کے سمجھنے میں دھوکا ہوا لیکن آخر یہ لوگ نواب صاحب کے یہاں پہونچ ہی گئے ۔

لیکن جس گلی میں وہ آئے تھے اور جس مکان کے سامنے کھڑے تھے ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر حیرت کر رہے تھے کہ کہاں آگئے ۔ بھلا ایسے نواب صاحب جن کے پاس کپڑے کا وہ عالی شان محل ہو جسے لے کر وہ شیر کا شکار کھیلنے گئے تھے ، وہ اور ایسے گھر میں اور ایسی گلی میں رہیں !! یہ گھر تو دیہات کے گھروں کا ایسا چھوٹا ہے اور پرانا اتنا ہے کہ ہمارے دیہات میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو لیکن جب بابو نے محلے والوں سے پوچھا کہ کیا نواب رفیع الشان بہادر صاحب یہیں رہتے ہیں تو سب نے کہا ہاں ۔

آخر بابو نے دروازہ کی کنڈی کھٹ کھٹائی تو اندر سے ایک دبلا پتلا لڑکا بہت معمولی کرتا پائجامہ پہنے باہر آیا ۔

"بابو۔ ہم لوگ کٹ پور سے نواب صاحب بہادر کے پاس درخواست لے کر حاضر ہوئے ہیں۔"

"کیسی درخواست؟"

"حضور ہم لوگوں پر شادیانہ جو لگ گیا ہے اس کو دینے کا ہم میں بوتا نہیں۔"

"یہ بات ہے۔ میں سمجھ گیا۔ سمجھا دیکھو۔ ہم تم کو اصل بات بتاتے ہیں۔ اس ریاست کے اصلی نواب صاحب تو اسی جگہ رہتے ہیں ان ہی کا اسم شریف ہے نواب رفیع الشان بہادر۔ لیکن عدالت نے ایک غلط فہمی کی وجہ سے ایسا فیصلہ کر دیا ہے کہ ریاست آج کل دوسرے نواب کے پاس چلی گئی ہے۔ تم لوگ ان ہی کے پاس جاؤ۔ تمھارا کام ان سے ہی نکلے گا۔"

یہ کہہ کر وہ لڑکا گھر کے اندر سے پنسل لایا اور ایک پرچے پر دوسرے نواب صاحب کا نام اور پتہ لکھ کر ان لوگوں کو رخصت کر دیا۔

دوسرے نواب کا محل واقعی محل تھا جہاں دس بارائتیں بیٹھ آ کر ٹھہر سکتی تھیں۔ اس کی عالی شان بارادری دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ وردی پوش ملازم برابر ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ بہت بڑی موٹر برساتی میں کھڑی تھی۔ سامنے بہت بڑا اور سرسبز باغیچہ تھا۔ ان کسانوں کو ایک وردی پوش ملازم منشی جی کے پاس لے آیا۔

کسان منشی جی کو جھک جھک کر آداب کرنے لگے۔

منشی جی نے تیوری چڑھا کر اور قلم کان میں لگا کر پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"کٹ پور سے"

"کیا شادیانہ لے کر آئے ہو؟"

"نہیں تو حضور۔"

"ابے سالے...... نہیں نہیں کیا بک رہا ہے۔ وہ جوتے پڑیں گے کہ کھوپڑی اڑ جائے گی۔ نکالو تم لوگ شادیانے۔ ریاست بھر کے کاشتکاروں پر شادیانہ لگا ہے کیا تم لوگوں پر نہ لگے گا؟"

بابو نے آگے بڑھ کر ہاتھ باندھ کر کہا

"ہم لوگ تو فریاد لے کر آئے تھے کہ ہماری بہت بری حالت ہے مرے جاتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ساتھ کچھ رعایت کی جائے۔"

"تو تو بڑا ٹرّا معلوم ہوتا ہے۔ سپاہی ذرا جھاڑنا تو دو ہاتھ۔"

ابھی منشی جی کے منھ سے پوری بات بھی نہ نکلی تھی کہ ایک پہلوان نے جو سپاہی کی وردی چپراس اور سنہری پگڑی سے مرصع تھا بڑھ کر ایسے زبردست دو طمانچے مارے کہ بابو کے گال اندر سے پھٹ گئے اور منھ سے خون بہنے لگا۔

بابو کی یہ حالت دیکھ کر سب کسانوں کا لہو خشک ہو گیا۔

منشی جی۔ "سپاہی ذرا ان لوگوں کو حاطے کی تعزیح تو کرا لاؤ۔"

سپاہی نے لاٹھی سے کسانوں کو اس طرح ہانکا گویا کہ وہ سب جانوروں کا گلا تھے اور ہنکا کر ایک ایک کو حاطے کی طرف لے گیا۔ یہاں ایک طرف گائے، بیل بندھے تھے اور دوسری طرف تیس چالیس کسان مرغا بنے کھڑے تھے اور ان میں سے کسی کی پیٹھ پر دو اینٹیں تھیں اور کسی کی پیٹھ پر چار اور سپاہی ہاتھوں

میں جوتے لیے گھوم رہے تھے۔ ادھر کسی نے آرام لینے کی کوشش کی اور ادھر اس کی کھوپڑی پر جوتے برسنے لگے۔ سپاہی جس طرح ہنکا کر ان کسانوں کو احاطے میں لے گیا تھا اسی طرح ہنکا کر واپس لے آیا۔ اب منشی جی کڑک کر بولے۔

"نکالتے ہو شادیانہ یا پھر بناؤں تم لوگوں کو بھی ویسا ہی مرغا۔"

کٹ پور کے کسانوں نے احاطے میں جو مقتل کا سا نظارہ دیکھا تھا اس کے بعد ان میں کہاں دم تھا جو منشی جی کے حکم کی خلاف ورزی کرتے۔ منشی جی نے ازراہ مہربانی ایک ایک روپیہ کی چھوٹ دے دی اور صرف دو دو روپیہ فی کس شادیانہ لگایا۔

ان کسانوں کے پاس کہاں تھے دو دو روپیہ جو وہ نکالتے۔ وہ تو کہو کہ بالو اپنی بچی کچی پونجی ساتھ لایا تھا اس نے سب کی طرف سے شادیانے کی رقم ادا کر دی۔

منشی جی سے چھٹکارا پانے کے بعد اب کسانوں میں ہمت کہاں تھی جو وہ نواب صاحب کا سامنا کرتے۔ انھوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سیدھے بھاگیں اپنی گاڑیوں کی طرف۔ لیکن ابھی وہ محل سے نکلنے بھی نہیں پائے تھے دو پیادے دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ نواب صاحب نے تم سب کو طلب کیا ہے۔

کسانوں نے کہا کہ اگر منشی جی نے دو دو روپیہ لیے ہیں تو نواب صاحب پانچ پانچ سے کیا کم لیں گے۔ لیکن سب نے اشاروں میں طے کر لیا

کر چاہے جان چلی جائے پر ایک ڈبل بھی جیب سے نہیں نکالیں گے۔

بہت بڑی بارادری تھی جس میں طرح طرح کے ساز و سامان کے بیچ میں نواب صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہی نواب صاحب جو شیر کے شکار کو آئے تھے۔ انھوں نے کسانوں کا سلام لیا۔ اور پھر مسکرا کر کہا۔

تمھارے گھر شادی ہے اور تم بلا کچھ کھائے پیئے چلے!! یہ کیسی بات ہے!! کچھ نہیں تو اپنا منھ تو میٹھا ہی کر لو۔

"بٹیا کی شادی ماں کون کھات ہے۔"

کسی کسان نے کچھ ڈر کر اور کچھ خوش ہو کر جواب دیا

ہم لوگوں کے یہاں ایسا رواج نہیں ہے ___ یہاں بیٹے کی شادی میں بھی کھانا ہوتا ہے اور بیٹی کی شادی میں بھی ___ چلو تم لوگ کمر کھولو ___ سیدھا لو ___ اور رات یہیں گزارو ___ آج ترنگنی بائی کا ناچ ہوگا ___

نواب صاحب کے گھر سے سیدھا جو آیا تو ایک ایک آدمی کو اتنا ملا جس میں دو بلکہ تین آدمی کھالیں پھر آٹا، دال، چاول، سبزی گھی، مسالہ اور پاؤ پاؤ بھر گڑ۔ ان لوگوں کے لئے جو ترے پر دری بچھا دی گئی، اور ایک درخت کے نیچے کھانا بنانے کی جگہ دے دی گئی۔

رات کو جس بائی کا ناچ ہوا وہ خاص طور سے کسانوں ہی کے لئے بلائی گئی تھی ___ اور وہ تھی بھی بڑی بانکی اور پھرتیلی ___ اس اس طرح کودے اور اچکے جیسے بکری کا بچہ ___ کسانوں نے رات بھر گانا سنا اور ناچ دیکھا! اس سے ان کو بہت لطف آیا ___

لیکن جب صبح یہ لوگ کٹ پور لوٹنے لگے اور انھوں نے اپنے من ہی من میں یہ جائزہ لیا کہ سفر میں کتنا نفع ہوا کتنا نقصان تو ان کو نقصان کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ ان کو بہت شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ ہم لوگوں نے بابو اور برجو کے کہے پر چل کر غلطی کی۔

باب (۹)

نیا کھاتا

(۱)

"کون تھا ؟"

شوکت الشان نے دروازے کی کنڈی لگا کر جواب دیا۔

"کوئی نہیں ابا حضور۔ ہوا کا جھونکا تھا۔"

"ہوا کا جھونکا!

گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں"

بیٹا اب کوئی کیا آئے گا۔ ماما' اصلیں سب سو گئی ہوں گی۔

دیر ہوئی جب گھڑیال نے دس بجائے تھے۔ بیٹا بہت بھوکے ہو۔ ؟"

"نہیں ابا حضور کچھ ایسی بھوک تو نہیں۔"

"کیا تیلانیں۔ قوال کے چھوکرے نے پیسہ اس طرح مانگا کر انکار بن ہی نہ پڑا۔ نہیں تو اس وقت کچھ نہ کچھ تو تم کو مل ہی جاتا۔

یہ کہہ کر نواب رفیع الشان نے ایک چھوٹی سی ٹھنڈی آہ کھینچی۔

ان کی آہ سن کر شوکت بے چین ہوگیا اور کہنے لگا۔

" ابا حضور میری فکر نہ کیجئے۔ مجھے تو کوئی ایسی بھوک نہیں۔ آپ کو بھی تو خاصہ تناول کرنے کا موقع نہ ملا۔"

"نہیں بیٹے۔ ہم پرانے لوگ بہت کڑی جھیل چکے ہیں۔ استاد مولانا خدا بخش کہا کرتے تھے کہ ہمارے جدامجد شہنشاہ ہمایوں نے وہ وہ تکلیفیں جھیلی ہیں کہ غریب سے غریب شخص نے بھی نہ جھیلی ہوں گی ——
شہزادوں کا دن اگر تخت و تاج ہے بیٹا تو رات میدان جنگ یا جنگلوں کی خاک ہے۔ اس زندگی میں ایسے دن رات سے کہاں مفر۔"

نواب رفیع الشان اپنی پھٹی ہوئی رضائی اور میلی چیکٹ توشک میں گھسے ہوئے لیٹے تھے۔ لیکن شوکت ابھی تک پاؤں پر رضائی ڈالے بیٹھا تھا۔

ان لوگوں کا گھر دو چار پائی والے ایک در کے دالان اور اتنے بڑے ایک صحن پر مشتمل تھا۔ دالان کے لکڑی کے در پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جو جگہ جگہ پھٹ جانے کی وجہ سے ٹھنڈی ہواؤں کو بس برائے نام ہی روک رہا تھا۔ خاص کر شوکت کی طرف کا پردہ تو بہت پھٹا تھا۔ اس کے بدن پر ململ کے کرتے کے اوپر ایک پھٹی ہوئی صدری تھی۔ جسے

توڑ توڑ کر ٹھنڈی ہوا جسم کو برما رہی تھی۔

اتنے میں چراغ لہرایا۔ نواب رفیع الشان نے کہا۔

"لو بھائی انھوں نے بھی ساتھ چھوڑا۔ کیا شعر کہہ دیا ہے ظالم نے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

یہاں یہی عالم ہے۔ اچھا بٹیا اب کھانے کی آس چھوڑ دو بڑے لوگوں کے دماغ سے ہم غریبا عزیزوں کی یاد اوجھل ہو گئی ہوگی۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ اچھا لاؤ ایک کٹورا پانی تو پی ہی لیں اور سمجھ لیں کہ خاصہ نوش جان کر چکے۔"

پانی پی کر نواب صاحب نے کہا۔

"کیوں بیٹے شیرمال کیسی تھی؟"

یہ سوال سن کر شوکت کے لڑکپن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"بہت خستہ تھی ابا حضور۔"

"ہاں بھئی۔ خستہ تھی اور بالائی کے ساتھ تو مزا دے گی۔ اور گلفام بھی خوب تھا۔"

نواب نے یہ کہہ کر ایک چٹخارا مارا۔

"گلفام؟ ابا حضور؟"

"ارے ہاں تم کیا جانو۔ ہائے تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ علاقہ

واپس مل جائے تو پہلا کام تو یہی کرنا ہے کہ تم کو نوابی کھانوں اور نوابی غلطیوں کا مزہ چکھایا جائے۔ اس کے بغیر کیسے سمجھو گے کہ شہزادگی کیا چیز ہوتی ہے۔

"گلفام ایسی مٹھائی ہوتی تھی۔ جو صرف ہمارے یہاں کے رکاب دار بنا سکتے تھے۔ بس منہ میں ڈالے رکھو اور گھل جائے یاد کرکے مزہ آ گیا۔ ظالم رکاب دار کبھی کبھی گلفام میں آم کی باس دے دیتا تھا۔ اہاہا۔ ہاہا۔ حیدرآباد کے نواب شجاعت یار جنگ نے ایک بار جو گلفام کھایا تو رکاب دار کو ایک ہزار روپے ماہوار دینے پر تیار ہو گئے لیکن اس نے کہا کہ جس چوکھٹ کا نمک کھایا ہے اس سے مر کر نکلوں گا۔ وہ کسی طرح بھی جانے پر راضی نہ ہوا۔ وہ وفاداریاں اب کہاں۔"

"کیسا تھا گلفام بیٹا۔"

"بہت نفیس۔ کیا کہنا۔ منہ میں رکھتے ہی گھل گیا اور اس سے دل خوش ہو گیا، جیسے بنارس کے لنگڑوں کا عطر نکالا گیا ہو۔"

باپ بیٹے نے ان یادوں سے پیٹ بھر کر دو دو گھونٹ پانی پیا اور لیٹ گئے۔

چراغ پہلے ہی بھڑک کر خاموش ہو چکا تھا۔ کہیں دور طبلہ ٹھنک رہا تھا۔ گجرے کھنک رہے تھے اور ہوا کی لہروں پر میٹھی تانیں لہریں لیتی ہوئی آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر سناٹا رہا پھر نواب نے کہا۔

"سو گئے بیٹا؟"

بھوک میں نیند کہاں آتی ہے۔ شوکت کھائے ہوئے گلفام کے مزے یاد کر رہا تھا۔ منہ میں بار بار رال آ جاتی تھی۔ جو گلفام کی گھلاوٹ اور آم کی باس میں ڈوب کر نیچے اتر جاتی تھی۔ شوکت نے جواب دیا۔

"نہیں ابا حضور، فرمائیے"۔

"اپنا علاقہ واپس مل جائے تو ہم کبھی ایسی گھٹیا بات نہ کریں گے کہ شادی بیاہ اور تقریب میں جہاں جہاں کھانا جاتا ہو وہاں بھیجنا بھول جائیں اور کسی غریب کو بھوکا سلا دیں۔"

"وہ لوگ تو ہم کو بھوکا جگا رہے ہیں۔ سلا کہاں رہے ہیں۔"

"جیتے رہو بیٹا۔ کیا بات پیدا کی ہے۔ یہ ہوا تڑپا تڑپا کر مارنا کوئی شرافت ہے۔ ہمارے جد امجد ہمایوں کے ساتھ ان کے بھائیوں کامران اور عسکری نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ بھئی میرے پاس تو وہ دل ہے کہ جہاں ایک خوان کی ضرورت ہو وہاں جب تک دو نہ بھیج لوں چین نہ آئے۔ ہائے تم نے یہ تماشے دیکھے کہاں۔ خدا بخشے تمھارے دادا میاں کو جب وہ لڑکے تھے تو محل سے باہر کہیں جا رہے تھے راہ میں ان سے کسی فقیر نے کہا کہ میں بھوکا ہوں۔ انھوں نے نوکر سے کہا اسے کھانا کھلا دو اور آگے چلے گئے جب واپس آئے تو دیکھا فقیر اسی جگہ کھڑا ہوا ہے۔ انھوں نے پوچھا کھانا ملا؟ وہ چند روٹیاں دکھلا کر کہنے لگا۔ بس کتوں کے کھانے والی یہ روٹیاں ملی ہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ پتیلا خالی ہونے کے بعد اسے دو چار روٹیوں سے پونچھ لیا جاتا ہے اور وہ کسی فقیر کو دے دی جاتی تھیں۔ وہی روٹیاں اس فقیر کو دے دی گئی تھیں۔ فقیر ایسا موٹا تھا کہ اس نے ان کا ایک نوالہ بھی نہ کھایا۔

ابا نواب کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ جس فقیر کے لئے میں نے کھانے کا حکم دیا تھا۔ اسے اور ایسا کھانا دیا گیا۔ میری دادی بڑے طنطنہ کی بیگم

لیکن ان سے شکایت کرنے کی ابا نواب کو ہمت نہ ہوئی۔ انھوں نے اندر کہلا دیا کہ میرا خاصہ باہر آجائے۔ جب وہ باہر آیا تو چار خوان تھے۔ اور ہوگا کوئی دس آدمیوں بھر کا کھانا۔ ابا حضور نے وہ چاروں خوان فقیر کو دے دیئے اور کہا۔ "کھاؤ اور کھلاؤ"

"کیا کہا ہے امیر مینائی نے
"گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں"

شوکت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بھوک سے نہیں اپنے باپ پر اور اپنے آپ پر ترس کھا کر کہ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔

نواب صاحب کی ذرا دیر کے بعد پھر آواز سنائی دی۔

"ہمارے محل میں تو عزیزوں، عزیز کے عزیزوں اور ان عزیزوں کے عزیزوں اور دوستوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جو بھی ایک دن کے لئے آتا مہینوں اور برسوں رہتا۔ ہم کو تو یہ بھی خیال نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ایک یہ لوگ ہیں جو بنتے تو ہیں خاندانی نواب مگر نہ عزیزوں کے ہیں اور نہ دوستوں کے۔ حالت یہ ہے کہ شادی کے موقع پر کھانا بھجوانے کو کہلا دیتے ہیں۔ لیکن بھیجنا بھول جاتے ہیں۔ کیا زمانہ ہے۔

"طوق زریں ہمہ درگردن خسر می بینم"

شوکت اپنے دماغ میں محل بنانے اور بسانے لگا جس میں اس نے اپنے ساتھ کے کھیلنے والے گلی کے لونڈوں تک کو آرام سے بسا دیا۔ وہ پھر کھشوں کو جو انھیں سونے کو ملے تھے۔ حیرت سے تک رہے تھے اور گلفام پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ خلعتوں میں اٹھلائے اٹھلائے گھوم رہے تھے۔ ساری رات وہ ایسے ہی تماشوں سے

لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب صبح آنکھ کھولی تو لبوں پر تبسم تھا۔

(۲)

"نواب زادہ صاحب۔ بھئی نواب زادے صاحب"۔

نواب اور نواب زادے دونوں جاگ رہے تھے۔ لیکن خاموشی سے اپنے بستروں میں پڑے تھے۔

آواز سن کر نواب نے کہا۔

"اچھا بھئی"

پھر شوکت سے کہا "ذرا دیکھنا بٹیا۔ مگر پہلے بستر وغیرہ درست کر لو۔ یہ لحافوں کے کھلے ہوئے سیون ہماری غریبی پر ہنستے ہیں"۔

باپ بیٹے دونوں سردی کھاتے ہوئے بستروں سے نکل آئے۔ شوکت نے ان کو تہہ کر کے پلنگوں کے سرہانے لگا دیا اور پھر دروازے کی کنڈی کھولی۔

دروازہ کھلتے ہی نواب اعغن اندر آئے بغل میں ان کا محبوب مرغ بانکے بہادر دبا ہوا تھا آتے ہی انھوں نے کہا۔

"حیا اب تو جینے کو جی نہیں چاہتا ہے"۔

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اعغن کے بدن پر اچھی سی

چھینٹ کا دگلا تھا جس کے رنگ مدھم پڑ گئے تھے اور سر پر کشمیری کام کی ٹوپی تھی جس پر تیل کے دھبوں کی تہہ چڑھ گئی تھی۔ کندھوں پر پرانی مگر بہت قیمتی کشمیری شال تھی۔

"خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ بیٹھو بیٹھو۔ یہ تو بتلاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔"

اغن نواب نے اپنے آنسو پوچھے اور کہنے لگے۔

"کیا بتلاؤں کہ کیا معاملہ ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ مفلسی سب بہار کھوتی ہے۔"

نواب اغن نے یہ کہہ کر مرغ پر ہاتھ پھیرا اور نواب کی طرف منھ اٹھا کر کہنے لگے۔ اب تو اپنی پیاری اولاد کو ہاتھ سے دینا پڑے گا۔

رفیع الشان نے مرغ کی طرف محبت سے دیکھ کر کہا

"بھئی پہیلیاں تو نہ بجھاؤ۔"

اغن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کل جو میں گھر گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پلیٹ میں قیمہ رکھا ہوا ہے۔ اسے دیکھتے ہی یاد آیا کہ منیا بانکے بہادر کو ایک ہفتے سے گوشت نہیں ملا۔ دال بھات کی واہیات خوراک پر بھلا کیا لڑے گا۔ میں نے پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے بات کہتے میں سب قیمہ صاف کر دیا۔ میں اسے پیار کرتا رہا اور پیار کرتے کرتے باہر چلا گیا۔

نواب فلک جاہ کے گھر پر مشاعرہ تھا وہاں سے رات گئے واپس آیا۔ آکر خادم طلب کیا اب جو خوان اٹھا کر دیکھتا ہوں تو سوکھی روٹیاں

ہیں۔ واللہ دال تک نہیں۔ میری شرافت دیکھئے کہ میں نے بیگم سے کچھ نہیں پوچھا دو لقمے نگل کر کھا لئے پھر ایک کٹورا ٹھنڈا پانی پیا اور پڑ رہا۔

رات کو دو بجے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اس اللہ کی بندی نے بات تک نہ پوچھی۔ آخر میں نے پوچھا۔

"تم نے بھی کچھ کھایا؟"

"میں جب بلا کھائے پیئے جی سکتی ہوں تو کھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بچوں نے بھی کچھ کھایا؟"

"ہاں۔"

"کیا کھایا؟"

"پلیٹ بھر قیمہ۔"

"بھئی میں بانکے بہادر کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ دوسرے بچوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"کیا آپ کے اور بچے بھی ہیں؟"

"بھئی اتنا شرمندہ نہ کرو تم ہی بتلاؤ کہ کیا کروں کیا بانکے بہادر کو مر جانے دوں۔"

"توبہ ــــ ان کا نمبر تو ہم سب کے بعد آئے تو آئے۔"

"خدا کے لئے بتلا دو کہ بچوں نے اور تم نے کچھ کھایا کہ نہیں۔ تم کو میرے سر کی قسم۔"

"آخر آج یہ فکر یہاں کہاں سے آپڑی ہے؟ کیا بانکے بہادر سلمہ' سے

جی بھر گیا ؟"

"میں اٹھ کر خود بھی بچوں کے پاس گیا ، تو دیکھا کہ تینوں جاگ رہے ہیں اور رو رہے ہیں ۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے ۔"

"بڑی لڑکی تو کچھ نہ بولی مگر دونوں چھوٹے لڑکوں نے کہا ۔" اماں جان نے ہم کو مار مار کر سوکھی روٹی کھلائی اور کہا کہ اب زندگی بھر یہی کھانا ملے گا ۔ گوشت جب آئے گا تو بانکے بہادر کو دیا جائے گا ۔"

"یہ سن کر میرے دل پر عجب عالم گزر گیا کہ ہائے یہ پھول سے نواب زادے اور نواب زادیاں اور سوکھی روٹی کھائیں ۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کروں ایک طرف تو یہ خیال آتا کہ یہ تینوں بھی تو آخر اولاد ہیں دوسری طرف بانکے بہادر کا خیال آتا کہ اسے کیا کھلاؤں ۔ ساری رات پلک سے پلک نہیں لگی اسی سوچ میں کٹ گئی کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں ۔ وہ اللہ کی بندی بھی نہیں سوئی لیکن ایک کلمہ بھی جو دل دہی کا کہا ہو ۔ جیا اس زندگی پر لعنت ہے ۔ اب اس اولاد کو دفن کروں یا ان اولادوں کو ۔"

نواب رفیع الشان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ بانکے بہادر کی طرف دیکھ کر کہنے لگے ــــ

"بھئی بانکے بہادر کیا مرد ہے ۔ ہمیشہ سر ہتھیلی پر لے کر میدان میں اترتا ہے ۔ پیٹھ دکھلانا تو جانتا ہی نہیں ۔ خون میں نہا نہا جاتا ہے ۔ لیکن تیور وہی رہتے ہیں ۔ اس کی رستمانہ جنگ دیکھ کر رگوں میں خون اس طرح دوڑنے لگتا ہے ۔ جیسے ہم خود میدان جنگ میں ہوں ۔ واللہ شاہ نامہ کی داستانیں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں ۔

بھئی نواب اغن سچ کہتا ہوں کہ اگر آج مجھے میرا علاقہ واپس مل جائے تو اس کے لئے محل بنوادوں مگر کیا کروں ایسا مجبور ہوں۔"

نواب رفیع الشان ہاتھ ملنے لگے۔ شوکت بھی حسرت سے بانکے بہادر کی طرف دیکھنے لگا۔ بانکے بہادر نے بھی ایک نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے بازو کھجانے لگا۔ شوکت سوچنے لگا کہ اگر اپنی کچھ بھی حیثیت ہوتی تو میں ضد کرتا کہ ابا حضور یہ مرغ مجھے دلا دیجئے۔

نواب رفیع کچھ سوچ کر کہنے لگے۔

"بیٹا اغن۔ اسے کسی قدرداں کو دے دو۔"

"چچا اس کی جدائی کا خیال کر کے کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اللہ جانتا ہے اس مرغ کے لئے میں نے دولت پانی کی طرح بہائی ہے۔ جب یہ چوزہ تھا، اس وقت اسے روزانہ جواہر مہرہ اور کشتہ مرجان کھلایا ہے اور جب جوانی پر آیا تو دونوں وقت مغز کنجشک دیا۔ پر اب کیا کروں۔ پیسے پیسے کے لئے بیگم کا دست نگر ہوں۔ ہائے اس پیارے کے بغیر کیسے جیوں گا۔"

"بیٹا شہزادوں پر ہر قسم کے وقت پڑتے ہیں اور وہ سب برداشت کر لیتے ہیں۔"

اغن نے خیالات کی دنیا میں ڈوب کر کہا۔

"اس کو دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی میرا راج پاٹ باقی ہے اور سب میری شمشیر کا لوہا مانتے ہیں —— ہائے۔"

نواب رفیع کچھ سوچ کر کہنے لگے

"ایک راہ سوجھ گئی۔ ایسی جگہ اسے دیا جائے جہاں تمہارا بھی حق رہے۔"

اغنو ۔ "ارے جب اپنے ہاتھ سے گیا تو گیا۔ خیر اگر کچھ حق رہے تو
دل کو ذرا تسلی ہو جائے گی۔"

"اغنو ۔ تم اس کے بیٹے کو بیٹی سمجھو ۔ بیٹی دوسرے گھر بیاہی جاتی ہے۔"
"چچا بیٹی کے لئے تو ماں باپ پہلے سے تیار رہتے ہیں مگر
بیٹے کی بات ۔"

اتنے میں دروازہ پر شور ہوا اور دس بارہ آدمی جن میں بوڑھے جوان
اور بچے سب تھے ۔ اندر آ گئے اور شور کرنے لگے ۔

"مبارک ہو ۔ مبارک ہو ۔ اسفندیار نے سہراب کو مار لیا ۔"
نواب رفیع یہ سن کر اچھل پڑے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں ۔
"واللہ!!! سچ ہے !! واقعی سہراب کو مار لیا ——" اب
تو ہمارا اسفندیار نوشیرواں ہے نوشیرواں ۔"

جھمن بیگ نے جو سب سے آگے تھے ، اور آداب بجا لا کر کہا ۔
"نواب استاد ۔ ادھر یہ جیتا ادھر بڑے نواب نے کمر سے روپیوں
کا توڑا نکال کر سامنے رکھ دیا ۔ اور کہا ۔ مجھے عطا کر دو اسفندیار کو ۔"

نواب رفیع " پھر تم نے کیا جواب دیا ۔ جھمن بیگ ۔"
جھمن بیگ کے ہاتھ میں بیٹر دبا ہوا کانپ رہا تھا ۔ اس کی چونچ
اور سر پر زخم تھے ۔ جن پر مرہم کے پھاہے لگے ہوئے تھے ۔ نواب صاحب نے
ہاتھ بڑھا کر کہا ۔

ادھر لاؤ میرے فاتح کو ۔
جھمن بیگ کے ساتھ ایک چھوکرا ہاتھ میں حقہ اور خاصدان

لئے ہوئے آیا تھا۔ چھمن بیگ نے پہلے بٹیر نواب کے ہاتھ میں دیا اور پھر باری باری دونوں چیزیں چھوکرنے سے لے کر نواب رفیع کے سامنے پیش کیں اور ادب سے کہا۔

" نواب استاد آپ نے کئی مرتبہ کہا ۔ میرے یہاں حقہ اور خاصدان لے کر نہ آیا کرو ۔ میں جانتا ہوں کہ اس گستاخی سے آپ کی شان مہمان داری مجروح ہوتی ہے ۔ لیکن کیا کروں میرا جی چاہتا ہے کہ اس دربار میں بھی میرا ہی سکہ چلے ۔"

اس فقرے پر سب ہنس پڑے ۔

چھمن " نواب شوکت بھائی اب تم حقے اور پان کی فکر نہ کرنا ۔"

نواب رفیع نے ایک تبسم کے ساتھ یہ باتیں سن لیں ۔ ایسے موقع ان کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے ۔ جب ان کے گھر میں نہ پان ہوتا تھا اور نہ حقہ ۔ اسے وہ بھی جانتے تھے اور چھمن بیگ بھی ۔ آج بھی ویسا ہی موقع تھا ۔

نواب صاحب نے جواب دیا ۔

" بھئی تمھاری خوشی اس میں ہے تو یہی سہی ۔"

پھر انھوں نے اسفندیار کے پیچھے اور جو بیچ دیکھ کر کہا ۔

" بات کھلی تو نہیں ؟"

ایک بوڑھے نے جو پھٹی رضائی اوڑھے تھا جواب دیا ۔

کیسے کھلتی ، نواب استاد ۔ اس فن میں تو آپ کا ثانی نہیں ۔

وہاں کے استادوں نے بالی سے پہلے اس کی چونچ اور پنجوں کو خوب دیکھا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آیا۔"
بوڑھے روشن لال نے کہا۔
"ایسی چونچ اور ایسے پنجے کون تراش کر سکتا ہے" آپ نے تو تراشنے کے بعد دھاریاں تک بنا دیں۔ قدرت کی کاریگری کا مقابلہ کیا ہے آپ کی تراش نے۔"
نواب :" ارے روشن لال جی کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہو۔ یہ تو مشق کی بات ہے۔ لوگ چاول پر قل ہو اللہ لکھتے ہیں، میں چاہوں تو پوری الحمد چاول پر لکھ دوں۔
"حق ہے۔"
"حق ہے۔"
"سچ تو یہ ہے کہ کاریگری کی وجہ سے اسفندیار جیتا ہے ورنہ سہراب تو ایسا جیتا تھا کہ شیر کیا جیتے گا۔ لیکن اس کی ضرب اسفندیار کے آگے ایسی تھی جیسے خنجر کے سامنے چاقو اور چھری۔"
باپ کے کمالوں کا تذکرہ سن کر شوکت کا سینہ چوڑا ہو گیا اور وہ اپنی بھوک بھول گیا۔ اس کے پاؤں میں سردی لگ رہی تھی اور جی چاہ رہا تھا۔ کہ رضائی اوڑھ لوں۔ لیکن کیسے اوڑھتا — پھٹی ہوئی تھی۔
نواب رحیم نے اسفندیار کو موڑ دے کر کہا۔
بھئی۔ آدھا کاغذ اسے اور موٹا کرو۔"

"مجھ کیا کروں اس کے لئے۔"

"کچھ نہیں بس اتنا کرو کہ شہد اور بالائی جو دیتے ہو اس میں ایک منقہ پیس کر ملا دیا کرو اور ہاں رتی کا سولھواں حصہ کشتہ یاقوت بھی دو۔ لیکن لو گے کہاں سے یہ کشتہ کہیں لکھنؤ کے کسی عطار کے یہاں سے نہ لے لینا۔ یہ جانے چوڑیوں کے ٹکڑوں سے بناتے ہیں یا کاہے سے کہ ان کے کشتے میں ذرا جو طاقت ہو۔ تم حکیم اجمل خاں کے دواخانہ دہلی سے منگوا لینا۔"

ایک نوجوان جو صرف ایک موٹا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اور اپنے کپکپاتے دانتوں اور ہونٹوں کو سنبھال کر کہنے لگا۔

"اگر حکیم صاحب کو اسفندیار کا حال لکھ کر نسخہ لکھوایا جائے یا دہلی جاکر دکھلایا جائے تو کیسا رہے حضور نواب صاحب؟"

روشن لال "حکیم صاحب بٹیروں کا کیا حال کیا جانیں۔ بٹیر کے پاؤں میں کوئی نبض لگی ہوئی ہوتی ہے جس سے وہ حال جان لیں گے؟"

آغا۔ "حکیم صاحب تو بہت بڑے حکیم ہیں وہ جانتے تو ضرور ہوں گے مرغوں اور بٹیروں کا حال۔ لیکن یہ لوگ مرغ بازی بٹیر بازی وغیرہ فنوں کی قدر نہیں کرتے ہیں۔"

روشن لال "ٹھیک کہا آپ نے۔ نئے زمانے کے لوگ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ میرا بھتیجا جو وکالت کرتا ہے، وہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کی ہنسی اڑاتا ہے۔"

نواب "ان لوگوں کے بدن میں وہ گرم خون کہاں جو بہادرانہ

جگنوں پر کھول اٹھے وہ تو بس تاش کھیلنا جانتے ہیں۔"

اغن: "سچ ہے نواب صاحب کیا بات کہہ دی آپ نے۔"

نواب: "یعنی ہم لوگ تو بٹیروں اور مرغوں سے بہادری کے کارناموں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ غدر کے بعد سے تو جسے دیکھو چوڑیاں پہنے بیٹھا ہوا ہے۔"

اغن: "چچا میں تو جب اپنے بانکے بہادر کو لڑتا ہوا دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ گویا خود دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہوں اور ان کو اپنی شمشیر زنی سے گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا ہوں۔ سردی کھاتا ہوا نوجوان۔" اور جو اپنا بٹیر یا مرغ ہار گیا تو پھر حضور؟"

روشن لال: "تو کیا میاں صاحبزادے تم نے نہیں سنا۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

نواب رفیع: "کیا شعر پڑھ دیا۔"

اغن: "(ٹھنڈی سانس بھر کر) چچا بٹیر بازی سکھلا دو تو مرغ بازی سے توبہ کرلوں۔"

روشن لال: "نواب اغن بٹیر بازی، زر بازی سونا اڑاؤ تب میرا ہاتھ لگتا ہے۔ جھمن بیگ کو دیکھو جب پندرہ سال خون تھوکا ہے تب یہ دریتیم (اسفندیار کی طرف اشارہ کرکے) ہاتھ آیا ہے۔"

ایک اور نوجوان جو کشمیرے کی اچکن اور اس پر گلو بند پہنے ہوئے تھا کہنے لگا۔

"لالاجی نواب اعظم نے مرغ کے لئے کچھ کم کھویا ہے ۔ ساری جائداد گنوادی ہے ۔ تب بانکے بہادر ملا ہے ۔ زرا دیکھئے گا نواب اعظم کی شال ۔ اس میں پیوند لگ گئے ۔

نوجوان جوش محبت میں یہ بات کہہ گیا لیکن آخری فقرہ سن کر سب سٹپٹا سے گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ۔ نواب اعظم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور یہ عالم ہو گیا کہ زمین پھٹے تو سما جائیں ۔ یہ بات اس وجہ سے اور کھلی کہ کہنے والے کی حیثیت بہت معمولی تھی ۔ وہ کشمیرے کی اچکن جو پہنے تھا ۔ نواب رفیع نے کھنکار کر کہا ۔

میاں صاحب زادے یہ پیوند نہیں ہیں ۔ یہ تو رقعے ہیں ۔ اور رقعے تو بڑے بڑے نوابوں کی شال میں لگے دیکھے گئے ہیں ۔ مگر بھئی واللہ جس نے یہ رقعے لگائے ہیں کمال کر دیا ہے ۔ نہ جھول نہ موڑ ۔ ان تناؤ واہ کیسے کیسے کاریگر ہیں ابھی لکھنؤ میں !! یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر کام نہ ہو تو بھی ان کی قدر دانی کرنے کے لئے کام بنوانا چاہیئے ۔ میری مجھے ایسا آدمی مل جائے تو میں اپنی نئی شال میں بھی دو ایک رقعے ضرور لگوالوں ۔ کیوں بھئی اعظم ، تم نے تو بہت انعام دیا ہوگا اس کاریگر کو "

نواب اعظم پر اور محفل پر نواب رفیع الشان کی اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا ۔ اور فضا بدل گئی ۔ نواب اعظم نے اپنے کو سنبھال کر اور بگڑ کر کہا ۔

"حیا اس کو کچھ دیا تو ضرور مگر اصل انعام تو اس بات کو سمجھے کہ یہ شال کاندھے پر ڈالے گھوم رہا ہوں جو بھی دیکھتا ہے وہ کاریگر کی تعریف کرتا ہے":

نواب رفیع یہ انعام تو سو انعاموں کا انعام ہے اب دیکھو ان میاں صاحبزادے ہی کو معلوم ہو گیا کہ رتبے لگانا کیا فن ہے اور اس کی قدر دلانی کیسے کی جاتی ہے۔ اسی طرح بات معلوم ہوا کرتی ہے کیوں بھئی ــ؟

کشمیرے کی اچکن والے نوجوان اپنی غلطی محسوس کر کے بے حد کٹ گیا تھا، اب نواب صاحب کی یہ بات سن کر ذرا اس کی حالت سنبھل گئی کہنے لگا ــ

"نواب صاحب بجا ارشاد ہوا۔ مجھے بڑی قیمتی بات معلوم ہو گئی ــ"

"مگر میاں صاحبزادے یہ بات تم نے سولہ آنے سچ کہی تھی کہ نواب اغن نے لاکھوں روپے اڑا دیا ہے۔ تب جا کے بانکے بہادر ہاتھ آیا ہے۔"

نواب اغن مگر حضور حیا اب تو مرغ بازی سے توبہ کرنی پڑے گی اب یہ فن بھی جا رہا ہے کون قدر کرتا ہے بانکے بہادر کی۔"

جھمن بیگ ــ" نواب اغن یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آج آپ کے بانکے بہادر کو کون نہیں جانتا ہے۔ اخبار شعلۂ سخن میں تو اس کی خبریں چھپ گئی ہیں۔ وہ جو ہیں ملیح آباد کے بڑے خاں صاحب وہ جب بھی لکھنؤ آتے

ہیں تو ایسا کوئی نہ کوئی مرغ بھی ساتھ لاتے ہیں۔ اور کہیں نہ کہیں ایسے لڑاتے بھی ہیں۔ لیکن ان سے جہاں کہو ذرا اس کا بانکے بہادر سے مقابلہ ہو جائے تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے ہیں کہ میرے مرغ کا مزاج نصیب دشمناں ناساز ہے۔"

نواب۔ "بہادری تو بانکے بہادر کی خیر مسلم ہے ہی لیکن ذرا اس کی شان تو دیکھو۔ کس طرح چھاتی پھیلائے کھڑا ہے اور کیا تیور ہیں۔ جب مقابل میں کوئی مرغ آتا ہے تو کس غرور سے اس کے پنجوں چونچ اور بازوؤں کی طاقت کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اس کے اسلحہ کے مطابق حملہ کرتا ہے۔ کس پھرتی اور تیزی سے حملہ کرتا ہے۔ جست تو اس غضب کی ہوتی ہے جیسے کڑی کمان کا تیر۔"

اتنا کہہ کر نواب رفیع نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"مگر بھئی، غوث کا کہنا بھی سچ ہے کہ اب یہ فن شریف لکھنؤ سے جا رہا ہے اور استادان فن ناقدری سے تنگ آکر بھاگ رہے ہیں۔ کوئی رام پور جا رہا ہے تو کوئی حیدرآباد۔"

اغوث: "حیدرآباد جو گئے ہیں، ان کا حال تو مجھ سے سنئے۔ بچارے روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں تنخواہ و نخواہ اور انعام و اکرام تو سب کچھ ہے مگر وہ بات کہاں جو لکھنؤ میں تھی۔ وہ لوگ تو بڑے بڑے مزے کی باتیں کرتے اور بتلاتے ہیں۔"

"وہ کہتے ہیں کہ حیدرآبادی نواب اصیل مرغوں کی جگہ انگریزی نسلوں کے مرغ پالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو موٹا کرو جب استاد لوگ

کہتے ہیں کہ حضور ان مرغوں کے بدن پر تو یوں ہی چربی ہوتی ہے۔ اگر ان کو دبلا نہ کیا جائے تو کم از کم موٹا تو نہ کیا جائے۔ موٹا کیا تو لڑنے میں ان کا دم پھول جائے گا۔ پھر نہ پینچ رہے گی اور نہ پھلانگ۔ لیکن حیدرآبادی نواب ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتے۔ وہ کہتے ہیں موٹا کرو۔"

روشن لال:" وہ خود جو مشک کے برابر کے توند رکھتے ہیں، وہ لوگ کیا جانیں دبلاپے کی قدر۔"

نواب اغن "ابھی سنیئے تو استاد لوگ ان کی فرمائشوں سے مجبور ہو کر مرغوں کو کشتیوں اور مرداریدکی جگہ مکھن اور عرق انگور دلواتے ہیں۔ ان چیزوں کو کھا کھا کر جب وہ خوب موٹے ہو جاتے ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ نواب صاحبان کیا کرتے ہیں؟"

سب۔ "کیا کرتے ہیں؟"

ان کا موٹاپا دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور باورچی کو دے کر کہتے ہیں کہ بھون لاؤ۔

ساری محفل چیخ اٹھی۔

"ارے۔ ارے۔"

"توبہ۔ توبہ۔"

اغن۔ "جی اولاد بنا کے ایسی حرکت۔" بھئی مرغ ہم میں سے کون نہیں کھاتا ہے مگر۔۔"

روشن لال (ٹوک کر) کیا کہتے ہو نواب زادے۔"

اغن۔ "ارے بھائی معاف کیجئے گا۔ یاد نہیں" کہ آپ

نہیں کھاتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے تو بہتیرے مرغ کھاتے ہیں لیکن ایسے مرغ کو کون کھائے گا۔ جسے متنبیٰ کر چکا ہو۔

نواب رفیع۔ "بھئی رام پور والے تو ایسے نہیں ہیں۔"

جھمن بیگ۔ ان کو تو دنبے لڑانے کا شوق ہے اور اس کے بعد مرغوں کا۔ بٹیر تو ان کے نزدیک اتنی چھوٹی چیز ہے کہ اس کی لڑائی نظر ہی نہیں آسکتی ہے۔"

نواب رفیع۔ "واہ رے لکھنؤ یہاں تو ہم نے چڑکوے تک لڑائے ہیں۔ لیکن ان نازک لڑائیوں سے لطف لینے کے لئے بھی اسی ذوق کی ضرورت ہے جس سے انیس و دبیر کے کلام سے لطف لیتے ہیں۔

جھمن "بجا فرمایا۔ وہ خانصاحب والا واقعہ یاد رہے جب ان کا بٹیر ہار گیا اور لوگوں نے شور مچایا کہ خاں صاحب ہار گئے خاں صاحب ہار گئے۔ تو خاں صاحب لاٹھی تان کر کھڑے ہو گئے گرج کر بولے کیا شور مچا رکھا ہے کیا میں ہار گیا ہوں۔ ہے کسی مائی کے لال میں ہمت کہ آ کر مجھ پٹھان کا مقابلہ کر کے دیکھے۔ وہ تو کچھ خلیفہ موجود تھے ان سب کا لحاظ کرتے تھے انھوں نے آنکھ ماردی اس لئے خاں صاحب سے کوئی نہیں بولا۔ ورنہ وہاں تو ایک سے ایک ہٹا چھٹا اور پھکیت موجود تھا۔ وہ ضرور مقابلہ کرنے پر تل جاتے اور پھر بٹیر بازی بات کی بات میں لٹھ بازی بن جاتی۔"

اغن۔ "یہ خاں صاحب تو بس اکھاڑے کے مرد ہیں۔ وہاں صبح سے شام تک کشتیاں دیکھتے رہتے ہیں اور خود بھی زور کرتے ہیں۔ لیکن بٹیر بازی کے میدان میں تو اس طرح چڑچڑانے لگتے ہیں جیسے ہریلا جواری۔"

نواب رفیع:۔ میاں آغن اکھاڑے کی بات اور ہے بٹیر بازی اور مرغ بازی میں ایک طرف خون کے فوارے چلتے ہیں اور دوسری طرف رگوں میں آگ دوڑتی ہے۔ بھئی اس میدان میں بڑے صبر اور شرافت کی ضرورت ہے ــــ میں نے میر سلطان علی مرحوم کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان کا مرغ یا بٹیر ہار جائے تو بھی اسی طرح مسکراتے رہتے تھے، جیسا اس کے جیت جانے پر۔ یہ وضع دار یاں کشتی والوں اور لٹھ بازوں میں کہاں۔

سرخ محل کی ڈیوڑھی کے گھڑیال نے دس بجائے ان کو گن کر چھمن بیگ نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی اور پھر کہنے لگے۔

"استاد حضور۔ رخصت کی اجازت چاہتا ہوں۔ نئے بٹیروں کو موٹھ کرنا ہے چھمن بیگ کے ساتھ آغن کے سوا سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہوئے ان کے جانے کے بعد آغن نے کہا۔

چچا میرے بارے میں کیا حکم ہے ــ؟"

نواب رفیع:۔ بھئی آغن مرغ کا پالنا اور ہاتھی کا پالنا برابر ــ اس کا کھانا، اس کی دیکھ بھال، صفائی، تعلیم اور ریاضت یہ سب کے سب بہت ہی کٹھن کام ہیں۔ رونق مرزا بچارے نے مرغ کی خاطر بیوی بچے بھی چھوڑ دیئے اس پر بھی کام نہ بنا تو چوری کی۔ سنا ہے کہ اس نے عدالت میں کہا تھا مرغ کی ذمہ داری بیوی بچوں اور اپنی ذات کی ذمہ داری سے بھی اونچی چیز ہوتی ہے۔ مگر عدالت نے اس بات کی قدر نہ کی اور جیل بھیج دیا۔ ہائے بچارا!! میں جانتا ہوں کہ اب بھی اللہ کا دیا تمہارے پاس بہت کچھ ہے اور تم ابھی برسوں اس شوق کو چلا سکتے ہو، لیکن اپنی بیگم اور بچوں کا خیال کرو۔ یہ بھی دیکھو کہ بیگم کے لئے تو

بانکے بہادر سوتیلا بیٹا ہے۔ وہ اس کی خاطر کیوں مصیبتیں جھیلنے لگیں۔"

نواب رفیع سوچنے لگے پھر بولے۔

"سوچتا ہوں لالا شیام ناتھ سے کہوں۔ اگر مرغ وہاں رہا تو گویا تمہارا ہی رہا۔ تمہارے ہی نام سے لڑایا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ لالہ جی کچھ تم کو ——— ہاں ہاں۔ تم کو اس کی ضرورت نہیں لیکن دوسرے کو بھی شکریہ کا موقع دینا چاہیئے۔ سو دو سو روپیہ شکرانہ معمولی رقم ہے۔

اغن ——"چچا آپ نے تو دل پر گھونسا مار دیا۔"

رفیع۔ "اگر مجھے بزرگ سمجھتے ہو تو بس چپ رہو اس معاملہ میں۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو کل سہ پہر کو آجانا۔"

جب اغن چلے گئے تو نواب نے شوکت سے کہا۔

اغن کا شوق کتنا سچا ہے۔ ہائے کیا بیتے گی اس کے دل پر جب بانکے بہادر کسی دوسرے کے گھر جائے گا۔ لیکن میں سمجھ گیا۔ ہوگا دوسرا فیترا فاقہ اس کے گھر میں۔ مرغ کا اونڈا بھی بالکل ہی خالی تھا۔ کتنی نحیف آواز تھی اس کی ——

"بٹیا مہری اس وقت بھی نہ آئی۔ ان لونڈی بچوں نے خود ہی کہلایا تھا کہ شادی کے زمانے میں دونوں وقت کا کھانا آئے گا، اور خود ہی دو روز بھیج کر بند کر دیا۔ کیسے کیسے لوگوں کو عروج مل رہا ہے اس زمانے میں ——"

ہائے ——— افسوس بر کار چرخ بلند۔"

"اچھا جاؤ اور دو پیسے کی نہاری ا روٹی تحسین کی مسجد سے ادھار لے آؤ ——"

شوکت یہ سن کر ذرا ہچکچایا اور پھر کہنے لگا — پچھلے پیسے باقی ہیں ۔"

"کتنے ؟"

"چھ آنے ۔"

"ہوں اس سے میری طرف سے کہہ دینا کہ سب جلد ہی ادا ہو جائے گا اب ایسی بات بھی نہیں ہے کہ وہ چھ آنے کی وجہ سے ادھار قرض نہ دے۔ ہائے اپنا علاقہ! تب کیا دن تھے اور اب کیا ہیں اور جانے کب تک یہ حال رہے ۔"

شوکت نے جامے دار کا انگرکھا پہنا۔ جس میں درجنوں چھوٹے بڑے چھید تھے لیکن وہ تھی بڑی نادر چیز۔ اس کے رنگوں میں ابھی تک تازگی باقی تھی ایسی تازگی جو غربت کے زخموں کو چھپا لیتی تھی۔

شوکت نے ایک رومال میں پیالہ باندھا اور چوک کی طرف چلا۔ شوکت کو نہاری روٹی لینے اکثر جانا پڑتا تھا اور اس کے لئے ہاتھ میں پوٹلی لے کر آدھے چوک سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ چیز اس کی نوابزادگی پر بہت شاق گزرتی تھی۔

شوکت اپنی لمبی گلی سے گزر کر چوک کے پاس پہونچا ہی تھا کہ ایک طرف سے تان کی آواز آئی —

آ۔ آ۔ آ۔ آ — آ

شوکت کے دل پر یہ آواز ایک نامعلوم اثر کیا کرتی تھی، جس کا سمجھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ عجیب میٹھا میٹھا درد پیدا ہو جاتا تھا۔ اس

آواز سے۔ اس سے سابقہ پہلے پہل نواب جانی کی شادی میں پڑا تھا جب کہ ملکہ جان نے لوگوں کے اصرار پر اپنی نوسالہ بیٹی مہ لقا سے ایک غزل گوادی تھی۔ کیا شعر گایا تھا اس نے۔

لکھی تھی حسن پرستی ازل سے قسمت میں

میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

اس راستے سے گزرتے وقت وہ اکثر اس آواز کو سنا کرتا تھا۔

اس وقت اس نے جو یہ آواز سنی تو سب کچھ بھول گیا اور دیوار کے پاس کھڑا ہو کر آ۔ آ۔ سننے لگا۔ جب تان چڑھتے چڑھتے اوپر بہت اوپر پہونچ کر ایک جھونک کے ساتھ لہراتی ہوئی نیچے اترتی تھی تو اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی زخمی دل میں گدگدی پیدا کر رہا ہے۔

آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ

آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ

یہ ملکہ جان کے بالا خانے کی پشت تھی اس کے نیچے بھی ایک کمرہ تھا جو گلی کی طرف کھلتا تھا اس وقت اس کمرے میں تعلیم ہو رہی تھی لیکن اس کے دروازہ بند تھے۔

اتنے میں کسی نے کمرے کا دروازہ کھولا اور کہا۔

آؤ بیٹے اندر آکر سنو "

یہ ملکہ جان خود تھیں۔ بال کھلے چہرہ اڑا اڑا سا۔ بھاری جسم ملگجی ساری بے ہنگم طور سے لپٹی ہوئی۔

شوکت کو اسے دیکھ کر کراہیت سی آئی۔ اور دل میں کہنے لگا کہ لوگ

اسی پر مرتے ہیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔
"معاف کیجئے گا۔"
پھر گھبرا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی سے نکل کر چوک میں داخل
ہو گیا۔ لیکن چلتے وقت کھلے ہوئے دروازہ سے اس کی نظر مہ لقا پر پڑ گئی جس کا
بھولا چہرہ بڑی بڑی بالیوں کے ہالے کے بیچ میں چمک رہا تھا۔
وہ تو بھاگ آیا۔ لیکن مہ لقا کی آواز اس کے کانوں اور دل کا
پیچھا کرتی رہی۔
"آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ —
آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔"
ادھر اس آواز میں چوک کا شور و شغف شامل ہوا اور ادھر
شوکت کو یہ احساس ہونے لگا کہ کہاں میں نواب زادہ اور کہاں یوں بھرے
بازار میں سودا خریدنا اور خرید کر گزرنا —
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

(۳۲)

لالہ شیام ناتھ کی بارادری میں جب نواب رفیع الشان پہونچے
تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ واحد رسول بھی موجود ہیں۔ نواب رفیع نے سوچا کہ

یہ بات ذرا ویسی رہی کیوں کہ شیخ صاحب بھی مشہور مرغ باز ہیں۔ ان کی موجودگی میں اگر بانکے بہادر کے بارے میں لالاجی سے بات چیت کی جائے گی تو ان کو ضرور ناگوار ہوگا۔ کہ یہ مشہور مرغ مجھے کیوں نہیں دیا جارہا ہے ۔

لالاجی نے نواب صاحب کو دیکھتے ہیں کہا۔

"آئیے آئیے نواب صاحب۔ آج کدھر کا چاند نکلا "

"کیا بتاؤں لالاجی' بہت دنوں سے ادھر آنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن ایسی مصروفیتیں رہیں کہ بس "

"میں تو سمجھا کہ آپ مجھے بھول گئے "

"ارے ایسا کہاں ممکن ہے۔ ہمارا آپ کا ساتھ' وہ کبوتر بازیاں وہ پتنگ بازیاں بھلا بھولنے والی چیزیں ہیں؟"

"بس اتنا ہی یاد ہے؟"

نواب صاحب: "ارے بھائی وہ باتیں تو نہ یاد دلاؤ "

ماجرائے نوجوانی عہد پیری میں نہ پوچھ "

شرم آتی ہے اب اس قصہ کو دہراتے ہوئے "

لالا صاحب: "کبھی ادھر سے گزرتے بھی ہو "

" خالی ہاتھ کیا گزروں ۔ اپنی وضع تو یہی رہی کہ جب گئے خاصدان میں سو ڈیڑھ سو رکھ آئے ۔"

شیخ جی " بھائی آج کل تو کوئی بھی ایسا نہیں کرسکتا ہے۔ گرانی کتنی ہے' غضب خدا کا کہ چار سیر کا آٹا بک رہا ہے۔ آدھ سیر کا گھی ' پانچ

روپیے ختک تنخواہ پانے والے جانے کس طرح زندہ ہیں۔"

نواب۔" ہاں شیخ جی۔ آٹے دال کا بھاؤ۔ تم نہ جانو گے تو کون

جانے گا۔"

"تم ٹھہرے نواب۔ نہ گھر کی فکر نہ شہر کا اندیشہ۔"

"شیخ جی کاش ایسی ہی زندگی ہوتی جیسا آپ کہہ رہے ہیں۔

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا

یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

پیادے نے آکر فرشی سلام کیا۔

لالاجی:" کیا بات ہے؟"

پیادہ۔ حضور یہ پڑوس میں جو اخبار والے ہیں۔ ان کے یہاں پولیس

آگئی ہے۔

"پولیس۔"

نواب و شیخ "آئیں۔ غضب"!!

لالاجی۔" کیا کیا تھا ان لوگوں نے؟"

شیخ۔" میں سنتا ہوں یہ لوگ کوکین بیچتے ہیں۔

"ہو سکتا ہے چوری کا مال نکلا ہو۔"

لالا۔ جو بھی ہو۔ آبرو گئی۔ اب کون پوچھے گا کہ بے قصور ہو یا

نہیں۔ سب یہی کہیں گے کہ ان کے گھر پولیس آگئی تھی۔"

اتنے میں وکیل سردار خاں آگئے۔

سردار خاں۔" آداب بجالاتا ہوں۔"

"آداب عرض ہے ۔"

لالاجی ۔ بھئی وکیل صاحب یہ بیچارا اخبار والا کیوں پکڑا گیا؟

سردار ۔ "سرکار ایک قانون بنارہی ہے ۔ اس کے خلاف اس نے کچھ اپنے اخبار میں لکھا تھا ۔"

"تو یوں کہو کہ بغاوت کے الزام میں پکڑا گیا ہے ۔"

نواب ۔ "بغاوت تو چوری اور قتل سب سے بری چیز ہوتی ہے ۔ حاکم وقت کے خلاف کوئی کام کرنا اور حاکم بھی کیسا جس نے قیصر جرمنی اور سلطان ترکی کو جنگ کے میدان میں شکست دے دی ہے ۔"

"کیوں کیا اس شخص کا دماغ چل گیا تھا جو اس طرح سرکار سے بھڑ گیا ۔"

"خراب ہی ہوگا ۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی ۔"

سردار خاں ۔ "یہ اخبار والا کانگرسی ہے ۔"

نواب ۔ "بھائی وکیل صاحب ۔ یہ کانگرسی کون لوگ ہوتے ہیں ۔ کانگرس کیا کوئی خاص مذہب ہے ۔؟

سردار خاں ۔ کانگرسی مسٹر گاندھی کو اپنا رہبر مانتے ہیں ۔"

نواب ۔ "یہ مسٹر گاندھی کون ہیں ۔

سردار خاں ۔ ایک گجراتی ہندو ہیں ۔ جو کہتے ہیں کہ انگریزی سرکار کو ہرا کر وہ ہندستان جیت لیں گے ۔"

نواب ۔ "کیا ان کے پاس قیصر جرمنی سے بھی بڑی توپ ہے ؟"

سردار خاں ۔ "توپ بندوق کچھ نہیں ۔ کہتے ہیں کہ وہ اس سرکار کو

نہتے بھی ہرا دیں گے۔"

یہ سن کر سب نے قہقہہ لگایا۔

نواب۔ ؎

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں "

نواب۔ "وکیل صاحب۔ اب اتنا اور بتلا دیجئے کہ یہ خلافت کیا چیز ہوتی ہے؟"

'وہ ٹرکی کے خلیفہ جو لڑائی میں ہار گئے ہیں نا۔ اور انگریزوں نے جن کی حکومت چھین لی ہے۔ خلافت والے کہتے ہیں کہ ان کی حکومت ان کو واپس دے دو۔"

لالاجی۔ "واہ بھئی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ لفظ خلافت سرکار کے خلاف ہونے کی خرابی ہے۔ بھئی کسی فاتح نے بھی کبھی ایسا کیا ہے کہ فتح کیا ہوا ملک خیرات میں دے دیا ہو جو انگریز اپنا فتح کیا ہوا ملک خلافت والوں کو دے دیں۔؟"

نواب۔ "انگریز اپنی جیتی ہوئی سلطنت واپس کر دیں"۔ خوب۔ اور جو ان کے لاکھوں آدمی مرے اور کروڑوں روپیہ گولا بارود کی شکل میں اڑ گیا، وہ ان کو کون لوٹائے گا؟

شیخ۔ آپ لوگوں نے کچھ سنا بھی ہے، بڑے بڑے مسلمان خلافت میں شریک ہو رہے ہیں۔"

نواب کوئی بھی شریک ہو لیکن جب تک بات عقل میں نہیں آتی،

میں نہیں مانتا۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ کانگریس والے کہتے ہیں کہ بلا لڑے بھڑے سلطنت جیت لیں گے۔ اور خلافت والے کہتے ہیں کہ شور مچا کے ترکی کے خلیفہ کو سلطنت دلادیں گے ۔"

"یہ بھی تو وہ دیکھیں کہ انگریزوں کی طرف فوج توپ اور بندوق کے علاوہ اقبال بھی تو ہے۔ جرمنی کے ایسے سائنس جاننے والے ملک کو کیوں کر ختم کر دیا۔ سنا ہے کہ اب جرمنی کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہاں کے لوگ درخت کی چھالوں اور کتے کے گوشت سے پیٹ بھرتے ہیں ۔"

شیخ ۔" اور ترکی کے بہادر تلوار باز سپاہیوں کو بھی تو ہرا دیا ۔"

نواب ۔" وکیل صاحب یہ بھی کچھ کھلا کہ قیصر جرمنی مسلمان ہوگیا تھا یا نہیں ؟"

شیخ ۔ "مگر جو کچھ بھی ہو بھائی ان نے وہ وہ بہادریاں اور وہ وہ چالاکیاں دکھلائی ہیں کہ چھکے چھڑا دیے۔ افسوس قسمت نے ساتھ نہ دیا ۔"

نواب ۔" قسمت کی بدنصیبی کو صیاد کیا کرے ۔"

لالا جی ۔" ارمان وکیل صاحب ، یہ اخبار والے جیسے بھی ہوں مگر ہیں ہمارے پڑوسی ان کے لئے کچھ ہو سکتا ہے ؟"

وکیل ۔" ہاں ضمانت تو ہو سکتی ہے شاید "

لالا جی (کچھ سوچ کر) پھر پتہ لگائیے ۔ ہو سکے تو کچھ کیا جائے ۔"

وکیل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر چلے گئے۔ اب موقع تھا گفتگو چھیڑنے کا۔ اس لئے نواب صاحب نے یوں ابتدا کی۔

"لالاجی۔ آپ کے مرغوں کا مزاج کیسا ہے۔"

"مرغ؟ (ٹھنڈی سانس لے کر) کیا بتلاؤں نواب آج پندرہ روز ہوئے ہیں کہ لال صاحب آئے اور ایک کاغذ دکھلانے لگے۔ جس پر مرغ بازی کے اخراجات کی تفصیل موجود تھی۔ دیکھا تو اس میں لکھا تھا۔

"دو ملازم سو روپیہ ماہوار۔ دوائیاں اور مقویات ایک سو پچاس روپیہ ماہوار۔ متفرقات انعامات وغیرہ بیس پچیس روپیہ ماہوار۔ کاغذ دکھا کر کہنے لگے اتنے میں تو موثر رکھا جا سکتا ہے۔ جس سے کہ شہر میں عزت ہوگی۔ میں نے سمجھایا کہ بیٹا مرغ بازی شاہوں کا کھیل ہے اس سے دہلی۔ رام پور۔ حیدر آباد بلکہ لاہور تک نام ہوتا ہے۔ دور دور سے لوگ لڑائی دیکھنے آتے ہیں۔ مرغوں کی لڑائی دیکھ کر ہماری فطری بہادری کی آب پاشی ہوتی ہے یہ ہمارے مٹتے ہوئے عروج کی نشانی ہے۔ وہ کہنے لگے اب تو یہ مشغلہ نکموں اور تضیع اوقات کرنے والوں کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ وہ لوگ آپس میں مرغوں کی ہار جیت کے تذکرہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زمانے بھر میں یہی ہو رہا ہے۔

اتنی سخت بات سن کر میں نے گردن جھکا لی کہ اب بچوں کے منہ کون لگے۔ اب ہم سب گویا نکمے ہیں۔ لیکن دل میں یہ بھی سوچا کہ ایک زمانہ تھا۔ جب ہم ہی ہم تھے، لیکن اب پڑھ پڑھا کر نئی روشنی کے لوگ نکل آئے ہیں جو نئی طرح کی باتیں سوچتے ہیں۔ وہ کیا جانیں مرغ کیا ہوتا ہے

اور مرغ بازی کیا ہوتی ہے۔ اس طرح میری مرغ بازی ختم ہو گئی۔"

نواب۔ "پھر آپ نے مرغوں کو کیا کیا؟"

"میں نے اس دن شیخ جی کو بلایا اور یہ قصہ سنا کر کہا اب سب مرغ آپ کے حوالے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

لیکن افسوس یہ کام بھی نہ بنا۔

شیخ جی۔ "یہ کہہ کر قسمت میں یہ دولت نہ تھی۔ ہوا یہ کہ بیس دن کی بات ہے یعنی لالاجی والے واقعہ سے کوئی پانچ چھ دن کی بات ہے کہ کسی طرح ڈربے میں سانپ پہونچ گیا اور اس نے میرے دونوں چہیتے مرغوں دولھا اور شمشیر کو سونگھ کر شہید کر دیا۔ آہ کلیجہ پر وہ چوٹ لگی کہ دنیا تاریک ہو گئی۔ میں دن بھر رویا۔۔۔ اور رات کو تہیہ کر لیا کہ اب جیتے جی کوئی شوق نہ کروں گا۔"

نواب صاحب۔ "پھر کیا کیا آپ نے باقی مرغوں کو؟ کیا اپنے بھتیجوں کو دے دیا۔؟

بھتیجے"۔ ارے صاحب ان کا حال نہ پوچھئے۔ وہ دونوں خلافت میں شریک ہو گئے ہیں۔ داڑھی رکھ لی ہے اور بہت موٹے موٹے کپڑے کے کرتے، پاجامے پہنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرغ بازی بٹیر بازی اور سب بازیاں بہت بری چیز ہیں۔ ان کے نزدیک آوارہ گردی اور شہدہ پن ایک طرف اور بازیاں ایک طرف کوئی نیا اخبار نکلا ہے اس میں ایسی ہی

باتیں چھپا کرتی ہیں۔ اسے یہ لوگ خریدتے ہیں اور زور زور سے پڑھتے ہیں تاکہ میرے کان میں بھی آواز آجائے۔ میں تبھی طرح دیتا رہتا ہوں۔ اب بچوں کے منہ کون لگے۔"

لالاجی۔" ان لوگوں نے تو سب بازیوں کو تو فضول قرار دیا ہے اور ایک نئی فضول خرچی نکال لی ہے جو ان سب سے چوگنی ہے۔"

شیخ جی۔ وہ کیا؟

لالاجی۔" یہ چندے کا چلن جو چلا ہے۔ پرسوں میرے لال جا نے دو ہزار روپیہ گاندھی جی کو چندے میں دے دیئے۔ اب پوچھو کہ ان دو ہزار سے کیا مرغ بازی سال بھر مزے سے نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اب میں کیا کہوں۔

شیخ جی۔" چندے کا چلن بھی خوب ہے۔ اب تو سب کام چندے سے ہونے لگے ہیں۔ آپ نے چندے کا میلاد شریف کبھی نہیں سنا ہوگا۔ لیکن اس سال امین آباد میں میلاد شریف چندے سے ہوگا۔ کیا زمانہ ہے؟ کبھی ہم لوگ ساجھے کی تجارت پر ہنسا کرتے تھے لیکن اب تو ساجھے سے بڑی بڑی تجارتیں ہوتی ہیں اور اسے کمپنی کہا جاتا ہے۔"

لالاجی۔" جی ہاں جی ہاں۔ یہ جو قیصر باغ میں چلتی پھرتی تصویروں کے کھیل دکھانے والا گھر بنا ہے اسے کسی کمپنی نے بنایا ہے۔ جس میں ہزاروں آدمیوں کا چندہ شامل ہے۔"

نواب صاحب نے دونوں کی باتیں سن کر بہت گہری ٹھنڈی سانس بھری اور سوچ میں پڑ گئے کہ اب اعظم کے لئے کیا کیا جائے۔

ملازم نے نئی ٹشکیں لاکے رکھ دیں، پرانی اٹھا لے گیا۔ خاصدان میں پان آگئے لالاجی کے دو مصاحب بڑے آغا اور ڈگشت جی بھی آگئے اور جرمنی کی بہادری پر تبصرہ ہونے لگا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ جرمنی دراصل ہارا نہیں ہے۔ یہ ہار بھی اس کی ایک چال ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح انگریز اس کی طرف سے غافل ہو جائیں۔ تو پھر وہ حملہ کر دے۔ اب جو وہ حملہ کرے گا تو کسی بہت ہی خطرناک ہتھیار سے حملہ کرے گا۔

لالاجی نے کہا "اگر لڑائی کچھ دنوں اور چل جاتی تو ہندستان کا بہت فائدہ ہوتا۔"

"یہ کیسے لالاجی۔"

لالاجی۔ "لڑائی کے زمانے میں زنگ خوردہ کیلیں تک پیسے پیسے بک گئیں۔ غریبوں نے اپنے گھروں کی دیواروں سے سڑی گلی کیلیں نکال کر بیچ ڈالیں۔ ہزاروں آدمیوں کا اس طرح بھلا ہو گیا۔"

کاروبار کے معاملہ میں یہ لوگ لالاجی کی باتوں کو حرف آخر سمجھتے تھے کیوں کہ انھوں نے ناکارہ لوہے کی تجارت سے لاکھوں بنا لئے تھے اور اس سے ایک بہت بڑا علاقہ خرید لیا تھا۔

نواب صاحب کے دل پر بانکے بہادر کی فکر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ انھوں نے گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ جب قیصر جرمنی کی تعریفیں ہونے لگیں تو انھوں نے دو مرتبہ بہت زور دے کر کہا کہ مجھے یقین ہے کہ قیصر جرمنی مسلمان ہو گیا تھا۔

چلمیں پھر بدلی گئیں اور خاصدان میں نئے پان آگئے۔ رات

کافی آگئی تھی اس لیئے لوگ اب جانے کے لیئے اٹھنے ہی والے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ایک لڑکا ایک گٹھر اٹھائے ہوئے بھاگتا ہوا دیوان خانہ میں گھس آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے لاٹھی لیئے ہوئے چوکیدار بھاگتا ہوا آگیا اور اس نے بڑھ کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچنے لگا۔

لڑکا۔ "لالاجی۔ بچائیے بچائیے"۔

سب حیرت سے لڑکے اور چوکیدار کو دیکھنے لگے۔ لالاجی نے ہاتھ کے اشارے سے چوکیدار کو روکا اور لڑکے سے پوچھنے لگے۔ تم کون ہو ــ؟

لڑکا یہ سن کر گھبرا گیا کہ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ پھر لالاجی کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"میں مسعود صاحب کا لڑکا ہوں فرخ۔ اخبار والے مسعود صاحب کا ــ مساوات اخبار والے۔ مجھے ابا جان نے آپ کے پاس بھیجا ہے"۔

"اچھا اچھا۔ سمجھ گیا میں کہ کیا معاملہ ہے"۔

لڑکا۔ "یہ کاغذات ضروری ہیں۔ پولیس کے ہاتھ نہ لگنا چاہئیں پولیس اس وقت گھر کی تلاشی لے رہی ہے۔ میں ان کو لے کر چھپ کر بھاگ نکلا ہوں ان کو آپ چھپا دیجیئے۔

یہ سن کر لالاجی کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔

"تو میں۔ میں۔ میں کیا کروں۔ ان کو چھپانا تو جرم ہوگا۔ لے جاؤ ان کو میرے یہاں سے ابھی کہیں لے جا کر جلا دو۔

شیخ جی واہ لالا جی۔ ابھی پڑوس کے حق کی باتیں کر رہے تھے۔ چلو بیٹیا میرے ساتھ۔ میں ان کو ابھی ٹھکانے لگوائے دیتا ہوں۔ گومتی زیادہ دور نہیں ہے"

لڑکا مگر سنیئے تو۔ یہ تو ضروری کاغذات ہیں ان کو کہیں چھپاکر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ قوم اور وطن کی خدمت ہوگی"۔

شیخ جی (گھبراکر) کیا ان کو میں اپنے گھر رکھ لوں، کچھ الو ہوں میں؟ بھاگ یہاں سے؟ بڑا آیا لقمان بن کے۔ لالا جی آپ نے ان لوگوں کو اتنا منھ کیسے لگالیا؟"

لالا جی:" بھئی منھ لگانا کیسا۔ پڑوسی ہیں ہم لوگ۔ یہ روزگار تو ان لوگوں نے اب شروع کیا ہے۔ مگر کیا روزگار ہے"۔ سرکار کی بغاوت!"

"بھئی لڑکے اب جاؤ یہاں سے اپنی گٹھڑی لے کے۔ اگر پولیس آگئی تو ....."

لڑکے نے جھک کر گٹھری اٹھائی اور چلنے کا ارادہ کیا۔ وہ ابھی گھوما ہی تھا کہ بوٹوں کی چاپ سنائی دی اور درغہ جی مع دو کانسٹبلوں کے اندر آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی لالا جی شیخ جی اور نواب صاحب سروقد کھڑے ہوگئے۔ لالا تو تھرتھر کانپنے لگے۔ بڑی مشکل سے ان کی زبان سے نکلا۔

"آئیے آئیے درغہ جی"۔

درغہ جی نے گھور کر لڑکے کی طرف دیکھا اور گھوم کر لالا جی

پر ایک نظر ڈالی اور بولے ۔

"ہوں ـــ"

لالاجی نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا

"یہ لڑکا جانے کیا آخور اٹھا لایا ہے ۔ میں کہہ رہا تھا کہ لے جاؤ اسے یہاں سے"!

"ڈکنسٹ جی جو دس منٹ پہلے لالاجی سے باتیں کر رہے تھے ۔ پھر کسی وقت چپکے سے چلے گئے ۔ وہ بھی دروغہ جی کے ساتھ ساتھ اندر آگئے تھے، وہ لالاجی کی بات سن کر کہنے لگے ۔

"صحیح فرما رہے ہیں لالاجی ـــ دروغہ صاحب"

دروغہ جی" تم سے کون پوچھ رہا ہے ۔ ہاں لالاجی تو آپ کا بیان یہ ہے ۔ لیکن اس وقت تو مال آپ کے ہی گھر میں پایا جاتا ہے ـــ"

لالاجی :" جی حضور صحیح فرمایا آپ نے! لیکن دیکھئے تو وہ لڑکے ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ گھر میں ہونے سے کیا ہوتا ہے، قبضے میں تو اسی کے ہے ؟

"کیا باتیں کرتے ہو لالاجی ۔ بھلا عدالت ایسی بات مان لے گی ؟ یہ بغاوت کا معاملہ ہے بغاوت کا"

"عدالت، بغاوت، بھگوان نہ کرے کہ ایسی کوئی بات ہو ۔ کیا کہتے ہیں آپ ارے کوئی جا کر وکیل صاحب کو بلا لاؤ ارے شیخ جی تم ہی بتاؤ کہ کیا کروں ۔ بھگوان ارے جلدی سے لال صاحب کو بلا لاؤ وہ ابھی جا کے

کپتان صاحب سے بات چیت کر لیں گے۔"

لالاجی کا زنان خانہ پاس ہی تھا وہاں بھی خبر پہونچ گئی کہ پولیس آگئی ہے۔ عورتیں بدحواس ہوکر مردانے دروازے کے پاس آگئیں اور رونے دھونے اور پرارتھنا کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

سب کے سب ملازم بھی جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، ہر طرف سے آ آ کر اس جگہ ایک طرف کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ داروغہ جی جوتا پہنے ہوئے دودھ جیسی چاندنی پر ٹہل ٹہل کر اور نواب صاحب اور شیخ جی کے سامنے اپنے بوٹ گھما گھما کر ادھر ادھر کی الماریاں دیکھنے لگے پھر بولے۔

"تلاشی لینا پڑے گی۔"

اس موقع پر ڈکنٹ جی نے لالاجی کے پاس جا کر کان میں کچھ کہا۔ اسے سن کر لالاجی کے چہرے پر ذرا اطمینان کی جھلک آگئی مگر پھر تھوڑا ہی زردی سے چھا گئی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھے اور کراہتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ داروغہ جی بوٹ پہنے فرش پر ٹہلتے رہے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے رہے۔ دس منٹ میں لالاجی اندر سے نوٹوں کی ایک گڈی لے آئے اور کہنے لگے۔

حضور یہ آپ کے ماتحتوں کا نذرانہ ہے۔ اب اس بات کو رفع دفع کر دیجئے۔

داروغہ جی۔" لالاجی وہ رفع دفع ہو ہی جاتی۔ آپ فضول پریشان ہوگئے۔ میں نے تو صرف صورت حال آپ کو سمجھائی تھی۔"

داروغہ جی نے کانسٹبلوں کی طرف دیکھا جو دروازہ کے پاس کھڑے مسرت بھری نظروں سے نوٹوں کی گڈی کی طرف تک رہے تھے اور کہا۔

"چلو لڑکے کو گرفتار کر کے لے چلو۔ مگر لڑکا ہے کہاں؟"

"لڑکا کہاں ہے؟"

"ارے لڑکا کہاں ہے؟"

"کدھر گیا ہے؟"

کسی نے دیکھا اسے جاتے ہوئے؟"

فرخ کہیں نہیں ملا۔ اس کے ساتھ اس کے کاغذات کی گٹھری بھی غائب تھی۔ کوئی نہ بتلا سکا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے اور کیسے گیا۔

(۴)

نواب صاحب جب لالا جی کے گھر سے لوٹے تو ان کے دل پر ایک نہیں کئی بوجھ تھے، جن کی وجہ سے وہ بہت افسردہ تھے۔ ایک بڑا بوجھ تو یہ تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے لالا جی پر داروغہ جی نے بیجا دباؤ ڈالا اور ڈکشٹ جی نے اس دباؤ کے ماتحت لالا جی سے نوٹوں کی گڈی جس میں غالباً خود بھی حصہ پائیں گے نکلوا لی، اور داروغہ جی کو دلوا دی۔ نواب صاحب

کو کوفت یہ تھی کہ میں سب کچھ دیکھتا رہا مگر کچھ نہ کر سکا۔ ان کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ میں بانکے بہادر کو فاقوں سے اور نواب اغن کو اس کی جانکاہ فکر سے نجات نہ دلا سکا۔ ان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ میں خالی ہاتھ گھر جا کر اپنے اور اپنے بیٹے کے کھانے کا کیا بندوبست کروں گا۔ ڈیڑھ دن سے خود انھوں نے بھی ایک نوالہ نہیں کھایا تھا۔ اور لڑکا جس کی بڑھوتری کے دن تھے اس کو ڈیڑھ دن میں صرف ایک روٹی ملی تھی۔

نواب صاحب کو اگر موقع ملتا تو وہ لالہ جی سے کوئی معقول رقم ادھار ضرور مانگ لیتے۔ خاص کر اس سہارے پر کہ ان کو اپنی جگہ یقین تھا کہ اگر پریوی کونسل میں مقدمہ گیا تو میں ضرور جیت جاؤں گا کیوں کہ صرف اتنا ثابت کرنا تھا کہ میرے باپ اور ماں میں شادی ہوئی تھی۔ اس حقیقت کو ثابت کرنا کیا مشکل ہے۔ میری ماں شریف گھرانے کی بیٹی تھیں بھلا کوئی گھرانا بیٹی کو بلا شادی کے کسی شریف کے گھر رخصت کر دیتا ہے؟ کہیں بھی ایسا ہوا ہے اندھیر ہے کہ عدالت نے ایک گمنام لونڈی کو نواب بیگم تسلیم کر کے لونڈی بچے کو جائداد پر قبضہ دلا دیا یہ سب کچھ میرے وکیلوں کی حماقت یا بے ایمانی سے ہوا۔ اور ایسے وکیلوں کا انتخاب مصاحبوں نے اپنی غرض سے کیا تھا۔ یہ نمک حرام سب کے سب دوسرے فریق سے مل گئے تھے۔ نواب صاحب کو اپنی ان باتوں پر پکا یقین تھا لیکن ان کے پاس روپیہ نہ تھا۔ جو وہ پریوی کونسل میں اپیل کر سکتے۔

نواب صاحب کے پاس نوابی کے جانے کے بعد جو کچھ بچا کھچا تھا وہ گھر کی ملازمہ لے کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ رہے تن کے کپڑے اور تانبے اور چینی کے برتن وہ دو سال تک دلالوں کی معرفت اونے پونے بک کر ختم ہو گئے تھے۔ پرانی نوابی کی یادگار اب صرف دو انگرکھے تھے جو جاڑا گرمی، برسات پہنے جاتے تھے اور جن میں اتنے چھید تھے کہ روشنی کے سامنے لاؤ تو چھلنی معلوم ہوتے تھے۔

کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے دوستوں اور عزیزوں کے یہاں آنا جانا ختم کر دیا تھا۔ صرف ایک دو جگہ ایسی تھیں جہاں اب بھی چلے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک لالاجی کا گھر تھا۔ واپسی کے وقت دماغ الگ کام کر رہا تھا اور پاؤں الگ۔ پاؤں خاموشی سے اپنے راستے پر چل رہے تھے۔ اور دماغ فکروں میں الجھا ہوا تھا۔ نواب چونکے تو دیکھا کہ ان کے پاؤں پرانی عادت کے مطابق ان کو دلربا کی ڈیوڑھی کے سامنے لے آئے ہیں۔ یہ فوراً پچھلے پاؤں لوٹنے لگے۔ لیکن دربان نے آواز دی۔

"نواب صاحب کو تسلیمات عرض کرتا ہے خاکسار، حضور تشریف لائیے۔ بائی صاحبہ کمرے میں تشریف رکھتی ہیں۔ مدتوں سے آپ کے لئے چشم براہ ہیں۔"

نواب سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کریں۔ ان کی وضع داری کا تقاضا یہ تھا کہ اسی وقت آتے جب جیب میں پندرہ بیس روپے ہوتے۔ ان کا دستور یہ رہا تھا کہ شام کو آتے تھے اور دس بجے تک واپس چلے جاتے تھے۔ لیکن آج تو جیب بھی خالی تھی اور رات کے دس بھی بج رہے تھے۔

دربان نے دوسری آواز لگائی ۔

"محل دارنی نواب رفیع الشان والا قدر عالی شان تشریف لا رہے ہیں ۔"

اس آواز کے بعد واپسی ناممکن تھی ۔

دلربا کا سن ۵۴ سال کے اوپر تھا بال تو خضاب کی وجہ سے کالے تھے لیکن چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور بدن بھی بھاری ہو گیا تھا ۔ لیکن چہرہ پر دلکشی، انداز میں سبک پن اور آواز میں لوچ اب بھی باقی تھا ۔ اور خوش مذاقی میں تو آج بھی وہ یکتا مانی جاتی تھی ۔ اس کے پرانے ملنے والوں میں سے دو تین روزانہ آجاتے تھے اور چار چار چھ چھ گھنٹے کی نشست ہو جاتی تھی ۔ اب سے دس سال پہلے دلربا کا شمار چوک کے آفتابوں میں کیا جاتا تھا ۔ لیکن جس دن نواب رفیع الشان کا علاقہ نکلا اور نواب صاحب نے دو انگوٹھیاں ہزار ہزار روپیہ کی جو وہ کسی طرح قرض والوں سے بچا کر ساتھ لے آئے تھے رخصتانے کے طور پر اسے بھیجیں، اسی دن اس نے چوک کا کمرہ چھوڑ کر گلی میں سکونت اختیار کر لی ۔

علاقہ نکلنے کے بعد نواب صاحب سال بھر تک دلربا کے گھر نہیں آئے لیکن دلربا ان کی خدمت میں ہر ہفتہ خاصدان میں پان اور کبھی کبھی حلوے یا مربے کی قاب بھیجتی رہی اور ساتھ ساتھ یہ پیام بھی ۔

"اللہ ۔ صورت تو کبھی کبھی دکھلا جائیے ۔ موا علاقہ گیا تو گیا ۔ آپ مجھ سے کیوں ادھر گئے ؟"

آخر ایک دن نواب کو تاب نہ رہی اور وہ آ ہی گئے ۔ نظریں ملتے

ہی دونوں رونے لگے۔ دلربا نے آنسو پونچھ کر کہا۔

"نواب آپ نے مجھے بھی ان رنڈیوں میں گن لیا ہے جو صرف جو اہرات کے لئے محبت کرتی ہیں اتنا ہی سمجھے آپ مجھے؟"

چلتے وقت نواب نے خاصدان میں دس روپے رکھ دیئے۔

دلربا ان کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی مگر کچھ بولی نہیں۔ شاید اس خیال سے کہ نواب کو دکھ نہ ہو۔ اس کے بعد چھٹے چھ ماہے نواب آنے لگے لیکن اب کی نوبت ایک سال بعد قدم رنجہ فرمایا تھا۔ ڈیوڑھی سے گزرے تو خود ان کو بھی گھر میں نیا پن محسوس ہوا۔ صحن میں جو گملے چنے ہوئے تھے ان کے درخت کافی بڑھ چکے تھے۔ دالان کے آگے ایک سائبان ڈال دیا گیا تھا جس کے نیچے صوفے بنا کر رکھے گئے تھے لیکن دالان کے اندر بدستور دودھ کی ایسی چاندنی اور قالینوں کا فرش تھا اور اوپر رنگ برنگ کے جھاڑ۔

دلربا نواب کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ لب فرش استقبال کیا اور عزت اور محبت سے لا کر مسند پر بٹھا دیا اور خود پہلو میں آ بیٹھی۔ خوشی سے دلربا کی آنکھیں اور دانت چمک رہے تھے۔ اسی عالت میں وہ بھوؤں پر جھوٹ موٹ کی خفگی کے بل ڈال کر کہنے لگی۔

"اللہ نواب۔ آپ کے پہلو میں میں کہتی ہوں کہ دل نہیں ہے کیا۔ اگر میری صورت اب اس قابل نہیں رہی ہے کہ آپ آئیں تو کیا میری محبت بھی ایسی گئی گزری ہے کہ آپ برسوں اپنی صورت نہ دکھلائیں۔"

"ارے دلربا۔ دل کو نہ پوچھو وہ تو مثل ماہی بے آب تڑپتا رہتا ہے۔ مگر کیا کروں، ایسی ہی مجبوریاں آپڑیں۔"

"جانے دیجیے۔
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں؟
یوں کہئے کہ اب نہ میری آواز میں لوچ ہے نہ پاؤں میں تھرک۔ مجھ
میں اب موسیقی ہے نہ رقص۔ ایسے میں یار آئے تو کیوں آئے؟
یہ کہہ کر دلربا نے ادا سے گردن دوسری طرف موڑ لی۔ جڑاؤ نکلس
جگمگانے لگا۔

نواب:۔
"یار کیوں کر یار کی گلیوں میں جانا چھوڑ دے"
کس طرح بلبل چمن سے آشیانہ چھوڑ دے

کمال ہے نواب صاحب آپ تو دونوں طرف سے وکالت کرتے ہیں میری طرف سے بھی اور
اپنی طرف سے بھی۔ ارے شکایت تو یہی ہے کہ جس دن سے میں موئی رس گلی میں آئی تو وہ یار جو
روزانہ آیا کرتے تھے انھوں نے جھانکنا تک چھوڑ دیا ۔۔۔ ارے کم بختو حقہ
تو لاؤ۔ ہے وہ تمباکو نواب صاحب والا؟ ہاں ہوگا کیوں نہیں؟ ابھی پہلی
ہی کو تو اس امید پر منگایا تھا کہ شاید یہی فال نیک ثابت ہو۔"
ملازمہ فوراً حقہ لے آئی اور سونے کا مہنال ادب سے نواب صاحب
کی خدمت میں پیش کیا۔
دلربا۔ "ارے لیجیے آ گیا حقہ۔ شاباش معلوم ہوتا ہے نواب صاحب
کا جلوہ دیکھتے ہی چلم بھرنا شروع کر دی تھی؟
"کیوں نواب صاحب چلتی ہے جیسی اب تھا؟ منگواؤں؟"
نواب نے ایک کش لیا مدتوں کے بعد اپنی پسند کی انناس والی تمباکو

ان کو ملی۔

"کہاں دلربا؟ حکیم صاحب کی سخت ممانعت ہے۔"

"اچھا تو پھر خاصا منگواؤں؟"

"خاصا کیوں؟ کیا تم نے ابھی تک نوش نہیں کیا۔ میں تو کبھی کا کھا بھی چکا اب تو دس بجے رہے ہیں۔"

"بات یہ ہے نواب صاحب کہ آج میرا جی ذرا ویسا ہو رہا تھا اس لئے سوچی کہ اس وقت ناغہ رہے۔ لیکن اب شاید آپ کے ساتھ بیٹھوں تو دو ایک لقمے کھالوں۔ آپ کو میرے سر کی قسم۔ صرف میرے خیال سے دسترخوان پر بیٹھ جایئے اتنا تو میرا دل رکھ لیجیے کیا اب مجھ میں اتنی بھی کشش نہیں رہی ہے۔"

"کیا کہتی ہو دلربا۔ کوئی میری نظروں سے دیکھے تم تو آج بھی ویسی ہو جیسے پہلے دن تھیں۔ مگر بھئی میں کھانا جو کھا چکا ہوں؟"

"یہی سمجھ کر تو میں قسمیں دے رہی ہوں۔ دیکھئے وہ پرانی وضع داری والی بات زبان پر نہ لایئے گا۔

نواب "تم تو زبان بندی کی سزا دے رہی ہو۔"

دلربا۔" ایسا نہ کہئے۔ آپ کی بندی ہوں۔"

دلربا نے دونوں کلائیاں اس طرح آگے بڑھا دیں۔ جیسے ان کو کوئی باندھے جا رہا ہو۔ اس کی کلائیاں اب بھی بہت سڈول ملائم اور چمکیلی تھیں۔

"واللہ کیا گھرا ہے۔ اب نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔" اگر تم کسی عدالت میں وکیل بن جاؤ تو تم سے کوئی بھی پیش نہ پا سکے۔"

"نواب، جب پیشہ چھوڑ دیا تو پیشی میں کیا جاؤں گی۔"

ہائے ظالم کیا بات کہہ دی۔"

"میں کیا بات کہہ سکتی ہوں آپ کے پیش میری کیا چلے گی۔"

"ہائے پھر وہی ضلع جگت۔ پیش چلنا کیسا ان لفظوں کا مارا تو پانی تک نہیں پی سکتا۔"

"تب ہی آپ ہمارے گھر پانی تک پینے کے روادار نہیں۔"

"کیا بات میں بات پیدا کرتی ہو۔ پانی کیا زہر بھی پلاؤ تو پی لوں۔"

"کون سا زہر کڑوا یا میٹھا؟"

"تم تو توبہ تڑوانے پر آمادہ ہو۔"

"پھر منگواؤں؟"

"اگر میری صحت عزیز نہ ہو۔"

"آپ کی صحت مجھے عزیز نہ ہوگی تو کسے ہوگی۔ لال پیارا تو لال کا خیال پیارا۔"

"واہ واہ دلربا اب کیا مجھے لال بناؤ گی؟"

"آپ تو زبان پکڑتے ہیں۔"

"ہائے یہ نعمت اب کہاں میسر!"

"مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔"

خادمہ نے آکر کہا۔ خاصہ تیار ہے۔

دلربا نے نواب کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اٹھا کر دسترخوان پر لاکر بٹھا دیا۔ دسترخوان پر جو نواب صاحب بیٹھے تو معلوم ہوگیا کہ کھانا اپنے وقت پر ہو چکا تھا اور ان کے لئے خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے۔ نواب صاحب جانتے

بیتے کہ دلربا نے جب سے کرہ چھوڑا ہے اس نے اپنے رات کے کھانے کا وقت ایک بجے رات کی جگہ (جیسا کہ رنڈیوں کا دستور ہوتا ہے) آٹھ بجے کرلیا ہے —
دستر خوان پر بانو کے یہاں کی بالائی، نصیر کے یہاں کی شیرمالیں۔ منگو کے یہاں کے سیخ کے کباب، ملّا کے یہاں کے گولے اور ٹکیا کے کباب اور رامو کے یہاں کی برفیاں تھیں اس کے علاوہ دھوئی ماش کی دال تھی۔ قورمہ اور زردہ بھی تھوڑا تھوڑا سا تھا۔ یہ تینوں چیزیں غالباً خاصے کی بچی ہوئی تھیں۔ پراٹھے تازے تازے ڈالے جارہے تھے۔ چینی کی پلیٹیں اور ڈونگے جن میں کھانا نکالا گیا تھا۔ بہت نایاب قسم کے تھے جن میں سیزیاں اور رومانی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سب نواب کے اہتمام میں نکالے گئے تھے۔

دلربا اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے اور کھانے کا سوانگ رچاتی رہی اور کہتی رہی جانے آج بھوک کہاں اڑ گئی ہے۔ آپ کی وجہ سے دو ایک نوالہ حلق بھی رہے ہیں۔ آپ دستر خوان پر نہ ہوتے تو ایک نوالہ بھی حلق سے نہ اترتا۔"

نواب صاحب کا اس احساس سے گلا بھر آیا کہ دلربا نے کسی نہ کسی طرح میرے چہرہ یا باتوں سے ضرور اندازہ لگا لیا کہ میں بھوکا ہوں۔ اللہ اللہ اب وہ وقت آگیا کہ جن لوگوں کا پیٹ میں بھرتا تھا وہ اب میرا پیٹ بھریں۔ کاش میرا علاقہ واپس مل جاتا۔ نواب صاحب کو شوکت کی بھوک بھی یاد آرہی تھی اس وجہ سے حلق سے نوالے نہیں اتر رہے تھے۔

دلربا: "نواب صاحب اب تو وہ زمانہ آگیا ہے کہ اپنے کو ارباب نشاط میں گنتے شرم آتی ہے۔ کچھ خبر ہے آپ کو؟ چوک میں کسی طرف ایسے

کمرے بھی کھل گئے ہیں۔ جہاں تماشبین پندرہ پندرہ منٹ کے حساب سے جاتے ہیں۔ موئی رنڈیاں نہ ہوئیں۔ دکان کی پڑیاں ہوگئیں۔ کل بچاری مرادی آئی تھی۔ وہ بہت جھینک رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اب تو چوک کے کمرے پر بیٹھتے شرم آتی ہے۔

نواب: "سچ کہتی ہو۔ یہ جو رنڈیاں آئی ہیں یہ تو ہمارے گھر کی لونڈیوں سے بدتر ہیں۔ نہ سلام کرنا آئے نہ مزاج پوچھنا آئے، خوش مذاقی کی کون کہے، بس پان پر پان چبا رہی ہیں اور اٹھلا رہی ہیں۔ آنے جانے والوں سے اٹھنی، چونی مانگ رہی ہیں۔"

دلربا: "(طنزیہ مسکراہٹ سے) اچھا نواب صاحب۔ بڑی معلومات ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آج کل ادھر کے پھیرے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں میرا خیال بھی کیوں آنے لگا۔"

"استغفراللہ کیا بات کہتی ہو۔ اب میں ایسا گیا گزرا نہیں ہوں۔"

"اچھا اچھا چلئے مان گئی۔"

"نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے

پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"

نواب ہائے کیا بات یاد دلائی۔ یاد ہے کبھی یہ شعر میں نے پڑھا تھا۔

دلربا نے رومال سے ہونٹوں کو اس ادا سے پونچھا جیسے کوئی شرما کر سر پر آنچل ڈال لے۔ جوانی کے قصوں اور اس ادا نے نواب کے چہرے پر جوانی کی جھلک پیدا کردی۔

"وہ جب آپ شاہ مینا سے فٹن پر آرہے تھے اور راستے میں بھیڑ کی وجہ سے میرا جو پہلا آپ کی فٹن کے پاس رک گیا تھا۔"

نواب۔ ہاں ہاں یاد آگیا۔ کیا شعر پڑھا تھا وہ دیکھو۔

طاق مسجد کے بھرے مانگیں مرادیں منتیں

جو نہ کرنا تھا کیا او دلربا تیرے لئے

سچ کہتا ہوں دلربا۔ یہی حال تھا اس زمانے میں میرا۔"

ٹھیک ہے یہی شعر تھا۔ میں سن کر تڑپ گئی۔ آپ نے مجھ نگوڑی پر نہ جانے کیا کر دیا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ......"

"مگر اس شعر کی چوٹ اگر تم نے کھائی تھی تو پھر میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیا تھا؟"

"وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اللہ بخشے میری خالہ جان کو۔ ان کے آداب اور طریقے تو بہت سخت تھے۔ اس زمانے میں میں نواب برجیس سلطان کی پابند تھی۔ خالہ جان کا حکم تھا پوری طرح وفادار رہو۔ مجرے محفل کی بات دوسری ہے گھر آنے والوں سے ہنسی مذاق بھی کسی حد تک جائز ہے۔ لیکن پابندی کی حالت میں خفیہ نام و پیام کو وہ ارباب نشاط کی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ ہائے کیا زمانے تھے !! — نواب منیر کا واقعہ معلوم ہے آپ کو؟"

"کون سا واقعہ؟"

"ہوا یہ کہ جس دن نواب پر قرقی آئی ہے اسی رات کو ستارہ ناز و غمزوں کا طوفان برپا کر کے جڑاؤ کنگن جو شاید نواب کے خاندان کی آخری دولت تھی لے آئی تھی۔ قرقی والوں نے نواب صاحب کو مع اپنے

خاندان کے کپڑوں کے دو دو چار چار جوڑے دے کر محل سے نکال دیا۔ اس وقت نہ نواب کے دوستوں کا پتہ تھا اور نہ مصاحبوں کا۔ بیچارے سرائے میں جا کر ٹکے۔ خالہ جان کو جو یہ خبریں ملیں تو وہ آ کے ستارہ سے کہنے لگیں۔

"بیٹی نواب نے تجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اور خدا کے فضل سے تیرا صندوقچہ ان کے دیئے ہوئے زیوروں سے پٹا پڑا ہے۔ یہ دولت پشتوں کے کھانے کے لئے کافی ہے۔ اب تو ایسا کر کے ان کنگنوں کو واپس کر دے — نواب کا چار چھ مہینے کا خرچ نکل آئے گا۔ اور ہم پر ان کی ہائے نہ پڑے گی۔"

ستارہ کہنے لگی "آپ نواب کو جانتی ہیں وہ دی ہوئی چیز کو کبھی واپس نہیں لیں گے اور لے بھی لیں تو ان کے مصاحب حرام خور جو گدھ کی طرح ٹوٹے پڑتے ہیں سب کھا جائیں گے۔"

خالہ جان نے کہا۔ "یہ دونوں باتیں میں دیکھ لوں گی۔

خالہ جان نے اس وقت ستارہ سے یہ خط لکھوایا۔

"میرے اچھے نواب۔ یہ موئے کنگن بڑے منحوس معلوم ہوتے ہیں۔ دو راتوں میرے سرہانے رہے ہیں تو طرح طرح کے خواب آتے رہے ہیں اور کل ایسا ہوا کہ میرا پیارا مٹھو مر گیا اور میری بلی نے سارے دن دودھ نہیں پیا۔ اس لئے مجھے یہ کنگن بالکل راس نہیں آئیں گے۔ خدا کے لئے واپس لے لو بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ تم خود بھی ان کو نہ رکھو۔ ان کو اسی وقت لالا شیام ناتھ کے یہاں بھجوا دو۔ ایسی منحوس چیزیں دہی

لیتے ہیں ۔

تمھاری کنیز ستارہ

اماں جان نے لالہ جی سے کہہ سن لیا تھا اس لئے جیسے ہی نواب منیر نے وہ کنگن لالہ جی کو بیچے انھوں نے اسی وقت ستائیس سو بھیج دیئے اس طرح خالہ جان نواب منیر کے کام آئیں ۔"

"اب میں سمجھا کہ نواب کے پاس قرقی آنے کے بعد یہ دبیہ کہاں سے آیا۔ مگر کچھ خبر ہے دلربا کو۔ نواب منیر نے ان ستائیس سو کا کیا کیا ؟"

"کیا کیا ؟"

یہ قصہ مجھ سے سنو ۔ وہ ستائیس سو ستائیس دن بھی نہ چلتے ۔ انھوں نے سرائے میں وہ رنگ رلیاں منائیں ہیں کہ آج تک لوگوں کو یاد ہیں ۔

"جو بھی ہوا ہو ۔ ہم نے تو ان کو تباہی سے بچانے کی اپنی والی کوشش کر لی ۔"

کھانا کھا کر نواب صاحب مسند پر آکر بیٹھے ہی تھے کہ محل دارنی خبر لائی کہ راجا صاحب پہاڑ پور آرہے ہیں ۔

نواب صاحب یہ خبر سن کر ذرا تشویش میں پڑ گئے کہ اب میں کیا کروں کیا مسند خالی کر دوں ۔ اتنے میں راجا صاحب آگئے ۔ دلربا نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور دیکھتے ہی بولی ۔

"آیئے آیئے راجا صاحب ۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے ......"

(بات کاٹ کر) دیکھو جی کانٹوں میں نہ گھسیٹو ۔"

"راجا صاحب آپ تو ایسے گنے چنے لوگوں میں ہیں جن سے لطف صحبت

ملتا ہے۔"

آپ سے ملئے۔ آپ ہیں نواب رفیع الشان صاحب بہادر۔ آپ بھی کبھی کبھی قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ایسی صحبتیں کہاں ملتی ہیں۔"

راجا۔ "ارے نواب صاحب آپ کے تذکرے تو بہت سنے ہیں۔ آداب بجا لاتا ہوں"۔

نواب (نیم قد اٹھ کر) "آداب عرض ہے"۔

"نواب صاحب آپ کی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی ہر طرف باتیں ہوتی ہیں"۔

نواب صاحب۔ "اب چھوڑیئے ان باتوں کو۔ وہ فراق وہ وصال کہاں"۔

راجا صاحب کو دلربا نے نواب صاحب کے برابر بٹھا دیا۔ راجہ صاحب چھوت چھات کو بہت مانتے تھے اس لئے ان کے لئے دوسرا پیچوان منگوایا گیا۔

"نواب صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ کا ایسا مرغوں کا جوہر شناس آج لکھنؤ میں نہیں"۔

میں کیا اور میری بساط کیا۔ البتہ بعض استادوں کی مہربانی سے کچھ آ گیا ہے۔"

"ایک گزارش ہے نواب صاحب۔ لاٹ صاحب سے کل مرغوں کی نسلوں کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں تو وہ کہنے لگے کہ کوئی بڑی شہرت کا مرغ اگر مل جائے۔ اگر کہیں وہ نوشیرواں ہو تو کیا کہنے، تو وہ اس مرغ کو لندن میں

کسی بہت بڑے لاٹ کو بھیجیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے کارناموں کی مصدقہ تاریخ بھی ہونی چاہیئے۔ نواب صاحب ایسا مرغ اگر مل جائے تو میں اس کے مالک کی خدمت میں جو بھی فرمائیے گا وہ "نذرانہ پیش کرسکتا ہوں۔

نواب (مسکراکر) ایسا مرغ کوئی علاحدہ کیوں کرنے لگا۔ لوگ تو اپنی جان تک قربان کردیتے ہیں اپنے رستموں کے لئے"۔

دلربا۔ "سچ فرمایا آپ نے نواب صاحب۔ مجھے یاد ہے کہ آغا بیگو نے اپنے مرغ کے لئے اپنے خاندان کو چھوڑ دیا تھا"۔

راجا صاحب۔ "جو بھی ہو لیکن نواب صاحب اگر آپ چاہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور کرسکتے ہیں۔ دلربا تم سفارش کردو"۔

دلربا۔" نواب صاحب آپ کو میرے سر کی قسم جو بھی کرسکتے ہوں کیجئے راجا صاحب کے لئے"۔

"دیکھئے راجا صاحب۔ کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گا۔ لکھنؤ کا سب سے مشہور مرغ بانکے بہادر میاں اغن کے پاس ہے۔ اگر کسی طرح وہ اس کی جدائی برداشت کرلیں تو کیا کہنا"۔

راجا: "وہ مرغ" ارے اس کے تذکرے تو لاٹ صاحب کے یہاں بھی ہورہے ہیں۔ وہ مل جائے تو بس پھر واہ وا۔ نواب صاحب پھر میں آپ کے احسان سے سر نہ اٹھا سکوں گا۔

نواب" ایسی باتیں نہ کہئے میرے بس میں جو کچھ ہے ضرور کروں گا"۔

راجا صاحب سیدھے سادے سپاہی تھے بات چھپانا تو

ان کو آتا ہی نہ تھا پیچوان کا ایک کش لے کر کہنے لگے۔

"اگر وہ مرغ مل گیا تو لاٹ صاحب بہت خوش ہوں گے اور ہوسکتا ہے کہ آپ کو رائے بہادر کا خطاب مل جائے۔"

نواب: "ایسی بات ہے؟ تب تو میں جان لڑا دوں گا۔"

جب اپنے کو کوئی چیز ملنے والی ہو، اس وقت دوست سے یہ کہنا کہ آپ کو ملے گی"۔ یا اگر اپنی کوئی چیز ہو اور اس کے بارے میں پوچھا جائے کہ کس کی ہے تو جواب میں کہنا کہ "آپ کی ہے"۔ یہ پرانی تہذیب تھی جو اب مٹتی جا رہی تھی۔ لیکن راجا صاحب تو پرانی تہذیب کا نمونہ تھے، ان کی زبان پر 'مجھ کو' کی جگہ بلا کسی تکلف کے آپ کو" آگیا۔ اس تہذیب پر نواب دل میں لوٹ گئے اور خوش ہو کر کہنے لگے۔

"اغن کو جیسے بنے گا راضی کر کے رہوں گا۔ آپ رائے بہادر ہو جائیں تو اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے"۔

دلربا: "آپ کی بات تو اغن کے لئے حکم ہوگی۔"

"ہے تو وہ میرا شاگرد۔"

راجا: "بڑی شبھ گھڑی میں یہاں آیا۔ اچھا دلربا رانی اسی بات پر ہو جائے۔ ایک ٹھمری۔"

دلربا: "راجا صاحب۔ آواز اب کہاں چلتی ہے جو آپ کو سناؤں۔ یہ تو سب جوانی کی باتیں تھیں۔ جوانی گئی آواز گئی۔

"اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"

راجا: "یہ تو مجھ سے پوچھو کہ تم میں کیا کیا ہے۔ مجھے تو اچھا

سرگوشیوں ہی میں لطف آتا ہے۔

دلربا نے سازندوں کو بلوایا۔ طبلچی اور سارنگیے بہت دھیمے سروں میں بجانے لگے اور دلربا گاؤ تکیہ سے لگے لگے بہت دھیمی آواز میں ٹھمری گانے لگی۔ دلربا کا ریاض تو چھ سات سال سے چھوٹا ہوا تھا لیکن گلا ابھی تک پکا تھا اور فن کی تو وہ خیر ماہر ہی تھی گنگنانے کی سطح پر جب وہ گاتی تھی تو آواز میں پہلے کے ایسے سوز و گداز آجاتے تھے اور قدرداں لوٹ جاتے تھے۔

آدھ گھنٹے یہ محفل جمی رہی پھر دلربا نے عذر کیا کہ اب دم نہیں۔ گانے بجانے کی محفل کے ختم ہو جانے پر دلربا نے پوچھا۔

"پہلے راجا صاحب موہنی سے میل ہوا۔"

"ارے کہاں اس کی ہٹ کے سامنے تو سب ہار گئے۔ بس مجروں میں صاحب سلامت ہو جاتی ہے۔ آٹھ روز کی بات ہے کہ ڈپٹی دلارے رام کے یہاں مجرا تھا۔ ظالم نے مجھ سے آنکھ ملا کر یہ غزل چھیڑی۔

کبھی ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"

"دلربا توبہ۔ وہی مثل ہے کہ چھاتی پر مونگ دلو۔ نواب صاحب آپ کو معلوم ہے یہ واقعہ۔"

"نہیں میں نے نہیں سنا۔"

دلربا "تبلا دوں راجا صاحب؟"

راجا صاحب: "ارے اس میں چھپانا کیا ہے۔

عشق مجنوں ہوا ہوں سودائی　　　دور پہونچی ہے میری رسوائی"

"ہوا یہ نواب صاحب کہ میں محبت کا بھوکا ہوں۔ یار دوست جو لطیفہ جان کے یہاں اکٹھا ہونے لگے تو میں بھی وہیں جانے لگا۔ موہنی کے یہاں جو غیر حاضری ہونے لگی تو وہ کھٹک گئی۔ کئی مرتبہ پوچھا کہ راجا صاحب کیا کہیں اور آنکھ لڑ گئی ہے۔ میں نے ہر مرتبہ بات ہنسی میں اڑا دی۔ یا تو دربان دونے نے اس کو اصل حال تبلا دیا۔ یا اس نے مخبروں سے پتہ لگا لیا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جب میری فٹن لطیفہ کے کمرے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی تو وہ آئی اور کسی طرح میری نشست پر انھوں نے ایک پڑیا ڈال دی۔

واپسی پر فٹن میں بیٹھتے وقت میں نے سلیقے سے بنی ہوئی ایک پڑیا جو پڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ سائیں نے کہا کہ میں نے دیکھا نہیں کہ کس نے یہ پڑیا یہاں ڈالی ہے۔ پھر وہ کہنے لگا آپ ہاتھ نہ لگا دیجئے کہیں کوئی ٹونا ٹوٹکا نہ ہو۔ لیکن میں نے ہمت کر کے پڑیا کھول ہی ڈالی۔ دیکھا تو اس میں دو گلوریاں ہیں۔ ان کی بناوٹ صاف تبلا رہی تھی کہ موہنی کا ہاتھ ہے۔ میں نے سونگھا تو وہی ظالم خوشبو۔ جب منہ میں ان کو رکھا تو شک ہی نہ رہا۔ میں نے کہا ارے ظالم تو بھی جاسوس نکلی۔ آئی اور آ کر کہہ گئی کہ پکڑ لیا۔ پھر میری جانے کی ہمت نہ پڑی۔ منتظر رہا کہ ادھر سے کوئی خیریت پوچھنے آئے۔ جب پانچ چھ روز گزر گئے اور کوئی نہیں آیا تو میں نے بڑے آغا کو بھیجا۔ کہ زرا ٹوہ لو کہ کیا معاملہ ہے لیکن موہنی نے ان کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور بلا کچھ سنے یا کہے ہلالان کو واپس کر دیا۔ اس واقعہ کو سال بھر ہو گیا ہے اور تب سے ملنا جلنا کیسا نامہ و پیام تک بند ہے"۔

افوہ ری آن۔ انھوں نے تو بیگموں کو بھی مات کر دیا۔

"بیگموں کو!! آپ لوگ تو ہماری عزت کبھی کر ہی نہیں سکتے۔"
جب دیکھو وہی بیگموں والی بات۔ گویا آن ہے تو ان ہی میں ہے"
"کیا کہتی ہو تم کو تو سر آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔
نواب:" اور دل میں بساتے ہیں"
"ہاں، مگر جوتیوں کی طرح کہ جب ہم لوگ پرانے ہو جاتے ہیں
تو بدل ڈالتے ہیں۔"
اس طرح ہنسی مذاق ہوتے رہے آخر ایک گھنٹہ ٹھہر کر راجا
صاحب خاصدان میں پچیس روپے ڈال کر چلے گئے۔
رات بہت آگئی تھی اس لئے نواب صاحب نے بھی رخصت
ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ شرم دامن گیر تھی کہ اپنے پاس دس روپے بھی
نہیں ہیں جو خاصدان میں رکھ دیں۔
دلربا اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے ابھی سر شام ہے اور
نواب صاحب ابھی ابھی آئے ہیں۔ باتوں کے دوران اس نے پوچھا۔
"نواب صاحب آپ نے چودھری صاحب کی بات تو سنی ہوگی؟"
"کون چودھری صاحب؟"
"وہی ڈھول پور والے۔ ہوا یہ کہ جب عدالت نے قرض خواہوں
کو ڈگری دے کر ان کو نان شبینہ کا محتاج کر دیا اور وہ سر جھکا کر عدالت
سے نکلنے لگے تو چھمن جان ان کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔
"چودھری صاحب یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ تالی دونوں ہاتھوں
سے بجتی ہے؟"

چودھری صاحب نے اس بے موقع سوال پر حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔ تو پھر؟"

"پھر یہ کہ آج تک میں نے آپ کی محبت کا امتحان لیا تھا۔ اب آپ کو میری محبت کا امتحان لینا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"جو کچھ آپ نے دیا ہے وہ حاضر ہے اور میں آج سے آپ کی زرخرید لونڈی ہوں۔"

"چودھری صاحب ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔"

چھمن مچل گئی۔ رونے لگی اور قسم کھائی کہ اگر آپ اسی وقت مالک بن کر میرے ساتھ نہ چلیں گے تو ابھی انگوٹھی کا نگینہ چبا لوں گی۔ آخر چودھری صاحب خاموش ہو گئے۔ چھمن ان کو اپنی بگھی پر لے گئی۔ تب سے چودھری صاحب اس کی جائداد اور دولت کے مالک ہیں اور وہ ان کی خادمہ۔"

"ہاں ایسی بھی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن مسعود آباد۔ نور آباد۔ خلیل پور۔ مانک نگر۔ چھچھوندی۔ بھورا نورنگ یہ سب ریاستیں کن لوگوں نے کورٹ کرائیں؟ وہ بھی تو چھمن ہی کی بہنیں تھیں۔ کورٹ کرا کے وہ دوسری ریاستوں میں مزے کرنے لگیں۔ ارے یہ تماشبینی کی دنیا ہی ایسی ہے۔"

ایمان سے کہیئے آپ مجھے کس طائفے میں گنتے ہیں۔ چھمن والے طائفے میں یا ان موئی تیتریوں کے طائفے میں؟

نواب صاحب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) "تمھاری خرافت تو اسی دن کھل گئی تھی جب تم نے پنچ لڑا یا اور یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ میں آپ کی بیوی کے گلے سے اتروا کر کوئی چیز قبول نہیں کر سکتی۔ کہیں رنڈیاں ایسا کرتی ہیں۔"

"اچھا اگر یہ بات ہے نواب صاحب تو میں بھی چھمن کی طرح آپ سے پوچھتی ہوں کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے یا نہیں۔"

نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ آنسو ضبط کر کے انھوں نے اٹک اٹک کر کہا۔

"چودھری صاحب کی بات اور ہے۔"

"کچھ تو کہیے میرا دل رکھنے کو۔"

"بس کرو۔ جانے دو۔"

نواب صاحب تیزی سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ ان کے آنسو تھے کہ ضبط کی حدوں سے باہر نکلے جا رہے تھے۔ وہ چوک سے بچ کر گلیوں گلیوں ہوتے ہوئے گھر آئے۔ یہاں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پلنگ پر ایک بڑا سا خوان رکھا ہے۔ اور دوسرے پر بڑی سی گٹھری۔ شوکت بیٹھا ہوا ان کو دیکھ رہا ہے۔

نواب نے پوچھا یہ کیا ہے۔

"معلوم نہیں جو شخص لایا تھا۔ اس نے بھی یہ نہیں بتلایا کہ کہاں سے لایا ہوں۔ کہا کہ نواب صاحب کو سب کچھ معلوم ہے۔"

نواب نے پوچھا "ان میں کیا ہے؟" شوکت نے کہا "ابھا میں

نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ نواب صاحب نے حیرت اور تجسس بھرے ہاتھوں سے دونوں چیزیں کھول کر دیکھیں۔

خوان میں میوے، حلوے۔ مٹھائیاں، مربے اور شیرمالیں وغیرہ تھیں اور گٹھڑی میں دو دوشالے دو انگرکھے اور سب کے اوپر وہ دونوں انگوٹھیاں تھیں جو نواب نے دلربا کو رخصتانہ کے طور پر دس سال ہوئے بھیجی تھیں۔ ان کی واپسی اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ دلربا کو جسد اب منظور نہیں۔

شوکت دوشالوں اور اس سامان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن نواب کی آنکھوں میں جو آنسو اب تک رکے ہوئے تھے بے اختیار بہنے لگے۔

شوکت نے گھبرا کر باپ کی طرف دیکھا ان کے منھ سے صرف اتنا نکلا۔

"علاقہ واپس مل جائے تو ــــ"

باب ۱۰

ڈاکو بھلتو

(۱)

کٹ پور کے کسانوں کو توقع یہ تھی کہ جب گاؤں بھر کے لوگ مل کر نواب صاحب سے کہیں گے کہ ہم لوگ لگان اور طرح طرح کے محصولوں اور افسروں اور حاکموں کے حقوق کے بوجھ سے مرے جا رہے ہیں تو نواب صاحب کو دیا آجائے گی اور وہ کچھ نہ کچھ مہربانی ضرور کریں گے۔ لیکن جب نواب صاحب کے یہاں کوئی بھی شنوائی نہ ہوئی تو وہ بے حد ملول ہو گئے اور ان کی واپسی اس طرح ہوئی جیسے وہ کوئی پیارا پیارا مردہ پھونکنے کے بعد شمشان سے واپس جا رہے ہوں۔

سب سے زیادہ افسردہ برجو تھا۔ اس کو ناکامی کا غم تو تھا ہی ساتھ ساتھ ایک اور غم مل گیا تھا جو اس سے بہت گہرا تھا وہ یہ کہ اس

کے کان میں بھنک پڑ گئی تھی کہ سانولی شیاما سے پھنسی ہوئی ہے۔
اس خبر سے اس کے دل پر سخت چوٹ لگی اور واپسی میں وہ راستے
بھر غصہ سے کھولتا رہا۔ کٹ پور آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ مہاراج کے گھر
جا کر سانولی کو بلا لیا اور راستے ہی سے بلا کچھ کہے سنے جوتا اتار کر اس
کو مارنا شروع کر دیا اور گھر تک برابر مارتا لایا۔

سانولی مار کھاتی گئی اور ہائے ہائے کرتی گئی۔ مگر اس نے ایک
بار بھی تو نہ پوچھا کہ یہ مار کس قصور پر پڑ رہی ہے۔ گھر آ کر برجو نے کہا۔

"اب مہاراج کے گھر نہ جانا۔"

"کوئی میں اپنی مرضی سے جاتی ہوں۔"

"مہاراج کا رعیت ہوں تو میں ہوں۔ تو نہیں ہے۔ بھگت لوں گا
جو کچھ ہوگا۔ تو اب نہ جانا۔"

سانولی کو برجو کی بات پسند نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ
اسے شیاما سے کچھ لگاؤ ہو گیا تھا۔ بلکہ ایک بات اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ جس
ساری کے باندھنے پر سانولی نے مار کھائی تھی۔ اور پھر اس مار کی وجہ سے اتار
کر ایک گھڑے میں جیسے وہ بکس کی طرح استعمال کرتی تھی رکھ دی تھی۔ اب برجو
کے آنے پر اس نے وہ ساری پھر نکال لی تھی اور پہن کر مہاراج کے گھر گئی تھی
اور وہاں جا کر شیاما سے کہا تھا۔

"چھوٹے مہاراج اب تو تمھاری سانولی رانی بنے گی اور ضرور بنے
گی۔ چاہے بڑے مہاراج مار کا لے کر پھونک ہی کیوں نہ ڈالیں۔"

سانولی اسی ساری میں مہاراج کے گھر کا کام کرنے لگی۔ شیاما اس

دن گھر سے ایک منٹ کو بھی باہر نہیں گیا اور ایسی جگہ بیٹھا رہا جہاں سے
سانولی برابر نظروں کے سامنے رہے۔

دو گھنٹہ میں بڑے مہاراج سانولی کی طرف ہو کر نکلے۔ سانولی نے
تو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لیکن مہاراج غصے اور غصے سے زیادہ حیرت کا
شکار ہو گئے کہ اتنی مار کھانے پر بھی یہ عورت پھر وہی ساری باندھ کر آئی ہے۔
وہ سانولی کی طرف بڑھے، اور ان کی کھڑاویں چلانے لگیں۔

"پتاجی ادھر آئیے۔ ذرا بھی کھاتے کی ایک بات سمجھا دیجئے۔"
شیامو کی طرف دیکھا مہاراج نے تو اس کے تیوروں میں ایک
نئی بات پائی۔ مہاراج معاملہ کو بھانپ گئے اور خاموش کھڑاؤں سے
چل کر باہر نکل گئے۔

اس کے بعد سانولی مہینہ بھر تک وہی ساری باندھے رہی اور ہر
جگہ جاتی آتی رہی۔ اس طرح سانولی نے اپنے نزدیک شیامو کو اگر کچھ دے
دیا تو ذات پات کی دنیا سے کچھ لے بھی لیا تھا۔ اس وقت سانولی شوہر
کی مار کو درست نہ سمجھ رہی تھی، لیکن ساتھ ساتھ اپنے کو بھی غلطی پر نہیں
سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ نیچ لوگوں کے اوپر اٹھنے کے راستے
بھی نیچے ہی سے نکلتے ہیں، اوپر سے نہیں۔

رات بھر جو باتوں باتوں میں کہنے لگا کیوں نہ کسی اور گاؤں
میں جا کر بس جائیں۔ بوڑھے باپ نے کہا "کیا وہاں اونچ نیچ نہیں ہوگی
اور کیا وہاں زمیندار کا جوتا نہ ہوگا۔ تو تو بدیس جا کر پاگل ہو گیا ہے۔ ہم
لوگوں نے چمار کے گھر جنم لیا ہے اور جہاں جائیں گے چمار ہی رہیں گے۔ اور

لوگ ہم سے وہی برتاؤ کریں گے جو چماروں سے کیا جاتا ہے۔ کچھ سمجھے"
اتر جاؤ جا ہے دکھن، بھاگ کے وہی لچھن"
پھر وہ کہنے لگا۔

"پرانے ہونے کی وجہ سے یہاں سو رعائتیں مل جاتی ہیں۔ یہاں سے جہاں بھی جاؤ گے وہاں نئے ہوئے اور کچھ نہ ملے گا! ورنہ یہ سمجھ لو کہ آج کل زمین بڑی مشکلوں سے ملتی ہے اور اس کے لئے بہت بھاری بھاری نذرانے دینا ہوتے ہیں۔"

برجو کو یاد آگیا کہ اس کے مرنے والے بھائی کی بیوی نے اپنے شوہر کے کھیت کا پٹہ ابھی دو ہی مہینے ہوئے مہاراج کو نذرانہ دے کر اپنے نام کرالیا تھا۔ انھوں نے ترس کھا کر آدھا نذرانہ واپس کر دیا تھا اور اس کو چھپر کے لئے پھوس بھی مفت دے دیا تھا۔

دوسرے دن مہاراج کا آدمی سانولی کو بلانے آیا۔ برجو کے باپ نے کہا۔

"مہاراج سے ہاتھ جوڑ کر کہہ دو کہ اس کا جی نہیں اچھا ہے"۔

برجو نے جو گھر کے باہر درخت سے لکڑی کاٹ رہا تھا پکار کر کہا "بابا صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے ہو کہ جو خدمت ہو ہم مرد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جب ایسی بات ہے تو ہماری عورتوں کو کیوں بلاتے ہیں۔"

مہاراج کے آدمی نے جو سنا وہ جا کر مہاراج سے کہہ دیا۔

مہاراج پہلے ہی سے اس بات پر کہ سب کسان ملاّن کے مشورے کے نواب صاحب کے پاس چلے گئے بہت بگڑے ہوئے تھے۔ یہ جو سنا تو ان کے تن بدن

میں آگ لگ گئی ۔ وہ بیٹھے سے اٹھ کھڑے ہوئے پھر ٹہلنے لگے۔ ان کی کھڑاویں معمول سے دگنی آواز سے کھٹ کھٹ کرنے لگیں ۔ مہاراج جانتے تھے کہ کیا معاملہ ہے جو برجو نے اپنی عورت کو میرے گھر آنے سے منع کر دیا ہے ۔ لیکن چمار دں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ کہیں کہ کون مہاراج کے گھر آئے گا اور کون نہیں آئے گا ۔

مہاراج نے دو روپے لئے اور گاؤں کے چوکیدار کی طرف چل دیئے وہ اپنی گائے لئے ہوئے مہاراج ہی کے پیڑوں کے نیچے گھومتا ہوا دکھائی دیا ۔ مہاراج کو دیکھ کر دور ہی سے بولا ۔

"کہاں چلے مہاراج "۔

" زرا ہوا کھانے نکل آئے ۔"

پھر مہاراج قریب آکر گائے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے ۔

"گئو کی سیوا کرنا بڑا اچھا کام ہے "۔

ہاں مہاراج ۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ جنگل تو گھیر لیا گیا اور تالاب کے کناروں تک پر کھیتی ہونے لگی ہے اب کوئی گئو چرائے تو کہاں چرائے "

ہاں بھئی بات تو سچی ہے سنا ہے کہ یہ سب گاؤں والے جو نواب صاحب کے پاس گئے تھے تو اسی کام کے لئے گئے تھے کچھ معلوم ہے کہ کیا ہوا ؟

ہم کو کچھ نہیں معلوم ہم تو سناٹے میں پڑ گئے جب معلوم ہوا کہ اتنے کسان جب چاپ تے نکل گئے اب ہم سے تو اوپر سے پوچھ گچھ ہوگی یہ تو ایسی بات ہے جو اس گاؤں میں کیا کہیں آس پاس بھی نہیں ہوئی تھی۔

بھئی تم ہو ذرا سیدھے حاکم۔ اپنی رعایا کی ہر بات کو معاف کر دیتے ہو اس لئے یہ لوگ سر چڑھ گئے"۔

یہ سن کر چوکیدار بہت پھول گیا۔

"اس مرتبہ تو میں ان لوگوں کی حاکم سے کس کر شکایت کروں گا"۔

ضرور کرو۔ ادھر شہر جانے کے لئے کرایہ ورایہ کی ضرورت ہو تو یہ رقم لو۔

چوکیدار کو نذرانے تو روز ہی ملتے تھے۔ لیکن چونی، اٹھنی یا حد سے حد روپیہ۔ دو روپیہ اکٹھا پہلی مرتبہ مہاراج نے دیئے اور وہ بھی خلاف توقع ان کو پاکر وہ بہت خوش ہو گیا۔

"مگر مہاراج یہ بھی تو بتلاؤ کہ شکایت کروں تو کس کی کروں کیا سارے گاؤں کو اپنا بیری بنالوں۔"

مہاراج کے دل نے کہا کہ ہو نہ ہو، یہ چالاک چوکیدار میرا مطلب تاڑ گیا ہے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی انھوں نے محسوس کر لیا کہ یہ واقعی اوپر کے حاکموں سے شکایت کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی بدنامی نہ ہو۔

"میرے خیال میں یہ سب شرارت برجو چمار کی ہے اس کے دماغ آج کل چڑھے ہوئے ہیں۔

"یہ بات ہے تو کچھ فکر نہ کرو سب کس بل نکل جائیں گے"۔

تیسرے دن شام کو چوکیدار نے مہاراج سے کہا۔ "میں برجو کا نام لکھوا آیا ہوں"۔ پھر خاموشی سے بیڑی کے دو تین کش لینے کے بعد رازدارانہ

"اچھا ہوا جو میں پہونچ گیا۔ تھانے دار صاحب بہت ناراض تھے اور کہہ رہے تھے کہ میرے گاؤں میں اتنی بڑی بات ہوگئی اور میں نے خبر تک نہیں دی۔ میں نے کہا جو کچھ ہوا اچانک ہوا اور پہلے سے کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگی تھی جب معاملہ ہوگیا تو میں نے کہا کہ اب اس بات کی کھوج کرلوں اور اندر تک پہونچ جاؤں۔ تب تھانے جاؤں۔ تھانے دار صاحب نے یہ سن کر بس ایک سوال پوچھا۔" ان کا اگوا کون ہے؟"

میں نے کہا۔" برجو چمار۔ سرکار وہ جب سے لام پر سے آیا ہے جانے کیسی باتیں کرتا ہے کہ ہر شخص اس کی باتیں سنتا ہے۔ ان باتوں سے سب میں سرکشی آرہی ہے۔

پھر تھانے دار صاحب نے کیا کہا۔

"انھوں نے ایک لمبی سی ہونہہ کی۔ اور کہا جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا ——"

"ایسی بات ہے۔ اچھا لو بیڑی پیو"

دوسرے دن بہت تڑکے مہاراج کے چار آدمی برجو کے گھر پہونچے اور اسے پکڑ کر مہاراج کے سامنے لے آئے۔ مہاراج نے اپنے سامنے گن کر اس کے بیس جوتے لگوائے۔ سینکڑوں گالیاں دیں اور پھر مرغا بنا کر چبوترے کے نیچے کھڑا کر دیا اور اس کی کمر پر ایک کسان کا جوتا رکھ دیا۔ برجو کا باپ جو برجو کے ساتھ ساتھ آیا تھا مہاراج کی کھڑاؤں سے سر ملنے لگا اور رو رو کر، ہاتھ جوڑ جوڑ کر، گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ لیکن مہاراج ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر دوپہر کے قریب سانولی نے آکر مہاراج کے پاؤں پکڑ لئے

اور کہنے لگی کہ اب برجو کی مجال نہیں جو آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔

ایک مرتبہ چوکیدار ادھر سے گزر چکا تھا اور اس نے مہاراج کو سلام کر کے ان سے بیڑی مانگ کر پی تھی۔ اور برجو کے معاملے میں اس نے ذرا بھی دخل نہ دیا تھا۔ برجو کے ساتھ جانے والے کسان بھی ادھر سے گزرے تھے، لیکن ان کی بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ کیوں کہ لکھنؤ سے ناکام واپسی سے ان کی ہمت ٹوٹ گئی تھی، ساتھ ساتھ ایکا بھی۔ ان حالات کو دیکھ کر برجو کی ہمت بھی جواب دے گئی اور جب سانولی نے مہاراج سے کہا کہ برجو آپ کی آ گیا پر چلے گا۔ تو مہاراج نے برجو سے پوچھا بول تو کیا کہتا ہے تو اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"ہاں مہاراج"

یوں تو سانولی مہاراج کے گھر سے سرِ شام ہی واپس آ جایا کرتی تھی لیکن اس دن آدھی رات کو آئی اور بڑبڑاتی ہوئی آئی۔

"لام پر کیا گئے کہ دماغ چل گیا یہ بھول گئے کہ ہم کون ہیں۔ ہم ہیں کیا؟ نیچ، اچھوت، چمار، پھر ہماری عزت کیا؟ تو تو اکڑ رہا تھا اپنی فوجی وردی پر۔ مل گیا اکڑنے کا پھل؟ دیکھا کیا ہوا؟ مار کھائی۔ ذلیل ہوئے اور میری بات جو چھپی ہوئی تھی گاؤں بھر کو معلوم ہو گئی۔ لو آج آئی ہوں آدھی رات کو اب بتلاؤ کیا کر سکتے ہو تم؟"

"چپ رہ نہیں تو ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دوں گا۔"

برجو بولا تو بہت گرج کر۔ لیکن اس کی آواز سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ سانولی کڑوا جواب دینے ہی والی تھی کہ اس بارش

سے اس کی آواز بھنگ گئی اور وہ روتی ہوئی بولی۔

"مجھے شما کردو۔ میں بے بس ہوں۔"

دوسرے دن منہ اندھیرے برجو نے اپنی وردی پہنی۔ لڑائی میں قابل قدر خدمات کے صلے میں تمغہ جو ملا تھا وہ لگایا۔ بہادری کے جو سرٹی فکٹ ملے تھے وہ ساتھ لئے اور چل کھڑا ہوا۔ سانولی رات بھر جاگتی رہی تھی اس نے چلتے سمے برجو کو جل پان کے طور پر گڑ کا ٹکڑا اور پانی دیا۔ اور پھر پیچھے پیچھے گاؤں کے نکڑ تک چلی آئی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مہاراج کی طرف نہیں بلکہ کسی اور طرف جا رہا ہے تو ٹھہر گئی اور اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک برجو درختوں میں چھپ نہ گیا۔

دن بھر برجو نہ آیا۔ رات کو بھی نہ آیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا اور رات ہو گئی۔ اس رات سانولی آدھی رات سے پہلے ہی آ گئی اور جب دیکھا کہ برجو ابھی تک نہیں آیا ہے تو وہ ڈری کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔ آخر اس سے ضبط نہ ہوا اور رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر برجو کا باپ بھی رونے لگا۔

مگر آدھی رات گزرنے کے بعد برجو واپس آ گیا۔ آیا تو بہت ہی تھکا ہوا اور بہت ہی دل شکستہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی بوجھ لاد کر میلوں چلا ہو۔ آتے ہی برجو اپنے چھوٹے گھر کے گندے کھاٹ پر گر گیا اور کہنے لگا۔

"بیا تم سچ کہتے ہو کہ چار چار ہے اور چار ہی رہے گا۔"

(۲)

کسی نے برجو کا کندھا ہلایا۔

"برجو اٹھ میں آیا ہوں۔"

آواز بھاری اور مضبوط تھی۔ لیکن اس میں ہمدردی اور یگانگت بھی

تھی ——

"کون ہو تم؟"

"راجا بھگتو"

یہ آواز نیچے سروں میں نہیں نکلی تھی بلکہ بھاری سروں میں نکلی تھی

جسے چھپر کے نیچے سب سونے والوں نے سن لیا اور سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اور

کھسر پھسر کرنے لگے۔

"ڈاکو بھگتو!!"

"ہاں راجا بھگتو۔"

"آپ راجا جی آپ!!"

"ہاں ہاں میں ہی ہوں۔ راجا بھگتو۔"

بھگتو راجا بھی کہلاتا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک دن انگریز کلکٹر شکار

کھیلنے کسی طرف گھنے جنگل میں اکیلا نکل گیا تھا۔ بھگتو نے دیکھ لیا تھا اور اپنے تین چار آدمیوں کو لے کر اچانک گھیر لیا۔ سب نے اس کی طرف بندوقیں تان لی تھیں۔ تب بھگتو کہنے لگا۔

"کہو صاحب اڑا دوں؟"

"کون ہو تم؟"

"بھگتو"

"تم بڑا بہادر ہے کہ اس طرح ہمارے سامنے آ گیا ہم تم سے بہت خوش ہوا۔ اور تم کو راجا کا ٹائیٹل دے دیا۔"

بھگتو جو ابھی اس وقت تک بھگتو پاسی کہلاتا تھا وہ راجا بھگتو کہلائے گا!! یہ ایسی چیز تھی جس کا بھگتو نے تصور کبھی نہ کیا تھا۔ نہ ہی یہ بات کہ کلکٹر کو کیا حق ہے خطاب دینے کا، اور یہ کہ کیا اس طرح وہ راہ چلتے خطاب دے سکتا ہے۔ ان باتوں تک بھگتو کا دماغ پہونچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چل گیا کلکٹر کا نعرہ۔ اور بھگتو کے حکم سے اس کے ساتھیوں نے بندوقیں ہٹا لیں۔ اور یا تو وہ لوگ کلکٹر کی جان لینے جا رہے تھے یا اپنے پڑاؤ پر لے جا کر اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ اپنی خاص شراب پلائی اور اس طرح پلائی کہ دس گلاس لا کر رکھ دیے پھر کلکٹر کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی بوتل سے سب میں شراب انڈیل گئی پھر کہا کہ صاحب جو گلاس چاہو اٹھا لو اس خاطر مدارات کے بعد حفاظت کے ساتھ جنگل کے کنارے تک پہونچا دیا۔

اس دن سے بھگتو کو اس کے ساتھی راجا بھگتو کہنے لگے۔

برجو نے پاؤں چھو کر کہا۔

"دیا رکھا راجا بھگتو، ہم بہت گریب ہیں"۔

"ارے تم لوگوں پر دیا نہ رکھیں گے تو کس پر رکھیں گے۔ کبھی بھگتو نے کسی غریب کو لوٹا ہے جو تم اس سے ڈر رہے ہو۔

"کیا سمجھے؟"

"نہیں راجا جی آپ نے کبھی کسی غریب کو نہیں مارا"۔

اب تک برجو کا خاندان بھگتو کے گرد اکٹھا ہو چکا تھا۔ باپ، بیوی اور بیوہ بھاوج سب کے سب۔ بھگتو اس جوار کا سب سے بڑا ڈاکو تھا جو پانچ چھ سال سے اس اطراف کے مہاجنوں کے لئے دہشت بنا ہوا تھا اور پولیس کو نچا رہا تھا۔

اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ سارا گاؤں سو رہا تھا۔ کتے چھوٹے ہوئے ہر طرف گھوم رہے تھے۔ اور بھونک رہے تھے۔ برجو اور اس کے گھر والے جو اب بھگتو کے گرد آ کر بیٹھ گئے تھے ان کو حیرت تھی کہ کتوں نے کیسے بھگتو کو آنے دیا۔

برجو نے بھگتو کو اپنی کھاٹ پر بٹھایا خود بھاگ کر اندر سے ایک بوتل شراب لایا اس کے ساتھ دو مٹی کے کلہڑ ان دونوں میں اس نے شراب انڈیلی۔

بھگتو نے ایک کپا اٹھا کر حاضرین کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔

برجو کو چھوڑ کر تم لوگ اندر جاؤ۔ نہ تو باہر نکلنا اور نہ ہماری باتیں سننا کیا سمجھے۔

"ہاں راجا بھگتو"۔

پہلے دونوں عورتیں سلام کر کے اندر چلی گئیں اور پھر برجو کے باپ نے بھی پرنام کیا اور چلا گیا بھگتو ان لوگوں کو دیکھتا رہا جب لوگ گھر یعنی ایک در والے کمرے کے اندر چلے گئے اور اسے اندر سے بند کر لیا اور سوائے رات کے سناٹے کے ارد گرد اور کچھ نہیں رہ گیا تب اس نے برجو سے کہا۔

تیرے سنکٹ کا حال مجھے معلوم ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تم فوجی وردی ڈانٹ کر اور اپنے کاغذ داغذ لے کر صاحب کے پاس اور افسروں کے پاس دو دن گھومتے پھرے۔ کیوں ہوا تھا نہ یہی ؟

"ہاں راجا جی یہی ہوا تھا۔"

"پھر ان بڑے لوگوں نے کیا کیا ؟"

"بھگا دیا اور دروگہ جی نے تو دو چار گالیاں بھی سنا دیں۔

"پھر ؟ اب بتلاؤ کیا کرو گے ؟"

"کیا کروں گا راجا جی۔ چمار ہوں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ کچھ اپائے ہو تو بتلاؤ"۔

"ہوں"

بھگتو نے ٹھرے کا پیالا اٹھایا اور ایک چسکی لی۔

بڑی تیز بو کی دارو پیتے ہو تم لوگ۔ مگر بری نہیں ہے۔ برجو میں اس طرح ہر جگہ کھاتا پیتا نہیں ہوں، جانے کون کیا ملا دے۔ میرے لئے سرکار نے ہزاروں کا انعام رکھا ہے۔

ہاں راجا جی احتیاط کرنا چاہیئے۔ مگر نہیں ......"

تم پر بھروسا ہے۔ بھروسا نہ ہوتا تو اکیلا کیوں آتا اور اس طرح

بے دھڑک کیوں پی لیتا ؟"

برجو نے بھگتو کو اطمینان دلانے کے لئے اس کے سامنے ایک ہی بوتل سے دو کپ بھرے تھے ۔ جن میں سے ایک بھگتو نے اٹھایا تھا اور پہلی چسکی اس نے پی تھی ۔

بھگتو لمبا اور دبلا تھا ۔ جو تنگ خاکی پائجامہ اور خاکی کرتا اور اس پر مرزئی پہنے ہوئے تھا ان کپڑوں سے پسینہ کی تیز بو آرہی تھی ' جو اس بو سے ملتی جلتی تھی جو جنگل میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کیچڑ میں بہت سے پتے سڑ رہے ہوں ۔ بھگتو کا چہرہ یوں تو بالکل معمولی تھا مگر دو چیزیں ایسی تھیں جو دیکھنے والوں کے دماغ میں نقش ہو جاتی تھیں ایک تو آنکھیں جو پنجرے میں بند وحشی چڑیا کی طرح برابر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اچکتی رہتی تھیں ' کبھی اتر ' کبھی دکھن ' کبھی چھت ' کبھی فرش ہر طرف گھومتی رہتی تھیں اور دوسری چیز تھی اس کی خاص قسم کی مونچھیں ۔ مونچھیں کیا تھیں دو سوجے تھے جو دونوں طرف ہوا میں چھید کرتے رہتے تھے ۔

بھگتو کے بدن پر سب سے قیمتی چیز اس کے جوتے تھے برجو نے ایسے جوتے صرف بڑے انگریز افسروں کے پاؤں میں دیکھے تھے ان میں زرا بھی آواز نہیں ہوتی تھی ۔ نہ تو کھٹ کھٹ کی اور نہ چرمر کی ۔

"جانتے ہو برجو کہ میں بھی اس سنکٹ میں پڑ چکا ہوں جس میں تم پڑے ہو ۔ سمجھے اب کہ میں کیوں آیا ہوں ؟ کیا سمجھے ۔

"کچھ کچھ سمجھا ۔"

میں راجا بھوج پور کے یہاں نوکر تھا۔ موٹا کھاتا، موٹا پہنتا اور تین روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ ایک دن راجا جی کی نظر میری عورت پر پڑ گئی۔ انھوں نے اسی دن مجھے دس میل دور ایک جگہ دوڑا دیا اور کہا کہ رات وہیں رہنا اور دوسرے دن واپس آنا اور پھر رات کو میری عورت کو بلوا بھیجا وہ ٹھہرے راجا، جن کے پاس نہ ہوں گے تو بیاس نوکر تو ہوں ہی گے کیا کرتی وہ بیچاری۔ چلی گئی۔"

جب میں لوٹ کر آیا تو اس نے یہ سنکٹ مجھے سنایا۔ میں اس وقت راجا جی کے پاس گیا اور ذرا کڑے تیوروں سے پوچھا کہ "یہ کیا کیا آپ نے؟" کیا بکتا ہے۔ تیری عورت جھوٹی ہے۔ پھر نوکروں کی طرف مڑ کر کہا ٹھیک تو کرنا اس کا دماغ۔"

نوکروں نے چار پانچ جوتے مار کر مجھے بھگا دیا اور کہہ دیا کہ اب اگر مہاراج کی آگیا کے خلاف کچھ کہا، یا کچھ کیا تو گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے۔

پھر تو راجا جی میری عورت کو ہر چوتھے پانچویں بلانے لگے ایسا بھی ہونے لگا کہ رات کو وہ میرے ساتھ سو رہی ہوتی کہ راجا سپاہی بھیج کر بلوا لیتے۔ پھر تو ہر ایک مجھ پر ہنسنے لگا۔ منشی جی تک مخول کرتے اور کہتے کہ

راجا اگر تیری عورت کو بلا لیتے ہیں تو تیرا کیا جاتا ہے کوئی وہ تیری عورت کے لال توڑ لیتے ہیں؟

بر جو تمھاری بیوی کی گود میں اس وقت چھ مہینے کا ایک بچہ ہے۔ تم کو اس پر پیار آتا ہوگا۔ مگر پھر سوچتے ہوگے کہ بھگوان جانے کہ وہ تمھارا بچہ ہے یا چھوٹے مہاراج کا ہے۔ یہی حال میرا ہو گیا تھا۔ جب

میری بیوی کا پیٹ سے ہوئی۔ اس وقت سے مجھے شک شروع ہو گیا۔ پھر دن پورے ہو گئے اور بچہ پیدا ہوا۔ وہ پانچ مہینہ کا جب ہوا تو کھیلنے لگا۔ میں اسے دیکھ کر خوش بھی ہوتا تھا اور کڑھتا بھی تھا۔ اور پھر سوچتا تھا کہ کیا زندگی ہے کہ ان باتوں پر بھی نہیں خوش ہو سکتے جن پر دنیا خوش ہوتی ہے ——

ایک طرف میری حالت ایسی تھی اور دوسری طرف میری عورت کی خاطریں ہوتی تھیں۔ دودھ آتا۔ مٹھائی آتی۔ کپڑے ملتے۔ دو چار سونے کے زیور بھی مل گئے پھر تو میری عورت کے مزاج اتنے چڑھ گئے کہ وہ مجھے گھٹیا سمجھنے لگی۔

راجا جی کا دستور یہ تھا کہ جب کبھی شکار کو جاتے بندوق میرے اوپر لدواتے میں ان کے ساتھ بندوق لئے گھومتا رہتا جب شکار سامنے آتا تو وہ بندوق لے لیتے۔ فائر کرکے پھر مجھے دے دیتے اب یہ ہونے لگا کہ جب راجا جی شکار کو جاتے تو ایک طرف میرے پاس بندوق ہوتی اور دوسری طرف لوگ میری ہنسی اڑاتے رہتے۔

ایک رات میں بیوی کے پاس تھا کہ اس کی طلبی آئی اور وہ چلی گئی اس دن صبح میری آنکھ کھلی تو سوچنے لگا کہ بھگت رام تیری بھی کیا زندگی ہے نہ عزت اپنی رہی نہ اپنی عورت اپنی رہی۔ اتنے میں راجا جی کا پیادہ آیا اور کہا کہ چلو راجا جی شکار کو جا رہے ہیں میں تیار ہو کر پہونچا تو راجا جی نے حکم دیا کہ بندوق اور کارتوس کی پیٹی اٹھا کر ساتھ ساتھ چلو اور یہ بھی کہا کہ "ہوشیار رہنا بندوق بھری ہوئی ہے۔"

جیسے بندوق میری ہوتی تھی ویسے ہی میں بھی بھرا بیٹھا تھا۔ اب جو ہاتھ آئی بندوق اور میں نے اٹھایا تو دل میں جانے کیا ہونے لگا کہ اتنے میں میری بیوی سامنے آ گئی اور اٹھلا کر بولی۔

"کیا سکار کو جا رہے ہو راجا جی؟"

بس میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں نے پہلے تو بندوق عورت کی طرف جھپائی مگر پھر دل نے کہا کہ اس کا کیا دوش۔ پلٹ کر میں نے راجا جی سے کہا۔

راجا جی تم میری عورت کا مزا تو بہت چکھ چکے ہو۔ اب زرا میرے نشانے کا مزا بھی چکھ لو۔

بندوق کی نال جیسے ہی راجا جی کی طرف مڑی ہے۔ ارے ان کی گرج، اور کڑک سب ایسی غائب ہو گئی۔ مانو بھرے حوض میں چھید ہو گیا اور اس کا سارا پانی ایک دم سے نکل گیا وہ تو گڑگڑا کر کہنے لگے۔

"ارے لیودیرے لے اور جو جی چاہے لے لے بول کیا لے گا"

"اپنی عورت کو دو گے؟"

اے بھگت رام تو تو بڑا اچھا اور بڑا بہادر ہے زرا سن تو عورت.... دت تیرے کی۔ عورت کا نام سن کر وہ غصہ بھی نہ آیا جو مجھے آیا تھا لے لے.......

اس وقت ہوں گے کوئی پندرہ مرد اور عورتیں اکٹھا لیکن میں نے ان کی کوئی پرواہ کی اور بندوق چلا دی۔ اور راجا جو فائر سے پہلے ہی قریب قریب مر چکا تھا، بھیگی ہوئی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ دت تیرے سالے کی.....

راجا کو اس طرح مرتے دیکھ کر میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔ پھر میں نے بہت اطمینان سے اور بلا کسی گھبراہٹ کے جو لوگ کھڑے تھے ان پر نظر ڈالی خوف کے مارے سب کے چہرے سفید ہو رہے تھے اور منشی جی جو میرے اوپر بہت نعرے چلاتے تھے ان کی حالت تو خوف سے ایسی ہوگئی تھی کہ میں اگر ڈانٹ بھی دیتا تو ان کا دم نکل جاتا۔ پھر میں نے بندوق ایک کندھے پر رکھی اور کارتوس کی پیٹی دوسرے کندھے پر ڈالی اور جو آدمی اکٹھا تھے ان سے کہا۔

"آتا ہے کوئی مائی کا لال سامنے؟"

کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بلکہ ایسا لگا کہ ان لوگوں کے سینوں میں سانسوں کا آنا جانا بھی بند ہوگیا ہے میں نے کڑک کر کہا۔

"سن لو سب کان کھول کر۔ میری عورت ہے تو بڑی حرام جادی۔ لیکن اگر کسی نے بھی اس سے ایسی ویسی باتیں کیں تو اس کے سارے گھرانے کا صفایا۔"

"پھر میں نے راجا کے گھوڑے کو لیا جو شکار کے لئے تیار رکھا تھا اور اس پر جنگل چلا آیا۔ وہ دن اور آج کا دن میری بیوی کا وہ رعب ہے کہ بڑے بڑے مہاجن اور زمیندار اسے سلام کرتے ہیں اور تحفے بھجواتے ہیں اور بہن جی بہن جی کر کے بات کرتے ہیں۔ کیا سمجھے؟"

پھر مسکرا کر بھگتو نے کہا۔

"اور یہ جو یہ دیکھ میری مونچھیں بھلا کوئی چمار یا پاسی اس طرح کی مونچھیں رکھ کر ان پر اس طرح تاؤ دے سکتا ہے؟"

بھگتو اپنی نوکیلی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔

برجو یہ سب کچھ سن کر دیر تک چپ رہا پھر کہنے لگا۔

"یہ تمھارا ہی جگر ہے بھگتو راجا جو پولیس کے خوف کے باوجود خوش رہتے ہو۔ میں ہوتا تو ایسا نہ کر سکتا۔"

بھگتو ہنس پڑا۔

"پولیس کا خوف!! کیسے ہو برجو؟ پولیس سے اور مجھے خوف!! ارے میں اب تک دو دروگاؤں کی تین بیٹیوں کی بھاری بھاری جہیز دے کر شادیاں کرا چکا ہوں۔ اور اب تو جو بھی سالہ دروگہ آتا ہے وہ یہی کہلاتا ہے کہ ہم پر بھی دیا رہے راجا بھگتو۔ کہو برجو کیا سمجھے"۔

"پھر ہم کو آگیا دو کہ کیا کروں"۔

اگر تمھاری مرضی ہو تو دو روز کے اندر اندر مہاراج اور لالاجی دونوں کی خبر لے لوں۔ اب تو میں جہاں کام کرتا ہوں وہاں کے غریبوں کی مرضی سے کرتا ہوں اور جو ملتا ہے۔ اس میں ایک حصہ جہاں پولیس کا ہوتا ہے وہاں ایک حصہ غریبوں کا بھی ہوتا ہے کیا سمجھے برجو"۔

"میں بہت پریشان ہوں بھگتو جی، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا کروں"۔

ایک اور بات بھی سن لو۔ وہ یہ کہ اگر چاہو تو ہمارے جتھے میں آجاؤ وہاں دو تین لام سے آنے والے سپاہی بھی ہیں ان کے ساتھ تمھاری خوب نبھے گی پھر تو شیا مو تمھاری چلمیں بھرے گا اور کہو گے تو اپنی عورت بھی تمھارے حوالے کر دے گا۔ کیا سمجھے۔"

بھگتو آخر کا جملہ کہتے وقت طنز یہ ہنسی ہنسا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ ہی بچی ہوئی شراب ایک گھونٹ میں ختم کر کے کہنے لگا۔

"اگر میری بات پسند آئے تو جنگل میں آ کے بتا دینا۔"

"جنگل میں کہاں آؤں گا؟"

"جیسے ہی تم جنگل میں پاؤں دھرو گے مجھے خبر ہو جائے گی۔"

اک دم سے بھگتو کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آئی اور وہ مسکرا

کر بولا۔

جنگل آؤ گے تو سچ مچ کے راجا بھگتو سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

اور یہ بھی دیکھو گے کہ وہاں کیسے جنگل میں منگل ہوتا ہے۔ کیا سمجھے۔

یہ کہہ کر بھگتو بے آواز جوتوں سے بے آواز کی دو تین جستوں میں

ایک درخت کے پاس پہونچ گیا وہاں سے دو آدمی جو سائے میں چھپے ہوئے

تھے باہر نکل آئے رات ڈھل رہی تھی لیکن درختوں کے جو جھنڈ جنگل کو گھیرے

ہوئے تھے وہ ابھی تک تاریکی کا زندہ ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ جن کی ناک سے

جھینگر کی سیٹیاں اور حلق سے سیار کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ رات کے تینوں

مسافر تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے ان اندھیرے کے ڈھیروں میں غائب ہو گئے

ادھر وہ لوگ گئے اور ادھر برجو کو پتہ چلا کہ گاؤں کے لوگ بیدار

ہونے لگے ہیں اور صبح ہونے والی چہل پہل کا آغاز ہونے ہی والا ہے۔

"کیوں ری میں بھگتو جی کے جتھے میں چلا جاؤں؟"

برجو نے سانولی کو سب کچھ بتا کر یہ سوال کیا۔

"نہیں سب کہیں گے کہ نیچ تھا نا۔ کوئی اور اپائے سوچو مجھے لے کر

کہیں بمبئی یا کلکتے نکل چلو۔"

"اس طرح دوسروں کی باتوں کو دیکھتی رہے گی تو جس حالت میں ہے اسی حالت میں رہے گی۔"

"بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں مان سکتی کہ اس کام میں جان جوکھوں میں نہیں ہوتی ہے۔ اگر تم پکڑے گئے تو پھر کیا کریں گے بھگتو راجا ہمارے لئے۔"

"جتنے دن ہم جئیں گے اتنے دن تو عیش کریں گے۔"

ضرور عیش کرلو گے۔ سنا ہے کہ ڈاکوؤں کو پریاں خوب ملتی ہیں مگر میں تو یہاں اکیلی سڑوں گی مجھ سے ملنے میں تمھارے لئے ہزاروں خطرے ہوں گے۔

"میرا جی تو کہتا ہے کہ اس زندگی سے وہ زندگی اچھی ہے۔"

نہیں یہ زندگی جیسی بھی ہو مگر ڈاکوؤں کی زندگی سے اچھی ہے۔

"ہاں تجھے یاری کرنے کو جو ملتی ہے۔"

سانولی چپ ہو رہی اور آنسو بہانے لگی۔

(۳۳)

دوسرے دن دوپہر کو کسان چیہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ خبر اڑ گئی کہ برجو کو پکڑنے پولیس آگئی ہے۔ یہ سن کر وہ لوگ برجو کے گھر کی طرف بھاگے۔ یہاں سچ مچ پولیس نظر آگئی اسے دیکھ کر سب اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ برجو کے گھر کے پاس

آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ جو بے خوفی لکھنؤ جانے سے پہلے آگئی تھی۔ ایسا اس کا پتہ نہ تھا وہ اس طرح غائب ہو گئی تھی جیسے تپتے اساڑھ میں کبھی کبھار سہ پہر کو آندھی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈک آکر دوسرے دن کی دھوپ میں غائب ہو جاتی ہے۔ سب لوگ بس دور ہی سے پولیس اور برجو کے گھر والوں کو دیکھتے رہے ان میں سے کسی کو بھی بھیس گز کے اندر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مائیں ایسی ڈر گئی تھیں کہ بچے رونے لگے اور مائیں ان کا منھ داب داب کر چپ کرانے لگیں۔ سارے گاؤں پر ایسی دہشت چھا گئی کہ کتے بھونکنے لگے۔

برجو کے قریب بس دو آدمی آئے۔ بابو۔ یارمضان لیکن ان دونوں کے منھ سے بھی تسلی کے کلمے نہ نکلے۔

برجو کو پکڑنے شہر سے دو کانسٹبل اور ایک ہیڈ کانسٹبل آئے تھے ان میں سے ایک نے ہتھکڑیاں پہنا کر اسی ہاتھ میں پکڑ لی اور دوسرا سے مارتا ہوا لے چلا۔ ان کے پیچھے پیچھے ہیڈ چلا۔

برجو۔ "حجور ہمارا کیا قصور ہے۔ کچھ تو بتاؤ ہم کو کاہے کی سزا مل رہی ہے۔"

برجو کو باپ اور بیوہ بھاوج نے رو رو کر رخصت کیا۔ باپ کے منھ سے صرف اتنا نکلا۔

"بھگوان کو یاد کر، برجو وہ بڑا دیالو ہے۔"

برجو کا اندھا لڑکا بھولا کسی طرح باپ کو نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ برجو کی ٹانگوں سے چمٹا مسلسل اپنی بے نور آنکھوں سے آنسو بہائے جا رہا تھا — پولیس والے اسے سختی سے الگ کر رہے تھے لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔ برجو بھی سمجھانے کی

کوشش کر رہا تھا لیکن بھولا کی نہیں ہتھیں کی زنجیر کسی طرح نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ آخر برجو نے بابو اور رمضان سے کہا کر تم لوگ اسے اٹھالو نہیں اسے بھی کوئی ڈنڈا نہ لگ جائے۔

پولیس کے کانسٹبل نے اس فقرے پر برجو کو ایک زبردست دھول دی۔

"ابے کیا ہم لوگ قصائی ہیں"

سانولی مہاراج کے گھر کام کر رہی تھی اس وقت اسے برجو کی گرفتاری کی خبر ملی۔ وہ وہیں سے روتی پیٹتی آئی۔ کانسٹبل اس وقت برجو کو گاؤں کے نکڑ تک لے جا چکے تھے۔ وہ کانسٹبلوں کی منتیں کرنے لگی کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے جو کچھ قصور ہے وہ میرا ہے۔ اس کی جگہ تم مجھے پکڑ لو۔ میں نے خود ہی مہاراج کے گھر جانے سے انکار کیا تھا۔

کانسٹبلوں نے گالی دے کر سانولی سے کہا "بھاگ جا یا کچھ تو بھی لے گی"

سانولی کانسٹبلوں کی جھڑکیاں اور گالیاں کھاتی رہی لیکن برجو کے پیچھے اس نے چلنا نہیں چھوڑا۔ جب تین میل کی کچی سڑک نکل گئی اور پکی سڑک آگئی تو وہاں پولیس کا اکہ کھڑا ملا اس پر دونوں کانسٹبل برجو کو لے کر بیٹھ گئے اور اکہ چلنے لگا۔ سانولی اب اکے کے پیچھے دوڑنے لگی۔

برجو سانولی کی مسلسل خوشامد کر رہا تھا کہ تو چلی جا۔ جب وہ اکے کے ساتھ دوڑنے لگی تو برجو نے چلا کر بہت لجاجت سے کہا۔

"میں ہاتھ جوڑتا ہوں اب تو چلی جا۔ میرا کہا سنا معاف کر دینا اور

سن میں نے بھی تجھے معاف کر دیا۔ بالکل معاف کر دیا۔ تیرا کچھ دوش نہیں۔"

برجو کے اس آخری فقرے نے سانولی کی طبیعتوں کا زور چوس لیا اور چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گئی۔ بلکہ گر پڑی پھر سنبھل کر جب اس نے کچھ کہنا چاہا تو اکہ دور کافی دور جا چکا تھا۔

اکے کے نکل جانے کے بعد برجو کا باپ اور بیوہ بھاوج سانولی کو ڈھونڈتے ہوئے آئے اور ان کے پیچھے بابو اور رمضان بھولا کو لئے ہوئے۔

بھولا سانولی کی سسکیاں پہچان کر روتا ہوا اس سے لپٹ گیا وہ اسے پا کر ایک بار کھل کر رو دیا۔ جب رونے کا زور اتار پر آیا تو سب نے سانولی کو سمجھایا اور اسے واپس لے چلے۔ سانولی جب پکی سڑک کو چھوڑ کر کچی سڑک واپس آ گئی تو اس نے دس قدم آ کر ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا سامنے دور تک جانے کہاں تک پکی سڑک چلی گئی تھی پکی اور سخت ایسی سخت جس پر نہ اپنے پاؤں کے نشان بنتے نہ بیلوں کے کھر کے اور نہ گھوڑوں کی ٹاپوں کے۔ سڑک چلی گئی تھی، چلی گئی تھی مانو دنیا کے پچھواڑے تک چلی گئی تھی اور اس وقت تیز ہوا کی وجہ سے اس پکی سڑک پر دھول اڑ رہی تھی اور آسمان تھا۔ نیلا آسمان اس سرے سے اس سرے تک۔ اس اک زندگی میں ذرا بھی جو مروت کی چھینٹ ہو۔

جب سانولی حسرت سے کھڑی اس طرف دیکھ رہی تھی جدھر برجو گیا تھا اسی وقت ایک چمارن نے جو پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ سانولی کی گود میں اس کا چھ مہینے کا بچہ دے دیا۔

سانولی بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ وہ روتی جاتی تھی اور اسے

پیار کرتی جاتی تھی۔

"میرا پاٹن ——— مجھے تیرے لئے جینا ہی پڑے گا ——— "

ایک آہ اور ایک سسکی کے ساتھ سانولی اپنی پرانی اور بجھی ہوئی زندگی کی طرف برجو کو کھو کر اور پاٹن کو لے کر لوٹ پڑی ——— کیا کرتی۔؟

باب (۱۱)

پرانے کوہ و صحرا

(۱)

محل دارنی نے کڑک کر صدا لگائی۔

"حضور نواب رفیع الشان صاحب بہادر کے صاحبزادے نواب
شوکت الشان صاحب تشریف لا رہے ہیں۔"

شوکت نے پہلی مرتبہ ایسے خاندانی نوابی محل میں قدم رکھا تھا۔ انھوں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے کو ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں بیمار ماں اور بوڑھے باپ کے ساتھ پایا۔ خدمت گار کا کیا سوال کوئی چولھا جلانے والا تک نہ تھا۔ ماں کچھ دنوں کے بعد رخصت ہوگئیں پھر یہ رہ گیا یا ابا حضور۔ ابا حضور نے ایک ایک کرکے سب عزیزوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ جہاں کوئی بے رخی برتتا اور پہلے سے

جب کہ یہ نواب تھے مختلف برتاؤ کرتا تو یہ کنارہ کش ہو جاتے۔ اب تو پرانے ملنے والوں میں سوائے الاشیام ناتھ کے اور کوئی رہ نہیں گیا تھا، وہی کبھی کبھار آجاتے۔ مگر جب آتے تو ان کے طور طریقوں سے یہی معلوم پڑتا گویا کہ وہ محل میں آئے ہیں۔ ٹوٹے پلنگ پر اس طرح بیٹھتے گویا کہ وہ عالی شان مسند ہے اور پان کی ایک گلوری بھی اس طرح شکریہ اور تسلیم کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ گویا وہ دنیا کی کوئی نرالی نعمت ہو۔ جسے نواب صاحب خصوصیت سے ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ادھر نئے دوستوں میں کچھ لٹے ہوئے نواب اور بگڑے ہوئے راجا صاحبان تھے وہ بھی دو چار سال سے۔ ان میں سے ایک آدھ جو تھے پانچویں دن آجایا کرتا تھا۔ یہ لوگ پرانے زمانے کی باتیں کرتے تھے جو کہ ان کے خیال میں دنیا کا سب سے اچھا زمانہ تھا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ اب تو ہر چیز بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ لوگ پرانے زمانے کی باتوں کو یاد کرتے، اپنی بیماریوں خاص کر اختلاج کی تفصیل سناتے، پرانے استادوں کے اشعار پڑھتے، شوکت پر ترس کھاتے کہ اس کے کھانے کھیلنے کے دن اس طرح کھنڈر میں کٹ رہے ہیں۔ یہ سب زمانہ کا قصور ہے اور پھر ٹھنڈی سانس بھرتے۔ دو چار گلوریاں نواب صاحب کے خاصدان سے بہت تکلف کے ساتھ کھاتے اور ذرا دیر ٹھہر کر چلے جاتے۔

ان لوگوں کے علاوہ گھر میں آنے والے کچھ اور لوگ بھی تھے مرغ باز، بٹیر باز، پرانے نوابوں کے پرانے مصاحب قدیم طرز کے داستان گو جن کی داستانوں میں تھم کم اور لفاظی زیادہ ہوتی تھی، بوڑھے رکاب دار، پھٹی آواز والے گویّے اور ناکام پھکیتے یہ لوگ وہ تھے جن کی اب کہیں کھپت نہیں رہی تھی۔

یہ لوگ جب آتے تو آتے ہی اپنے فن کی باتیں کرنے لگتے صرف مصاحبین ایسے تھے جو نواب صاحب سے ان کی خوبیوں کی باتیں کرتے تھے۔ آنے والوں کا یہ گروہ ہمیشہ شروع مہینہ میں آتا اور اس وقت سے آنا شروع کرتا جب ان کو خبر مل جاتی کہ گزارے کی رقم آ گئی ہے۔ اور اس وقت تک آتا رہتا جب تک اس رقم میں سے کچھ جان باقی رہتی۔

یہ گروہ جب آتا تو اپنے ساتھ گزرے ہوئے زمانہ کی خوش مذاقیوں کی بو باس لے کر آتا۔ ان کے آتے ہی قہقہے لگتے لگتے۔ اور سبحان اللہ اور واہ وا کی صدائیں بلند ہونے لگتیں پھر تو کسی دن مرغ مسلم بھی بھن رہا ہے تو کسی دن بادشاہی دال، کبھی شیرمال کے زعفرانی ٹکڑے تیار ہو رہے ہیں یا ماہی پلاؤ دم دیا جا رہا ہے، یا کشمیری چائے بن رہی ہے جس میں آٹھواں حصہ بالائی ہوتی ہے۔ چائے کی پیالیاں مہمانوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں تو ان کے ساتھ خستہ شیرمالیں بھی ہیں اور ہوش ربا کی داستانیں بھی۔ داستان نہیں ہے تو کسی شاعر کا کلام کسی بوڑھے گلے کی تانیں اور گٹکریاں ہی سننے میں آ جاتیں۔

یہ چہل پہل بس تین ہی چار دن رہتی کیوں کہ ادھر نواب صاحب کے خاص دان میں پان کی کمی نظر آئی اور ادھر ان پرانے وفاداروں نے نواب صاحب کو قرض سے بچانے کے لئے آنا چھوڑا۔ کہتے تھے کہ بھی وہیں تک گدگدانا اچھا ہے جہاں تک آنسو نہ آ جائیں۔

شوکت نے اب تک تو صرف نوابی محل کی باتیں ہی باتیں سنی تھیں اور شاید یہ باتیں ہی باتیں رہتیں اگر للا شیام ناتھ نے نواب رفیع الشان اور ان کے چچازاد بھائی نواب افسر الدولہ میں اس حد تک صلح نہ کرا دی ہوتی کہ شوکت کا

اپنے چچا سے میل جول قائم ہو جائے۔ ہوا یہ کہ جب لالا شیام ناتھ نے مسلسل اشاروں اور کنایوں میں کہا کہ بچے بڑوں کے جھگڑے میں کیوں پڑیں تو آخر ایک دن نواب رفیع الشان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"یہ جاؤ بیٹا شوکت اپنے چچا کے گھر میں سمجھ گیا۔ تمہارے لالا جاچا کا مطلب! وہ زبان سے چاہے نہ کہیں، لیکن چاہتے یہی ہیں کہ اب میں علاقہ حاصل کرنے کا خیال چھوڑ دوں"۔

لالا شیام ناتھ نے نواب رفیع الشان کی مرضی پاکر شوکت کو اُن کے چچا نواب افسرالدولہ سے ملا دیا۔ نواب افسر بہت اچھی طرح ملے اور شوکت سے اصرار سے کہا کہ محل میں جاؤ اور اپنی چچا زاد بہن کی شادی میں شرکت کرو۔

شوکت نے سراپا اشتیاق ہو کر نوابی محل میں قدم رکھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملاقات ہو۔ ساتھ ساتھ کھٹک بھی تھی کہ کہیں مجھ سے کوئی بے تکی حرکت نہ سرزد ہو جائے۔

محل دارنی کی صدا کو کہیں دور پر محل کے اندر دہرایا گیا اور پھر آدھے منٹ کے بعد دہرانے والی نے جوابی صدا لگائی۔

"چھوٹے نواب صاحب بہادر کو عزت کے ساتھ لایا جائے۔"

محل دارنی "قدم رنجہ فرمائیں حضور۔"

محل دارنی نے ایک ہاتھ سے اپنے گوٹے کناری سے لدے ہوئے بھاری پائینچے سنبھالے اور دوسرے سے آنچل برابر کرتی ہوئی آگے آگے چلی پھاٹک کی اس ڈیوڑھی سے گزر کر جہاں پالکیاں رکھی جاتی تھیں ایک صحن سا ملا۔ اس کے بعد ایک اور ڈیوڑھی جو ایک اچھا خاصا مکان تھا جس کے اوپر

صحنچیاں تھیں۔ اور نیچے بڑے بڑے دالان۔ ایک طرف کے دالان میں مالنیں گجرے بنا رہی تھیں انھوں نے شوکت کو دیکھتے ہی کھڑے ہو کر تسلیمیں عرض کیں۔ دوسری طرف کے دالان میں چڑی مارن کالے بھجنگے لئے بیٹھی تھی۔ محل دارنی نے شوکت سے کہا۔

"حضور ایک لمحہ قیام فرمائیں۔ آج منگل کا دن ہے نا"۔

چڑی مارن نے جھک جھک کر شوکت کو تین سلام کئے۔ پھر اپنے ٹوکرے سے ایک کالا بھجنگا نکالا اور شوکت کے ماتھے سے چھلا کر چھوڑ دیا۔۔ بھجنگا ایک اڑان میں چھوٹے صحن سے آسمان کی طرف نکل گیا۔

چڑی مارن "سلامت رہیں حضور"۔

شوکت نے چڑی مارن کو انعام دیا اور محل دارنی کے ساتھ آگے چلا۔ محل دارنی نے جیسے ہی ڈیوڑھی پار کی اسے چھریرے بدن اور لمبے قد کی دو جوان خادمائیں، جن کو محل کی اصطلاح میں قلماقنیاں کہا جاتا تھا ملیں جو ٹیا بنی کی چوڑی گوٹ لگے ہوئے لہنگے پہنے تھیں اور ان پر راجپوتی وضع کے دوپٹے تھے، جن کا ایک کونا لہنگے میں اڑس لیا گیا تھا۔ اور دوسرے کونے سے کاتی باندھی گئی تھی۔ دونوں نے جھک جھک کر تسلیمیں عرض کیں اور پھر بلند آواز سے کہا۔

"اللہ رکھے چھوٹے نواب حضور تشریف لا رہے ہیں۔

دونوں بسم اللہ بسم اللہ کہتی کمر لچکاتی، ہشیار باش کی صدائیں لگاتی آگے آگے چلیں۔

راستے میں کچھ خادمائیں آتی جاتی ملیں۔ کچھ اِدھر اُدھر بیٹھی کام

کر رہی تھیں۔ ان میں سے جو بھی دیکھتی کہ شوکت کو اس عزت سے محل میں بلایا گیا ہے۔ تو وہ اگر بیٹھی ہوتی تو کھڑی ہو جاتی اور آتی جاتی ہوئی تو ٹھہر جاتی۔ پھر آداب اور مجرا بجا لاتی اور دعائیں دینے لگتی۔

"خدا سلامت رکھے چھوٹے نواب کو"

"خدا حضور کو پروان چڑھائے"

"دولت واقبال سلامت رہیں"۔

"جو آنے والی ہو مجھ ناچیز پہ آجائے اور یہ چاند کا ٹکڑا ہر بلا سے محفوظ رہے"

صحن بے حد بڑا تھا جس میں درخت لگے تھے اور بیچ میں بڑا سا حوض تھا جس کے بیچ میں فوارہ چھوٹ رہا تھا اور بطخیں تیر رہی تھیں۔ حوض کے ایک طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ یہاں ایک بڑا سا چوکا لگا ہوا تھا جس پر چاندنی بچھی تھی۔ مگر اس وقت ذرا ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے چوکے پر سے قالین اور گاؤ تکیے اٹھا لئے گئے تھے۔

صحن سے گزر کر چبوترہ ملا جس پر سیاہ اور سفید چوکور پتھروں کا فرش تھا اس سے گزر کر سات دروں کا لمبا چوڑا اور اونچا دالان ملا، جس میں لال اور ہرے مخمل کی چھت گیری لگی تھی جس کے چاروں طرف زردوزی کی بیل تھی اور جگہ جگہ اسی کام کے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ بیچ میں ایک سہ رنگا جھاڑ لٹک رہا تھا اور اس کے گرد رنگ برنگی ہانڈیاں تھیں۔

سات دروں والے دالان کے بیچ کے در میں ایک چھوٹا سا گنگا جمنی فوارہ نصب کیا گیا تھا جس کے نیچے ایک چھوٹا سا شیشے کا حوض تھا جس

میں ننھی ننھی لال لال مچھلیاں تیرتی نظر آ رہی تھیں اس فوارے سے نکلنے والی ہلکی پھوار میں کیوڑہ ملا ہوا تھا جس کی مہک بیگموں کے لباسوں میں لگے ہوئے عطروں کی خوشبوؤں میں اس طرح گھلی ملی جا رہی تھی جیسے کسی خوش گلو کے گانے کے ساتھ سارنگی کی آواز۔

فرش کے بیچ میں زربفت کے قالین پر نواب بیگم صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ بارہ کلیوں کا بہت بھاری مرصع پائجامہ پہنے اوپر تنگ شلوکا جو نیچے سے ذرا اوپر آکر ختم ہو گیا تھا اور پیٹ کی ذرا سی دھار دکھائی دے رہی تھی اس پر بادلے کا شربتی دوپٹہ تھا۔ وہ کلے میں گلوری دبائے معاملات کا فیصلہ کر رہی تھیں اور حکم دے رہی تھیں۔

نواب بیگم صاحبہ کا بدن کسی حد تک بھاری تھا مگر کھال ملائی کی طرح چکنی اور ملائم تھی اور رنگ دودھ اور انگوری شراب کے رنگوں کا مرکب تھا۔

بیگم صاحبہ کا حکم ہر طرف چل رہا تھا لیکن ان کے انداز سے اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ حکم چلا رہی ہیں۔

چوکے پر یہاں سے لے کر وہاں تک شادی کا سامان بکھرا ہوا تھا گنگا جمنی اور چاندی کے برتن کھنک رہے تھے۔ زیوروں کے سٹ چمک رہے تھے اور عطر دان مہک رہے تھے۔ لال، ہرے، گلابی ، نیلے، زعفرانی اور دھوپ چھاؤں والے غرضیکہ ہر رنگ کے رنگ برنگی جوڑے ہر طرف لگائے جا رہے تھے۔ محل کی لڑکیاں مغلانیوں کو ساتھ لئے تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں کسی طرف دوپٹہ پر کرن ٹانکی جا رہی تھی تو کسی طرف بارہ کلی کے پائجاموں

پر بانکڑی لگائی جا رہی تھی تو کسی ان کاموں کے سلسلے میں مشورے ہو رہے ہیں۔ سریلی آوازیں بلند ہو رہی ہیں فقرے چل رہے ہیں اور دبی دبی ہنسی ادھر ادھر مچل رہی ہے۔

"نیلے پر سنہرا گوٹا کیسا رہے گا۔ میرے خیال میں تو اچھا رہے گا۔"

"چل بھاگ۔ کیا کیا باتیں فرماتی ہو۔ نیلے آسمان پر نکلنے والا چاند روپہلا ہوتا ہے یا سنہرا؟"

"ارے یہ شیشیاں تو اس عطردان کی نہیں معلوم ہوتیں۔"

"اے میری بھولی بھالی بہنا۔ تم تو بڑی شیشیوں کو چھوٹے خانوں میں رکھ رہی ہو۔ سمجھیں کچھ؟"

"ارے اس کپڑے کی دھوپ چھاؤں تو ہلکی پڑ گئی۔"

"دیکھتی نہیں ہو کہ شام ہو رہی ہے۔ ایسے میں تو چھاؤں بڑھے گی نہیں تو اور کیا ہوگا۔"

"اے بہن۔ اس کشمیری چادر کو کسی تہہ سے موڑو کہ بیل پھول کھل جائیں۔"

شوکت جب دالان کے پاس پہونچا تو دونوں قلماقنیوں نے الگ الگ ٹکڑوں میں ایک ہی بات کہی۔

پہلی قلماقنی:۔ "جناب عالیہ نواب بیگم صاحبہ ملاحظہ ہو۔"

دوسری قلماقنی:۔ "چھوٹے نواب شوکت الشان بہادر تشریف لے آئے۔"

ایک دبلی پتلی چمکتی خادمہ لڑکی جو بہت بڑا پاندان کھولے

سبک ہاتھوں سے گلوریوں پر گلوریاں بنائے چلی جارہی تھی بولی۔

"ماشاء اللہ حضور کی عمر بہت بڑی ہے۔ جناب عالیہ نواب بیگم ابھی آپ کو پوچھ رہی تھیں"۔

بیگم صاحبہ نے نظر بھر کر شوکت کو دیکھا۔

"آؤ بیٹا نواب شوکت الشان آؤ۔ تمھارے آنے سے ہم سب کو بہت خوشی ہوئی اس کو اپنا ہی گھر سمجھو اور اب آتے رہنا۔ تمھارے دادا ہی کا محل ہے۔ کسی اور کا تھوڑی ہے"۔

بیگم صاحبہ کے محبت بھرے لہجے میں دکھلاوا ضرور تھا۔ لیکن اس میں تھوڑی بہت اصلیت کی جھلک بھی تھی۔ شوکت کو بیگم صاحبہ نے اپنے قالین پر بلاکر بٹھالیا۔ پھر اس کے سامنے دو خوان لاکر کھولے گئے۔ ایک میں زعفران کے شربت کا جگ اور گلاس اور کابل کے سردے کی قاشیں تھیں اور دوسرے میں کشمیری چائے اور کئی طرح کے حلوے۔ ایک میں ٹھنڈی چیزیں اور دوسرے میں گرم۔

شوکت نے شربت کا گلاس اٹھالیا۔

اتنے میں کسی نے سامنے سے آکر شرم و نزاکت سے جھک کر تسلیم کی۔

بیگم نے کہا۔ "یہ تم سے چھوٹی تمھاری بہن نواب عفت آرا ہیں۔ ان سے بڑی نواب عصمت آرا مانجھے میں ہیں جاکر ان کو سلام کر آنا۔ وہ تم سے چار سال بڑی ہیں۔

عفت آرا کا رنگ ملگجی، بدن سبک اور خال وخط بے حد نازک تھے وہ بار بار اپنے ڈوپٹہ کا آنچل سنبھال رہی تھی۔ اس موقع پر اس کے ہاتھ اور انگلیاں

اس طرح حرکت کرتے تھے گویا کوئی رقص کا مدرا ہو۔

"ارے شوکت تم کہاں !!"

یہ مظفر تھا۔ جو شوکت کا رشتے کا بھائی اور ہم سن تھا اور جس سے پتنگ بازی ہوا کرتی تھی۔ مظفر ذرا جوش سے کہنے لگا۔

"بھئی خوب آئے تم۔ بیت بازی میں ایک آدمی کم پڑ رہا تھا۔ حضور نواب چچی بیگم صاحبہ۔ ان کو لے جاؤں اپنے ساتھ ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں ان سے پردہ کون کرے گا ؟ جاؤ بیٹیا شوکت اپنے ہم سنوں میں جا کر کھیلو۔"

(۲)

شادی کے موقع پر جو ایک ہنسنے ہنسانے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے وہ ہر طرف چھائی تھی۔ تکلفات کے پردے کم زور ہو گئے تھے۔ اور دوستی کرنا اور کسی حد تک بے تکلف ہو جانا آسان ہو گیا تھا۔ شوکت جو بیت بازی میں شامل ہوا تو ذرا ہی دیر میں یہ محفل والوں میں کھپ گیا۔ اور ہر طرف سے لوگ پکارنے لگے۔ نواب شوکت۔ نواب شوکت بھائی۔ نواب شوکت چچا اور بھئی نواب شوکت۔ یہ بھی اسی طرح وہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کے نام لینے لگا۔

یہ بیت بازی دوپہر کے کھانا کھانے کے بعد سے چل رہی تھی ۔ اور برابر نئے ممبر آآکر شامل ہو رہے تھے ۔ ایک آدھ پرانے ممبر چلے بھی گئے تھے ۔ اس وقت دو نئے ممبر آئے ۔ ایک چھمن مرزا اور دوسرا شوکت قرعہ ڈال کر ایک کو ایک طرف اور دوسرے کو دوسری طرف شامل کر لیا گیا ۔

چھمن کو آدھی کے قریب خالق باری یاد تھی اور وہ بھی اس طرح کہ جس حرف کا شعر دینا ہوتا تھا اس حرف کا شعر ذرا ہی دیر میں اسے یاد آجاتا تھا ۔ اس کے آنے سے بیت بازی بہت تیزی سے آگے بڑھنے لگی ۔ اور کھٹا کھٹ شعر دیئے جانے لگے ۔ اس طرح سے جو بیت بازی چلی تو دو گھنٹوں میں دونوں طرف کا سرمایہ ختم کے قریب پہونچ گیا اور رفتار سست ہونے لگی ۔ پھر رات کے کھانے کے بعد جب یہ محفل جمی تو شوکت کی پارٹی کے دیوالیہ ہونے کے آثار نظر آنے لگے ۔ شوکت ابھی تک کوئی خاص کارنامہ نہیں دکھلا سکا تھا ۔ کیوں کہ اس کو اشعار تو کافی یاد تھے لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ کون شعر کس حرف سے شروع ہوتا ہے ۔ اس وجہ سے شعر دینے کے لئے اس کو اپنے سارے ذخیرے کو ٹٹولنا پڑتا تھا اور زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ وہ ٹٹولتا ہی رہ جاتا اور اس کی طرف کا کوئی لڑکا یا لڑکی شعر دے دیتا تھا ۔ لیکن جوں جوں بیت بازی کی رفتار دھیمی ہونے لگی ۔ شوکت کو موقع ملنے لگا کہ وہ اپنے ذخیرے میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی شعر دیدے ایک بجے رات کے قریب جب شادی کا شور و شغف محل میں مدھم پڑ گیا تھا اس وقت بیت بازی آکر ے پر رک گئی اور شوکت کی پارٹی مات کھانے لگی ۔ جب کافی دیر ہو گئی اور اس طرف سے شعر نہیں آیا تو گنتی گنی جانے لگی

جب معرکہ کی بیت بازی ہو تو گنتی کا وقت بڑا سنسنی خیز ہوتا ہے۔ چنانچہ
اس وقت شوکت کی پارٹی کے لوگوں بہت بے چین تھے اور چھمن کی پارٹی
کے لوگ بہت خوش۔ یہ گنتی جو سو پر ختم ہونے والی تھی جب اسی پر پہونچی تو
شوکت کی طرف کی ایک لڑکی بلبلا کر کہنے لگی۔

ہائے لوگوں کوئی شعر سوچو۔ ایسا شعر جو ی سے شروع ہوتا ہو۔

جیسے یارب 'یاد' یہاں......

یاد کا لفظ سن کر شوکت کو شعر یاد آگیا اور اس نے کہا۔

لیجئے شعر۔

اس وقت گنتی نوے پر آچکی تھی۔ اس لئے شوکت کے اس
اعلان سے دونوں طرف کے ممبر چونک پڑے۔

شوکت :۔ یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

شوکت کی پارٹی نے مسرت کے نعرے بلند کئے "وہ مارا!!"

چھمن نے کہا۔ بھئی نواب شوکت بھائی میں ایک بات ہے۔
وہ یہ کہ وہ جو شعر بھی دیتے ہیں وہ اعلا درجہ کا ہوتا ہے۔ وہ میری طرح
"خالق باری سرجن ہار" کے قسم کے اشعار دے کر طبیعت مکدر نہیں کرتے۔

مرزا چھمن کے آخری فقرہ پر قہقہہ پڑ گیا۔ بیت بازی پھر چل
نکلی لیکن آدھ ہی گھنٹے بعد پھر دال پر رک گئی۔ پھر وہی ایک طرف گھٹن
اور اس طرف مسرت کا عالم چھاگیا۔ گنتی ستر پر آئی تھی کہ اسی لڑکی نادرہ
نے بلبلا کر کہا۔ اللہ نواب شوکت بھائی۔ پھر کوئی کرامت دکھلائیے "۔

شوکت :- دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ میرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

اس شعر پر دونوں طرف سے واہ وا ہونے لگی ۔ اور پھر بیت بازی چل نکلی ۔ تین ہی چار شعروں کا تبادلہ ہوا تھا کہ پھر شوکت کی پارٹی مات کھانے لگی اور پھر گنتی گنی جانے لگی جب اسی پار کرکے نوے پر گنتی آنے لگی تو پھر نادرہ نے تڑپ کر کہا ۔

اللہ نواب شوکت بھائی ایک شعر اور ......

اس کا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ شوکت نے شعر پڑھا ۔

ایک کی آنکھوں میں آنسو ایک کی نیچی نظر
دونوں کے بیچ میں یہ نامہ و پیغام تھا

اس شعر پر اتنی واہ وا ہوئی کہ بیت بازی میں مشاعرہ کا سماں بندھ گیا ۔ چمن نے اس پر فرمائش کی کہ نواب شوکت بھائی ، یہ پوری غزل اگر یاد ہو تو سنا دیجئے ۔ اس فرمائش پر ہر طرف سے ہاں ہاں ہونے لگی ۔

شوکت تو چوک کے پاس ہی رہتا تھا ، جہاں سے ہر وقت گانے اور ریاض کرنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں ۔ ان کو سنتے سنتے اور کھیل ہی کھیل میں ادا کرتے کرتے شوکت کا گلا کافی پکا ہو گیا تھا ۔ لیکن اس وقت اس نے گانے کے بجائے یہ غزل معمولی ترنم سے سنا دی ۔ کچھ بیت بازی کا پس منظر اور کچھ پہلے شعر کا اثر جو ابھی ذہنوں میں گونج رہا تھا اور ان سب پر ڈھلتی ہوئی رات کی چھاپ اور پھر شوکت کی لچکیلی اور پاٹ دار آواز ۔ اس پر ترنم جو

ہلکا تھا، پر تھا فن کا مارا۔ ان سب نے مل کر شوکت کی غزل خوانی میں عجیب سحر پیدا کر دیا۔ لوگ جھوم جھوم گئے۔ مرزا محمود نے جو چمن کا بڑا بھائی تھا اٹھ کر اچانک شوکت کی پیشانی کا بوسہ لے لیا — یہ اظہار ستائش لڑکیوں کو پسند نہیں آیا۔ پھر تو لیا محمود کو سب نے آڑے ہاتھوں۔

"مرزا محمود بھائی کو تعریف کرنا تو خوب آتی ہے۔"

"ہاں کیسی پھرتی سے اٹھے اور منزل مقصود تک پہونچ گئے۔"

"چال کو تو دیکھو۔ کیسی بے ساختہ تھی۔"

"ہاں آمد ہی آمد تھی ذرا جو آورد ہو۔"

اور واپس بھی اسی طرح آئے۔ سنا ہے ٹینس میں یوں ہی ہوتا ہے۔

"اسی کو کہتے ہیں طوفان کی طرح جانا اور آندھی کی طرح آنا۔"

اس پہ دبی دبی ہنسی ہونے لگی، ان باتوں سے کچھ دیر کے لئے بیت بازی رک گئی۔

مرزا محمود کا یہ حال کہ معلوم ہوتا تھا کہ کانٹوں کے بستر پہ بیٹھا ہے ایک منٹ میں نہ جانے کتنی مرتبہ نشست بدلی، پان کھایا، رومال سے منھ پونچھا۔ کھنکھارا۔ اگالدان استعمال کیا اور جانے کتنی مرتبہ کہا۔

"ہاں بھئی کسے خ دینا ہے۔"

"خ دونا۔"

"یہ خاموشی کیسی۔"

"یا خ دو یا مات مانو۔"

آخر کسی نے بیت بازی کا خ دے دیا اور وہ چلنے لگی۔ لیکن پھر

دس پندرہ ہی منٹ کے بعد شوکت کی پارٹی پڑ آکر رک گئی اور پھر گنتی گنی جانے لگی۔

محمود لڑکیوں کی باتوں سے کچھ تپا ہوا تھا۔ اس نے اچھل کر کہا کہ اگر نادرہ نواب شوکت سے اسی طرح کہیں جیسے پہلے کہا تھا تو نواب صاحب کو پھٹ سے شعر یاد آجائے۔

یہ سن کر نادرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

جیسے ہی وہ چوکے سے نیچے اترنے لگی ایک خادمہ نے اپنی ڈیوٹی انجام دی اور لپک کر اس کا پمپ شو اس کے پاؤں کے نیچے سیدھا کر کے رکھ دیا۔ لیکن نادرہ غم اور غصے سے اتنی الجھی ہوئی تھی کہ جوتوں میں اس کا پاؤں پہلی اور دوسری کوشش میں بھی سیدھا نہیں گیا۔ تیسری کوشش میں وہ جوتا پہن سکی اور پھر آنسو پونچھتی ہوئی تیز رفتاری سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی چلی گئی۔ تب تو ایسا سناٹا چھایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ محفل میں کوئی ہے ہی نہیں یہاں تک دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک ٹک، جو جب سے محفل جمنا شروع ہوئی تھی کسی نے ابھی تک نہیں سنی تھی، صاف سننے میں آنے لگی۔ کہیں کسی گملے میں ایک جھینگر بول رہا تھا اس کی آواز بھی صاف سنائی دینے لگی۔

ایسے میں مظفر کی غصہ میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد"

محمود نے بھی تیزی سے جواب دیا۔ آپ کون ہوتے ہیں نصیحت کرنے والے۔

یہ کہہ کر مرزا محمود نے اپنے اڑے ہوئے چہرے پر اطمینان لانے
کی کوشش کی اور گاؤ تکیہ سے اس طرح ٹیک لگا کر بیٹھ گئے گویا جو اس وقت
ہو رہا ہے سب لغو باتیں ہیں اور قطعی قابلِ توجہ نہیں۔ محمود اور مظفر میں عزیز داری
ضرور تھی لیکن دونوں کی تربیت بالکل الگ الگ ماحول میں ہوئی تھی
دونوں بہت دور کے رشتے سے نواب افسر الدولہ کے عزیز ہوتے تھے لیکن
مرزا محمود کے والد گریجویٹ تھے اور قانون پاس کرکے پہلے انھوں نے لکھنؤ
میں وکالت شروع کی تھی لیکن دو سال کے بعد ہی بمبئی میں جا کر بس گئے تھے
وہاں ان کی وکالت خوب چل رہی تھی انھوں نے اپنے سب لڑکوں کو مرزا
محمود سمیت کانونٹ میں تعلیم دلائی تھی اس پس منظر اور تعلیم کو دیکھتے ہوئے مرزا
محمود نے اپنے نزدیک کوئی بڑی غلطی نہیں کی تھی۔

مرزا مظفر کے باپ ٹھیکے دار تھے اور لکھنؤ ہی میں کاروبار کرتے تھے۔
انگریزوں تک ان کی رسائی تھی اس وجہ سے ٹھیکے خوب مل جاتے تھے انھوں
نے پیسہ خوب کما لیا تھا لیکن اپنی طرزِ رہائش میں کوئی خاص تبدیلی
نہیں کی تھی۔ پتنگ بازی اور بٹیر بازی سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ مظفر
کو بھی اسی طرح کی تربیت ملی تھی۔

نادرہ کے جاتے ہی محل کی لڑکیاں ایک ایک کر کے اٹھنے لگیں،

"اے دیکھو جوہری ہار لے کر آیا تھا وہ میں نے ابھی تک حضور
اماں جان کو نہیں دکھایا ہے ذرا جا کر دکھا دوں۔"

"ارے لو میں نے ابھی تک مغلانی کو یہ نہیں بتایا کہ کارچوب کے

پاجامے پر کون سا ڈوپٹہ لگایا جائے گا۔

"مجھے بھی ایک کام یاد آگیا ہے"

"میں بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں"

"بٹیا بیگم میں بھی چلوں نہ آپ کے ساتھ"

خادمائیں دوڑ دوڑ کر جوتیاں سیدھی کرنے لگیں لیکن لڑکیاں محفل سے جانے کے لئے ایسی جلدی میں تھیں کہ اگر جوتی سیدھی نہ ہوتی تو اس کا بھی انتظار نہ کرتیں اور خود ہی پاؤں گھما کر اس میں ڈال کر چل دیتیں۔

محل کی لڑکیوں کے جانے کے بعد لڑکے بھی جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگے سب سے پہلے مظفر اٹھا۔

"بھئی میں تو چلا"۔

دوسری طرف سے آواز آئی "میں بھی چلتا ہوں تمھارے ساتھ"

محفل میں ویرانی سی چھا گئی۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی ایسی محفل میں کوئی نہ کوئی بزرگ ضرور موجود رہتا تھا۔ اس وقت استانی جی تھیں جو الگ بیٹھی ذلی کتر رہی تھیں انھوں نے پکارا۔ اور تنبیہ کرنے والی آواز سے کہا۔

"بٹیا مرزا محمود بھتوں میں بیٹھ کر ایسی باتیں نہیں کرتے ہیں"۔

لڑکیاں دو دو چار چار کرکے اٹھ کر برابر جا رہی تھیں اور شوکت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں اٹھ کر چلا جاؤں یا بیٹھا رہوں۔ اتنے میں بھاری جوڑوں کے سرسرانے کی آواز آئی اور نواب بیگم صاحبہ اپنی تین خواصوں کے ساتھ شمامۃ العنبر کی خوشبو کے ہالے میں تیز رفتاری سے چلتی اور ہانپتی

ہوئی آگئیں۔ آکر ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں — جو خواص ان کے بارہ کلی کے پائجامے کے پائینچے سنبھالے تھی اس نے پائینچے ان کے قدموں پر ڈال دیے اور خود پیچھے ادب سے کھڑی ہوگئی۔ دو خواصیں جن میں ایک کے ہاتھ میں خاصدان تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں صندوقچے ادھر ادھر کھڑی ہوگئیں۔

نواب بیگم نے جب ان کی سانس قابو میں آگئی۔ لڑکوں کی طرف دیکھ کر ذرا کڑوے مگر بزرگانہ لہجے میں کہا۔

"بچو، ہنسو، کھیلو، یہی دن ہیں ہنسنے کھیلنے کے اور شادی بیاہ کے موقع پر تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ لیکن منہ سے جو بات نکالو وہ گری ہوئی نہ ہو۔ میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ ایسی بات کس کی زبان سے نکلی ہے۔ لیکن جس کی زبان سے بھی نکلی بہت برا ہوا اب رات بھی آگئی ہے اس لئے محفل برخواست کردو"

بیگم نے گھوم کر ایک خواص کی طرف دیکھا جو خاصدان لئے ہوئے تھی اس نے فوراً خاصدان کھول کر نواب بیگم صاحبہ کی طرف بڑھا دیا — خاصدان میں پھولوں کے گجرے کے بیچ میں چھ گلوریاں اور قوام کی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ بیگم نے دو گلوریاں لیں، قوام کی شیشی سے ایک سینک بھر قوام لیا اور پھر اٹھ کر واپس لوٹ گئیں۔

(۳۳)

دوسرے دن شام کو جب شوکت اس جگہ پہونچا۔ جہاں محفل جمی تھی تو وہاں کچھ نہ پایا صرف استانی جی۔ بیٹھی ڈلی کتر رہی تھیں شوکت نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے آج سناٹا ہے۔

نواب بہادر بٹیا ہنسی مذاق، کھیل کود، شعروشاعری ان

سب میں مزا اسی وقت تک ہے جب تک بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ اور برابر والوں کی مروت رہے۔ نہیں تو شریفوں کی صحبت اور رذیلوں کی بیٹھک میں فرق کیا رہ جائے گا۔ کل جو بات ہو گئی تھی وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ اب آج سب لڑکے سنا ہے مردانے میں ہیں۔ اور لڑکیاں شادی کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔

مردانے میں نہ تو لڑکوں کی صحبت کسی طرف بھی نظر آئی اور نہ بڑوں کی۔ بڑے لوگ ادھر ادھر دو دو چار چار فرش پر یا کرسیوں پر بے ترتیبی سے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ فرش کے ایک الگ حصے پر دس بارہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں غل مچا رہے تھے اور کود پھاند کر رہے تھے۔ شوکت بچوں کو دیکھ رہا تھا کہ دو صاحب ٹہلتے ہوئے ادھر آئے ایک تو بوڑھے سے تھے جن کے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی اور شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اور دوسرے جوان تھے جو اعلا درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔

سوٹ پوش نے ایک لڑکی کو جو بہت پھدک رہی تھی فریدہ کہہ کر پکارا ــــ وہ قریب آ گئی۔

"خان بہادر صاحب کو سلام کرو۔"

"آپ کے بچوں میں یہ سب سے بڑی ہے"

"یہ تو بڑی اچھی بچی معلوم ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے اسے ایک پیسے کی جگہ دو پیسے دے کر خریدا ہے۔ اور اس کے کپڑے بھی بہت اچھے ہیں کیوں فریدہ، میں یہ کپڑے لے لوں؟"

لڑکی شرارت بھری آواز سے بولی۔ "پھر تو میں ایک ہی پیسے کی رہ جاؤں گی۔"

خان بہادر کا اس بات پر ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ انھوں نے اسی وقت پانچ روپے کا نوٹ نکال کر فریدہ کو دیا۔

"لے بیٹی یہ انعام لے۔ کیا بات کہہ دی ہے تو نے۔ کس باپ کی بیٹی ہو آخر۔"

یہ تینوں شخصیتیں شوکت کو یاد رہ گئیں۔

دوسرے دن شام کو نواب بیگم صاحبہ نے گھرانے کے لڑکے اور لڑکیوں کو اسی جگہ بلایا جہاں صحبت جمتی تھی اور کہا "ہنسو کھیلو، شادی بیاہ کے موقع اسی لئے ہوتے ہیں۔"

آج کی صحبت میں نہ مرزا محمود تھا اور نہ ان کا بھائی چھمن مگر کسی نے نہ تو ان کے بارے میں پوچھا اور نہ ان کا تذکرہ آیا۔ مگر محفل ویسی ہی جم گئی جیسے پہلے جمتی تھی۔

آج چادر چھپول کا کھیل ہوا۔ عفت آرا اور مظفر کپتان چنے گئے دونوں کپتانوں نے اپنے اپنے آدمی چن لئے ـــــ دالان کے بیچ میں پردہ لگا دیا گیا ـــــ کپتان پردے کے اِدھر اُدھر کھڑے ہوگئے ـــــ ایک کپتان نے پکارا "شیر آؤ" کوئی دبے پاؤں آکر پردے کے پیچھے بیٹھ گیا ـــــ دوسرے کپتان نے آواز دی "ماہی گیر آؤ" پردے کے دوسری طرف کوئی آکر بیٹھ گیا اب پہلے کپتان نے ماہی گیر سے پوچھا کہ تبلاؤ "پردے کے اس پار کون ہے" نام رکھنے میں کسی نہ کسی طرح کی اس سے مناسبت جس کا نام رکھا جائے ضرور ہوتی تھی ـــــ ماہی گیر نے بہت سوچا کہ شیر کون ہوسکتا ہے لیکن سمجھ میں نہ آیا اس طرح دوسرا کپتان بازی ہار گیا۔

جب شوکت کی باری آئی تو اس سے کہا گیا کہ بوجھو پردے کے اس پار کون ہے۔ پردے کے اس پار جو آیا تھا اس کو چاندنی کہہ کر پکارا گیا تھا۔ شوکت سوچنے لگا کہ "اس پار چاندنی ہے ــــ چاندنی کون ہو سکتی ہے؟ چاندنی چاندنی ۔۔۔۔۔۔ اچانک شوکت نے زور سے کہا۔

"نادرہ ــــ"

اور سچ مچ وہ تھی نادرہ ہی ــــ شوکت اسے جیت کر اپنی طرف لے آیا۔ اس دن مرزا محمود نے جو شوکت اور نادرہ کو ایک کڑی میں پرو دیا تھا تو اس کا شوکت کے دل پر بھی کچھ اثر ہوا تھا۔ اور اس کے دماغ میں یہ جملہ مسلسل گونج رہا تھا کہ نادرہ مجھ سے کس جوش سے کہتی تھی کہ "شعر دیکھئے نواب شوکت بھائی۔ اللہ سوچئے تو"۔

اس یاد کو دل میں رکھ کر جب وہ چاندنی کو جیت لایا تو بہت خوش ہوا۔ محل کی لڑکیاں نادرہ کی بولی کی ہنسی اڑاتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ نادرہ بول چال میں کبھی کبھی فارسی اضافت بول جاتی تھی اور ایسے الفاظ بھی بول جاتی تھی جو محل کی بول چال میں متروک تھے ــــ جیسے واللہ۔ نشانِ راہ۔ میدانِ عمل، نظرِ ثانی، صدائے بے ہنگام، رنگِ شفق وغیرہ۔ فارسی اضافت تو وہ چیز تھی جسے بیگماتی زبان برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ جہاں محل کی کسی لڑکی کی زبان پر فارسی اضافت آئی وہاں استانی جی نے ٹوکا۔ "ارے توبہ بی بی۔ تم تو مردوؤں کی بولی میں بات کرنے لگیں"۔

نادرہ کو جو محل کی لڑکیوں نے فارسی اضافت والے الفاظ بے دھڑک استعمال کرتے سنا تو طرح طرح سے اس کی ہنسی اڑانے لگیں ــــ ایک مرتبہ

نادرہ نے کسی کے فقرہ کے جواب میں کہا۔ "میں تو بس آپ کے نقش قدم پہ چلتی ہوں" جواب اچھا تھا، کیوں کہ جس غلطی پہ نادرہ پر فقرہ کسا گیا تھا وہی غلطی فقرہ کسنے والی بھی کر چکی تھی۔ لیکن محل کی لڑکیوں سے یہ فارسی اضافت اور یہ نامانوس ترکیب برداشت نہ ہوئیں۔ ایک لڑکی نے طنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ دوسری لڑکی سے جو دور دروازے کے پاس کھڑی تھی پکار کر کہا۔

اے بہنا ——— زرا اغلاق ابواب کردو

اس پر محل کی سب لڑکیاں منھ پھیر کر دبی آواز سے ہنس پڑیں۔

نواب افسرالدولہ کے ایک دوست تھے مرزا کامران ——— جنھوں نے اینگلوانڈین لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس دن اتفاق سے مرزا کامران کی بارہ تیرہ سال کی لڑکی روزی بھی آئی تھی ——— جو چوکے کے برابر بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر شوکت کے برابر بیٹھی تھی ——— اس کا رنگ تھا تو بہت گورا ——— مگر اس پر ہندستانی خون کا نمک بھی تھا ——— محل کی لڑکیاں عرض کے پیجامے اور ڈھیلے کرتے پہنتی تھیں ——— اور سیدھے بال بناتی تھیں ——— کانوں میں بالیاں اور ناک میں ہلکی نتھ ہوتی تھی ——— لیکن روزی تنگ پیجامہ، اس پر فراک پہنے تھی ——— لمبا دوپٹہ تھا، ناک میں کچھ نہ تھا، کانوں میں بندے تھے اور بال الٹے بنے تھے ——— شوکت کو وہ سب لڑکیوں سے زیادہ دل کش اور خوبصورت معلوم ہو رہی تھی ——— وہ کانونٹ میں پڑھتی تھی، اس وجہ سے لہجہ میں میم پن تھا۔ روزی نے جو اغلاق ابواب والا جملہ سنا تو غصہ میں کھڑی ہوگئی، اور ادھر ادھر دیکھنے لگی، جب کسی نے اس سے ہمدردی نہیں دکھائی تو اٹھ کر تیر کی طرح چلی گئی ———

شوکت کو اس طرح نادرہ کی ہنسی اڑایا جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔
اس لئے اس نے جو روزی کو اس طرح اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا تو سمجھا کہ اسے بھی
یہی بات ناگوار ہوئی اور اسی پر چلی گئی ۔۔۔ شوکت کے دل میں روزی کے ایسے
خاموش احتجاج پر اس کے لئے ایک عزت پیدا ہو گئی ۔۔۔ اس نے دل میں کہا
کہ دیکھو یہ مغربی تہذیب والے جانتے ہیں کہ آداب محفل کیا چیز ہوتے ہیں ۔۔۔
اس کا بھی دل چاہا کہ میں بھی ایسے فقرے پر ناراضگی دکھلاؤں اور روزی کی
طرح چل دوں ۔۔۔ لیکن دو وجہوں سے وہ ایسا نہ کر سکا ۔ ایک بات تو یہ
ہوئی کہ شوکت سوچنے لگا کہ اگر میں اس طرح نادرہ کے لئے خفا ہو کر چلا گیا ۔ تو
کہیں میری یہ بات بھی اسی نظر سے نہ دیکھی جائے جس طرح مرزا محمود کی حرکت
دیکھی گئی تھی ۔۔۔ دوسری بات یہ تھی کہ محل کی لڑکیوں نے جس طرح ہنسی
اڑائی تھی اس میں کچھ ایسی لطافت اور نزاکت تھی کہ شوکت اس سے متاثر ہوئے
بغیر نہ رہ سکا ۔۔۔ وہ شرارت سے چمکتی ہوئی آنکھیں وہ شوخی سے کھنکتی ہوئی
آوازیں اور وہ ہاتھوں سے آنچل کو سامنے لا کر ہنسنا ۔۔۔ غرض کہ شوکت نادرہ
کا طرفدار تھا لیکن اس کے مخالفوں کی طرف جھکنے سے بھی اپنے کو نہ بچا سکا ۔۔۔
محل کی لڑکیاں نادرہ کی صرف بولی ہی کی ہنسی نہیں اڑاتی تھیں بلکہ
اس کی چال پر بھی ہنستی تھیں ۔۔۔ نادرہ جب چلتی تھی تو ہلکی سی چاپ پیدا
ہوتی تھی ۔۔۔ اس وجہ سے جب وہ آتی تو چاپ سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ
آ رہی ہے ۔۔۔ اس چاپ پر محل کی لڑکیاں جن کے پاؤں سلیپر سمیت اس
طرح زمین پر پڑتے تھے جیسے درخت سے پتے گر رہے ہوں ، وہ مسکراتی تھیں اور
ایک دوسرے کی طرف آنکھوں سے اشارے کرتی تھیں ۔

ایک مرتبہ نادرہ تیز آئی اس وجہ سے چاپ زرا زور زور سے نکلی پھر
تو محل کی لڑکیاں یوں ایک دوسرے سے کہنے لگیں ۔

"تم تو مجھے دھرتی دھمک معلوم ہوتی ہو ۔"

میری نظر میں تم تو دھرتی کھسک ہو ۔

نہیں ــــ زرا اور ہلکی ــــ دھرتی مسک کہو ۔"

"ہاں ٹھیک ہے ۔ دھرتی بس زرا مسک جاتی ہے باقی خیریت"

"دھرتی چمک کیوں نہ کہو دیکھتی نہیں ہو کہ اس سے سر میں چمک پیدا
ہو جاتی ہے ۔ شوکت کو ایسی باتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور لطف بھی ۔

(۴)

نوابی محل ایک اچھی خاصی بھول بھلیاں تھا ــــ دو نئی ڈیوڑھیاں
بھی دو مکانوں کے برابر تھیں ۔ ان میں برآمدے اور کمرے اور ان کے اوپر صحنچیاں
بنی ہوئی تھیں ــــ ڈیوڑھیوں سے نکل کر بہت وسیع صحن اور فوارے والا
صحن جس کے تین طرف بڑے بڑے دالان ان کے پیچھے کمرے، اغل بغل صحنچیاں اور
ان کے اوپر دو چھتیاں تھیں ــــ ان میں سے دو کی پشت پر اپنے صحن الگ
تھے ۔ بڑے صحن کے چوتھی طرف نوکروں کے لئے کمرے، برآمدے اور کوٹھریاں

تھیں اور ان کے بیچ میں باورچی خانہ تھا جو بجائے خود دالان، کمروں، کوٹھریوں اور صحن والا ایک مکان تھا ـــــ مکان کی دوسری منزل پر بھی اسی طرح کی عمارت تھی ـــــ ان سب رہائشی جگہوں کو ملانے والے زینے تھے، راہداریاں تھیں، گیلریاں اور کھڑکیاں تھیں ـــــ سب مل ملا کر محل ایک ایسی جگہ بن گیا تھا کہ ایک ناواقف لڑکی وہاں راستہ بھول سکتی تھی ـــــ

محل کی آبادی ایک اچھے خاصے محلے کی آبادی کے برابر تھی۔ وہاں کے مستقل باشندوں میں نواب اور بیگم کے قریب اور دور کے عزیز اور ان کے لڑکے لڑکیاں بہوئیں اور داماد تھے ـــــ پھر ان سب کے نوکر خادمائیں اور خادماؤں کے لڑکے لڑکیاں مائیں اور دادیاں تھیں ـــــ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بلا کسی خاص سلسلے کے رہ پڑے تھے اور رہتے رہتے وہ بھی اس بڑے خاندان کا جز بن گئے تھے ـــــ ان سب بسنے والوں کے پالتو جانور بھی تھے بکریاں، مرغیاں، بلیاں، کبوتر، توتے، مینائیں، گلہریاں، بطخیں اور نیولے کے بچے ـــــ

محل کا مردانہ حصہ بھی ایسا ہی وسیع تھا ـــــ بہت بڑی بارہ دری ـــــ اس کے پیچھے کمرے، صحنچیاں، دونوں طرف وسیع برآمدے، بغل میں چھ کمروں اور برآمدے والا وسیع مہمان خانہ، کافی دور ہٹ کر چمن کے پیچھے درختوں سے چھپا ہوا چھوٹے مکانوں کا ایک سلسلہ، جن میں اصطبل بھی تھا، موٹر خانہ بھی تھا، ہاتھی خانہ بھی تھا، اور چڑیا گھر بھی تھا، جن میں پرانے نواب صاحب کے وقت میں مرغ اور کبوتر وغیرہ رکھے جاتے تھے ـــــ مگر اب خالی رہتا تھا۔ اسی طرف منشیوں، اہل کاروں اور نوکروں کی رہائش گاہیں بھی تھیں ـــــ

مردانے کی مستقل آبادی بھی کافی تھی ــــــ

محل میں جو سودے والیاں آجاتی تھیں وہ پہلی ڈیوڑھی میں دکان لگا کر ایک طرف بیٹھ جاتی تھیں ــــــ کیوں کہ ان کو محل کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی ــــــ لیکن اس جگہ بیٹھ کر بھی وہ اپنا سودا اسی طرح بیچ لیتی تھیں جیسے ادھر ادھر محلے کی دکانوں میں بکتا ہے ــــــ گھنٹوں تک گاہکوں کا سلسلہ لگا رہتا تھا ــ

سودے والیوں ہی کی طرح ٹونے ٹوٹکے اتارنے والیاں اور نظر گزر جھاڑنے والیاں بھی آتی تھیں ــــــ سیانوں اور عالموں کی ایجنٹ بھی آتی تھیں. کوئی زعفران سے لکھی ہوئی پلیٹیں لے کر آرہی ہیں' تو کوئی سفید مرغ کے خون سے لکھا ہوا نقش ــــــ ان سے تمام بلائیں بھاگ جاتی ہیں اور اقبال قائم رہتا ہے ــــــ بوڑھی جھنیں لمبے لمبے کرتے پہنے' گلے میں خاک شفا سے بنی ہوئی تسبیحیں ڈالے' آیا کرتی تھی. ان میں سے کوئی بھوت پریت بھگاتی تھی تو کوئی بی بی کا روضہ لاتی تھی اور مور کے پیروں سے بنے ہوئے مور چھلوں کو ہلا ہلا کر روضہ پر سے غلاف اتار کر اس کی زیارت کراتی تھیں ــــــ

مردانے میں ریچھ والے. بندر والے. سپیرے. اختوں بختوں کا تماشہ دکھانے والے. اور جادو سے سب کچھ غائب کر کے پھر واپس لے آنے والے' یہ سب لوگ برابر آتے رہتے تھے اور ان کے تماشے بھی ہوتے رہتے تھے اور ان کو بھی انعام و اکرام ملتے رہتے تھے ــــــ

شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے آج کل مہمانوں کی ایک فوج آئی ہوئی تھی ــــــ اور ان کے ٹھہرنے کے لئے مردانے اور زنان خانے کے

سب کمرے کوٹھے اور صحنچیاں کھلوادی گئی تھیں ـــــ ان میں جو الم غلم سامان بھرا تھا ان کو تہہ خانوں میں منتقل کردیا گیا تھا ـــــ شادی سے دو دن پہلے محل کے اندر اور باہر کا گوشہ گوشہ آباد ہوگیا تھا ـــــ ہر طرف لوگ آتے جاتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے تھے۔

نواب افسرالدولہ کے خاص دیوان خانے اور شہ نشین کو چھوڑ کر ابھی تک محل میں اور کسی جگہ بجلی نہیں لگی تھی اس وجہ سے رات کو مردانے اور زنانے صحنوں اور بڑے دالانوں میں تو گیس کے ہنڈے جلتے تھے، باقی اور جگہوں کے لئے لیمپ، دیوارگیریاں اور لالٹینیں تیار کرکے لگادی جاتی تھیں ـــــ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ یا ان کی دونوں صاحبزادیوں کی نظروں سے جو چیز جتنی دور ہوتی تھی اتنا ہی اس میں بددیانتی اور بے سلیقہ پن اور لاپرواہی ہوتی تھی ـــــ کسی لیمپ میں تیل کم ڈالا گیا۔ یا چرا لیا گیا اس وجہ سے وہ نو بجے سے گل ہوا جارہا ہے، تو کسی دیوارگیری کی بتی نہیں کاٹی گئی ہے اور وہ لو دے رہی ہے' یا کسی لالٹین کی چمنی اپنی جگہ پر بیٹھی نہیں ہے' اس وجہ سے وہ برابر بھڑک رہی ہے ـــــ کسی لالٹین کی چمنی ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے وہ دھواں دے رہی ہے ـــــ اور دو چار لالٹینیں ایسی بھی تھیں جن کی چمنی ٹوٹ گئی تھیں یا کوئی لے گیا تھا اور ان کی جگہ کوئی دوسری چمنی لگائی نہیں گئی تھی' وہ مٹی کے تیل کے دیے کی طرح ذرا دیر دھواں دے کر جلتی رہتیں اور پھر بھڑک بھڑک کر بجھ جاتیں۔ اور اندھیرا ہوجاتا ـــــ

لیکن پھر بھی مہمان ناراض نہیں تھے ـــــ سب ہی جانتے ہیں کہ شادی

بیاہ میں ایسی بے انتظامیاں ہو ہی جاتی ہیں ۔

جس دن بارات آنے والی تھی اسی دن گہما گہمی اور شور و ہنگامہ انتہا کو پہونچ گیا تھا، اور محل کے سب ضابطے ٹوٹ گئے تھے ـــ جو ان لڑکے اور مرد ادھر ادھر کی زنینوں اور راہداریوں اور دروازوں سے محل کے اندر آجاتے تھے، اور اپنی عزیز عورتوں سے باتیں کر لیتے تھے ـــ نوکر بھی اندر سامان لے کر آتے تو بے دھڑک دوسری ڈیوڑھی پار کر لیتے تھے ـــ محل دارنی اور اس کے ساتھ کی دونوں سپاہی نما خادمائیں یا قلماقنیاں اس نرغے کے سامنے بے بس تھیں، وہ برابر بیگم صاحب سے شکایت کرتی تھیں کہ باہر کے چوکیدار نکما پن کر رہے ہیں اور بلا روک ٹوک سب کو آنے دیتے ہیں ـــ بیگم صاحبہ جب چوکیداروں کو حکم بھجواتیں تھیں تو چوکیدار اپنی جگہ پر نہ ملتے تھے اور جب چوکیدار آجاتے تھے تو حکم لانے والا کسی اور حکم کی تعمیل کو جا چکا ہوتا ۔

ایسے میں ایک چھوکری شوکت کو جو مردانے میں تھا، ڈھونڈتی ہوئی آئی، اور کہنے لگی ـــ

"آپ کو سب لڑکیاں اور لڑکے اندر بلا رہے ہیں ۔ بائیں باغ کی طرف والے کمرے میں سب اکٹھا ہیں ۔"

شوکت اندر گیا تو دیکھا کہ سب کسی بے حد اہم مسئلے پر سوچ رہے ہیں اور بحث بے حد سنجیدگی سے کر رہے ہیں ـــ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی زبردست معرکہ درپیش ہے ـــ

شوکت کو دیکھتے ہی محل کی ایک لڑکی نے کہا ۔

"نواب شوکت بھائی ہم لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک سنہرا

خاص الخاص ہم لوگوں کی طرف سے دلہن کو بھی طور سے نکاح سے پہلے سنا دیا جائے
کیونکہ نکاح کے بعد وہ نرغہ ہوگا۔ کہ ہم لوگوں کو مناسب موقع نہ مل سکے گا۔
کیا آپ اس تجویز سے اتفاق کرتے ہیں

شوکت نے یہ تجویز بسر و چشم مان لی۔

پھر اس لڑکی نے کہا کہ یہاں تک تو بالکل خیریت ہے۔ لیکن آگے چلو تو کئی زبردست مرحلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات کو کہ نکاح سے پہلے سہرا گایا جائے۔ محل کے ضابطوں کی رکھوالیاں شرم و لحاظ کے قانون کی خلاف ورزی قرار دے کہ سہرا گانے سے ہم کو روک دیں۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ جب سہرا گانے کا قصد ہو اس موقع پر چند ہوشیار لڑکیاں کوئی بہت زبردست مسئلہ بیگم صاحبہ کے پاس لے کر چلی جائیں اور معاملے کو اتنا طول دیں کہ باقی لوگ سہرا گا کر ختم کر دیں۔"

اگر فوراً ہی اس قصور پر نصیحت اور خفگی شروع ہو جائے تو سہرے کے گانے سے جو لطف آیا ہے اس کو آپس میں تقسیم کرنے کا کام ڈیڑھ گھنٹے کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ پھر سب اس جگہ اکٹھا ہو کر اس لطف کا حصہ بانٹ کر لیں۔

یہ پروگرام بھی بالاتفاق منظور کر لیا گیا۔ اب اور الجھن سامنے آگئی ایک تو یہ کہ وہ دو چار لڑکیاں کون ہوں جو ایسی قربانی کریں کہ جب سہرا گایا جانے والا ہو تو وہ آپس کا جھگڑا چکانے چلی جائیں —— دوسرے یہ کہ وہ جھگڑا کیا ہو جس کے طے ہونے میں کم سے کم آدھ گھنٹہ لگ جائے —— تیسرے یہ کہ لڑکے چاہتے تھے کہ وہ بھی ان کاموں میں شریک ہوں۔ لیکن آج لڑکوں کو نیچے آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔

عفت آرا نے کہا — "نواب شوکت بھائی! آپ کو ان ننھی منی سی الجھنوں کے لئے تھوڑی ہی بلایا گیا ہے؟ آپ کو تو ایک پربت جیسی بھاری چیز ہٹانے کے لئے بلایا گیا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ کہ سندر یا سہرا۔ نگریا سہرا یا نجریا سہرا کے ساتھ مچھریا سہرا آسکتا ہے یا نہیں"۔

"آپ نے میں کیا رکاوٹ ہے؟"

"بہت بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔ وہ یہ کہ اس سے ہتک عزت بھی ہو سکتی ہے اور حق تلفی بھی —"

"یہ کیسے؟"

بات کھلی تو شوکت کو معلوم ہوا کہ عفت آرا کا خیال ہے کہ اگر مچھریا کا قافیہ نہ لایا گیا تو دلہن کی حق تلفی ہو گی —— وہ یوں کہ اودھی میں مچھریا مچھلی کو کہتے ہیں اور دلہن واقعی مچھلی کی طرح بے زبان ہے۔ ایسی بے زبان ہے کہ اگر کبھی آگے چل کر اسے شوہر پر بہت غصہ بھی آگیا تب بھی وہ اتنا بھی نہ کہے گی کہ "تم بڑے وہ ہو"۔ لیکن نادرہ کا خیال ہے کہ مچھریا ہوئی مچھر کی مادہ اگر دلہن مچھر کی مادہ ہوئی تو دلہا یقینی مچھر قرار پائے گا۔ یہ بات بری ہو گی۔"

"کیوں بری ہو گی؟"

"میں بتاؤں گی نہیں —— بس سمجھ جائیے —"

چلئے میں بتاتی ہوں دیکھئے (سرگوشی کے انداز میں) دونوں یعنی دولھا بھائی اور مچھر یہ سمجھیں گے کہ ان کی ہجو ملیح ہو رہی ہے۔ دولھا بھائی کہیں گے کہ

میرا ماشاءاللہ سے ذرا اچھا بدن ہے تو یہ لوگ نظر لگا رہے تھیں اور مجھ سے کہہ گا کر تو دیکھو مجھے کس سے تشبیہ دے رہے ہیں

ان سب فقروں پر مسکراہٹیں اور دبی ہنسی چلتی رہی۔

ایک لڑکی نے مصنوعی غصہ میں کہا۔

"دیکھو تم لوگ میرے دولہا بھائی کو چھیڑ چھیڑ کہہ کر ان پر نظر لگا رہی ہو۔ کیسی بری بات ہے۔ ابھی کل ہی تو ان کی اماں جان حضور فرما رہی تھیں (ان کی نقل کرتے ہوئے) ہے ہے میرے لاڈلے کو دانا نہیں لگ رہا ہے۔ دیکھو بچارا دبلا ہوتا چلا جا رہا ہے"۔

"اے تو ذرا سی نظر لگ جائے گی تو ان کے لئے تو یہ اچھا ہی ہوگا۔ پھر تو وہ بڑے اچھے نکل آئیں گے، کیوں نہ؟

"دیکھو بہن معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری نظریں مچل رہی ہیں ان کو لگنے کے لئے۔

بحث ابھی جاری ہی تھی کہ نیچے سے دو لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔

بڑا پیارا موقع ہے۔ نواب بیگم صاحبہ اور سب بزرگ جوڑوں کے رکھوانے میں ایسے لگے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں —— چلو ایسے میں سہرا گا دیا جائے۔

"مگر ابھی سہرے کی نہ تو لے بنی ہے اور نہ ساتھ گانے کی مشق ہوئی ہے ——"

دلہن کا پھوپھی زاد بھائی موجود تھا، جو نہ صرف لڑکیوں کے ساتھ

گڑیاں کھیلتا تھا بلکہ گڑیوں کے جوڑے بھی سیتا تھا ان کے بیاہ پر ڈھولک کے گیت بھی گاتا تھا اور کبھی کبھی ناچتا بھی تھا ـــــ اس نے یہ سنتے ہی ڈھولک اٹھائی اور چار پانچ لڑکیوں کو بٹھا کر سہرا گانا شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر میں لڑکیاں تالی پر چلنے لگیں اور لے بن گئی۔

لڑکیاں نیچے جب آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ میدان تو واقعی خالی ہے کیوں کہ نواب بیگم صاحبہ اور دوسری بیگمات سب دوسری طرف ہیں لیکن صدر دالان صحن کے پاس کی صحنچی میں دلہن مانجھے بیٹھی تھی، شمشاد میراسن نے گانا اور ناچنا شروع کر دیا ہے ـــــ اس کی آواز کوئل کی ایسی تھی تو ناچ تڑپتی مچھلی کی طرح۔ یوں ہی اس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی اور جب ناچنے کھڑی ہو جاتی تو فراٹے بھرتا ہوا پتنگ معلوم ہوتی ـــــ نواب بیگم صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ یہ ہے تو موئی میراسن لیکن اس کے سامنے تو ڈومنیاں بھی مات ہیں۔" آنکھیں وہ چلاتی، بھوؤں کو وہ گردش دیتی، گردن میں لہر وہ لاتی اور ان سب کاموں میں وہ پھرتی وہ چلبلاپن کہ محل کی بیگموں کو اس کے رقص میں طوائفوں اور ڈومنیوں کے رقص سے زیادہ مزا آتا ـــــ

شمشاد نواب بیگم اور دوسری بیگموں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر نوجوان عورتوں کی فرمائش پر اس وقت وہ گانا گا رہی تھی جن کو شوخیاں کہتے ہیں اور جن کو شادی بیاہ کے موقعوں پر گایا جاتا ہے لیکن کنواری لڑکیوں کو ان کے سننے کی اجازت نہیں ہوتی ـــــ اس وقت شمشاد یہ شعر گا رہی تھی۔

دولہا بھائی آ رہے ہیں لکھنؤ سے شام کو
باجی آج آپا بن کچھ چپکی سی گھبرائی ہوئی

وہ گا بھی رہی تھی۔ ناچ بھی رہی تھی اور بتا بھی رہی تھی ـــــ کبھی بتلاتی کہ دولھا بھائی کس طرح گبرو جوان بنے، مونچھوں پر تاؤ دیتے، گھوڑا اڑائے چلتے رہے ہیں ـــ کبھی یہ کہ آپا کیسی چپ چپ، گھبرائی ہوئی مسکراتی ہوئی شرمائی ہوئی پھر رہی ہیں اور کبھی یہ کہ باجی یعنی اماں کس طرح مسکرا مسکرا کر اپنی چھوٹی بہن کی زبانی سے یہ بات سن رہی ہیں۔ ناچ میں تانے اور نقلیں اتارنے میں شمشاد فرش پر دس گز کے اندر اڑی اڑی پھر رہی تھی۔ کبھی تو گڑیا کی طرح سمٹ جاتی، تو کبھی غرور بھری مینا کی طرح پھدکنے لگتی، اور کبھی بھوکے شکرے کی طرح جھپٹ پڑتی ـــ اس کی شوخیاں اور چلت پھرت پر محفل لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔

محفل کی عورتوں کے بے انتہا انہماک سے فائدہ اٹھا کر لڑکے بھی جو ابھی اوپر سے آئے تھے، ایک گوشہ میں کیواڑوں کی آڑ لے کر کھڑے ہوئے اور اس نرالے رقص اور نقل کو حیرت سے دیکھنے لگے ـــ لڑکیوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون سا پانسہ پھینکیں جو یہ صحبت یا تو برخاست ہو جائے یا کسی اور جگہ منتقل ہو جائے تاکہ ان کے لئے میدان خالی ہو جائے وہ اس جگہ اپنی محفل جما سکیں۔

زنانے دیوان خانے میں ایک اہم مسئلہ زیر بحث تھا ـــ وہ یہ کہ دولھا ہاتھی پر آئے یا موٹر پر ـــ لڑکے والے ہاتھی پر اصرار کر رہے تھے لیکن لڑکی والے موٹر کے لئے بضد تھے ـــ لڑکی کے باپ نواب افسر الدولہ نے نواب بیگم صاحبہ سے کہلا دیا تھا کہ کمشنر صاحب اور دوسرے انگریز بہادر صاحبان بھی آئیں گے۔ ایسے میں دولھا کا موٹر پر ہی آنا مناسب رہے گا ـــ افسر الدولہ پرانے نوابوں میں نہ تھے ـــ وہ علی گڑھ کالج میں پڑھ چکے تھے اور کئی انگریزوں اور سرکاری افسروں سے دوستی تھی اور ان کو شکار بھی کھلوا چکے تھے ـــ جب وہ اپنی بیگم کو لے کر نینی تال جاتے تھے تو لاٹ صاحب سے ملانے ان کو بے پردہ لے جاتے

تھے اور ایک مرتبہ تو لاٹ صاحب کی بھری پارٹی میں بھی بے پردہ لے گئے تھے اور سب کے سامنے لاٹ صاحب سے اپنی بیوی کا ہاتھ ملوایا تھا۔

نواب افسرالدولہ کی بیٹیوں کو جہاں استانیاں گلستاں بوستاں وغیرہ پڑھاتی تھیں اور سلائی اور کڑھائی سکھاتی تھیں وہاں ایک میم صاحبہ بھی انگریزی کا بولنا اور کیک بنانا سکھانے آتی تھیں ـــــ نواب صاحب کی برابر یہی کوشش رہتی تھی کہ ان کا شمار ماڈرن لوگوں میں کیا جائے ـــــ اس وجہ سے ان کا اصرار تھا کہ ان کا ہونے والا داماد جو کہ خوش قسمتی سے اچھے خاندان کا ہونے کے ساتھ ساتھ ایل۔ ایل۔ بی بھی تھا بجائے جامے کے شیروانی میں اور بجائے ہاتھی کے موٹر پر آئے۔

جب لڑکی والوں نے موٹر کی تجویز پیش کی تو لڑکے کی دادی نے کہلوایا کہ کچھ یاد ہے کہ "دارا شکوہ صرف اس وجہ سے جنگ میں ہار گیا تھا کہ وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا"۔ نواب بیگم صاحبہ نے جواب میں کہلوایا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے ـــــ اب تو وہ شہزادہ میدان ہارے گا جو موٹر سے اتر کر ہاتھی پر بیٹھے گا ـــــ یہ جواب دے کر لڑکی والے سمجھے تھے کہ انھوں نے لڑکے والوں کا منھ بند کر دیا اور پالا مار لیا ـــــ لیکن اس وقت اس جواب کا جواب آیا اور اسے لے کر دولہا کی طرار دودھ شریک بہن ہلالی بانو آئیں ـــــ بارہ کلیوں کا بھاری پائجامہ اس پر تنگ، شلوکا اور چکن کا دوپٹہ بھاری نتھ موٹے موٹے سونے کے کنگن پہنے ہوئے فینس سے اتریں۔ جھک جھک کر سلام کرتی، نواب کے خاندان والوں کو دعائیں دیتی، حوض، باغیچے، آرائش اور محل کی ہر ہر چیز کی خوبصورتی کی تعریفوں پر تعریفیں کرتی ہوئی آ کر بیٹھیں ـــــ دو چار باتوں

کے بعد بیگم صاحبہ کی نوابی شان اور خراخت پر دو شعر سنا دے پھر مطلب پر آمیئں ـ

اے نواب بیگم صاحبہ ـ آپ کا اقبال اجلال اور سہاگ سلامت رہے ـــ اقبال اور شان ہمیشہ چڑھتے سورج رہیں ـــ دروازے پر ہاتھی جس طرح آج جھومتے ہیں اس طرح ہمیشہ جھومیں اور ان کی تعداد بڑھتی چلی جائے ـــ جو شان ہاتھی میں ہے وہ بھلا موٹر میں کہاں ـــ بڑی کتاب میں ہاتھی کا نام آیا ہے ـ اور "الفیل" کی سورت اتری ـ سبحان اللہ کیا کہنا اس کا !! یہ موا موٹر اس کو تو فرنگی لے کر آئے ہیں ـــ اس میں کل پرزے ہوتے ہیں اور تیل جلتا ہے اور اونچائی میں زمین سے دو گز بھی تو نہیں ہوتا ـ"

ہلال بانو سانس لے کر پان کی دو گلوریاں نوش کر کے پھر یوں گویا ہوئیں "مگر ایک بات ہے حضور نواب بیگم صاحبہ ـ موٹر میں بھی ایک خوبی بنی ہے جو بہت پائے کی ہے ـــ اے ہاں میں تو جو کہتی ہوں خدا لگتی کہتی ہوں ـ چاہے کسی کو برا ہی کیوں نہ لگے ـ وہ خوبی یہ ہے کہ موٹر ہاتھی کیا عربی گھوڑوں سے بھی تیز چلتا ہے ـ بلکہ یوں کہو کہ وہ ہوا سے باتیں کرتا ہے اگر بھاگم بھاگ کا موقع ہو تو اس سے اچھی کوئی سواری نہیں ـ البتہ کسی کو اڑن کھٹولا مل جائے تو بات دوسری ہے!

ہلال بانو اتنا کہہ کر مسکرائیں ـــ اور رومال سے اپنا منہ پونچھنے لگیں ـ

عفت آرا نے ساتھ والی لڑکی کے چٹکی لے کر کہا

"اب لگائے گی یہ ہوا میں گرہ"

ہلال بانو نے اپنے سیدھے ہاتھ کا کنگن کلائی کے اوپر کھسکایا اور پھر ہاتھ چلا کر کہنے لگی ـ

"لیکن حضور عالیہ اگر مجھ سے کوئی گستاخی ہو تو معاف کی

جائے۔ برات میں بھاگم بھاگ کی کہاں گنجائش تھی؟۔ برات تو ایسی چیز ہے جو مزے مزے چلتی ہے۔ اس میں اسی کا مزہ ہے۔ تماشائی دو رویہ کھڑے ہو کر برات کو دیکھتے ہیں اور براتی تماشائیوں کو دیکھتے چلتے ہیں ـــ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو برات میں مزا کیا ـــ تماشائیوں نے اگر برات کو نہ دیکھا تو سمجھ لیجئے کہ برات نہیں نکلی بلکہ جنگل میں مور ناچا۔"

"اور حضور بیگم صاحبہ مزے مزے چلنے کے لئے تو ہاتھی ہی موزوں ہے جو جھومتا ہوا چلتا ہے۔

"کیا کہنا اس سواری کا۔" اس میں راجاؤں کا راج ہے ـــ سپہ سالاروں کی دھاگ ہے اور شاہوں کی شان ہے۔ جب سونے چاندی کا گنگا جمنی ہودا کسا جاتا ہے، اس وقت بیٹھو تو معلوم ہوتا ہے کہ گلفام کا بالاخانہ چل رہا ہے ـــ بیٹھنے والا سب سے بالاتر رہتا ہے اسپ پر شہ بھی بیٹھے اور شہ بالا بھی، تو وہ شان ہو کہ فرشتے رشک کھائیں اور حوریں ہل ہل جائیں۔ اور سب کہیں ـــ

شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلا تیرا

ہلال بانو کا میٹھا لہجہ ہاتھوں اور ابروؤں کی حرکت اور اس پر یہ زبان اور یہ طرز ادا بیگمات سمجھ گئیں کہ اس پری کو شیشے میں اتارنا آسان نہیں ـــ

لڑکیوں نے جو قینچی کی طرح چلنے والی یہ زبان دیکھی تو آپس میں کہنے لگیں "چلو یہ آتش بازی صاحبہ ٹال سال کا دام اتنا لیا تو دو تین گھنٹے سے پہلے ٹلنے والی نہیں اور ان کی وجہ سے سب بزرگ خواتین بھی الجھی رہیں

گئیں اس لئے اس طرف سے تو بالکل اطمینان رکھو لیکن موئی فتنی شمشاد کو کیسے ٹالا جائے۔

اتنے میں محل داری کے تحت کام کرنے والی خادمہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔

" جناب علیا' بیگم بہرام مرزا صاحبہ تشریف لا رہی ہیں' ان کے ساتھ نینس میں مسز کامران بھی ہیں۔ دونوں استقبال کی منتظر ہیں۔"

نواب بیگم نے کہا عفت آرا سے کہو کہ تام جھام اور چھپر لے کر جاؤ اور استقبال کر کے لے آؤ۔ میری طرف سے مناسب الفاظ میں معذرت کر دینا۔

اس محل میں تام جھام اور چھپر کی ساخت اور استعمال میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ تام جھام اب صرف ایک آرام کرسی جو مخملی گدوں سے آراستہ تھی' رہ گئی تھی ـــــ اس میں ڈنڈے لگے ہوئے تھے جن کو تھام کر دو مضبوط کہاریاں اٹھا لیتی تھیں۔ زربفت کے بڑے چھپر کی جگہ اب ایک چھپر کھٹ ہوتا تھا' جس پر ریشمی غلاف اور جھالر لگا دی جاتی تھی ـــ یہ چیزیں یا تو ان بوڑھی ضعیف اور بیمار مہمان خواتین کے لئے استعمال ہوتی تھیں' جو محل کے بڑے صحن کو چل کر پار نہیں کر سکتی تھیں۔ یا پھر ان بیگمات کے لئے جو چلنے پھرنے کی ذرا بھی عادی نہیں تھیں۔ یا چل کر صحن پار کرنے کو خلاف شان سمجھتی تھیں۔ خود نواب بیگم تام جھام کو اسی وقت استعمال کرتی تھیں جب ان کی طبیعت اچھی نہ ہو ـــــ لیکن بیگم بہرام مرزا کی بات دوسری تھی ـــــ وہ استعمال کریں یا نہ کریں ان کے لئے تام جھام اور چھپر کا جانا ضروری تھا ـــ ورنہ وہ یہ سمجھ سکتی تھیں کہ ان کا استقبال ان کی شان کے مطابق نہیں کیا گیا ـــــ

بیگم بہرام مرزا نواب بیگم کی سگی بڑی بہن تھیں ــــ ان کی شادی ایک چھوٹے زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی ــــ وہ جب بھی آتیں سادے مگر سلیقے کے کپڑوں میں آتیں اور ساتھ صرف ایک معمولی سی خادمہ ہوتی ــــ لیکن ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے استقبال اور ادب و احترام کی سب شرطیں پوری کی جائیں ــــ وہ جب آکر بیٹھتیں تو بہت ٹھسّے سے اور لے دے کر بیٹھتیں، اور اپنی شان کے خلاف ذرا سی بات بھی برداشت نہ کرتیں۔

نواب بیگم کے حکم کے مطابق محل کی لڑکیاں ان کو آتار نے گئیں

عفت آرا نے آگے بڑھ کر جھک کر تسلیم عرض کی اور بہت ادب سے کہا۔

اچھی خالا اماں حضور۔ خوب ہوا جو آپ آگئیں۔ اس وقت زنانے دیوان خانے میں بڑا معرکہ درپیش ہے۔ لڑنے والے، باجی کی ہونے والی سسرال کے لوگ ہیں۔ انھوں نے عجب چال چلی ہے جس سے مات کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے کہا یہ ہے کہ "طلسم ہوش ربا کے حجرہ ہائے بلا سے نکال کر ایک خوبصورت بلا بھیج دی ہے جو ایک طرف تو ملکہ تاریک شکل کرشن کی طرح کسی بے ہوشی کی دوا کا شکار نہیں ہو سکتی ہے اور دوسری طرف صورت میں ملکۂ بہار ہے اور سیرت میں الف لیلہ والی بولتی چڑیا بھی، اچھلتا پانی بھی اور گاتا درخت بھی۔ بس یہ سمجھ لو کہ برات نہیں آئی وہ آگئی۔ ابھی تک تو وہی حضور اماں بیگم پر چھائے چلی جا رہی ہے۔ اب ذرا آپ چل کر اس موئی کی کاٹ کیجئے۔ اماں حضور نے کہا ہے کہ فوراً آجایئے۔ آپ کے بغیر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی"۔

عفت آرا کا لہجہ، طرز گفتگو اور ہاتھوں کی حرکتیں کچھ ایسی تھیں کہ سماں چھا گیا ایسا لگتا تھا کہ گویا میدان جنگ میں ہار ہونے ہی والی تھی کہ خدا

نے بیگم بہرام مرزا کو بھیج دیا اور اب تو جیت یقینی ہے بس ان کے جانے کی کسر ہے۔

بطرز گفتگو اور یہ زبان سن کر بیگم بہرام مرزا نے عفت آرا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ماشاءاللہ کیسی پیاری سی بیٹی ہے تو یہ گنگا جمنا سے دھلی ہوئی اور کوثر سے پاک کی ہوئی زبان یہ شہد سے زیادہ میٹھا لہجہ اور یہ تہذیب۔ اللہم زد فزد۔

مسز کامران جو پیچھے کھڑی تھیں انھوں نے کہا۔

"ہوں"

اس ننھی منی سی ہوں میں کچھ ایسی جلن اور کڑھن تھی کہ بیگم بہرام مرزا کھٹک گئیں۔

"کیا بات ہے بہن۔ لڑکیوں سے کوئی شکایت کی بات سرزد ہو گئی ہو تو ضرور بتاؤ۔ اس بہانے اپنی لڑکیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ یہ لڑکیاں میری بھتیجیاں ہیں۔ ان سے مجھے بھلا کیا شکایت ہوگی۔ جاؤ روزی ان میں جا کر کھیلو۔"

روزی نے تلملا کر کہا۔

"ان لوگوں میں؟ میں تو کچھ ہو جائے ان کے ساتھ کبھی نہ کھیلوں گی۔"

"کیوں بیٹی۔ کیا ان لوگوں سے لڑائی ہو گئی۔"

"تبلا دو ممی ہم سب کے سامنے؟"

"بیٹھو تم جاؤ۔ میں ذرا اس معاملہ کی تحقیقات کروں گی۔"

کہاریاں تمام حجام لئے اور خواص جو چھتر لئے کھڑی تھی۔ بیگم بہرام

مرزا نے ان کو بھی رخصت کر دیا۔ اور خود مسز کامران اور روزی کو لے کر صحن کے درختوں کے سایے میں حوض کے کنارے پڑے ہوئے سنگ مرمر کے چوکے پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ بیگم کے کپڑے تو سادے تھے لیکن ان کے پاؤں میں سونے کی کام والی پشاوری گرگابی تھی جو ابھی لکھنؤ میں کسی دوکان پر بکتی نہیں تھی۔ صرف پشاور سے آنے والے تحفے کے طور پر پیش کیا کرتے تھے یا پھر کابل سے آنے والے اور سود کا کاروبار کرنے والے منگولیے لاتے تھے جو بہت ہی مہنگے داموں میں بیچتے تھے۔

"ہاں بیٹی کیا بات ہے؟"

بیگم بہرام مرزا کو محل کے چھوٹے موٹے مقدمے طے کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ان کو یہ جتانے کا موقع مل جاتا تھا کہ وہ نواب بیگم کی بڑی بہن ہیں اور اس رشتہ سے محل پر ان کا بھی حق ہے۔

ادھر بہرام مرزا نے عدالت جمائی اور ادھر محل کی لڑکیوں نے صدر دالان میں جا کر شمشاد کو پکار کر کہا۔

"کچھ خبر ہے کہ حضور بیگم بہرام مرزا صاحبہ ادھر تشریف لا رہی ہیں ــــ"

ان کا نام تو لاحول تھا شمشاد کے لئے۔ وہ سارا گانا ناچنا بھول گئی۔ محفل میں بھی بدمزگی پھیل گئی اور لوگ پہلو بدلنے لگے ــــ اور اٹھنے کے ارادے کرنے لگے۔

اتنے میں عفت آرا آ گئی اور اس نے عورتوں سے کہا۔

بغل کے دالان کے پیچھے کا ہال بالکل خالی پڑا ہے آپ لوگ وہاں

جا کر کیوں نہ محفل جمالیں۔ وہاں بیگم بہرام مرزا جانے سے رہیں۔

"ہاں ہاں چلو۔ ادھر ہی چلو"

ذرا دیر میں صدر دالان خالی ہوگیا اب لڑکیاں وہاں اکٹھا ہوگئیں

اور اس بات کا انتظار کرنے لگیں کہ بیگم بہرام مرزا دیوان خانے کی طرف جائیں

تو پھر یہاں کا کام شروع ہو۔

بیگم بہرام مرزا نے خواص کو نواب بیگم کے پاس بھیج کر کہلوا دیا کہ

"میں ابھی آتی ہوں"۔ اور روزی سے اصرار سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے آخر

بیگم کامران نے کہا۔

"بتاؤ نا روزی"۔

روزی۔ "محل کی لڑکیوں میں ذرا بھی ایٹی کیٹ نہیں ہے۔ جب

مجھے دیکھتی ہیں تو آپس میں کھسر پھسر کرنے لگتی ہیں ــــ ابھی پرسوں میں ان

لوگوں میں جا کر ذرا سا دیر کے لئے بیٹھ گئی تھی۔ بس مجھے دیکھتے ہی آپس میں

کھسر پسر کرنے لگیں۔ پھر ایک نے پکار کر کہا" یہ غلط بابا ہے" یہ کہہ کر وہ اور

اس کے ساتھ سب مل کر کھل کھل کرنے لگیں۔ "ڈیم فول"۔

بیگم بہرام مرزا "لڑکیوں نے ایسا کیا تو بہت برا کیا میں ان کی اچھی خبر

لوں گی۔ لیکن یہ "غلط بابا" کیا ہوتا ہے؟"

بیگم کامران نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

غلط بابا۔ یعنی غلط بچہ۔

"ہماری لڑکیاں اور ایسی زبان بولیں!! ــ یہ بات تو سمجھ میں

آسکتی ہے کہ لڑکیاں نادانی سے کسی کے ساتھ نامناسب برتاؤ کر گزریں لیکن

یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی ہے کہ وہ اور ایسی زبان بولیں۔"
روزی۔" انھوں نے کہا تھا۔ بالکل یہی کہا تھا۔ لیکن بہت اٹھلا کر کہا تھا" غولط بوایا۔"

روزی نے بے حد جل کر مٹک کر آخر والے دونوں لفظ کہے۔
"میں لڑکیوں سے ضرور پوچھوں گی۔ یہ بھی پوچھوں گی کہ یہ حرکت کیا تھی اور یہ بھی کہ تم زبان کون سی بولنے لگی ہو۔"

ادھر بیگم بہرام مرزا کامران اور روزی کو لے کر زنانے دیوان خانے کی طرف گئیں۔ ادھر ادھر صدر دالان میں لڑکیوں کا پرا جم گیا اور ڈھولک پر تھاپ پڑی اور تالی پتالیاں بجنے لگیں۔ پھر عفت نے آواز اٹھائی اور سعید نے آواز ملائی اور سہرا گایا جانے لگا۔" جب پھیریا سہرا" آیا تو لڑکیوں نے ایک دوبارہ یہ بھی گا دیا۔

"مچھر آیا تیرا"

وزن کی کمی بیشی کو تالیوں میں دبا دیا گیا۔

ادھر سہرا گایا جا رہا تھا اور ادھر مانجھے والے کمرے میں متعین مامائیں، اصیلیں اور خادمائیں سب ہنسی سے بےدم ہوئی جا رہی تھیں۔ محل کی تہذیب اس بات کی اجازت تو نہ دیتی تھی کہ وہ اونچی آواز میں ہنسیں اس لئے وہ دوپٹوں کے آنچل منھ میں ٹھونس رہی تھیں اور ٹھیں ٹھیں کرتی ہوئی بدن کو طرح طرح سے بل دے رہی تھیں۔
دلہن جو ایک خوبصورت اور مہکتی ہوئی گٹھری بنی چھپر کھٹ پر پڑی تھی اس کا بھی ہنسی کے مارے عجیب حال تھا۔ مچھلی کی طرح مچل رہی تھی اور اس کے ہونٹوں سے لجائی ہوئی ہنسی کی آواز میں رس رہی تھی۔

لڑکیاں سہرا گا بھی رہی تھیں اور دو دو چار چار کر کے بھاگ بھاگ کر باغچے کے کمرے کے اندر جھانک بھی رہی تھیں جب وہ جھانک کر واپس آتی تھیں تو ان کی آواز میں ہنسی کی کھنک اور بڑھ جاتی تھی اس طرح پون گھنٹہ تک یہ سہرا چلتا رہا اور پھر دل کشی ہنسی اور مدھم قہقہوں میں ڈوب گیا۔

ادھر گانا ختم ہوا اور ادھر نواب بیگم کا پیام آیا کہ صدر دالان میں لڑکے کیوں ہیں۔ ان کے ہونے سے مہمان بیگموں کی بے پردگی ہو رہی ہے۔ اب شادی کے ختم تک لڑکے محل کے نچلے حصے میں نہ آئیں۔

سب لڑکوں کو سہرا گانے کے بعد کا مزا لئے بغیر رخصت ہو جانا پڑا۔

(۵)

اس دن رات کو شوکت مردانے سے آ رہا تھا اور ایک راہداری سے گزر کر زینے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جگہ اندھیرا تھا وہاں سے گزرنے لگا تو اسے ایک چاپ کی آواز سنائی دی۔

"چاندنی"۔

واقعہ یہ تھا کہ محل کی محفلوں میں شرکت اور اس میں کامیابی نے شوکت کی جھجک ختم کر دی تھی اور اس کی سماجی ہمت بہت بڑھا دی تھی، اس کی آواز میں اس وقت بڑی خود اعتمادی تھی۔

"کون؟ نواب شوکت بھائی؟"

"ہاں میں ہوں"۔

"نام تو میرا نادرہ ہے۔ چاندنی تو نہیں"۔

نادرہ جب زرا بھی مسکراتی تو عجب شگفتگی اس کے چہرہ پر آجاتی
کیوں کہ اس کی آنکھیں ہنسنے میں ہمیشہ ہونٹوں سے آگے نکل جاتی تھیں ۔
اور اس وقت تو شوکت کو اندھیرے میں نادرہ کا مسکراتا ہوا مکھڑا کچھ ایسا
چمکتا ہوا نظر آیا اور اس نے دل میں کہا ہو تو تم چاندنی ہی ۔"

"اگر یقین ہوتا کہ آپ ہی ہیں تو نادرہ صاحبہ کہہ کر پکارتا۔"
نادرہ نے محسوس کیا کہ شوکت نے چاندنی کا لفظ کسی مصلحت سے
استعمال کیا تھا۔

"سمجھ گئی۔ آپ نے اچھا کیا۔ شکریہ ۔"
دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں رخصت ہونا ابھی
نہیں چاہتے تھے ۔

"یہ بتلائیے کہ آپ کو یہاں کی سب باتیں اچھی لگیں ۔"
"اچھی تو لگیں ۔ کوئی خاص بات ؟"
"مجھے ایک بات زرا کھٹکی وہ یہ کہ محل کی لڑکیاں چاہتی ہیں کہ سب
لڑکیاں انھیں کی ایسی زبان بولیں ۔"

"ہاں (زرا گرم ہو کر) وہ تو میں کبھی ہی نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے جب
محل کی لڑکیاں کسی بات پر کھسر پھسر کر کے ہنس دیتی تھیں تو میں سوچنے لگتی تھی کہ یہ
کس بات کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے ۔ مجھے تو یہ سب باتیں اس وقت معلوم ہوئیں ۔
جب روزی نے شکایت کی کہ اسے " غلط بابا " کہا گیا اور پھر محل کی سب لڑکیوں
کی بیگم بہرام مرزا کے سامنے پیشی ہوئی اور پھر یہ کھلا کہ فقرہ دراصل میرے
اوپر کہا گیا تھا ۔ سنا ہے کہ اس پر نواب بیگم لڑکیوں پر ناراض ہوئیں اسی

پر عفت آرا نے سب کے ساتھ آکر مجھ سے معافی مانگی جب پورا قصہ معلوم ہوا تو مجھے بڑا غصہ آیا اور جی چاہا کہ ایک ایک کی خبر لے ڈالوں۔ لیکن پھر مجھے ایسا لگا کہ یہ سب لڑکیاں واقعی بہت ہی شرمندہ پھر میں ہنس پڑی تب تو عفت بہن نے مجھ سے دوپٹہ بدلا اور میری بہن بن گئیں ــــ"

"اور غلط بابا والی کا کیا ہوا یہ بھی آپ کو معلوم ہے ؟

بیگم بہرام مرزا نے مجھے بلا کر پوچھا تھا کہ واقعہ کیا ہوا تھا۔ میں نے اغلاق ابواب والی بات بتلا دی تھی" یہ کہہ کر نادرہ ہنسنے لگی۔

شوکت نے محسوس کیا کہ اس کی ہنسی میں جھیروں کی ایسی کھنک بھی ہے نادرہ ذرا گدبدے بدن کی تھی اور وہی بھرا بھرا پن اس کے بدن کی ہر لہر اور تبسم کی ہر جھلک میں تھا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رسیلا پھل ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب اور ذوق پر مشرق اور مغرب دونوں کی چھاپ تھی۔

نادرہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

نادرہ :" روزی بندی کو اب بھی یقین ہے کہ اسے غلط بابا کہا گیا تھا وہ بھی میرے پاس آئی تھیں اور یہ سمجھ کر آئی تھیں کہ چوں کہ مجھے بھی محل کی لڑکیوں نے بنایا ہے اس لئے ہم دونوں دکھی ہیں اور دونوں میں احساس یگانگت پیدا ہو جانا چاہیئے۔ مجھ سے کہنے لگیں کہ میں کیسے مانوں کہ محل میں سب بابا کے معنی الٹے سمجھتے ہیں یعنی یہاں بچے کے بجائے بوڑھے کو بابا کہتے ہیں اور کہنے لگیں بچپن سے آج تک لوگوں نے مجھے بابا کہا اور اب بھی لوگ میرے چھوٹے بھائی

اور بہوؤں کو بابا کہتے ہیں تو کیا محل کچھ دنیا سے الگ واقعہ ہے جو وہاں کی زبان اور ہوگی اور وہ زبان نہ ہوگی جو ملک بھر میں بولی جاتی ہے۔

شوکت کو روزی کی باتیں معلوم کرکے دل ہی دل میں بہت خفت ہوئی کیوں کہ اس نے تو روزی کے بارے میں بہت اونچی رائے قائم کی تھی۔

کیوں شوکت بھائی آپ نے کبھی سنا ہے بابا کے معنی بچہ؟

"نہیں"

مگر میں نے سنا ہے۔ میں کانونٹ میں پڑھ چکی ہوں نا وہاں سب لوگ بچے کو بابا کہتے ہیں لیکن کانونٹ کے باہر میں نے بھی اس لفظ کو اس معنی میں نہ اپنے خاندان میں سنا اور نہ قصبے میں کہیں اور سنا"

"آپ نے کانونٹ میں پڑھا ہے؟"

"کیوں؟"

"آپ کے لہجہ پر کچھ اثر نہیں"۔

میں روزی تھوڑی ہوں ابھی پار سال تک روزی اور میں دونوں ایک ہی کانونٹ میں تھے میں اس سے سینیر تھی وہ ڈے اسکالر تھی اور میں بورڈر تھی لیکن وہ روزی بن گئی اور میں نادرہ کی نادرہ رہی بات یہ ہے کہ مجھ پر میرے ابا جان کی تربیت کا بھی تو اثر ہے پار سال کچھ ایسا ہوا کہ اچانک ابا جان کے خیالات بدل گئے انھوں نے مجھے کانونٹ سے اٹھاکر خود پڑھانا شروع کر دیا۔ بہت دنوں سے پڑھا رہے ہیں اور اب تو اور چیزوں کے ساتھ اہسلام بھی پڑھاتے ہیں اور ان میں لکھی ہوئی باتوں کو دیر تک سمجھاتے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آزاد کی زبان بولو اور اسی

زبان میں سوچو۔

یہی میں کہتا تھا کہ آپ کی زبان محل والیوں کی زبان سے بلکہ ہم سب لوگوں کی زبان سے الگ ہے۔ مگر ایک بات بتائیے ہمارے لکھنؤ کی زبان میں کیا کوئی کسر ہے جو الہلال کی بھاری بوجھل زبان بولی جائے۔

نادرہ:۔ حسرت موہانی کا شمار بھی تو لکھنؤ کے شاعروں میں ہوتا ہے دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

جب ابا جان کے سامنے کوئی ایسی بات کہنا ہے جیسی آپ نے کہی ہے تو وہ یہ شعر پڑھ دیتے ہیں۔

کیف کچھ باقی ہے انے کوہ وصحرا میں نہیں

کیا ہے دوسرا مصرعہ؟ دیکھئے یاد نہیں آرہا ہے۔

کیف کچھ باقی ہے انے کوہ وصحرا میں نہیں
اہل گلشن کو شہید نغمۂ مستانہ کر

اتفاق سے شوکت کو اس نظم کے کئی شعر یاد تھے۔ اور وہ اس شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھنے ہی والا تھا لیکن اس نے بھانپ لیا کہ نادرہ نے عمداً اس شعر کا دوسرا مصرعہ "ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر" نہیں پڑھا۔

نادرہ بیگم آپ نے بہت اچھا شعر پڑھا۔

شکریہ۔ مگر آپ نے بیت بازی میں جتنے شعر دیئے سب آپ کے اونچے ذوق کی شہادت دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ آکر مجھے محسوس ہوا کہ حسن ذوق اور تہذیب قدیم کسے کہتے ہیں یاد رہے گی۔ یہاں کی

شادی کی محفلیں۔

"اب کہاں یہ صحبتیں اور کہاں (دبی آواز سے) آپ اور ہم"۔

مولانا آزاد کہتے ہیں کہ "ارض سما کی ان بیکران وسعتوں میں وہ شئے بھی جو بظاہر ناممکن ہو۔ امکان کا جامہ پہن کر رونما ہو سکتی ہے"

چند منٹ کی خاموشی کے بعد جب نادرہ رخصت ہونے لگی تو اس نے شوکت کو سلام کر کے آہستہ سے کہا ــــ

"آپ کا چاندنی پکارنا یاد رہے گا۔"

جب نادرہ چلی گئی تو شوکت کو راہداری قید خانہ معلوم ہونے لگی اور وہ بھاگ کر اس سے باہر نکل آیا۔

شوکت کے کانوں میں نادرہ کا آخری فقرہ مدتوں گونجتا رہا اور وہ سوچتا رہا کہ اس فقرہ کو سپاٹ لہجے میں کہا گیا تھا یا اس میں کچھ کسک بھی تھی ــــ

باب (۱۴)

صراط مستقیم

(۱)

آج رات بارات آنے والی تھی اس لئے مہمانوں پر مہمان چلے آ رہے تھے ــــ موٹریں گاڑیاں 'فینسیں' چوپہلے 'ڈولیاں' برابر آ رہی تھیں ــــ محل کے مردانے اور زنان خانے دونوں میں اب تو تل دھرنے کی جگہ نہ تھی ــــ

بچوں کے شور، نوکروں کی پکار، گھوڑوں کے ہنہنانے، کہاروں کی ہٹو بچو اور موٹروں کے ہارن سے محل کے بیرونی حصے گونج رہے تھے۔

گنجیفہ، تاش، چوسر، پچیسی اور شطرنج چل رہی تھیں۔ اس بڑے دیوان خانے کے دوسرے رخ پر مشہور گویا بسم اللہ خاں ہارمونیم اور طبلہ پر نیچی نیچی آواز میں اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ حقے، سگار، سگریٹ، پان اور ان کے ساتھ ساتھ لیمنیڈ اور جنجر کی بوتلیں بھی جن کا نوابی صحبتوں میں نیا نیا رواج ہوا تھا چل رہی تھیں۔ مذاق ہو رہا تھا اور قہقہے اڑ رہے تھے۔ دیوان خانہ کا ایک حصہ جو کوچوں اور میزوں سے سجایا گیا تھا اس میں نواب افسر الدولہ سوٹ پہنے ایک کوچ پر اپنے چند خاص خاص دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں خاں بہادر مشتاق احمد صاحب سگار پیتے ہوئے اندر آئے۔

افسر۔ آئیے خاں بہادر صاحب، میری آنکھیں دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔"

"نواب صاحب۔ یہ حقے کا تمباکو آپ نے کہاں سے منگوایا ہے اس تمباکو میں ذرا جو ملائمیت ہو۔

"تمباکو ہے تو خاص گھسیٹے کی دکان کا۔ میں تو وہیں سے منگواتا ہوں۔ اب تو وہ بھی اور دکانوں کی طرح مصنوعی مشک ڈال دیتا ہے۔"

چلئے اب گیا یہ بھی تمباکو ۔" بات یہ ہے کہ اصلی مشک ملتا ہے
سو روپیہ تولہ اور یہ مصنوعی ولایتی ملتا ہے دو روپیہ تولہ ۔"
"ویسے حقے سے میرا سگار اچھا۔"
"یہ بتلائیے کہ آج کا اخبار آپ نے دیکھا ۔"
"ہاں۔ لیکن کوئی خاص خبر تو نظر نہیں آئی ۔"
"آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ آپ شہر شہر امن سبھائیں بنائیں جائیں
گی تاکہ وہ آئے دن کی ہڑتالوں کا توڑ کر یں ۔"
"توڑ کر چکیں ۔ یہ امن سبھائیں کیا گاندھی ایسا لیڈر پیدا کر سکیں
گی جو لوگوں کے دلوں کو جیت سکیں ۔"
"امن سبھائیں ایسا لیڈر پیدا کر سکیں یا نہ کر سکیں ۔ لیکن لوگوں
کو ایسے لیڈروں کی عقل مندیاں تو دکھا ہی سکیں گی جو کہتے ہیں کہ ہڑتال کر دو'
اپنے اچھے خاصے کپڑے جلا کر خاک کر دو اور سرکاری نوکری چھوڑ دو ۔ بھلا
کوئی ان لیڈروں سے پوچھے کہ تمھاری ان حرکتوں سے سرکار کا کیا بگڑتا ہے
ایک آدمی سرکاری نوکری چھوڑ دے گا تو سرکار کو اس کی جگہ دس مل
جائیں گے ۔ اور اگر اسکول اور عدالت کا بائیکاٹ کر دگے ۔ گورنمنٹ کا
کیا نقصان ہوگا ؟ ان باتوں سے اگر کسی کو نقصان ہو سکتا ہے تو وہ ہیں
طالب علم اور غریب لوگ' بچارے جوان لیڈروں کے کہنے میں آ کر ہڑتال
کرتے ہیں ۔ ہڑتال کرنے سے دکانداروں کی بکری نہیں ہوتی ہے اور نوکریاں
چھوڑنے والے مارے مارے گھومتے ہیں' فاقے کرتے ہیں اور ان کے بال
بچوں کا برا حال ہو جاتا ہے ۔ یہ سمجھ لیجئے ـــــ خان بہادر صاحب' کہ اگر آپ

نان کو آپریشن کو تحریک میں شامل ہو گئے تو پھر اپنے یہ سب اعلا درجے کے
سوٹ جلا دینا ہوں گے اور ان بدیسی سگاروں کی جگہ بیڑی پینیا ہو گی۔"
"آپ نے شاید مولانا محمد علی کا لطیفہ نہیں سنا۔
وہ بھی نان کو آپریشن کے اور بدیسی مال کو جلا دینے کے زبردست
مبلغ ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے بدیسی سگریٹ پینے کو نکالی تو کسی نے
ٹوکا اور کہا "مولانا بدیسی چیز"
مولانا نے برجستہ جواب دیا "ابھی جلاتا ہوں"
نواب نے مسکرا کر کہا۔
"مولانا محمد علی کی حاضر جوابی کی داد دیتا ہوں۔ مگر اس کا مطلب تو یہ
ہوا کہ خود مولانا بھی دل سے بدیسی مال کو چھوڑنے کے قائل نہیں۔ کیوں خان
بہادر صاحب، اگر امن سبھائیں لوگوں کو ان کے لیڈروں کا یہ حال بتائیں
گی اور سب اونچ نیچ سمجھائیں گی کیا تب بھی لوگ ہڑتالیں کرنا نوکریاں چھوڑنا
اور بدیسی مال کا جلانا نہیں چھوڑیں گے؟"
خان بہادر صاحب کو محسوس ہوا کہ انھوں نے مولانا محمد علی کا
قصہ غلط موقع پر سنا دیا
نواب صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی بات کو پھیلاتے ہوئے
کہا۔
"میں تو کہتا ہوں کہ انگریزی راج ایک نعمت ہے۔ کیا کیا چیزیں ملی
ہیں ہم کو انگریزوں سے۔ یہ دیکھئے بجلی، ریل، موٹر، ہسپتال، انگریزی تعلیم
چھاپے خانے اخبار اور کیا کیا۔"

"نواب صاحب کچھ تو سنیے جو لوگ انگریزی پڑھے ہیں اتنے بیزار ہیں کہ ان کو فاقہ کرنا گوارہ ہے مگر ہڑتال نہ کرکے پیٹ بھرنا گوارا نہیں ۔"

"بیزاری وغیرہ کچھ نہیں ہے یہ کانگریس والے اور خلافت والے جب گیروے کپڑے اور بڑی بڑی عبائیں پہن کر آجاتے ہیں اور مذہب اور دھرم کا واسطہ دلاتے ہیں تو ہمارے ضعیف العقیدہ عوام ان کے کہنے میں آکر گمراہ ہو جاتے ہیں ۔"

"لیکن آپ کی سرکاری طرف کیا گیروے کپڑے والے اور عبائوں والے اور مذہب اور دھرم کا نام لینے والے کچھ کم ہیں؟"

اس موقع پر سورج پور کے ایک بہت کامیاب وکیل پنڈت موہن لال کاٹجو نے جو موہن جی کہلاتے تھے گفتگو میں دخل دیا اور کہنے لگے۔

"لوگ سرکار سے خفا تو بہت ہیں اب میں ایک ایسی بات بتلاؤں نواب صاحب جس کو سن کر آپ خاموش ہو جائیں گے آپ کے چچا نواب مرحوم کا ایک سپاہی تھا۔ مہان سنگھ جو ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ایک طرح سے ان کا باڈی گارڈ تھا ایک موقع پر کچھ جھگڑا ہو گیا اور مہان سنگھ نواب صاحب کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ نواب صاحب نے بہت اچھی طرح سے اس کا کریا کرم کیا۔ اس کو تو وہ چار روپے مہینہ دیتے تھے لیکن اس کی بیوہ کو چھ روپے مہینے پنشن دے دی اس کا گھر کچا تھا اسے پکا بنوا دیا پھر اپنا یہ دستور رکھا کہ سال بھر میں ایک مرتبہ بیوہ کو ضرور بلاتے اور تین چار جوڑے اس کے اور اس کے لڑکوں کو بنوا دیتے جب لڑکے بڑے ہو گئے تو

ایک کو بڑا سا کھیت دے دیا اور ایک کو اپنی اردلی میں رکھ لیا کیوں نواب صاحب یہ واقعہ ٹھیک ہے ؟"

"جی ہاں درست ہے۔ میں اس واقعہ سے واقف ہوں۔ مہان سنگھ کا بڑا لڑکا ابھی تک ہماری ریاست میں نوکر ہے۔ حضور چچا نواب مرحوم تو اپنی ان قدردانیوں کے لئے مشہور تھے۔"

موہن جی نے کہا۔

اب سنئیے اس سرکار کی بات۔ مہان سنگھ کے گھرانے کا ایک نوجوان بہادر سنگھ فوج میں بھرتی ہوا اور چھ مہینے کے اندر اندر مارا گیا سرکار نے اس کی موت پر بیوہ کو جو رقم دی ہے وہ اتنی بھی تو نہیں ہے کہ اس سے ایک گوئی خریدی جاسکے۔ رہا مان دان اور قدردانی کا سوال۔"

نواب افسرالدولہ ریاست کاٹ کر "بھئی قدردانی کرنا کن لوگوں کا فرض ہے ؟ قوم کے بہادروں کی قدردانی قوم ہی کو کرنا چاہیئے۔

موہن جی نے درد کے ساتھ کہا " اگر بہادر سنگھ طاعون میں مرجاتا تو شاید لوگوں کو اس کی بیوہ پر دیا آجاتی اور وہ کچھ مان دان بھی کرتے۔ لیکن اب تو کوئی بیچاری کو پوچھتا تک نہیں ہے۔ یہ غلطی کن لوگوں کی ہے اور اس کا ذمے دار کون ہے۔ یہ میں نہیں جانتا وہ بیوہ میری موکل ہے اور میں آنا جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔

خان بہادر نے تلخ لہجے میں کہا " بہادر سنگھ کو پیسہ چاہیئے تھا اور سرکار کو اس کی سروس۔ سرکار نے پیسہ دے کر اس کی سروس خرید لی۔ اس طرح حساب کتاب برابر ہو گیا۔ کیوں نہ نواب صاحب یہی بات ہے نا ؟"

شہر کے مشہور ڈاکٹر گپتا جو بات ختم کر کے ادھر آ گئے تھے۔ بیچ میں بول اٹھے۔

"میں تو سمجھتا ہوں کہ دنیا کا سب کام پیسہ کے لئے ہوتا ہے۔ اپنے ماہروں اور لیڈروں کی قدر کرنا۔ یہ باتیں کبھی ہوتی ہوں گی۔ مگر اب تو نہیں ہوتیں۔ اب دیکھئے کہ میں نے کیسے کیسے آپریشن کئے کہ لوگوں کو موت کے منھ سے نکال لیا ہے۔ لیکن ادھر اچھے ہوئے اور ادھر میری خدمت کو بھول گئے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جب فیس ادا کر دی تو سارا حساب بیباق ہو گیا۔ ان کے اسی برتاؤ کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میں نے تو شفا کی دوکان کھول رکھی ہے۔ جو میرے دام ادا کر دے وہ شفا خرید لے جائے۔ نہ وہ میرا احسان مند ہوگا اور نہ میں پیسے کے معاملہ میں اس کی مروت کروں گا۔ یہ تو سیدھا سادھا بیوپار ہے۔"

نواب افسر الدولہ خان بہادر اور جو لوگ موجود تھے ان میں سے کئی ایک جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کیسا بیوپار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر گپتا سرکاری اسپتال میں ملازم تھے اور آپریشن میں ان کا ایسا سرجن دور دور نہیں تھا۔ اس لئے ان سے آپریشن کرانے کی لالچ میں مریض دور دور سے سرکاری اسپتال میں آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو قاعدے کی رو سے اسپتال کے مریضوں کا آپریشن مفت کرنا چاہیئے تھا لیکن وہ ایسا نہیں کرتے تھے وہ تو صرف اسی مریض کا خود آپریشن کرتے تھے جو ان کو منھ مانگی فیس دے دیتا تھا، ورنہ وہ آپریشن اپنے اسسٹنٹ پر چھوڑ دیتے تھے۔

چند روز ہوئے ایک شخص اپنی بیوی کو لے کر کافی دور سے سرکاری

اسپتال میں آیا اور بیوی کو داخل کرادیا۔ بیوی بہت کم زور تھی اور اس کا آپریشن بہت نازک تھا۔ اس لئے اس شخص کو یہ خواہش تھی کہ ڈاکٹر گپتا خود ہی آپریشن کریں۔ ڈاکٹر نے ایک ہزار روپیہ مانگا۔ اس نے عذر کیا کہ میری اس کی حیثیت نہیں ہے اس عذر پر ڈاکٹر گپتا نے فیس آدھی کردی اور صرف پانچ سو لے کر آپریشن کے لئے تیار ہو گئے۔

جب ڈاکٹر آپریشن کرنے لگے اور انھوں نے نشتر سے عورت کا پیٹ کچھ کھول لیا تو شوہر سے جو پاس ہی کھڑا تھا کہا کہ یہ تو کافی بڑا آپریشن ہے۔ اس کے لئے میں کم سے کم پانچ ہی سو روپیہ اور لوں گا ورنہ آپریشن اسسٹنٹ کے سپرد کرکے ابھی چلا جاؤں گا۔"

اب صورت حال یہ تھی کہ مریضہ میز پر بے ہوش پڑی ہے، خون بہہ رہا ہے اور ڈاکٹر صاحب الگ ٹہل رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ پانچ سو روپیہ اور لاؤ تو میں نشتر اٹھاؤں۔

مریضہ کا شوہر خوشامدیں کرنے لگا گڑگڑانے لگا اور آخر میں ڈاکٹر کے پاؤں پر گر پڑا۔ کہنے لگا میرے پاس اور پیسہ نہیں ہے لیکن جب ڈاکٹر کسی طرح نہ پگھلا تو اس نے کہا کہ اچھا آپریشن پورا کر دیجئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اتنی رقم بعد کو دے دوں گا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "نہیں یہ رقم ابھی لاؤ۔"

شوہر نے خوشامدانہ کہا۔ "ابھی کہاں سے لاؤں گھر جاؤں گا تو کچھ بندوبست کردوں گا۔"

ڈاکٹر۔ "یہ جو عورت بھاری بھاری زیور پہنی کر تمھارے ساتھ

آتی ہیں ان کا ایک زیور بھی پانچ سو سے کم کا نہ ہوگا۔
شوہر سمجھ گیا کہ ان زیوروں ہی کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے لالچ نے زور پکڑا ہے۔ وہ زیور کے لئے بھاگتا ہوا آپریشن روم سے باہر چلا گیا۔
نرس سے ضبط نہ ہوا اور اس نے جا کر ڈاکٹر صاحب سے عاجزی سے کہا۔
"سر مریضہ بے حد کمزور ہے اور اس کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔"
"پھر تم کو کیا فکر۔ نہ تمہارا خون بہہ رہا ہے اور نہ میرا۔"
آخر مریضہ کا شوہر کسی عورت سے مانگ کر ایک بھاری زیور لے آیا اور اس کو ڈاکٹر صاحب کی بھینٹ کر دیا تب جا کر ڈاکٹر صاحب نے آپریشن پورا کیا۔ اب یہ ان کا کمال ہے کہ آپریشن کامیاب رہا اور عورت بچ گئی۔
ڈاکٹر گپتا اپنی بات پر حاضرین کی معنی خیز خاموشی دیکھ کر کہنے لگے ــــ
"بھئی بڑے بڑے انگریزوں کا بھی یہی دستور ہے کہ جب تک پوری فیس نہ لے لیں گے کبھی مشورہ نہیں دیں گے ــــ میں تو اس طریقہ کو صحیح سمجھتا ہوں۔"
خان بہادر کہنے لگے۔ "ڈاکٹر گپتا۔ آپ نے بہت پتے کی بات کہی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اس لڑائی میں ہندستانیوں کو ہمدردی جرمنی کے ساتھ نہیں ہے۔ کیوں کہ جرمنی ان انگریزوں کو ذلیل کر رہا تھا۔ جنھوں نے ہم کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں میں سے جو لوگ فوج میں جا رہے ہیں ان کی بھی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ اور وہ صرف پیسے کے

لئے جا رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ لوگ اپنے کو مرسی نری سمجھتے ہیں۔ انگریز بھی
ان کے جذبات کو جانتے ہیں اور وہ بھی ان کو مرسی نری سمجھتے ہیں۔ ہم سب
بھی ان نوجیوں کو مرسی نری سمجھتے ہیں۔ جب ہم کو اپنے ملک میں اتنی بڑی تعداد
میں مرسی نری نظر آتے ہیں تو ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ ہماری پوری قوم مرسی نری
ہے۔ اس احساس کے ماتحت ڈاکٹر۔ وکیل، تاجر، ماسٹر غرضیکہ ہم سب ہی
مرسی نری بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے کچھ علما کا متفقہ فتوا جس میں فوج
کی نوکری کو مسلمانوں کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے صحیح نظر آتا ہے۔"
موہن جی ابھی اتنی دور جانے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے انھوں
نے کہا۔

میں نے مسئلے کو اتنی دور تک نہیں سوچا ہے۔
نواب افسرالدولہ نے کپتان راحت رسول کو مخاطب کرکے کہا۔
"کپتان صاحب دیکھئے میری ریاست میں کسی طرح کا بھی تو ہنگامہ
نہیں ہوا۔ ایک جلسہ تک نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ میں نے حالات کو وقت پر
قابو میں کر لیا میری ریاست کا ایک جمار فوج میں بھرتی ہو کر گیا تھا اور وہاں
گرفتار ہو کر بری صحبت میں پڑ گیا اور پھر یہاں آیا تو بالشویک خیالات لے کر
جمار اور خیالات وہ بھی بالشویک۔ مجھے جیسے ہی اس بات کی رپورٹ ملی۔
میں نے کمشنر صاحب سے کہا چنانچہ دوسرے ہی دن وہ میری ریاست سے
ہٹا لیا گیا اب وہاں جو امن ہے اس کا حال تو آپ بھی جانتے ہیں وہ تو
آپ کے سرکل کی بات ہے۔"
راحت رسول نے کہا۔ "جی ہاں امن تو ہے لیکن آج کل امن کا

کچھ ٹھیک نہیں۔ کون جانے کہ راکھ کے نیچے کہاں کہاں چنگاریاں چھپی ہوئی ہیں"

"میں اسی لئے امن سبھا کی حمایت کرتا ہوں"

راحت رسول نے یہ بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ وہ کسی فکر میں ڈوب گیا اور ٹہلتا ہوا دیوان خانے کے باہر کے باغیچے میں آگیا۔ اس کے دماغ میں اس وقت نواب افسرالدولہ کی ریاست کے اس چمار کی بیوی گھوم رہی تھی جس کا انھوں نے ابھی ابھی تذکرہ کیا تھا۔

(۲)

ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات ہے کہ سوبے پور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر جان ٹائیگر نے کپتان پولیس راحت رسول کو بلا کر کہا۔

کپتان رسول مجھے ایک بہت ہوشیار پولیس افسر کی ضرورت تھی۔ ریکارڈ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ہمارے ضلع میں سب سے اچھے پولیس افسر آپ ہی ہیں بلکہ آپ کا شمار تو صوبے کے چند گنتی کے کامیاب افسروں میں کیا جاتا ہے آپ مستعد بھی ہیں ایماندار بھی اور ہوشیار بھی اپنی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے آپ اتنی جلد ترقی کر کے اس جگہ تک پہونچ گئے۔"

"حکم حضور"

"کام اہم ہے اور نازک بھی ہمارے علاقہ میں جو فوجی واپس آئے ہیں ان میں سے چند کے بارے میں یہ رپورٹ ملی ہے کہ وہ کچھ دن روس میں رہ کر اور بالشویک کے ساتھ زندگی گزار کر آئے ہیں اور ان کے خیالات سے متاثر ہیں ——

حال میں ایک بات ایسی ہوئی جس سے یہ شکوک بڑھ گئے وہ یہ کہ ایک

دن کٹ پور کے کسان متحد ہو کر ایک بہت بڑی ٹولی بنا کر لکھنؤ گئے ۔ اور نواب افسرالدولہ صاحب کے سامنے باقاعدہ مطالبات پیش کئے۔ کٹ پور کے چوکیدار کی رپورٹ ہے کہ ان لوگوں کا لیڈر ایک چمار ہے مجھے یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ کسانوں میں ایکا پیدا کرنا پھر ان کے مطالبات تیار کرنا اور ان کو اپنے گاؤں سے جہاں سے کہ وہ بہت مشکل سے نکلتے ہیں اتنی دور لے جانا اور بلا کسی کے جھگڑے اور مار پیٹ کے ان سب کو واپس لے آنا یہ سب کام کسی اونچے ذات کے آدمی کے ہاتھوں نہیں بلکہ ایک نیچ ذات چمار کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچے ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ اندر اندر کوئی زبردست بالشویک ٹائپ سازش ہو رہی ہے ۔ فی الحال تو اس چمار کو گرفتار کر کے سنٹرل سی۔ آئی ڈی کے سپرد کر دیا گیا ہے لیکن وہ چمار کوئی پتہ کی بات نہیں بتا رہا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ کوئی پولیس آفیسر بھیس بدل کر کٹ پور میں جا کر کچھ دنوں خود رہے یا اپنے ہوشیار آدمیوں کو بھیجے اور ان لوگوں کی سازش کا ایسا پتہ لگائے کہ جڑ، تنا، شاخیں سب معلوم ہو جائیں سمجھے آپ "۔

"جی حضور "

" بات یہ ہے مسٹر رسول کہ ہم انگریز ہندستانیوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں اگر کٹ پور والوں کو کوئی خاص تکلیفیں ہیں تو ان کو ضرور دور کریں گے اور اس معاملہ میں کوئی پہلوتہی نہ کریں گے لیکن اگر سازش ہوئی تو ...... "

" حضور میں سمجھ گیا اور یقین ہے کہ یہ کام کر لوں گا؟

" یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوگی اس کام کے کرنے سے آپ کا ریکارڈ بہت اچھا ہو جائے گا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آج کل سیاسی ہنگاموں کے زمانے میں بالشویک تحریک کا معاملہ کتنا اہم ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ

ایسی رپورٹ لکھیں جس میں انصاف بھی ہو اور سچی حقیقت بھی اور معاملہ پر قابو بھی حاصل کیا جا سکے۔ سمجھے آپ؟"

راحت رسول نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کے بعد بہت باقاعدگی سے کام شروع کیا پہلے "سی آئی ڈی افسر سے ملا جس کے پاس برجو کی تحقیقات کی رپورٹ آئی تھی اس افسر سے اس نے برجو کے بارے میں بہت سی ضروری باتیں معلوم کر لیں اور پھر یہ طے کیا کہ خود چمار بن کر کرکٹ پور جائیں اور ہفتے دو ہفتے وہاں رہ کر ضروری باتوں کی تحقیقات کروں چمار بننے کے لئے ضروری ہوا کہ چماروں کے رہن سہن اور عادتوں کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جائیں راحت رسول نے اس غرض سے کچہری کے ایک چپراسی کو جو چمار تھا اس کو بلا کر کہا کہ میں اس شہر کے چماروں کے محلے میں کچھ دنوں چھپ کر رہنا چاہتا ہوں۔ چپراسی نے اس بات کا انتظام کر دیا۔ راحت رسول ایک ہفتے تک چمار ٹولے کے ایک گھر میں چھپا رہا اور وہاں کانوں سے اور جب بھی ممکن ہوتا تو آنکھوں سے بھی آس پاس کے رہنے والے چماروں کی بات چیت ہنسی مذاق لڑائی جھگڑا گالی گفتار اور گیت گانوں وغیرہ کا مشاہدہ و مطالعہ کرتا رہا ان ضروری باتوں کو سیکھ کر راحت نے اپنے چہرہ کی چکناہٹ مٹانے اور رنگ کو مدھم کرنے کے لئے کپڑے دھونے کے صابن اور کچھ دواؤں کا استعمال کیا۔ یہ سب تیاری کرنے کے بعد راحت رسول نے فوجی باجے والوں کی ایک پرانی وردی یعنی ایک میلی دھوتی اور فوجی بنیائن ایک گٹھری میں رکھا اور کچھ سامان جو اس نے بمبئی سے منگوایا تھا اسے ایک کاغذ میں لپیٹا اور ان سب کو لے کر کرکٹ پور برجو کے گھر گیا۔

"برجو کہاں ہے"۔

"تم کون ہو۔ وہ تو گاؤں میں نہیں ہے"۔

برجو کے باپ کا جواب سن کر راحت نے حسن کا نام اب میکو تھا کاغذ کھول کر اس میں سے ایک ۹ × ۵ انچ کا خوبصورت آئینہ اور کوک سے چلنے والی ریل نکالی اور کہا کہ دو سال ہوئے میں لام پر سے چھٹی پر آ رہا تھا تو برجو نے یہ دو چیزیں یہ کہہ کر مجھے دی تھیں کہ آئینہ تو میری پتنی سانولی کو دے دینا اور یہ ریل میرے بیٹے بھولا کو۔ وہ بیچارا آنکھوں سے تو نہ دیکھ سکے گا پھر بھی چلا کر بہت خوش ہوگا۔

یہ چیزیں دیکھ کر اور یہ پیام سن کر برجو کے گھر میں ہل چل مچ گئی۔ ہر ایک دوسرے کو پکارنے لگا۔ پہلے بھولا [illegible] ہوا اور بھاگتا ہوا آ گیا پھر سانولی جو گھر کے باہر تھی آئی ان دونوں کے بعد برجو کی بیوہ بھاوج اور اس کی دونوں لڑکیاں آئیں۔

سانولی۔ "بھیا تم دو سال تک کہاں رہے؟"

"بھوجی دشمن نے ہمارا جہاز ڈبو دیا تھا اور ہم لوگوں نے کسی طرح کشتیوں پر بہہ کر افریقہ میں پہونچ کر ایک جگہ پناہ لی۔ تب سے اب تک جہاز ہی نہیں ملا جو آتے وہاں سے خط لکھنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی"۔

میکو کی بات پر شک کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی کیوں کہ برجو آئینہ اور ریل اور میکو کی بات دسوں بار کہہ چکا تھا۔

پھر میکو نے برجو کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں بتلائیں جو اسی کو معلوم ہو سکتی تھیں جو برجو کا گہرا دوست ہوتا اور جسے برجو خود یہ باتیں بتاتا۔ ان سب

باتوں کی وجہ سے میکو سے سب لوگ گھل مل گئے۔

راتے کو میکو نے برجو کی بیوہ بھاوج نندنی کو بتایا کہ اس کا پتی کیسے مارا گیا۔ یہ بات بالکل ویسی ہی تھی جیسی برجو نے بتلائی تھی مگر اس میں ایک بات زیادہ تھی وہ یہ کہ اس نے آخری سانس کے ساتھ اپنی بیوی کو پکارا تھا۔

یہ سن کر بیوہ بھاوج کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے اور اس کی بڑی پانچ سال کی لڑکی جو پاس بیٹھی تھی وہ تو ماں سے چمٹ گئی اور رونے لگی۔

برجو کے بھائی کے بالکل ہی قریب توپ کا گولا پھٹا تھا کہ جس سے بیچارے کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ اور لاش کا پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ ایسے میں وہ کسی کو یاد کب کر سکتا تھا لیکن راحت نے یہ فقرہ اپنی طرف سے بڑھا دیا تھا اور ساتھ ساتھ کہہ دیا تھا کہ مرتے وقت صرف میں ہی اس کے پاس تھا، برجو تو ذرا دیر بعد آیا۔

راحت کی یہ بات سن کر برجو کے گھرانے والے اس سے اور قریب آ گئے۔

ایک بات اور ہو گئی جس سے نندنی میکو کا مان دان بہت کرنے لگی۔ دوسرے دن جب کام کاج ختم کر کے سانولی مہاراج کے گھر سے رات کو آنے لگی تو ایک چمار کالو نے یا تو اس کا راستہ روکا یا ہاتھ پکڑا یا کوئی ایسی ہی بات کی جس سے بگڑ کر وہ گالیاں دینے لگی۔ پھر آگے آگے سانولی گالیاں دیتی ہوئی وہ پیچھے پیچھے وہ چمار کچھ کہتا ہوا۔ اس طرح یہ دونوں گھر تک آ گئے۔ سانولی گھر کے اندر جا کر گالیاں دینے لگی اور کالو باہر سے پکار پکار کر کہنے لگا کہ میرے پیسے دے دو نہیں تو ...... جب کالو بہت سخت گالیاں

دینے لگا۔ تو برجو کے باپ نے بھی اندر ہی سے دو ایک گالیاں دے دیں۔ اس پر کالو بھنا کر سانولی اور شیاموکے تعلقات کے بارے میں خوب زور دار گالیاں سنانے لگا۔

راحت کو کالو کی بد تمیزی سے زائد برجو کے باپ کی بزدلی پر حیرت ہوئی لیکن اس نے جذبات سے نہیں عقل سے کام لیا۔ سوچا کہ یہ موقع اچھا ہے برجو کے ساتھ اپنی دوستی جتانے کا۔ راحت نے پولیس ٹریننگ اسکول میں کشتی بھی سیکھی تھی۔ اور لاٹھی بھی۔ ساتھ ساتھ وہ نڈر بھی تھا۔ جب بات کافی بڑھ گئی تو وہ لاٹھی لے کر باہر نکل آیا اور چماروں والی گالیوں سے بھری زبان میں کالو سے کہا کہ ایک عورت سے لڑتے ہو جس کا شوہر موجود نہیں ہے۔ تم کو شرم نہیں آتی ہے۔ کالو نے پھر سانولی اور شیامو والی بات گالیوں کی زبان میں کہی۔ اور کہا کہ یہ میرے پیسے کیوں نہیں دیتی ——

کالو کے پاس لاٹھی نہیں تھی راحت نے اپنی لاٹھی پھینک دی اور کالو سے جا کر لپٹ گیا کالو ایک غیر آدمی کو اس طرح بیچ میں پڑتا دیکھ کر غصہ سے پاگل ہو گیا اور اس نے چاہا کہ راحت کا گلا دبا دے۔ اس کے دونوں ہاتھ جو آگے بڑھے تو راحت نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی گرفت میں دے دیئے اور پھر "جو جٹ سو" کی قینچی لگا کر پیترا بدلا تو اپنے دونوں ہاتھ چھوڑ کر اس کا داہنا ہاتھ سخت گرفت میں لے کر کالو کے پیچھے آگیا۔ اب کالو کا ہاتھ اس طرح راحت کی گرفت میں تھا کہ اگر وہ زرا اپنے ہاتھ کی جھٹکا دے دے تو ہاتھ اکھڑ جائے۔

چھ سات چمار اور چمارنیں دور دور کھڑے ہو کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ راحت نے کالو سے آہستہ سے کہا میری شینٹ میں دو ردیہ ہیں وہ اٹھا لو

جائیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ابھی پکار کر کہہ دو کہ سانولی کو بہن سمجھتا ہوں۔ سمجھے۔ نہ مانو گے تو ہاتھ توڑ دوں گا۔ میں جب فوج میں کام کرتا تھا تو ہاتھ توڑنے کے لئے مشہور تھا۔

کالو گرفت میں آتے ہی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اب لالچ کے پھیر میں جو پھنسا تو پکار کر کہنے لگا۔

"سانولی تو میری بہن ہے۔ میں تو نشے میں پاگل ہو رہا تھا۔ مجھے چھوڑ دو۔ اب اسے گالیاں نہیں دوں گا۔"

کالو کا قرضہ نو آنے کا تھا لیکن اس کو نہ سانولی مانتی تھی اور نہ برجو کا باپ۔ کالو کہتا تھا کہ جس دن برجو شہر سے ناکام واپس آیا ہے اس نے مجھ سے پیسے قرض لے کر تاڑی کی ایک پوری لبنی خریدی تھی اور وہیں بیٹھے بیٹھے پی گیا تھا۔ سانولی کہتی تھی کہ برجو کبھی اتنی پیتا ہی نہ تھا اور اس دن جب وہ آیا ہے تو وہ جاگ رہی تھی اس کو یاد ہے کہ نہ اس کے منھ سے بو آرہی تھی اور نہ وہ نشے میں تھا اور پھر یہ بات بھی ہے کہ برجو جب گھر آیا ہے تو اس کے ٹینٹ میں چار روپے سوا نو آنے موجود تھے جو اس نے نکال کر سانولی کو دیئے۔ یہ بحث برجو کے جانے کے دوسرے دن سے چل رہی تھی آج وہ پورے زور پر آکر اس طرح ختم ہو گئی۔

راحت نے چپکے سے دو روپے کالو کے ہاتھ میں تھما دیئے اور پھر اس کو چھوڑ دیا۔ کالو نے بہت آدر سے میکو کو سلام کیا اور اپنا انگوچھا جو مٹی میں گر گیا تھا جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور چل دیا۔

جب کالو چلا گیا تو برجو کے باپ نے کہا۔

"تم کاہے کو لڑنے لگے ۔ وہ آپ ہی بک جھک کر چلا جاتا۔"

یہ بات سن کر سانولی بولی۔

" میکو بھیا تمہارا ایسا نہیں ہے وہ تو بڑجو اور بھگتو کا ایسا بانکا دلیر ہے ۔"

نندنی کا جھونپڑا ذرا ہی دور پر تھا اور وہ بھی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی راحت کی بہادری اور اس کی جیت سے وہ اتنی خوش ہوئی کہ وہ گھر سے گڑ کا شربت بنالائی اور راحت کی خدمت میں پیش کر دیا ۔ اس کے آنے، پیش کرنے اور راحت کی طرف دیکھنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ راحت پر واری جا رہی ہے۔

اس واقعہ کے چار دن کے بعد وہ کہنے لگی ۔ میکو میں بتاؤں تم کیا کرو تم بھگتو کے جتھے میں چلے جاؤ اور مجھے تم جہاں کہو گے وہاں رہ لوں گی کہو گے تو میں اپنی لڑکیوں کو بھی چھوڑ دوں گی ۔"

اس سے پہلے چار دن کے اندر میکو اور نندنی میں جو بات چیت ہوئی تھی وہ بس بڑی اور شربت لو، مٹھائی لو، کھاٹ پر بیٹھو۔ ذرا سی تاڑی پی لو سے آگے نہیں بڑھی تھی لیکن اس بڑھیا راحت کو اس کے منھ سے اتنی بڑی بات سن کر اس میں ذرا بھی تو اچانک پن محسوس نہیں ہوا کیوں کہ اجنبیت سے لے کر اس فقرے تک جتنی منزلیں تھیں وہ سب نندنی اپنی آنکھوں اپنے تبسم اور حرکات و سکنات سے طے کر چکی تھی ۔ اس دن جب نندنی اپنے کھیت سے آرہی تھی تو اتفاقاً میکو سے مڈبھیڑ ہو گئی اسے دیکھتے ہی نندنی میں ایک جوانی سی آگئی اس نے جھکتی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا پھر اپنے ہونٹوں پر جو میکو کو دیکھ کر ذرا کس گئے تھے زبان

پھر کر اس نے یہ بات کہی۔ میکو نے نندنی سے آدھے سکنڈ کے لئے نظریں ملائیں پھر ذرا آگے بڑھ کر کہنے لگا۔

"جس جیون میں ہر وقت ڈر ہی ڈر ہو وہ میرے بس کا نہیں نندنی"

"مگر اس جیون میں جو تو بتا رہا ہے ایک نہیں سو ڈر ہیں۔ سرپر مہاراج، پھر چوکیدار، ضلع دار اور برادری کے پنچ، درو گہ اور ٹوپ پہننے والے گورے کس کس کو کہوں"

اسی رات کو جب راحت تاڑی خانہ سے جھوٹ موٹ جھومتا ہوا نکلا تو اس کو کالو ملا جو سچ مچ جھوم رہا تھا وہ راحت کا راستہ روک کر کہنے لگا۔

میکو تمہارے دیئے پیسے بہت بیلے آج تک چلے تم بھلے آدمی ہو لیکن اتنا سمجھے رہو کہ اگر نندنی کو گانٹھنے کی کوشش کی تو گلا گھونٹ دوں گا۔ کالو کو اک دم سے غصہ آگیا وہ تلملا کر کہنے لگا۔

"ابے سالے کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اندھا ہوں۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ اگر اس وقت تجھے جان سے مار نہ ڈالوں تب کہنا۔"

کالو نے لاٹھی اٹھا کر ماری بھی لیکن راحت جھکائی دے کر نکل آیا۔

راحت سمجھا تھا کہ کالو نے جو کچھ کہا اور کیا یہ صرف تاڑی کا زور ہے لیکن صبح جب اس کا اور کالو کا سامنا ہوا تو راحت کی صورت دیکھتے ہی کالو کے چہرے کے سب پٹھے پھر تن گئے اور کہنے لگا۔

"پیسوں کے معاملے میں جو دب گیا تھا۔ وہ بات دوسری تھی لیکن یہ نندنی والی بات اور ہی طرح کی ہے اس عورت کے لئے تو میں خون کر ڈالوں

گا چاہے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے "!

راحت دو چار دن سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ کٹ پور میں جو کچھ بھی ضروری تھا وہ سب میں نے دیکھ لیا ہے۔ اور اب قیام کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے اسی دن وہ اچانک برجو کے باپ اور بھولا سے مل کر رخصت ہو گیا۔

"چمار کی نہ دوستی کا ٹھیک۔ نہ دشمنی کا۔ دبو بھی ہوتا ہے اور مارنے مرنے پر تیار بھی ہو جاتا ہے"۔ یہ لوگ اور کوئی سازش کریں!! چلتے وقت راحت کے دماغ میں یہی بات تھی۔ یہ ماحصل تھا اس کے مشاہدوں کا۔!

ایک دن راحت نے برجو کے باپ سے پوچھا تھا کہ جب برجو کو پولیس لے گئی تو تم نے کیا کیا۔

"میں جا کر مہاراج کے پاؤں پر گر پڑا ان کی کھڑاؤں لے کر اپنے سر پر رکھ لیں اور کہا حجور مائی باپ ہیں۔ بلکہ بھگوان ہیں۔ سب ہی کچھ ہیں اور حرامی برجو سالا گدھا ہے۔ نہ تو کسی بات کو سمجھے اور نہ ذات پات کی اونچ نیچ دیکھے بس جو من میں آتا ہے کرنے لگتا ہے۔ مہاراج تمھاری منتی کرتا ہوں کہ اب اسے معاف کر دو' اب وہ ایسا کبھی نہ کرے گا۔ یہ سب سن کر مہاراج پسیج گئے اور انھوں نے مجھے پانچ روپے انگوٹھا لگوا کر بیاج پر قرض دیئے اور سورج پور کے ایک وکیل صاحب کے نام خط دیا اور کہا کہ وکیل صاحب کو یہ خط دینا اور پھر پانچ روپیہ فیس کے دینا وہ برجو کی ضمانت کر کے چھڑا دیں گے"!

"میں دونوں چیزیں لے کر وکیل صاحب کے پاس گیا۔ انھوں نے دونوں چیزیں لے کر دن بھر مجھے روکے رکھا اور خود کچہری چلے گئے۔ شام کو

وہاں سے آکر کہا کہ سرکار نے برجو کو رولٹ کے اندر پکڑا ہے اس میں کچھ نہیں چلتا ہے نہ وکیل، نہ دلیل، نہ اپیل ۔"

ایک رات سانولی کہنے لگی کہ میرا ایک دیور لڑائی میں مارا گیا اس کی بیوہ ماری ماری گھوم رہی ہے۔ مرنے والے کے جیون کے جو دام ملے ہیں ۔ وہ اتنے بھی نہیں ہیں کہ ایک اچھی سی گوئی خریدی جاسکے ۔ سرکار نے اتنا بھی تو نہ کیا کہ اس کے پتی کا کھیت ہی اس کے نام کرا دیتا ۔ مہاراج نے بھی اس کے مرنے کا کچھ خیال نہ کیا ۔ برجو کہا کرتا تھا کہ باہر دیسوں میں اپنے دیس پر مٹنے والوں کا آدر کیا جاتا ہے ۔ مگر یہاں نہ آدر نہ وارد ۔ لڑائی میں مرنے والوں کے گھر والے بھوکوں مرتے ہیں ۔

"کیا تمہاری دیورانی کو کھیت نہیں ملا ؟"

"ملا تو اسی راہ سے ملا جیسے ہم چماروں کو ملتا ہے ۔"

" اور لوگ جو لام سے واپس آئے ہیں کیا وہ بھی تمہاری ہی طرح ٹوٹا ہوا دل لئے بیٹھے ہیں ؟"

" خود ہی ان سے پوچھ لو ہر ایک منھ لٹکائے گھومتا اور جھکتا رہتا ہے اور جو جیوں کی جو بیوائیں ہیں ان کا تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں بس روتی رہتی ہیں ۔

تمہارا اور شیاموکا معاملہ کیا ہے ؟"

" تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے تم بھی لام پر جاکر ان کی طرح اپنی ذات بات بھول گئے ۔ اپنی بتاؤ یہ کہو کہ تمہاری گھر والیاں کیسے رہتی ہیں اور ان کو زمینداروں اور سرکاری افسروں کو کس کس طرح خوش کرنا پڑتا ہے ۔"

سانولی کے لہجے میں کچھ غصہ بھی تھا اور کچھ پامال غرور بھی ۔

"بھوجا میں نے یوں ہی ایک بات پوچھ لی"۔

بھیا ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جب میں بھی تمھاری طرح پکی جارن نہیں تھی اور میں بھی جھونپڑے میں رہ کر اونچی اونچی باتیں سوچا کرتی تھی۔ لیکن اب تو پتی کو کھو چکی ہوں اور معلوم نہیں اس سے ملنا ہو یا نہ ہو پھر میرے ساتھ ایک اندھا بیٹا بھی ہے جسے چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی اب تو سوچتی ہوں اس جنم میں جو ہونا تھا ہو چکا"۔

سانولی کا چہرہ بلا آنسوؤں کے رونے لگا۔

"میکو بھیا مجھے ایسا لگتا ہے جیسے برجو میرے کلیجے میں ہر وقت چٹکیاں لیتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ تو ایسا کام کیوں کرتی ہے جو مجھے دکھ دیتا ہے" پھر کہنے لگی میں یہ یاد کر کے بھی روتی ہوں کہ جب برجو نے پوچھا تھا کہ سانولی میں بھگتو کے کنے چلاؤں تو ہائے اس وقت میں نے ہاں کیوں نہ کر دی"۔

میکو نے گاؤں والوں کی ہر صحبت دیکھ ڈالی اور ہر قسم کی باتیں اور ان سب باتوں کی کڑیاں بھی آپس میں ملا کر دیکھ ڈالیں۔ آخر میں اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس گاؤں کی زندگی بھی دوسرے گاؤں ہی کی طرح کی ہے اور یہاں اب کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کسی راز کی نشان دہی کرے۔ جب راحت نے اس بات کا یقین کر لیا کہ میں نے گاؤں کی زندگی کے ہر ایسے گوشہ کا مشاہدہ کر لیا ہے جہاں سے سیاسی راز کا پتہ مل سکتا ہے اور یہ کہ گاؤں میں اتنی سیاسی سوجھ بوجھ ہے ہی نہیں کہ یہ گاؤں کوئی سیاسی تنظیم بنا سکے تب وہ وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

بھولا اس کو رخصت کرتے وقت بلک بلک کر رونے لگا راحت کو اس

کے دونے پر حیرت ہوئی کیوں کہ اس نے تو بھولا کے ساتھ کوئی خاص مہربانی کا سلوک بھی نہیں کیا تھا۔

راحت جب واپس آ گیا تو اس کی نظروں میں جو چیز سب سے زیادہ کھبی ہوئی تھی وہ تھیں بھولا کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی بے نور آنکھیں۔

راحت نے سوچ بچار کر دو دن کی محنت سے رپورٹ تیار کی اس میں اس نے تین باتیں دکھلائیں ایک تو یہ کہ بونکٹ پور میں بالشویک یا غیر بالشویک کسی قسم کی بھی کوئی سازش نہیں ہے دوسرے یہ کہ وہاں بے چینی ضرور ہے خاص کر ان لوگوں میں جن کے عزیز لام سے واپس آئے ہیں یا جن کے عزیز لام پر مارے گئے ہیں۔ کیوں کہ ان کی قربانیوں کی کوئی خاص قدر نہیں کی گئی اور تیسری بات یہ کہ حکومت، اور نواب اور مہاجن اور سرکاری افسر یہ سب مل کر اس طرح کسانوں کو دبا رہے ہیں اور کسانوں کی آمدنی میں حصہ بٹا رہے ہیں کہ کسانوں کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ ذرائع آمدنی بھی سکڑتے جاتے ہیں اور ان کی تندرستی اور اخلاق بگڑ رہے ہیں۔

رپورٹ پڑھ کر انگریز کلکٹر نے کہا۔ یہ آپ نے بالشویک سازش کی رپورٹ لکھی ہے یا ہوم رول والوں کی طرح سے میمورنڈم لکھا ہے۔

خان بہادر کو اس وقت راحت رسول کے چہرے پر کچھ عجیب کرب اور عجیب تفکر نظر آیا۔ انھوں نے پوچھا۔

"آپ کے نزدیک سرکار کو کیا کرنا چاہیئے۔"

راحت رسول نے مذکورہ یادوں سے چونک کر جواب دیا۔

"کس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے۔؟"

"یہ جو لاکھوں فوجی لام پر سے بڑی بڑی خدمتیں انجام دے کر واپس آ رہے

یں اور جو فوجی مر گئے یں ان کی لاکھوں بیوائیں ہیں۔ ان لوگوں کی قربانیوں کی قدردانی بھی تو ہونا چاہیئے قدردانی کرنا یہ کس کا فرض ہے سرکار کا یا ہم لوگوں کا؟"

"میرا خیال یہ بھی ہے کہ آج جو پنجاب میں آگ لگی ہوئی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنجابی فوجیوں کو احساس رہا ہو کہ ان کی قربانیوں کی صحیح قدر نہیں کی گئی۔"

خان بہادر نے گورنمنٹ کی فوجی پالیسی پر بھری محفل میں ایسا سخت تبصرہ جو کر دیا تو نواب افسرالدولہ سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے کافی سخت لہجے میں جواب دیا۔

"پنجاب کو تو ڈائر نے اچھا سبق دے دیا۔ جلیانوالا باغ میں گھیر کر ہزاروں آدمیوں کو بھون کر رکھ دیا اور ایک خاص گلی سے گزرنے والوں کو کہ وہاں سے جو بھی گزرے چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوئے گزرے ——— ڈائر کا حکم چل گیا اور گاندھی کچھ نہ کر سکا۔"

خان بہادر نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔

نواب صاحب اتنا آگے نہ جائیے آپ بھی تو آخر ہندستانی ہی ہیں!

(۳۲)

لکھنؤ کے لوگوں نے تو خیر بجلی کے قمقمے جلتے ہوئے دیکھے تھے لیکن قصبوں اور ضلعوں سے آنے والے بعض مہمانوں، ان کی بیوی بچوں اور نوکروں کے لئے تو بجلی ہی ایک عجیب چیز تھی اسے دیکھ کر وہ انگریز کی کاریگری پر حیران رہ جاتے تھے کہ یہ کیسے جلتی ہے؟ نہ تیل نہ بتی نہ دیا سلائی اور پھر قمقمہ ہر طرف سے بند لیکن جن لوگوں نے بجلی کے قمقمے دیکھے تھے ——— انھوں نے بھی اتنی تعداد میں

آج تک نہیں دیکھے تھے جتنے ان کو برات کی آمد کے وقت محل میں جگمگاتے نظر آ رہے تھے۔ بجلی کے رنگ برنگی قمقمے درختوں کے اندر پھلوں کی طرح بھی لگے ہوئے تھے اور پھولوں کی جھاڑیوں کے اندر بھی جگمگا رہے تھے اور دیواروں پر بیلوں کی طرح چڑھے ہوئے تھے اور دیوان خانے کے اندر جگہ جگہ ان کے بنے ہوئے خوبصورت خوبصورت ہار پڑے تھے برات کے جشن کے لئے جو بارگاہ بنائی گئی تھی اس میں درجنوں جھاڑ اور فانوس لگائے گئے تھے لیکن ان میں بھی موم بتی کی جگہ قمقمے روشن تھے جب سہرا پڑھنے والے شاعر نے کہا "زمیں پر سجائی ہے تاروں کی محفل" تو ہر طرف سے صدا آئی سچ ہے سچ ہے۔

بجلی کی اسی چمک دمک میں دولھا کی مسند بھی کچھ کم روشن نہیں تھی۔ اس کا زربفت کا کام بھی جس میں سچے نگ کھپا دیئے گئے تھے بجلی کی روشنی میں کہکشاں معلوم ہو رہا تھا اس پر جگمگا رہے تھے۔ دولھا کا سہرا اور مرصع جوڑا اور سر بالا کی پگڑی اور کلغی۔

روشنی اور رنگ کے اس طوفان سے خوشبو کی لپیٹیں بھی آ رہی تھیں کیوں کہ مالیوں نے جانے کتنے باغوں کی خوشہ چینی کی تھی اور بارگاہ کے ہر گوشے کو گلدستوں اور پھولوں کے پردوں سے داماں باغبانی و کف ستون گل فروش بنا دیا تھا پھولوں کی خوشبو میں مہمانوں کے قیمتی عطر اور حقوں کی تمباکو سے اٹھنے والا مشک و عنبر سے پُر دھواں بھی اپنی اپنی مہک ملا رہے تھے۔

نکاح، سہروں اور مبارک بادوں کے بعد ناچ گانے کی اصل محفل شروع ہوئی۔ ملکہ جان نے بارے کی پیشواز پہن کر ہزاروں ناز و ادا والے ہاتھ اٹھا کر یہ غزل چھیڑی تھی۔

جانے کیا ساقی کی نظروں نے اشارہ کر دیا
نذرِ ساغر آج ہم نے زہد و تقویٰ کر دیا

ملکہ جان کی آواز ہی ایسی تھی جو دل کو برما رہی تھی اس میں کوئل کی کوک کے ساتھ ساتھ سسکی ملی ہوئی تھی جو ذرا دیر میں محفل کو تڑپا دیتی تھی۔ پھر ملکہ جان کا بتانا نظروں کے اشارے کو اس طرح آنکھوں سے بتایا کہ لوگ دل پکڑ کر رہ گئے پھر وہی آنکھ ساغر بھی بن گئی اور پھر اسی نے زہد و تقویٰ بھی لوٹ لیا۔

زہد و تقویٰ کو صرف ایک اشارے سے تبلایا۔ بس چٹکی سے صرف تسبیح کا ایک دانہ اٹھا کر مگر کیا اثر ہوا ہے اس زہد و تقویٰ کا!!

پھر ملکہ جان کا گھونگھٹ کاڑھ کر ذرا گردن کو خم دے کر بتانا کہ کس طرح تسبیح آنکھوں پر قربان ہو گئی۔

دو غزلیں گا کر ملکہ جان گئی اور مرلقا آئی اس کے چہرے پر کچھ ایسی معصومیت اور ناواقفیت تھی کہ اگر کسی اور جگہ دیکھو تو شبہ تک نہ ہو کہ یہ طوائف زادی ہے وہ آکر سازندوں کے آگے جب کھڑی ہوئی تو بھولی بھالی سی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ ساز بجتا رہا۔ بجتا رہا پھر اک دم سے چھم کر کے جو بھاؤ کے ساتھ اس نے ہاتھ اٹھائے ہیں اور کمر لچکائی، جوبن چڑھائی ہے تو وہ شباب مجسم بن گئی۔

چھم چھم، چھما۔ چھم چھم —— معلوم ہوا کہ دنیائے حسن و شباب میں زلزلہ آگیا وہ گھونگھٹ ڈال کر آگے بڑھنا۔ وہ خم لے کر خنجر کی طرح کترا کر نکل جانا۔ وہ گھونگھٹ کا پٹ کھول کر نینوں کے بان مارنا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینا اور پھر اس طرح اپنی نظروں کو دیکھنے والے کی نظروں سے کھینچنا جیسے ریشم کی ڈوری سرسراتی ہوئی پھسلتی ہوئی اچانک ہاتھ سے نکل جائے اور پھر نظروں کا شکاری پرندے کی جھپٹ کے ساتھ لوٹنا اور آنکھوں میں

سما جانا۔

مہ لقا نے کمال یہ کیا کہ جب انگریز کمشنر آکر محفل میں بیٹھا تو اس نے انگریزی کی ایک سانٹ بہت صحیح تلفظ کے ساتھ غزل کی لے پر گا دی اور ساتھ ساتھ رقص بھی کیا اور بتا یا بھی اس پر تو انگریزی جاننے والے سب ہی لوٹ پوٹ ہو گئے اور کمشنر کی آنکھوں سے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر بس چلے تو اس متحرک شعلہ کو سوڈے کے ساتھ اپنے گلاس میں ڈال کر پی جائے۔

کمشنر نے دس دس کے دو نوٹ نکال کر دیری گڈ" دیری گڈ کہہ کر مہ لقا کی طرف بڑھائے وہ رقص کرتی ہوئی آئی اور اس طرح آئی کہ نوٹ کے ساتھ صاحب بہادر کی انگلی سے انگوٹھی بھی اتر والی۔

محفل جمی ہوئی تھی مہ لقا کی غزلوں پر غزلیں ہو رہی تھیں۔ حاضرین بالکل محو بیٹھے ہوئے تھے کہ خان بہادر صاحب جن کو مندرہ منٹ ہوئے ایک آدمی آکر باہر بلا لے گیا تھا کچھ غصے سے بھرے ہوئے اور کچھ متفکر سے واپس آئے اور راحت رسول کو محفل سے اٹھا کر باہر لے گئے اور کہنے لگے۔

کیا میرے علاقے میں آپ کے مشورے سے مولانا کی گرفتاری اور جلسے پر لاٹھی چارج ہوا ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو بہت افسوس کی بات ہے اور آج سے آپ کے اور میرے تعلقات ختم سمجھئے آپ؟ اب آپ مجھے پکا خلافتی سمجھئے۔ وہ دن دور نہیں ہے جب میں بھی قانون شکنی کروں گا۔۔۔"

خان بہادر صاحب بہت غصہ میں تھے لیکن راحت رسول کو ان کے غصہ پر غصہ نہیں آیا وہ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا کچھ سوچنے لگا۔

خان بہادر نے اپنی بات کا راحت رسول پر جو رد عمل دیکھا وہ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

آخر راحت رسول نے کچھ فیصلہ کرکے اپنی جیب سے ایک تار نکال کر خان بہادر کی طرف بڑھا دیا۔ ملاحظہ ہو یہ میری جیب میں نرسوں سے پڑا ہوا ہے۔

تار میں یہ تھا، تمھارا فوری تبادلہ کیا جاتا ہے۔ ہمیرپور جا کر ایک ہفتہ کے اندر کپتانی کا چارج لے لو۔

خان بہادر کا غصہ قدرے فکر میں بدل گیا

سوچ پور کے بعد ہمیرپور!! کیا یہ ترقی ہے؟

"یہ ترقی نہیں تنزلی ہے"۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے قصبے کی گرفتاریوں اور لاٹھی چارج سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے لاٹھی چارج میں چھ آدمی مر گئے جن میں ایک عورت بھی تھی اور سولہ زخمی ہو گئے۔

مگر یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ سرکار کے معتوب ہو گئے۔ مگر یہ کیوں؟"

"میں نے ایک اَن ڈیپ لومے ٹک رپورٹ دے دی تھی"۔

"کیسی رپورٹ؟"

راحت رسول نے مختصر طور پر بتلا دیا کہ ڈپٹی کمشنر نے کٹ پور میں اس کے سپرد کیا کام کیا تھا اور اس نے کیسی رپورٹ دی۔

میں نے لکھا تھا کہ اس علاقے کے کسان سخت مصیبتوں میں گرفتار ہیں اور جب تک حکومت ایک معقول اسکیم بنا کر عرصے تک کوشش نہ کرے گی وہ تباہی میں گرتے چلے جائیں گے نہ ان کے پاس آب پاشی کا انتظام ہے نہ چراگاہ ہے

نہ عمارتی لکڑی کا ہے' نہ اینڈھن بچا اور نہ اسپتال' نہ زچہ خانہ' نہ اچھے مویشی نہ اچھے بیج' نہ زراعت کی صحیح تربیت' نہ اسکول ـــــ وہ لوگ اپنی دو دو تین تین فصلیں پیشگی سستے داموں پر بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گوبر وہ دراصل بہترین کھاد ہے اس کو مجبوراً جلاتے ہیں۔ دوسری طرف بڑے اور چھوٹے دونوں زمیندار طرح طرح سے آئے دن رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں اور اچھوتوں سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔"

"آپ نے ایسی رپورٹ دے دی"؟

"ہوا یہ کہ ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایسی رپورٹ چاہتا ہے جس میں اصلی حالت کی سچی تصویر ہو اور جس کی بنا پر وہ انصاف کر سکے اس لئے میں نے ایسی ہی رپورٹ دے دی۔ اس کا یہ پھل ملا۔"

"خان بہادر صاحب (مسکرا کر) آپ کو نہیں معلوم کہ جب انگریز کہتا ہے کہ میں انصاف کرنا چاہتا ہوں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

"یہ بات تو میں اب سمجھا کیوں کہ ان لوگوں کی ڈکشنری دوسری ہے اور یہاں دوسری۔"

"لیکن میں اس بات کو بہت پہلے سمجھ گیا تھا اور اسی پر میں نے خطاب حاصل کر لیا جب بھی انگریز رپورٹ مانگے اور کہے کہ وہ انصاف کرنا چاہتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ رپورٹ ایسی دو جو اس کو ظلم کرنے کے بہانے مہیا کر دے یعنی جب کوئی شخص انگریز پر اعتراض کرے کہ یہ تم کیا کر رہے ہو تو وہ عذر کے طور پر رپورٹ پیش کر کے کہے کہ جب ایسی رپورٹ سامنے ہے تو میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔"

"اب میں سب کچھ سمجھ گیا میں نے انگریز کو پہچان لیا۔ ساتھ ساتھ اپنے

ملک کو بھی پہچان لیا خان بہادر صاحب کٹ پور کے چند کردار سانولی، بھولا،
امر، چمیا اور رمضان میری زندگی کا جز بن گئے ہیں اور میرے کردار میں سما گئے
ہیں یہ اب میرے اندر سے نہیں نکل سکتے ہیں۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے میں ایک
ہمیشہ سے ان کو دیکھ رہا ہوں ان کردار کے مقابل میں آتے ہیں۔ مہاراج، نواب
صاحب اور کلکٹر میں حیران ہوں کہ خود کو کس صف میں رکھوں میں راتوں کو جانماز
بچھا کر دعا کرتا ہوں کہ خدا مجھے صحیح راہ دکھلائے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے

ہمارے ملک میں ۲۶ کروڑ امر، چمیا، رمضان، سانولی اور بھولا ہیں
پانچ سالہ اندھا بھولا مجھ سے بہت ہل گیا تھا رخصت ہوتے وقت اس نے ٹٹول کر میری
گردن میں باہیں ڈال دیں اور کہنے لگا کہ :-

"چاچا میں پڑھنا چاہتا ہوں" میں نے پوچھا تم پڑھو گے کیوں۔
اس نے جواب دیا تاکہ میں بھی بیا کی طرح باتیں کروں اور سب
سنا کریں۔ یہ سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ علم کا شوق اس چمار کے گھر میں۔
خان بہادر صاحب ہم نہیں جانتے ہیں کہ اس کیچڑ میں کتنے لال چھپے ہوئے ہیں
لیکن افسوس ان کی خبر لینے والا کوئی نہیں ہے نہ سرکار اور نہ کوئی اور ـــــ"

"خدا تو ہے ......"

ٹھیک کہا آپ نے میرے دل سے بھی یہی آواز نکلتی ہے جس
کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے خیالات کی دنیا میں بالکل
تنہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک عظیم وحشت ناک صحرا میں کھو
گیا ہوں۔ راہ راست حاصل کرنے کے لئے مسلسل خدا سے دعا مانگ رہا ہوں

"ایاک نعبد و ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم"

گھبرائیے نہیں آپ کو انشاء اللہ صراط مستقیم کی ہدایت ملے گی یہ کیا کم ہے شیخ صاحب کہ خدا نے آپ کو نماز کی اور یاد خدا کی توفیق دی۔ ورنہ آپ اور ....."

خان بہادر نے اپنی زبان پکڑلی۔ راحت رسول جب علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو انھوں نے سوٹ کو اپنا مستقل لباس بنا لیا تھا اور اپنا نام شیخ راحت رسول سے راحت رسول شیخ کر لیا تھا وہ دوستوں سے انگریزی میں باتیں کرتے تھے جب لا کے کلاس میں آئے تو ایک اینگلو انڈین لڑکی سے عشق بھی کرنے لگے۔ یہ عشق دو سال چلا وہ لڑکی اکثر ان کے ساتھ نظر آتی تھی اور دونوں کبھی کبھار ساتھ گرجا بھی جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو چھٹی گزارنے علی گڑھ سے دہلی بھی ساتھ جایا کرتے تھے۔ لیکن جب راحت رسول شیخ ڈپٹی کلکٹر نہ ہو سکے اور انھوں نے پولیس انسپکٹر بننا منظور کر لیا تو اینگلو انڈین لڑکی نے ان کو چھوڑ دیا اس جدائی کی کوفت میں ان کی کچھ انگریزیت کم ہو گئی لیکن مذہب کا اثر ان پر کبھی نہیں چڑھا۔ راحت رسول نے خان بہادر کی ادھوری بات کے جواب میں کہا۔

آپ نے صحیح فرمایا۔ مجھے مذہب سے کبھی کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ مجھ پر اچھے اور برے سب وقت پڑ چکے ہیں اور سخت آزمائشوں سے بھی گزر چکا ہوں اور بڑے بڑے فیصلے بھی کر چکا ہوں لیکن کٹ پور سے آکر جس تذبذب اور کشمکش میں گرفتار ہوا ہوں ویسا کبھی نہیں ہوا۔ اب نہ تو کپتانی کی کرسی پر بیٹھ کر مزا آتا ہے نہ سیر و شکار میں، نہ ناچ گانے میں، نہ بیوی بچوں میں معلوم ہوتا ہے کہ دل مچھلی پکڑنے والے دو کانٹوں میں الجھا ہوا ہے ایک اس طرف گھسیٹ رہا ہے تو دوسرا دوسری طرف۔ دل کا سکون راتوں کی نیند میں اور ہونٹوں

کی ہنسی تو ایسی لگی کہ گویا قلقاری ہنیں ایسے میں مجھے خدا یاد آیا اور ایسا نظر آیا کہ اگر میری مشکل آسان ہوسکتی ہے تو اسی کی اعانت سے ہوسکتا ہے۔ ایا کہ نستعین ہے؟

اچانک ان دونوں نے محسوس کیا کہ بارگاہ میں ناچ گانا بند ہوگیا ہے۔ یہ محسوس کرکے دونوں اس طرف متوجہ ہوئے دیکھا تو نواب افسرالدولہ تقریر کر رہے ہیں۔

ہماری گورنمنٹ یعنی دولت برطانیہ بہادر ہندستان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اس نے ہم کو یہ ریلیں دیں۔ اسکول اور کالج دیئے امن اور تہذیب دیئے ان احسانوں کے لئے اس کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے میں اپنی بیٹی کی شادی کی خوشی میں اسے ایک حقیر نذرانہ پیش کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر نواب صاحب نے اپنے اردگرد کے ساتھیوں کو دیکھا۔

وہ حقیر نذرانہ ہے امن سبھا کا قیام جس کے ممبروں میں لالا شیام ناتھ ڈاکٹر گپتا اور شہر کے معززین شامل ہیں اس سبھا کے ابتدائی اخراجات کے لئے میں دس ہزار کی حقیر رقم کمشنر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

کمشنر۔ "تھینک یو۔ تمام سمجھدار ہندستانیوں کو اس وقت امن سبھائیں بنا بنا کر حکومت برطانیہ کی خدمت کرنا چاہیئے۔

اس فقرے پر نواب صاحب نے تالی بجائی انھوں نے غلطی یہ کی تھی کہ اپنے آدمیوں اور ملازموں کو خاص طور سے ہدایت نہیں کی تھی کہ وہ مستعد رہیں اور موقع پر اشارہ پاتے ہی تالیاں بجائیں نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ

مجمع تھا پانچ سو کا لیکن تالیاں بجائیں صرف دس پندرہ آدمیوں نے تالیوں میں سب سے زیادہ زور دار تالی تھی نواب صاحب کے چار مصاحبوں کی۔

کمشنر صاحب نے مسکرا کر مہ لقا کی طرف دیکھا اپنے گلاس کا آخری گھونٹ پیا اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تالی نہ بجانے والوں میں پنڈت دیبا شنکر اور مشتاق احمد تو تھے ہی لیکن ان میں ایک سرکاری ملازم بھی تھا یعنی راحت رسول اور اس بات کو سب نے بہت حیرت سے دیکھا۔

(۴)

محفل پورے شباب پر تھی، مہ لقا کا ناچ ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور مقبول حسین کشمیری کا ناچ گانا شروع ہونے جارہا تھا، اس کے ساتھیوں نے گھوڑے چھوڑنا شروع کر دیئے تھے اور لوگ اس پر ہنس رہے تھے۔ مہ لقا کی قائم کی ہوئی سنجیدہ رومانی فضا بدل رہی تھی اور اب لوگ نئی قسم کی دلچسپیوں کی توقع کر رہے تھے۔ اس حالت میں اچانک راحت رسول نے محفل سے اٹھ کر اپنی پانچ سالہ لڑکی فریدہ کو اشارے سے الگ بلایا اور اس کے کان میں کہا کہ "محل میں جاؤ اور اپنی امی جان کو ڈھونڈ کر ان کو ڈیوڑھی میں بلا لاؤ۔"

بیس منٹ کے اندر راحت رسول کی بیوی سلیمہ ڈیوڑھی کے بغل والے کمرے میں آ گئیں جہاں چھ سات کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور دو دیوار گیریاں روشن تھیں۔

سلیمہ آئیں تو ان کے ساتھ شادی کی زنانی محفل کی چہل پہل اور

بے فکری اور مسرت بھی آگئی۔ سلیمہ کا بدن دبلا بھرا بھرا اور گداز تھا جس کو دیکھ کر تعیش اور بھرپور پن کا احساس ہوتا تھا۔ قد بھی ذرا نکلتا ہوا تھا۔ اس پر کشمیری کام کی گلابی ریشمی ساری رام پور کے سنہرے کپڑے کا بلاؤز اور حضرت گنج سے خریدا ہوا انگریزی اسٹائل کا کوٹ یہ سب چیزیں بڑی پھبن دکھا رہی تھیں۔ سلیمہ کے بال الٹے بنے ہوئے تھے جس کا نیا نیا فیشن چلا تھا اور اپنے نئے پن کی وجہ سے اس میں بڑی کشش تھی۔ پیچھے حیدرآبادی اسٹائل کا جوڑا تھا کانوں میں جھومتے ہوئے بندے اور گلے میں یاقوت کا دو لڑا ہار۔ سلیمہ کے چہرے پر نوری بلاوے کی وجہ سے ذرا سی تشویش تھی۔ اس لباس میں اس بناؤ اور اس مسرت پر یہ تشویش وہ بے حد پیاری معلوم ہو رہی تھی۔

پمپ شو میں کھٹ کھٹ کرتی اور ساری کا آنچل سنبھالتی ہوئی سلیمہ آکر بڑے اسٹائل سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اس کے لبوں پر تشویش کے ساتھ دبی سے مسکراہٹ بھی تھی جس میں پیار کی مانگ بھی تھی اور اس کا وعدہ بھی۔ اس کے کپڑوں کے رنگوں کے ساتھ ساتھ کئی طرح کے عطروں کی مہک بھی آرہی تھی جس میں سردرد بھی تھا اور چٹخارہ بھی۔

راحت کو شادی کئے آٹھ سال گزر چکے تھے لیکن اس کو اپنی بیوی میں اس وقت تک باسی پن محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ نظر بھر بھر کر دیکھنے لگا۔

"کچھ کہئے بھی تو۔ کیوں بلایا ہے؟ کیا صرف گھورنے کو بلایا ہے؟"

جب راحت رسول کو توقع کے مطابق ڈپٹی کلکٹری نہ ملی اور اس ناکامی پر اس کو اینگلو انڈین محبوبہ نے چھوڑ دیا۔ تو وہ شادی کے نام سے چڑھنے لگا۔ اور اس طرح دو سال نکل گئے۔ پھر ایک دن اس کی بڑی چچازاد بہن نے

جب بلا کسی تمہید کے پوچھا کہ راحت تم آخر کیسی لڑکی سے شادی کرو گے تو راحت نے سرسری طور سے جواب دیا کہ ایسی لڑکی سے جو شریف گھرانے کی ہو، خوبصورت ہو اور اسکول میں پڑھی ہوئی ہو۔

سلیمہ نے اسکول میں چھ سال پڑھا تھا اور ایک کالی میم سے انگریزی بولنا بھی سیکھی تھی۔ لیکن جو فن اس کو خوب آتا تھا وہ تھا اسٹائل سے کپڑے پہننا اکڑ کر اور صوفے پر بن سج کر بیٹھنا اور ڈرائنگ روم میں آنے والوں سے بہت تمیز سے اور اپنے کو لئے دیے رہ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنا۔ راحت کی بہن نے کسی ترکیب سے راحت کو چھپ چھپا کر یہ لڑکی اس وقت دکھلا دی جبکہ وہ راحت کے چچا شیخ صاحب کے ڈرائنگ روم میں آکر اسٹائل سے بیٹھی تھی۔ سلیمہ کی صورت، پھبن اور اس کی نشست کی اسٹائل کو دیکھتے ہی راحت لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اتفاق سے سلیمہ کے باپ کو بھی یہ رشتہ اچھا معلوم ہوا اور دو مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔

سلیمہ جب بیوی بن کر آگئی اور راحت کے ساتھ رہنے لگی تب راحت کو محسوس ہوا کہ ڈرائنگ روم میں وہ جیسی بھی لگے لیکن گھر کے اندر تو وہ بالکل ہی پرانی قسم کی عورت ہے۔ سلیمہ صبح پلنگ کا بستر تہہ کرکے کھرے پلنگ پر پاندان کھول کر اور ایک پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتی اور کتھا چونا انگلی سے چاٹ کر انگلی پٹی میں پونچھتی جاتی۔ کھانا بھی سینی میں منگوا کر اسی پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کھا لیتی اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ باورچی خانہ ہی میں پیڑھی پر بیٹھ کر ہاتھ میں تام چینی کی پلیٹ لے کر جو چیز چاہتی وہ پتیلی سے اس میں نکالتی جاتی اور کھاتی جاتی۔ کیلے سنترے وغیرہ جو کھاتی، اس کے چھلکے پٹی کے نیچے ڈال دیتی اور وہ اس وقت تک

پڑے نہ ہتے جب تک صبح یا شام والی جھاڑو نہ ہو۔

سلیمہ گھر میں جو کپڑے پہنتی ان میں کوئی بھی خاص رونق نہ ہوتی تھی۔ دوپٹہ تو ہمیشہ بہت ہی بے ڈھنگے پن سے اوڑھتی تھی۔ یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سلیمہ وہی سلیمہ ہے جو اس وقت نظر آتی ہے جب اپنے ڈرائنگ روم میں کوئی تکلف والا مہمان آتا ہے یا جب وہ خود کہیں مہمان بن کر جاتی ہے۔ لیکن سلیمہ اپنے اس بے ڈھنگے پن کے باوجود اپنے شوہر کا ڈرائنگ روم، دفتر اور کھانے کی میز کو ہر وقت صاف ستھرا رکھتی تھی اور شوہر کو جب بھی کھانا کھلاتی میز پر سفید چادر بچھا کر اور چینی کی پلیٹوں میں باقاعدگی کے ساتھ کھلاتی۔ مگر خود اسی وقت شوہر کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھتی جب کوئی مہمان ہوتا۔

دو باتیں سلیمہ میں اور ایسی بھی جن کو موجودہ دور کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ سوتے وقت بچوں کو پیار سے قرآن کی سورتیں اور انگریزی بولنا سکھلاتی تھی۔ اور دوسرے اردو کا ایک اخبار اور ایک زنانہ رسالہ ضرور منگواتی اور ان کو شروع سے لے کر آخر تک مع اشتہارات کے پڑھ ڈالتی تھی اور ہاں ایک بات اور بھی تھی وہ یہ کہ سلیمہ اپنے بچوں کو بہت اچھے کپڑے پہنا کر اسکول بھیجتی تھی۔ ان کپڑوں میں صرف پیسوں ہی کا حسن نہیں ہوتا تھا سلیقے کا بھی حسن ہوتا تھا۔ چنانچہ فریدہ اپنے اسکول میں بہت ماڈرن قسم کی خوش پوش لڑکی سمجھی جاتی تھی۔

سلیمہ کو ناولوں کا بھی شوق تھا لیکن ان میں صرف اسلامی تاریخی ناولیں پڑھتی تھی۔ اسی وجہ سے اسے شرر کی ناولیں بہت پسند تھیں۔

سلیمہ نے ادا سے شوہر کی طرف دیکھ کر پھر پوچھا۔

"ارے کچھ تو کہئے۔ آخر کیوں بلایا ہے؟"

راحت سے ہنسی بن پڑا کہ اس مسرت سے لبریز فضا میں پریشانی سے بھرپور بات کیسے شروع کر دے۔

"کیا جب کوئی بہت ہی ضروری بات ہو تب ہی تم کو بلاؤں۔ محفل میں جی گھبرا گیا۔ میں نے کہا ذرا تم سے پوچھوں کہ تین روز محل کے اندر کیسے گزارے۔

"اس وقت تو اندر کانگرس کی سبھا جمی ہوئی تھی میں اس کو چھوڑ کر آرہی ہوں۔"

"کانگرس کی سبھا!!"

راحت رسول کو سلیمہ کی جو باتیں بہت اچھی لگتی تھیں، ان میں سے ایک تھی لوگوں پر تبصرہ۔ خاص کر جب وہ کسی محفل سے آتی تو ایسے تبصروں سے بھری ہوئی آتی اور فوراً ہنس ہنس کر راحت کو وہاں کے قصے سنانے لگتی۔ اس وقت سلیمہ کے فقرے سے راحت سمجھ گیا کہ کوئی زبردست تبصرہ ہونے والا ہے۔

سلیمہ کا تبصرہ دل چسپ بھی ہوتا تھا اور تلخی اور رشک و حسد سے پاک بھی۔ وہ غیر عورتوں کے لباس اور وضع قطع پر جلا کٹا تبصرہ نہیں کرتی تھی۔ ورنہ عام طور سے عورتیں تو اس طرح کی باتیں کرتی تھیں کہ اے بہن مرزائن تو آج زیوروں سے ایسی لدی پھندی آئی تھیں کہ پاؤں میں سونے کے لچھے تک پہن لئے تھے۔ جب گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھیں تو ان کو خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ

لوگوں کی اس بات پر نظر نہ پڑے کہ مرے پاؤں میں سونے کے چھلے ہیں۔ اس لئے
انھوں نے ہاتھ نیچے لے جاکر پاؤں کو ڈھیل دے کر پائنچے اوپر چڑھا لئے۔ دیکھو تو سہی
یہ سنا کہ آدھے بال سفید ہو گئے ہیں اس پر یہ ٹھاٹ باٹ۔ بوڑھی گھوڑی لال
لگام۔ یا یوں کہتیں کہ وہ جو ہے کچہری باغ کے وکیل صاحب کی بڑی بٹیا وہ
آج الٹے بال بنا کر اور ذرا سا دوپٹہ اوڑھ کر آئی تھی، فیشن کے مارے کرسٹان
بنی جارہی ہے۔ یا یوں کہتیں کہ مہرن نے شوہر کو مجسٹریٹ بنے ابھی سال بھر
بھی نہیں ہوا لیکن وہ میموں کا پرس لے کر چلنے لگی ــــ اور زبان کو اس طرح
اینٹھا اینٹھا کر باتیں کرتی ہیں گویا ساری زندگی لندن میں کٹی ہے، بس دو
ہی چار مہینے ہوئے ہیں کالوں کے دیس ہندستان میں آئے ہوئے۔

سلیمہ کی باتیں بالکل دوسری طرح کی ہوتی ہیں۔ جب راحت
نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"جی ہاں میں تو سچا ہی کہوں گی۔ آج شکر مل والے سیٹھ صاحب
کی شریمتی جو آئیں تو موٹے کھدر کی ساری باندھے ہوئے۔ کہنے لگیں اپنے
ملک کے کپڑے پہن کر دل کو بہت آنند آتا ہے۔"

یہ سن کر مجسٹریٹ صاحب کی بیوی اپنے پاس والوں سے مسکرا کر
کہنے لگیں۔ "آنند بھی آتا ہے اور روپیہ بھی بچتا ہے۔"

ان کے ساتھ والیاں ہنس دیں مگر خاں بہادر صاحب، مشتاق
احمد کی بیگم صاحبہ کہنے لگیں۔ "بہت عمدہ بات کہی آپ نے۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ کھدر پہننے والوں کو دوہرا فائدہ ہے۔ آم کے آم گٹھلی کے دام ــــ
شاید اسی لئے تو گاندھی جی اور مولانا شوکت علی محمد علی کہتے ہیں کہ کھدر کے

کپڑے پہنا کرو۔

"گاندھی اور مولانا شوکت علی محمد علی! میں تو ان لوگوں کا نام بھی نہیں سن سکتی۔"

اب تو خان بہادر ن جھاک کر بولیں۔

"یہ جو مجھے آپ نے پہلے سے نہیں بتایا تھا ورنہ نام لینے سے پہلے آپ سے درخواست کرتی کہ تھوڑی زرا زحمت تو ہوگی اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں رکھ لیجئے اے ہاں ان لوگوں کا نام کیا ہوگیا لاحول ہوگیا۔"

اب تو مجسٹریٹ کی بیوی کے تیور چڑھ گئے۔

"آپ جانتی ہیں کہ گاندھی اور محمد علی اور شوکت علی، ورابوالکلام اس قسم کے لوگوں کے مقدمے مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں آتے ہیں اور وہی ان کو سزائیں دیتے ہیں۔

"ارے ان لوگوں کے مقدمے مجسٹریٹ کرتے ہیں"!! مجسٹریٹ!!

"کیوں اس میں حیرت کی کون سی بات!!"

"ان لوگوں کے مقدمے اور مجسٹریٹ کی عدالت میں۔ توبہ توبہ۔!!"

"اس میں بے تکی بات کون سی ہے"۔

"میں تو آج تک یہ سمجھتی تھی کہ ان موؤں کے مقدمے زیادہ سے زیادہ کانسٹبل کے پاس جاتے ہوں گے۔ "کہاں مجسٹریٹ اور کہاں یہ لوگ"۔"

اس پر ساری محفل مسکرا پڑی اور مجسٹریٹ کی بیوی کے تن بدن میں

تو آگ ہی لگ گئی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ پہلو پر پہلو بدلنے لگیں آخر انھوں نے بیٹھے موڑی اور اپنی خادمہ کو ڈانٹنے لگیں کہ۔

"میرے لئے گاؤ تکیہ کیوں نہیں لائی ابھی تک۔"

یہ قصہ سن کر راحت ہنسنے لگا اور ساتھ ساتھ سلیمہ بھی ہنسنے لگی۔

ہنسی ختم ہوئی تو سلیمہ نے پھر پوچھا۔

"اب تو بتا دیجئے کہ کیوں میری طلبی ہوئی ہے۔"

"کل تار آیا ہے کہ میرا تبادلہ کر دیا گیا۔"

"تبادلہ۔ ہوں۔ زرا زحمت تو ضرور ہو گی۔ مگر پھر بھی نوکری کا پھر نوکری ہے۔ سرکار کی جو مرضی ہو۔ کسی اچھی ہی جگہ تبادلہ ہوا ہو گا۔"

"نہیں سلیمہ یہ بات نہیں ہے یہ تبادلہ مجھے سزا میں ملا ہے۔"

"سزا؟" سلیمہ گھبرا گئی۔

"ہاں سزا۔ تبادلہ کے ساتھ ساتھ تنزلی بھی ہے۔"

"سلیمہ گھبرا کر راحت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دو منٹ کے بعد اپنے کو سنبھال کر بولی۔

"ارے رحیم رحیم۔ ابھی تو ترقی پر پوری طرح خوشی بھی نہ ہونے پائی تھی۔ اب پیسے کا نقصان بھی ہو گا اور اس تنزلی پر لوگوں کی خوشی اور جلی کٹی بھی برداشت کرنا ہو گی۔ مگر یہ سب تو ہوا ہی کرتا ہے۔ سرکاری نوکری کی فکر نہ کیجئے۔"

راحت سلیمہ کے جواب سے سمجھ گیا کہ سلیمہ اپنے ناتجربہ کارانہ کسی وجہ سے سمجھی نہیں ہے۔ اس تنزلی کی حقیقت۔

اس نے جواب میں کہا

"میں نے یہ کہنے کے لئے بلایا تھا کہ نواب بیگم سے اجازت لے کر گھر چلو بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

رخصت لے کر گھر چلوں!! کیسی باتیں کرتے ہو لڑکی کی رخصتی سے پہلے چل دوں تو لوگ کیا کہیں گے۔"

"بہت سے لوگ تو نکاح کے بعد ہی اجازت لے کر چلے جا چکے ہیں۔"

"ان کی بات دوسری ہے۔ آپ میں اور نواب صاحب میں تو خصوصی تعلقات ہیں۔ اس لئے ہم لوگوں کو ٹھہرنا چاہیئے۔"

"مصنوعی تعلقات تھے مگر اب ہم دونوں کے بیچ میں آبنائے انگلستان حائل ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا کچھ شکر رنجی ہوگئی ہے"؟

"نہیں ایسی بات نہیں۔ لیکن پھر بھی ہم دونوں میں بہت دوری ہوگئی ہے۔ اور اب یہاں ٹھہرتے ہوئے میری سانس گھٹتی ہے۔"

سلیمہ سوچنے لگی کہ یہ کیسے معاملات ہیں۔ ایک طرف ایسا تبادلہ ہوا ہے جس میں ترقی نہیں ہے دوسری طرف نواب سے ایسا اختلاف پیدا ہوگیا ہے جس میں شکر رنجی نہیں ہے بلکہ آبنائے انگلستان حائل ہے۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لڑکی کی رخصتی سے پہلے چل دوں۔ لیکن سلیمہ نے

یہ ضرور محسوس کیا کہ راحت رسول اپنے ارادہ میں پکا ہے اور وہ واقعی اسی وقت جانا چاہتا ہے۔ اور اس فیصلے کو بدلنے پر وہ آمادہ نہیں ہے۔

ایک گھنٹہ کے اندر راحت رسول اپنے خاندان کو لے کر سوچ پور چل دیا۔

راحت رسول اپنی کار خود چلاتا تھا اس نے سلیمہ کو آگے اپنے پاس کی نشست پر بٹھا لیا اور فریدہ اور مقصود دونوں سوتے ہوئے چھوٹے بچوں کو پیچھے کی نشست پر خادم کے پاس لٹا دیا۔

کار چلتی رہی۔ اور راحت رسول سوچتا رہا ـــ لکھنؤ سے کافی دور نکل کر اس نے گہری آواز سے کہا۔

"سلیمہ ایمان اور سچائی کی زندگی میں زیادہ راحت میسر آتی ہے یا شان اور دولت کی زندگی میں"

سلیمہ راحت رسول کی آواز سے جان گئی کہ گہرا معاملہ ہے۔ اس سوال کو سنتے ہی اس کا قدامت کا پس منظر اسے سہارا دینے آ گیا اور اس نے چھوٹتے ہی جواب میں کہا۔

"ہمارے بزرگوں نے سچائی کے لئے کیا کیا برداشت نہیں کیا۔ میں تو اقبال کے اس شعر کی عاشق ہوں۔

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

راحت رسول نے اک دم سے برک لگا کر گاڑی روک لی اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے سلیمہ کی طرف عجیب نامانوس مگر احترام بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ سلیمہ ان نظروں سے ایسی مسحور ہو گئی کہ

باوجود کوشش کے نہ پوچھ سکی کہ کیا معاملہ ہے ـــــــ آخر راحت نے سکوت توڑا۔

"سلیمہ تم نے مجھے راہ دکھلا دی ۔ تم نے مجھے راہ دکھلا دی۔"

سلیمہ نے گھبرا کر کہا "میں نے راہ دکھا دی؟"

"کیسی راہ؟ آپ نے موٹر کیوں روک لیا۔"

"میں اسی جگہ دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کروں گا۔ خدا نے میری سن لی۔"

راحت رسول نے تھرماس کے نیم گرم پانی سے جلدی جلدی وضو کیا پھر زمین پر چادر بچھا کر شکرانہ کی نماز پڑھنے لگا۔ بچے مع خادم کے سو رہے تھے۔ گاڑی کا بھی انجن مع لائٹ کے بند تھا۔ سامنے جنگل سے لے کر تاروں بھرے آسمان تک سناٹا ہی سناٹا تھا۔ صرف افق پر بجلی چمک رہی تھی مگر اس میں بھی آواز نہیں تھی۔ سلیمہ اگر سن رہی تھی تو صرف اپنی دل کی دھڑکن جو کہہ رہی تھی کہ ہو نہ ہو اب ان جانی کا وہ آنے والی ہیں اور ان کا سامنا کرنے کے لئے بہت زیادہ مضبوط دل کی ضرورت ہوگی۔

شکرانہ کی رکعتیں پڑھ کر جب راحت واپس آیا تو وہ بہت پر سکون تھا اور اس کی آنکھوں میں کنویں کے خاموش پانی کا ایسا ٹھہراؤ تھا اس نے گہری مسکراہٹ سے سلیمہ کی طرف دیکھا۔

"بہت شکنی تو میں کر ہی چکا ہوں۔ اب اس کی قیمت زرد ما جہاں سے چکانا باقی ہے۔ کیوں سلیمہ اگر میں جیل جاؤں اور اگر تم کو

کئی سال صرف اپنے سہارے رہنا پڑے تو......

سلیمہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس کو راحت رسول کے وہ الفاظ یاد آگئے کہ تبادلہ سزا کے طور پر ہوا ہے۔

"جیل! دیکھئے، کیا خدا نخواستہ ......"

"(ہنس کر) ایسا جیل نہیں۔ بلکہ ویسا جیل جس میں ابوالکلام اور حسرت موہانی گئے تھے۔"

"میں سمجھ گئی۔ سب کچھ سمجھ گئی آج ہی ایک بیوی سے ملی ہوں جن کے شوہر نے سرکاری نوکری چھوڑ دی ہے اور ایک اور بیوی سے ملی ہوں جس کے شوہر اپنی وکالت چھوڑنے والے ہیں۔ اگر آپ بھی ایسا کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کیجئے"

سلیمہ کی زبان سے تو یہ بات نکل گئی۔ لیکن وہ سوچنے لگی کہ اگر راحت...... ایسا کیا تو کام کیسے چلے گا۔ ہم لوگوں کی جائداد پر راحت کے بڑے اور چچا زاد بھائیوں کا قبضہ ہے۔ ہمارے پاس رہنے کو گھر تک نہیں ہے۔ کچھ پس انداز نہیں ہے۔ اللہ رکھے دو بچے ہیں جن میں ایک لڑکا ہے جن کو پڑھا لکھا کر کسی قابل کرنا ہے۔ دس گیارہ سال میں بڑی لڑکی فریدہ شادی کے لائق ہو جائے گی۔ یہ فکریں ایک طرف اور راحت کا جیل جانا دوسری طرف۔ اس کی جدائی اور اس کے بعد کسمپرسی کی زندگی سلیمہ اپنے خیالات کے بہاؤ کو روک کر کہنے لگی۔

"آپ کی جدائی کا اور وہ بھی اس طرح کہ آپ جیل میں ہوں اور میں جیل کے باہر، اس کا برداشت کرنا آسان نہ ہوگا۔ سوچتی ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ مگر میں ملک و ملت کے خاطر سب کچھ برداشت کر لوں گی۔ اپنے سب

پیارے پیارے بدیسی کپڑوں کو جلا دوں گی۔ کھدر پہنوں گی، چرخا کاتوں گی اور اپنے ہاتھ سے موٹا جھوٹا پکا کر بچوں کو کھلاؤں گی اور کھاؤں گی۔ اور خدا کا شکر بھیج کر خوش رہوں گی"۔

گاڑی اسٹارٹ ہو گئی اور فرّاٹے بھرنے لگی۔

سامنے گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سیاہی کے پہاڑ معلوم ہو رہے تھے جو سامنے سے بھاگتے اور جھپٹتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ ان کی ٹہنیوں کی ہتھیلیاں کھلتی تھیں جو موٹر کی روشنی میں ذرا دیر چمک کر پھر تاریکی میں غائب ہو جاتی تھیں۔ موٹر اپنی کمزور روشنی لئے تاریکی میں گھسا چلا جا رہا تھا لیکن تاریکی تھی کہ کسی طرح ختم ہونے ہی کو نہ آتی تھی۔

وہ بجلی جو کچھ دیر پہلے افق پر چمک رہی تھی، اس کا بھی اب پتہ نہ تھا۔

سلیمہ اور راحت دونوں سوچ رہے تھے کہ اب آئندہ زندگی کیسی ہوگی۔ راحت کے دل میں اشتیاق تھا اور اس کے پیچھے کچھ دھڑکا۔ مگر سلیمہ کے دل میں دھڑکا اول تھا اور اشتیاق آخر میں۔

(۵)

"سلیمہ تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ تبدیلی مجھ میں اک دم سے پیدا کیوں کر ہو گئی۔"

"اپنے بڑے بڑے لیڈروں کی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ سب لوگوں میں اسی وجہ سے تبدیلی ہو رہی ہے"۔

"ہاں کچھ تو ان لوگوں کی باتوں کا اثر ہے ہی۔ لیکن اصل میں

انگریزوں کی غلامی کی مخالفت کا سبق میں نے سیکھا ہے کنٹ پور سے جہاں میں دس دن بھیس بدل کر رہا تھا۔"

اور چمار وں کے ساتھ کھانا بھی تو کھا آئے تھے۔ توبہ کیسی گھن آتی ہے اس بات کو یاد کر کے۔"

سلیمہ کی اندرونی شوخی نے تھوڑی دیر کے لئے اندیشوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے مسکرا کر یہ بات کہی اور نسوانیت اور محبت بھری نظروں سے راحت کو دیکھنے لگی۔

"مگر ان ہی کا کھانا کھانے سے میرے ضمیر کو یہ روشنی ملی کہ میں نے اپنے ملک کا درد دکھ محسوس کیا۔ ہوا یہ کہ ......"

اس مرتبہ دل سے سننے والا جو ملا تو راحت نے اپنا سارا تجربہ بہت تفصیل سے بیان کر ڈالا۔"

"کیا سانولی واقعی ایسی خوبصورت ہے کہ مہاراج کا بیٹا اس کے لئے دیوانہ ہو گیا۔"

"ہاں دیہات میں جو حُسن کا معیار ہے۔ حُسن میں نزاکت اور تراش کا دخل کم ہے۔ اسی لحاظ سے وہ ہے حسین۔"

ایسا حُسن شہر والوں پر کیا اثر نہیں کر سکتا ہے؟"

"دیکھو سلیمہ اس وقت میری بات کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ میری حسن پرستی کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں۔"

"آپ کو جو فیصلہ کرنا تھا کر چکے۔ پھر ذرا ہنس لینے میں کیا ہرج ہے۔"

"ہرج ہے۔"

"کیا ہرج ہے؟"

"میرے دل میں کمزوری آتی ہے۔"

"جاؤ بھئی۔ ایسا تھا تو پھر شکرانہ کیوں پڑھا۔"

"یہ کمزوری جو آرہی ہے وہ اس طرح کی نہیں ہے۔ بلکہ کسی دوسری طرح کی ہے۔ جسے میں بیان نہیں کرپاؤں گا۔ کیوں کہ خود اپنے لئے بھی اس کا سمجھنا مشکل نظر آرہا ہے۔ کچھ اس طرح کی باتیں ہیں یہ کہ مسئلہ در مسئلے الجھے ہوئے ہیں۔ اپنے ذاتی مسئلے، ملکی مسئلے، مذہبی تصورات اور اخلاق اور جانے کیا کیا یہ سب ایسے گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا بھی جوئے شیر لانا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر الگ ہو بھی گئے تو ان میں سے ایک ایک کو اپنے لئے صاف کرنا ہے۔ یہ چیز تو بے حد دشوار بلکہ محال نظر آرہی ہے۔ کاش کوئی ایسا لیڈر مل جائے جو پیروؤں کی طرح اس معاملے میں میری رہبری کر سکے۔ جب سے کٹ لیو سے لوٹا ہوں ان سب باتوں پر غور کر رہا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور ہے کہ کسی رخ سے سلجھنے بھی لگتی ہے تو آگے چل کر اور الجھ جاتی ہے کبھی میں اپنے سے پوچھتا ہوں کہ آخر میں کیوں الجھوں ان باتوں میں؟ کیا دنیا میں میں ہی رہ گیا ہوں ملکی اور ملی مسئلوں کو سلجھانے کے لئے؟ اور یہ کہ اگر ان مسئلوں میں پڑا بھی تو مجھے کیا ملے گا اور میری بیوی اور میری اولاد کو کیا ملے گا لیکن اس پر بھی اندر سے اٹھنے والے سوالات خاموش نہیں ہوتے ہیں اور طوفان پر طوفان امنڈتے چلے آتے ہیں۔ یہ سب باتیں بعض وقت پاگل بنا دیتی ہیں۔"

"مولانا صاحب نے فتویٰ جو دیا ہے کہ ملازمت چھوڑنا اور جیل جانا یہ سب جہاد ہے۔ کیا اس فتوے سے آپ کے مسئلے حل نہیں ہو جاتے ہیں؟"

فتوے کے بعد بھی بہت سے کیا۔ کیوں کر، کیسے اور کب وغیرہ باقی رہ جاتے

ہیں۔ پہلے تو ذاتی سوالوں کو جن کا تعلق میری اور تمھاری ذات سے ہے۔ سب سے بڑی

بات یہ ہے کہ ابھی میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ استعفا کب دوں؟ استعفا دینے

کے بعد کہاں رہوں، سوچ پور میں یا لکھنؤ میں؟ اگر میں جیل گیا تو تم کو کس

پر چھوڑدوں گا۔؟ تم پردہ نشین اور ناتجربہ کار ہو اور بچے چھوٹے چھوٹے

ہیں۔ تمھارے عزیز نکمے ہیں۔ رہے ہمارے چچا صاحب اور چچیرے بھائی سو

ان لوگوں نے کبھی بھی میرے یا تمھارے ساتھ محبت کا برتاؤ نہیں کیا۔ معلوم نہیں کہ

میری غیر موجودگی میں کیسے پیش آئیں۔"

یہ تو ہے مسائل کی ایک صف، دوسری صف یہ کہ میں استعفا دے کر

کیا پیشہ اختیار کروں؟ آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا زندگی کو چلانے کے لئے۔ کاروبار

کروں تو کون سا کاروبار کروں؟ ملازمت کروں تو کہاں کروں؟ پھر یہ بات بھی ہے

کہ اب تو بہت ہی سادی زندگی گزارنا ہوگی۔ اس لئے موٹر بیچ ڈالوں یا رکھوں۔

تیسری صف سوالوں کی یہ ہے کہ استعفا دیتے ہی کو میں اپنی سب سے

بڑی قربانی سمجھوں یا استعفا دینے کے بعد سیاسی کاموں میں بھی حصہ لوں؟ پھر سوال

یہ ہے کہ حصہ لوں تو کس پارٹی میں شامل رہوں؟ خلافت میں یا کانگریس میں یا دونوں

میں؟ پھر ان پارٹیوں میں جاؤں تو کیا کروں؟ مجھے تو ایسی باتوں کا کوئی بھی تجربہ

نہیں ہے۔ ابھی تو میری سمجھ میں یہی نہیں آرہا ہے کہ خلافت کمیٹی خلافت

عثمانیہ کو کیوں برقرار رکھنا چاہتی ہے اور کیا مسئلہ خلافت صرف مذہبی مسئلہ

ہے؟ اور سیاسی مسئلہ نہیں ہے؟ کیا اس مسئلے کا ہندوستان کی سیاست سے

بھی کوئی ربط ہے اور ربط کیا ہے؟ مسلمان اپنی آزادی کو چھوڑ کر خلافت کے

مسئلے میں کیوں لگے ہوئے ہیں۔ اور گاندھی جی اور کانگریس کیوں خلافت کی حمایت کر رہے ہیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا ترکی کے باشندے بھی یہی چاہتے ہیں کہ خلافت کا نظام قائم رہے؟ ۔ میں نے ترکی کے اندر کا اور جزیرۃ العرب کے لوگوں کا جو تھوڑا بہت حال سنا ہے اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگوں کی حالت بھی کچھ پورہ والوں سے یا ہمارے غریب لوگوں کی حالت سے بہتر نہیں اور ان کو بھی بیماری قسم کی نہیں تو کسی اور قسم کی آزادی کی یقینی ضرورت ہے۔

"پھر کانگریس اور گاندھی جی بھی میری سمجھ میں واضح طور پر نہیں آ رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات جو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ صرف عدم تشدد سے آزادی کیسے مل سکتی ہے اور یہ کہ اگر آزادی مل بھی گئی تو ہندوستان میں حکومت کس طرح کی بنائی جائے گی؟ کیا جمہوریت ہوگی؟ اگر جمہوریت ہوئی تو یہ بات یقینی ہے کہ اس میں اکثریت ہندوؤں کی ہوگی۔ کیا جمہوری حکومت ہندوؤں کی اکثریت ہونے پر بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کر سکے گی؟"

یہ سب باتیں ہیں سلیمہ، جن سے میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ کچھ سمجھتی ہو ان باتوں کو؟"

"کچھ کچھ ایسی ہی باتیں میرے دماغ میں بھی، جب میں اخبار پڑھتی ہوں، تو آتی ہیں۔ لیکن میں تو یہ سوچ لیتی ہوں کہ یہ سب بڑی بڑی باتیں ہیں اور ان بڑے لوگوں کے سوچنے کی چیزیں ہیں جو ہمارے رہبر ہیں۔ میں ان پر بھلا کیا سوچ سکتی ہوں"۔

"اب بتاؤ کہ رہبروں میں کس پر بھروسہ کروں اور کس پر نہ کروں؟ کیا یہ سب کھدر پہننے والے، دھواں دھار تقریر کرنے والے، ایماندار، قابل اور سمجھدار ہیں؟ اب دیکھو ان لوگوں میں سے ایک لیڈر خان بہادر صاحب بھی ہیں

کئی مرتبہ ان سے باتیں کیں لیکن ان کی باتوں سے میری تشفی نہ ہو سکی ۔

سوچ بچار پہونچ کر راحت نے اپنی الجھنوں پر غور کرنے کا ایک نرالا راستہ اختیار کیا ۔ ایک دن دہلی چلا گیا اور وہاں کے شمس العلماء امیر احمد وارثی کی خدمت میں ایک معمولی سرکاری ملازم کی حیثیت سے حاضر ہوا ۔ امیر احمد صاحب بڑے نمازی اور پرہیزگار آدمی تھے اور حکام رس بھی تھے اور مسلمانوں کی سفارشیں کرنے میں پہلو تہی نہیں کرتے تھے ۔ خوشبودار تمباکو اور خوشبودار حقہ کے بہت شوقین تھے ان کی دو بیویوں میں ایک سال بھر ہوا مر گئی تھی اس لئے اس کی جگہ پر کرنے کے لئے ایک کمسن لڑکی سے عقد کرنے والے تھے ۔ راحت کا سوال سن کر دہ کہنے لگے ۔

"متفقہ فتویٰ !! وہ تو کوئی چیز نہیں ہے" ۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہی علماء جنھوں نے فتویٰ دیا ہے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں اور دامادوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کی سفارشوں کے لئے دوڑے دوڑے پھریں گے وہ کہتے ہیں کہ جہاد فرض ہے اچھا بھئی ہے اور ضرور ہے لیکن اس کے لئے شرطیں بھی ہیں کہ ذرائع اور وسائل موجود ہوں مسلمان متحد ہوں ان میں مقابلے کی تاب ہو ۔ اگر یہ سب شرطیں پوری ہوتیں اور مسلمانوں کے پاس ذرائع اور وسائل ہوتے تو میں خود جہاد کرتا ۔ لیکن ان شرطوں میں سے کوئی بھی تو نہیں پائی جاتی ہے ۔ پھر جہاد کیسے کیا جائے ؟ کہتے ہیں کہ عدم تشدد سے مقابلہ کرو ۔ اگر عدم تشدد ایسی ہی کام کی چیزیں ہوتیں تو کمزور کو کبھی شکست ہوتی ہی نہیں ۔ کیوں کہ کمزور تو مقابلے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے ۔ اب جبکہ مسلمانوں کے پاس مقابلہ کرنے کے ذرائع اور وسائل نہیں ہیں تو پھر ہندوؤں سے اشتراک عمل

کرنے سے بہتر ہے کہ عیسائیوں سے اشتراک کیا جائے۔ جو کہ اہل کتاب ہیں۔"

راحت یہ نقطۂ نظر سن کر اپنے ارادوں میں کچھ مذبذب سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ جب جہاد کی حکم ایسا ہے تو پھر اس معاملے میں جلدی نہ کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ استعفا دینے کا معاملہ ایسا ہے کہ قدم اٹھانے کے بعد لوٹایا نہیں جا سکتا ہے۔ لیکن پھر راحت رسول کے دل میں یہ سوال اٹھا کہ اگر مذہب کا حکم یہ ہے تو پھر بنوکٹ پور اور اس قسم کے دیہاتوں کی غریبی اور پریشانیوں کا بھی مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی نہ کوئی قابل عمل علاج ہونا چاہیئے۔ بھلا مذہب کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ پندرہ فی صدی آدمی بھوکوں مریں اور بیس فی صدی فاقہ کشی کی زندگی گزاریں اور آبرو بیچنے پر مجبور ہو جائیں؟ کیا مذہب کے پاس ان خرابیوں کا کوئی حل ہے —؟

وہ کیا ہے اس سلسلے میں راحت نے مولانا وارثی سے بھی گفتگو کی اور اس کے بعد اور مولوی صاحبان سے بھی گفتگو کی لیکن اس گفتگوؤں سے وہ کسی نتیجے پر نہ پہونچ سکا۔ ان لوگوں میں سے کوئی بھی غریبی کے مسئلے کی اہمیت کو سمجھ ہی نہ سکا ان الجھنوں اور تذبذب کی وجہ سے راحت نے استعفا نہیں دیا اور ہمیر پور جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ جب وہ تبادلہ کے لئے چارج دینے والا تھا اس وقت اس کی نظر ایک سرکاری کاغذ کی فائیل پر پڑ گئی جس میں کہا گیا تھا کہ برجو کو کورٹ مارشل کے بعد گولی مار دینے کا حکم دے دیا گیا کیوں کہ وہ خفیہ بالشویک ثابت ہو گیا تھا پھر گولی مار دی گئی اور لاش پھونک دی گئی۔ اس کے خاندان والوں کو یہ خبر جب بھی اور جس طرح بھی اور جن الفاظ میں بھی مناسب سمجھا جائے، پہونچا دی جائے۔

یہ کاغذ پڑھتے ہی راحت کا سارا تذبذب دور ہوگیا۔ کیونکہ راحت کے دل نے اس سے پوچھا کہ ایک طرف ایسے ظلم وستم سے کوآپریشن کرنا ہے۔ اور دوسری طرف اس سے نان کوآپریشن۔ بتاؤ تم دونوں میں سے کون سا راستہ اختیار کروگے۔

باب (۱۳)

جوالامکھی کا نکاس

(۱)

نہ تو قومی لیڈروں کا خیال تھا کہ مولوی عبدالقدوس کے ایسے گم نام شخص کی گرفتاری پر اتنا جوش پھیل جائے گا اور نہ مقامی حکومت ہی نے اس پر جوش احتجاج کا مقابلہ کرنے کا کوئی انتظام کیا تھا۔ مولوی عبدالقدوس بچارے سورج پور کی ایک معمولی سی مسجد کے امام تھے اور ان کے محلے کے باہر کے بہت ہی کم لوگ ان کو جانتے تھے۔ لیکن ادھر وہ گرفتار ہوئے اور ادھر ڈگی پٹ گئی کہ مولانا حضرت عبدالقدوس صاحب گرفتار کرلئے گئے۔ ڈگی کا پٹنا تھا کہ ایسی زبردست ہڑتال ہوئی کہ شہر میں پان کی ایک دوکان بھی نہ کھلی اور سب اسکول اور کالج بند ہوگئے۔ ہزاروں آدمی اللہ اکبر اور مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس کی شکل میں چوک میں نکل آئے۔ کلکٹر نے دفعہ ۱۴۴ لگادی اور اس کا بہت زور شور سے اعلان کیا گیا لیکن کسی نے بھی اس کی پروا نہ کی اور جلوس اور نعروں کا جوش بڑھتا چلا گیا۔ اس پر انگریز کلکٹر نے، جو خود بازار میں کھڑا لوگوں کے احتجاجی جلوس کو دیکھ رہا تھا، مجمع پر لاٹھی چارج کرادیا

لیکن لوگ لاٹھیاں کھا کر بھی نعرے لگاتے رہے۔ اور منتشر نہیں ہوئے پھر تو کلکٹر
نے فائرنگ شروع کرادی جس میں چھ آدمی مرگئے اور پچاس زخمی ہو گئے۔

مرنے والوں میں ایک عورت بھی تھی جو اپنی گود میں بچہ کو لے کر کسی ہومیو
پیتھک ڈاکٹر کو دکھلانے گئی تھی اور وہاں سے دوا لے کر آرہی تھی۔ اس کی لاش اس
طرح ملی کہ اس کا سر پولیس کی گولی سے پھٹ گیا تھا اور ایک طرف کی آدھی پسلیاں
پولیس کے گھوڑے کی نال سے ٹوٹ گئی تھیں لیکن بچہ زندہ تھا کیونکہ اسے
عورت نے مرتے وقت اپنے پیٹ کے نیچے چھپا لیا تھا۔ اور وہاں دوا کی شیشی
بھی مردہ عورت کی مٹھی میں محفوظ تھی۔

ایک ہفتہ کے بعد مجسٹریٹ نے مولوی عبدالقدوس سے جو بے حد
میلے کھدر کے کپڑوں میں کھڑے تھے پوچھا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ حکومت سے
کسی قسم کا بھی تعاون نہ کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ افواج کی ملازمت کسی شکل میں
کیوں نہ ہو اور موجودہ حالات میں تعاون کرنا اسلامی آداب کے خلاف ہے؟"

مولوی نے بہادرانہ تیور سے جواب دیا۔

"آپ کی سی۔ آئی۔ ڈی۔ نے میری تقریر کی بہت ہی بچکس پھسپھی رپورٹ
پیش کی ہے۔ میں اور اس طرح دب کر تقریر کرتا! میں نے کہا تھا اور صاف لفظوں
میں کہا کہ انگریزی فوج میں شریک ہونا یا اس کی کسی قسم کی اعانت کرنا حرام
ہے۔ سرکاری ملازمت قبول کرنا حرام ہے۔ عدالت میں مجسٹریٹ کی کرسی پر
بیٹھنا یا وکیل بننا یا ایسی عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا جو انگریزوں
کی بنائی ہوئی ہو یہ سب باتیں حرام ہیں۔ میں نے یہ سب کہا تھا اور بہت
سخت الفاظ میں کہا اور اب پھر کہتا ہوں اور آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں۔"

مجسٹریٹ "۔ تم توہینِ عدالت کے بھی مرتکب ہوں گئے ہو۔"

"مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔"

مولوی کے اس جواب پر عدالت کے اندر اور عدالت کے باہر دونوں جگہ اللہ اکبر اور مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے لگنے لگے۔

"تم کو چھ سال قید سخت کی سزا دی جاتی ہے۔"

مولوی "جزاک اللہ۔"

خان بہادر مشتاق احمد جو اس وقت عدالت میں موجود تھے جو عدالت کی جانب کرسی پر معزز حاضرین کی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سزا سن کر کھڑے ہو گئے اور شیروانی کی ایک جیب میں ہاتھ ڈال کر اور تیوری چڑھا کر کہنے لگے۔

"مجسٹریٹ صاحب ابھی توقف فرمائیے۔ لگے ہاتھوں ایک مقدمہ کا اور بھی فیصلہ کرتے جائیے۔ پہلے سن لیجئے کہ میں آپ کی حکومت کے عطا کردہ خطاب خان بہادر کو اپنے نام کے ساتھ استعمال کرنا خلافِ شان سمجھتا ہوں۔ اس لئے اس کو بہ ہزار لعنت واپس کرتا ہوں۔ اور دوسرے اس بھری عدالت میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک بھی مسلمانوں کا انگریزی فوج ....

مجسٹریٹ ۔"عدالت برخواست۔"

خان بہادر۔ سنیئے ۔سنیئے میں اعلان کرتا ہوں کہ انگریزی فوج میں شامل ہونا مسلمانوں کے لئے ......"

مجسٹریٹ صاحب عدالت سے اٹھ کر بہت تیز رفتاری سے چلے گئے۔ اور فوراً ہی پیش کار اور وکیل بھی اِدھر اُدھر ہو گئے۔

خان بہادر۔ بات جاری رکھتے ہوئے ... مسلمان کے لئے حرام ہے۔ کیونکہ

چلے گئے مجسٹریٹ صاحب؟ کیوں نہیں اس وقت مجھے بھی سزا دے دی گئی۔؟"

مجمع جوش سے عدالت کے کمرے میں نعرے لگاتا ہوا گھس آیا۔

"اللہ اکبر۔ مہاتما گاندھی کی جے"

"اللہ اکبر۔ مہاتما گاندھی کی جے"

.... زندہ باد

.... جے

لوگوں نے خان بہادر کو کندھے پر اٹھا لیا۔ اور اس طرح ایک جلوس کی شکل میں شہر میں داخل ہوئے اور بازار کی طرف بڑھے جس وقت یہ جلوس جا رہا تھا اسی وقت ایک اور سمت سے بھی پر جوش نعروں کی آواز آئی اور ایک دوسرا جلوس آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس کے ساتھ جھنڈے بھی تھے۔ یہ جلوس ایک کار کو ڈھکیل رہا تھا جس پر ہاروں اور پھولوں میں سجا ہوا راحت رسول بیٹھا تھا۔

"راحت زندہ باد"

"راحت رسول کی جے"

مشتاق راحت کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز آئی کہ

"راحت رسول نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی"

یہ خبر مجمع میں سے کسی شخص نے آکر خان بہادر کو سنائی۔ یہ سنتے ہی مشتاق اپنے کو مجمع کی گرفت سے آزاد کرکے راحت رسول کی طرف بھاگے اور جا کر کہا —

"جزاک اللہ۔ راحت رسول تو نے مسلمانوں کے لئے مثال قائم کردی۔
اسلام کی خاطر پولیس کی پیشانی پر لات مار دینا۔ واہ وا۔"

مجمع کے لوگوں نے ان دونوں کو کار پر بٹھا کر بازار کا چکر لگایا۔ وہاں سے یہ مجمع شہر کی خلافت کمیٹی کے دفتر میں آیا یہاں یہ تجویز پیش کی گئی کہ مولانا عبدالقدوس کی گرفتاری پر احتجاج کرنے کے لئے شہر میں ایک عظیم الشان جلسہ کرنا ضروری ہے۔ ابھی اس بات پر غور ہی کیا جا رہا تھا کہ جلسہ کب ہو۔ کہ خبر ملی کہ کلکٹر نے دفعہ ۱۴۴ کی مدت جو اب ختم ہو رہی تھی بڑھا کر ایک مہینہ کر دی ہے۔ یہ سن کر راحت نے چھوٹتے ہی کہا۔

"کیوں نہ ہم لوگ اس دفعہ کو توڑیں"۔

خان بہادر "ہم ضرور توڑیں گے۔ اس کا توڑنا ہمارا فرض ہے ہم اس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں گے۔"

اسی وقت جلسہ کی تاریخ اور وقت مقرر کیا گیا اور اعلان کی تیاریاں ہونے لگیں۔

راحت رسول وہاں سے اپنی کار پر اپنی کوٹھی آیا۔ لیکن اس کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوتے ہی زور سے ہنس پڑا۔ کیوں کہ برساتی کی شکل دیکھ کر اسے یاد آگیا کہ ارے میں تو کل شام اس کوٹھی کو خالی کر کے شہر کے اندر ایک مکان میں منتقل ہو چکا ہوں۔

راحت اپنے نئے مکان میں آیا جو ایک معمولی محلے میں پرانی وضع کا معمولی سا پرانا مکان تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ باہر ایک پھاٹک تھا اور اندر کا صحن بھی اچھا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی کے لئے آرام دہ نہیں تھا بڑا سا دالان تھا جس

کے پیچھے کمرہ تھا۔ سامنے ایک چھوٹے دالان میں باورچی خانہ تھا۔ بس کل مکانیت یہی تھی۔

نصف دالان اور سارے صحن میں راحت رسول کا فرنیچر ڈھیر تھا۔ اس وقت دالان کے ایک کونے میں کھانے کا میز لگا دیا گیا تھا۔ اور اس کے برابر چار پلنگ بچھے تھے راحت کو دیکھتے ہی سلیمہ مسکرا پڑی اور فریدہ اور معقود چلانے لگے۔ ڈیڈی۔ ڈیڈی!!

راحت نے دونوں بچوں کو پیار کر کے کہا۔

"ڈیڈی نہیں، اب ابا کہا کرو"۔

سلیمہ کھدر کی ساری باندھے تھی اور فریدہ کھدر کا غرارہ، کرتا اور اوڑھنی اور معقود کھدر کا کرتا پیجامہ پہنے تھے۔ سلیمہ کا جسم کھدر کے کپڑوں میں بہت بھاری معلوم ہو رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ وہ زیادہ باوقار بھی لگ رہی تھی۔ اس وقت تو یہ پورا گھرانہ زندگی کی اس نئی تبدیلی پر بہت خوش تھا۔

سلیمہ نے کشتی میں چائے لگا کر میز پر رکھ دی اور کہنے لگی۔

"ایک ماما مل تو رہی ہے اور سستی بھی بہت ہے لیکن مجھ کو تو ایسا لگتا ہے کہ اگر اسی طرح صرف ایک ہانڈی کا معاملہ چلتا رہا تو میں خود ہی سارا کام کر لوں گی۔ فریدہ ہے تو چھوٹی سی۔ لیکن وہ بھی اس نئی تبدیلی سے بہت خوش ہے اور کام میں بہت ہاتھ بٹا رہی ہے۔ اگر اس طرح کام چلایا گیا تو ہم لوگوں کا خرچ کافی گھٹ جائے گا۔ مکان کا کرایہ الگ کم ہو گیا ہے اور باہر کا خرچ بھی۔ گھٹ گیا ہے، ان باتوں سے تو امید یہ ہوتی ہے کہ اب خرچ صرف تہائی یا چوتھائی

رہ جائے گا۔"

"خدا کا شکر ہے۔ جہاں اتنا ہوا ہے وہاں آمدنی کی بھی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔"

فریدہ "ڈیڈی۔ اے ابا جان۔ آج اسکول کے بچے مجھے ان کپڑوں میں دیکھ کر شور مچانے لگے۔ تم گاندھی والا ہو گئیں۔ تم گاندھی والا ہو گئیں۔ کیا یہ ٹھیک ہے ڈیڈی کہ ہم لوگ گاندھی والا ہو گئے؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔ گاندھی والے لوگ اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کی خدمت کرتے ہیں۔"

"پھر ہم بھی چڑائیں گے تم ملک کی خدمت نہیں کرتے ہو تم برے ہو۔"

"نہیں ہم لوگ چڑانے والے کو جواب میں چڑاتے نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی بری اور کڑوی باتوں کو مسکرا کر سن لیتے ہیں۔"

سلیمہ "دیکھئے سرکاری افسروں میں جو ہمارے دوست تھے ان لوگوں نے خبر تک نہ لی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے لئے ہم لوگ کوڑھی ہو گئے۔"

"کیا تم کو امید تھی کہ ان میں سے کوئی کام آئے گا! یا خیریت پوچھے گا؟"

"امید کیوں نہ ہوتی۔ ہم لوگ جو ان کے کام آتے رہے ہیں۔"

"ان باتوں کو اب بھول جاؤ اس وقت تو میدان جنگ ہے جہاں آمنے سامنے فوجیں کھڑی ہیں اور وہ لوگ دوسری فوج میں ہیں اور ہم دوسری فوج میں۔"

"کیا اپنے عزیز بھی ایسا ہی کریں گے؟"

"مجھے تو ڈر ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ اور ہم کو تو ان کی طرف سے اچھے

برتاؤ کے لئے کسی حد تک تیار بھی رہنا چاہیئے۔ البتہ چچا جان کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری اس تبدیلی پر وہ خوش ہوں۔ کیونکہ ہمارے چچیرے بھائی تو خلافت میں مجھ سے پہلے سے حصہ لے رہے ہیں؟"

اندھیرا ہو گیا تھا اس لئے زیدہ لال ٹین جلا لائی جو دالان کے بیچ کے در میں ٹکا دی گئی۔ اس سے اتنی تو روشنی ہو گئی کہ چہرے نظر آنے لگے۔

اس روشنی میں یہ تینوں رات کو بہت دیر تک خوشی اور جوش سے باتیں کرتے رہے۔ اور اسی روشنی میں انھوں نے ایک ہانڈی والا کھانا کھایا۔

(۲)

راحت رسول کے دادا ایک اچھے زمیندار تھے جن کی چار لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ چھوٹا لڑکا جو بچپن ہی سے بیمار رہتا تھا اپنی شادی کے سال ہی بھر بعد ایک لڑکا راحت رسول اور بیوہ کو چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ دادا نے راحت کا شوق دیکھ کر انگریزی اسکول میں نام لکھا دیا۔ جس سال راحت دسویں میں تھا اس کے دادا نے اپنی بیمار بیٹی کو دکھلانے کے لئے ایک لیڈی ڈاکٹر بلائی۔ راحت رسول نے اس سے جو سب کے سامنے انگریزی بولی تو دادا نے خوش ہو کر اسی سال علی گڑھ کالج بھیج دیا۔ اور چار عمدہ سوٹ سلوا دیئے اور ایک جوڑی بوٹ

خرید وادیئے۔

راحت چند ہی برسوں میں بالکل انگریز بن گیا گھر میں بھی آکر چھری کانٹے سے کھانا کھانے لگا۔ اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ ان باتوں کے خلاف راحت کے چچا۔ چچازاد بھائیوں پھوپھیوں پھوپھاؤں اور ان کے لڑکے اور لڑکیوں نے بہت شور مچایا۔ لیکن دادا نے جن کا خود اپنا رہن سہن بے حد قدیم طرز کا تھا اور جو ڈاکٹری دوا بھی اس ڈر سے نہیں استعمال کرتے تھے کہ کہیں اس میں شراب نہ ملی ہو ان پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب انکے سامنے بار بار کہا گیا کہ راحت ننگ خاندان بن رہا ہے تو انھوں نے کہا کہ یہ بات غلط ہے پھر چھت کی طرف اپنے ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر کہا:

"خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد"۔ دادا کا برتاؤ راحت رسول سے جیسا تھا ویسا ہی رہا اور وہ اسے ضروری اخراجات دیتے رہے اور جب دو ایک بار اس نے لمبی رقموں کا مطالبہ کیا تو وہ بھی بھیج دی۔

ایک بار راحت کے چچازاد بھائی خبر لائے کہ راحت ایک میم سے شادی کرنے والا ہے اور کہا کہ ہمارے خاندان کی عورتیں اس میم سے پردہ کریں گی لیکن دادا نے اس پر بھی راحت سے کچھ نہیں کہا۔

جب خبر ملی کہ راحت رسول انسپکٹر پولیس ہو گیا ہے تو دادا نے بہت دھوم سے میلاد شریف کیا۔ اور مٹھائی بٹوائی۔ لیکن جب راحت اس خوشی میں شرکت کرنے آیا تو وہ بہت بدلا ہوا تھا۔ چھری کانٹا گیا۔ اس نے تو چمچے کا بھی استعمال نہیں کیا۔ ہاتھ سے دال چاول کے نوالے بنا بنا کر کھائے۔ اب وہ کرتا پاجامہ

پہنے تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا رہتا اور اسی طرح لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتا۔

راحت رسول کی شادی کے بعد ہی پہلے اس کی ماں کا اور پھر دادا کا انتقال ہوگیا۔ جب دادا کا وصیت نامہ دیکھا گیا تو یہ خبر ملی کہ وہ اپنی جائیداد کا ایک حصہ راحت رسول کو، جیسے قاعدہ کے مطابق مجوب ہونا چاہئے تھا، لکھ گئے ہیں اس بات پر سوائے راحت رسول اور اس کی بیوی کے، اس خاندان کے کسی فرد کو بھی خوشی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس بات سے راحت میں اور انکے چچا اور پھوپھیوں کے خاندان میں کافی دوری ہوگئی یہاں تک کہ ملنا جلنا اور خط و کتابت برائے نام رہ گئی

راحت نے ملازمت سے استعفا دینے کے بعد اپنے چچا شیخ ولایت رسول کو خط لکھا کہ میں بھی آپ لوگوں کے راستہ پر چل رہا ہوں اور اپنے چچازاد بھائیوں کی پیروی کر رہا ہوں یعنی ملکی تحریک میں حصہ لے رہا ہوں اور اس غرض سے سرکاری نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔ اب آپ سے اس سلسلہ میں کچھ مشورہ کرنا ضروری ہے اس لئے آپ لوگ جلد سے جلد آجائیے۔ میں خود آتا لیکن فی الحال میں سلیمہ کو چھوڑ کر نہیں آسکتا ہوں اور ان کو لیکر آؤں تو گھر کس پر چھوڑوں۔ خط کے آخر میں نئے گھر کا پتہ لکھ دیا تھا۔

چوتھے دن شیخ صاحب اور انکے بڑے لڑکے معین رسول پہنچ گئے۔

شیخ صاحب کی داڑھی جو آدھی سے زائد سفید تھی ادھر کافی بڑھ گئی تھی۔ انھوں نے شیروانی چھوڑ کر عربی عبا پہننا اور ٹوپی چھوڑ کر عمامہ باندھنا شروع کردیا تھا جیب میں تسبیح بھی رہتی تھی جو نماز سے پندرہ منٹ پہلے نکلتی تھی اور آدھ گھنٹے سے لیکر پون گھنٹے تک چلتی تھی۔ مگر اس تسبیح سے بات چیت میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی تھی

داڑھی معین رسول صاحب نے کبھی رکھ لی تھی لیکن پہلے تو وہ قدرت پر چھوڑ دی گئی تھی لیکن اب ایک سال گزرنے کے بعد زیج کرلی ہوگئی تھی سان دونوں صاحبو نے گھر میں گھستے ہی کہا " راحت مبارک ہو جزاک اللہ"

پھر شیخ جی نے کہا کہ "میں خود تو ابھی تک تحریک سے دور دور رہا ہوں لیکن پندرہ دن ہوئے کہ میں نے ایک ایسا خواب دیکھا کہ مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ میں تحریک خلافت میں اس طرح حصہ لوں کہ ہجرت کر کے ہندوستان چھوڑ کر افغانستان چلا جاؤں چنانچہ سب انتظامات مکمل کر لئے ہیں اور دس دن کے بعد جا رہا ہوں صرف تمہاری چچی ساتھ جائیں گی ہم دونوں کا خیال ہے کہ تم بھی اپنے بال بچوں سمیت اس ظلم و ستم سے بھری کافر انگریز حکومت کو چھوڑ کر اسلامی حکومت افغانستان چلے چلو۔ شیخ ولایت رسول نے یہ ساری باتیں اتنی زور زور سے کہیں گویا کہ وہ جلسے میں تقریر کر رہے ہیں۔ تقریر ختم کرتے ہی انھوں نے ڈرامائی انداز میں جیب سے ایک چھپا ہوا کاغذ نکال کر کہا یہ ہے مولانا صاحب کا فتویٰ۔ وہ فتویٰ جس میں انھوں نے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں ہجرت کر جانا بہت بڑا کار ثواب ہے۔

یہ کہکر شیخ صاحب نے حقے کا ایک گہرا کش لیا۔ اور ذرا دیر کے لئے اپنی بات کا اثر دیکھنے کی غرض سے خاموش ہو گئے۔

سلیمہ نے خود اپنے ہاتھ سے حقہ بھر کر شیخ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا شیخ صاحب نے حقہ پینے کے لئے ادھر ادھر نظر دوڑا کر ایک آرام کرسی کو منتخب کیا تھا جو اس فرنیچر میں جو ڈھیر بڑا اتنا گھس ہوئی تھی۔ سلیمہ اور زبیدہ کو اس کرسی کو ایک ڈھیر کے اندر سے نکالنے کے لئے کافی جتن کرنا پڑے آخر یہ کرسی

نکال کر ڈالان میں بچھائی گئی۔ اس پر شیخ صاحب لیٹ کر حقہ پینے لگے اور باتیں کرنے لگے۔

شیخ صاحب نے کش لے کر راحت رسول کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس پر سکوت دیکھ کر انھوں اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ایک اور فتویٰ دکھلایا جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت سے کسی قسم کا تعاون کرنا حرام ہے پھر کہنے لگے۔

"ہندوستان میں رہ کر کچھ نہ کچھ تعاون کرنا ہی پڑتا ہے مثلاً ریل اور ڈاک کو استعمال کرنا ہی پڑتا ہے اس لئے حرام کام سے پوری طرح بچنے کی صورت یہی ہے کہ اس ملک ہی کو چھوڑ دیا جائے۔"

راحت رسول کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

"ملکی تحریک میں میں نے کسی اور ہی جذبہ کے تحت حصہ لینا شروع کیا ہے۔ جب میں استعفا دینے کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے خبر بھی نہ تھی کہ ایسے ایسے فتوے نکل آئے ہیں کیوں کہ میں تو انگریزی اخبار پڑھتا تھا اور ان میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں ہیں۔ اور ہوتی بھی ہیں تو اس طرح دبا کر شائع کی جاتی ہیں کہ ان کی اہمیت سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

شیخ صاحب کے صاحب زادے ہم "مگر اردو اخبار تو ایسی باتوں سے لبریز ہوتے ہیں۔"

"اب میں ان کو بھی پڑھتا ہوں یہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے تو انگریزی حکومت کی مخالفت اور آزادی کی تحریک کی حمایت کرنے کا فیصلہ یہ محسوس کر کے کیا ہے کہ ہمارے دیہاتوں کی تین چوتھائی آبادی کو ہر طرف سے

لوٹا جا رہا ہے اور انکی کمائی پر دوسرے عیش کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

شیخ :۔ "خیر بھائی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ دین و دنیا میں غرض مسلم کو ہے اسلام سے اپنا بھی امیری اور غریبی یہ چیزیں ان کے لئے قربانیاں کو ن کر سکتا ہے یہ چیزیں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ یہ تو خدائی کارخانے کی باتیں ہیں۔ ہم لوگ کیا خدائی کارخانے کے خلاف لڑنے نکلے ہیں؟ نہیں۔ پھر ہم لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ہم چاہتے ہیں اسلام کا اقتدار! ہم چاہتے ہیں جزیرۃ العرب کی آزادی ہم چاہتے ہیں خلافت عثمانیہ کا استقلال اور ہم ان باتوں کے لئے مر جانے کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ مولانا صاحب نے کل تقریر میں ایسی پتہ کی بات کہی کہ دلوں کے تمام شکوک دور ہو گئے! کہنے لگے لفظ خلافت میں خ سے خرقہ ہوتا خرقہ جو پہنتا ہے پھر اسے دنیاوی عیش و اکرام سے مطلب نہیں رہتا۔ لا اس جگہ نفی کا لا ہے۔ جس کے معنی ہیں دنیا کے عیش و اکرام کی نفی یعنی تعیش کی چیزوں سے منہ موڑ لینا۔ ف سے ہوتا ہے فقیری اس کا مطلب ہے ترک دنیا اور خدا سے دل لگانا اور ت سے ہوتا ہے تربت یعنی موت کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا۔ پھر انھوں نے کہا خلافت کی تحریک میں شامل ہونے والوں کو ان چار اصولوں پر عمل کرنا چاہئے؟

معین رسول نے عقیدت سے سر ہلا دیا ان کی فرنچ کٹ ڈاڑھی پر یہ عقیدت ذرا کم ہی کھپ رہی تھی۔ لیکن وہ اس عقیدت سے بولے۔

"واہ وا۔ کیا بات کہی ہے جناب مولانا صاحب نے۔"

"تو کیا آپ خرقہ اور فقیری کو ساتھ لے کر افغانستان جا رہے ہیں؟"

"پوری طرح تو نہیں مگر ہے قریب ایسا ہی۔ میں نے جائداد سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اب مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ صرف تھوڑا سا۔ وپیہ وقت بے وقت کے لئے ساتھ رکھ لیا ہے۔ وہ بھی اپنے خیال سے نہیں تمھاری چچی کے خیال سے۔"

"جائداد کا کیا کیا؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

شیخ جی کے بڑے بیٹے معین رسول جنکا ہندستان میں رہنے کا پکا ارادہ تھا وہ اس سوال پر بالکل خاموش رہے۔

"آپ کے افغانستان چلے جانے سے ہندستان کا کیا بھلا ہوگا؟"

"شیخ جی۔ ہم لوگ افغانستان سے فوج لیکر ہندوستان پر حملہ کریں گے اور یہاں سے انگریزوں کو باہر نکال دیں گے اور پھر اسلامی حکومت قائم کردیں گے۔ بھلا کہیں گاندھی والے عدم تشدد سے آزادی مل سکتی ہے؟ آزادی اگر ملے گی تو تلوار سے ملے گی۔ وہ بھی مسلمانوں کی تلوار سے۔"

"لیکن خلافت والے بھی تو مہاتما گاندھی کی طرح کہتے ہیں کہ وہ صرف عدم تشدد سے خلافت حاصل کریں گے۔"

"میرے خیال میں تو ان کا عدم تشدد کا مان لینا یہ انکی ایک سیاسی چال ہے کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس عدم تشدد کے بہانے ہم کو منظم ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ جس دن ہم منظم ہو گئے بس اسی دن سب مسلمان ملکر دھاوا بول دیں گے۔ لیکن مہاتما گاندھی تو اسے سیاسی چال نہیں کہتے ہیں وہ تو دل سے عدم تشدد

سے قائل ہیں۔ اور اس پر پوری طرح وہ عمل بھی کر چکے ہیں۔ اب دیکھ کر جنوبی افریقہ میں وہ اپنے اس اصول سے ذرا بھی نہ ہٹے اور کامیابی بھی حاصل کر لی۔"

معین رسول:" یہ تو ایک بنیئے اور غیر مسلم کی باتیں ہیں میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جس دن ملک جوش میں آجائے گا تو پھر کسی سے رو کے نہ رکے گا اور تلوار چل کر رہے گی۔ عدم تشدد وغیرہ سب دھرا رہ جائے گا۔"

شیخ صاحب:" بس جب یہاں تلوار چل رہی ہوگی اس موقع پر ہم افغانستان سے فوجیں لے کر آجائیں گے۔ اور کشمیر سے لے کر برما تک اور ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک سارا ہندوستان فتح کر لیں گے۔

راحت:" ہندوستانیوں کا جوش ہو یا افغانستان کی فوجیں ان دونوں طاقتوں سے تو انگریزی سلطنت ختم ہونے سے رہی۔ آج کل کی جنگ ہوائی جہازوں اور کوہ شکن توپوں اور گیسوں سے لڑی جاتی ہے اور یہ چیزیں نہ تو ہندوستانیوں کے پاس ہیں اور نہ افغانستان کے پاس۔" پھر جنگ میں فتح کیسے ہوگی؟"

"وہ تلوار کچھ اور ہوتی ہے جو اسلامی جوش سے چلتی ہے اس کے سامنے نہ توپیں چل سکتی ہیں اور نہ گیس۔ کیا سمجھے؟ تم کیا جانو اسلام کی طاقت؟"

راحت رسول نے جس بات کے لئے چچا اور بھائی کو بلایا تھا وہ بات یہ تھی کہ اگر وہ جیل چلا گیا تو سلیمہ اور بچوں کی خبر گیری کا کیا انتظام ہوگا۔ راحت چاہتا تھا کہ یہ بات صاف ہو جائے کہ اس کی جائداد سے کتنی آمدنی ہوتی ہے اور یہ طے ہو جائے کہ اس کی جائداد کی آمدنی ماہ بہ ماہ سلیمہ کو ملتی رہے گی۔

لیکن راحت نے جب بھی یہ بات چھیڑی چچا اور بھائی کی طرف سے یہی جواب ملا ارے سلیمہ گھر چلی آئے دو اس کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ آپس میں کہیں حساب کتاب ہوتا ہے؟"

جب شیخ صاحب مغرب کی نماز مع سنتوں اور نفلوں کے ادا کر چکے تو حقہ منگوایا اور آرام کرسی پر پہلے تو پالتی مار کر بیٹھ گئے پھر اسی حالت میں لیٹ گئے حقے کی نے کو انھوں نے جھکا کر اس طرح سامنے کر لیا تھا کہ وہ دست بستہ ہونٹوں کے سامنے رہے۔ شیخ صاحب ہونٹوں سے کش لیتے، ایک ہاتھ سے تسبیح پڑھتے دوسرا ہاتھ داڑھی پر پھیرتے۔ اور آنکھوں سے سلیمہ کی طرف دیکھتے جو سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

"بیٹی دنیا میں پیسہ اور روپیہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز ہے میل محبت اور آپس داری سمجھیں۔ . . . تم لوگ آکر اپنے گھر میں رہو۔ اسی کو اپنا گھر سمجھو۔ تکلیف ذرا نہیں ہوگی۔ تم بھی اور بچے بھی سب اچھی طرح رہیں گے۔"

جب سلیمہ نے شیخ جی اور انکے صاحب زادے کے لئے میز پر کھانا لگایا تو شیخ جی کہنے لگے۔

"اہو ہو۔ ڈپٹی کلکٹری چلی گئی لیکن ابھی آپ لوگوں کی انگریزیت نہیں گئی۔"
اُن کے بیٹے نے کہا۔
"رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔"

سلیمہ کو یہ دونوں باتیں بے حد ناگوار ہوئیں۔ مگر اس نے ناگواری چھپا کر دبی آواز میں کہا۔

"چچاجان! ابھی سامان لگا کہاں ہے جو آپ لوگوں کو تخت پر کھانا کھلاتی۔ دیکھیے سامان فرنیچر ڈھیر پڑا ہے۔"

(۳)

دوسرے دن صبح کو خلافت کے ایک فوری جلسہ میں راحت رسول کو بلایا گیا۔ شہر خلافت کمیٹی کے سکریٹری نے کہا کہ ایک دشواری یہ آن پڑی ہے کہ جہاں کوئی شخص جلسہ کا اعلان کرنے یا پوسٹر لگانے نکلتا ہے اسے فوراً ہی گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح جلسے کی اطلاع لوگوں کو پہنچانا ناممکن ہو رہا ہے۔ پولیس ہمارے بارہ والنٹیر اب تک گرفتار کر چکی ہے۔ اب ہمارے پاس والنٹیر نہیں رہ گئے ہیں جن کو پوسٹر لگانے اور گرفتار ہونے کے لئے بھیجا جائے سوال یہ ہے ایسی حالت میں ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا ہم لوگ ابھی محاذ کو ستیہ گرہ کا محاذ بنا کر اپنے کو گرفتار کرانا شروع کر دیں؟" یہ سن کر ممبر طرح طرح کے مشورے دینے لگے۔ کسی نے والنٹیر کی فراہمی کی راہ بتلائی اور کسی نے یہ کہا کہ ان گرفتاریوں کا اصل بھید یہ ہے کہ جب ہمارے والنٹیر کام کرنے نکلتے ہیں تو سرکاری مخبر جا کر پولیس کو بتا دیتے ہیں کہ والنٹیر فلاں جگہ خلاف کام کر رہا ہے۔ اس پر پولیس آ کر اسے گرفتار کر لیتی ہے۔ تو ایسی صورتیں کیوں نہ اختیار کی جائیں جن سے

مخبروں کو دھوکا ہو جائے اور وہ موقع پر والنیٹر کو گرفتار نہ کر سکیں۔ دو چار نے یہ رائے دی کہ مناسب یہی ہے کہ ای محاذ پر ستیہ گرہ شروع کر دی جائے اور ہم سب جلسے کا اعلان کر کر کے اپنے کو گرفتار کرالیں۔

لیکن مشتاق احمد نے کہا کہ جلسہ کا اعلان کرنے منیی ڈگی اور پوسٹر کا کام آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

یہ ایسا مشورہ تھا جس کو ماننے میں کسی کو تکلف ہو ہی نہیں سکتا تھا وہ فوراً مان لیا گیا۔ مشتاق احمد نے اپنے گاؤں سے اپنے خاص خاص آدمی پچاس کی تعداد میں بلا لئے اور ان سے پوچھا کہ "تم لوگوں کو میرا ایک ایسا کام کرنا ہے جس میں چھ مہینہ سے لیکر ایک سال تک کی سزا ہو سکتی ہے کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

ان سب نے جو جو جواب دیئے ان سب کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ ہم لوگوں کی خدمتوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جو بھی آپ کے لئے جیل جائے گا اسے جیل میں وہ آرام ملے گا جو اس وقت باہر نہیں ملتا ہے۔ در جیل کے باہر اسکے بیوی بچے بھی چین کی زندگی گزاریں گے اس لئے جو تم ہو اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ اور جب جیل جانے والا رہا ہو کر آئے گا وہ اسے آرام کی زندگی ملے گی۔

ان لوگوں نے جو بات کہی تھی وہ ان کے تجربے کی تھی۔ کیوں کہ چھ سال ہوئے خان بہادر کے ایک سپاہی نے ان کے کہنے پر ایک دردوغہ جی جس نے خان بہادر کے ساتھ بدتمیزی کی تھی سر بازار جوتوں سے پیٹ دیا

تھا۔ اس پر اس آدمی کو چار سال کی سزا ہو گئی تھی۔ وہ سزا میں چھوٹ وغیرہ پا کر تین سال کے بعد چھوٹ کر آ گیا تھا۔ اس نے تبلایا کہ میاں کا انتظام کچھ ایسا تھا کہ اسے جیل میں روز صبح کو آدھ سیر دودھ اور جلیبی کا ناشتہ ملتا تھا اور دونوں وقت کھانے کو گھی میں ڈوبی ہوئی گیہوں کی روٹیاں ملتی تھیں روز آنہ ایک بیڑی کا بنڈل بھی ملتا تھا۔ یہ غذا کھا کر وہ جیل سے پہلوان بن کر لوٹا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی بچوں کو کپڑے آٹا بھی ملتے رہے اور اس آدمی کی تنخواہ کے پانچ روپیہ بھی برابر ملتے رہے ان باتوں کے علاوہ طرح طرح کی رعایتیں کی گئیں۔

خان بہادر نے اپنے آدمیوں کو سمجھانا چاہا کہ حکومت سے کس قسم کا مقابلہ ہے اور اس میں حصہ لینا انکے لئے کتنا ضروری ہے لیکن انھوں نے کہا کہ ہم کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہم تو آپ کو مالک مانتے ہیں اور آپ کے حکم کے بندے ہیں۔ اور آپکے حکم پر چلیں گے۔

رات کو خان بہادر صاحب کے کسانوں کو ڈگی پیٹ کر اعلان کرنے اور پوسٹر لگانے کا گر سمجھایا گیا اور دوسرے دن صبح کو ان سے کہا گیا کہ پہلے شہر بھر میں بکھر جاؤ اور پھر اپنا کام اک دم سے شروع کر دو۔

خان بہادر کے آدمیوں نے خان بہادر کی ہدایت کے مطابق کام کیا۔ اس طرح اچانک جو پچاس آدمیوں نے شہر کے محلے محلے کام شروع کر دیا تو کام چلتا ہی رہا۔ پولیس خاموش رہی۔ اس خاموشی کے کئی سبب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ پولیس کے مخبر کافی دیر کے بعد ان دیہاتیوں کے بارے میں یہ طے کر سکے

گروہ کانگریس کے والنٹیر ہیں۔ اور دوسرا سبب یہ ہوا کہ جب تک پولیس تیار ہو کر گرفتاری کے لئے نکلے نکلے کام بہت کچھ ہو چکا تھا۔ پولیس نے اس پر بھی تین چار والنٹیروں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن کام برابر جاری رہا اور جلسہ کا گلی گلی اعلان ہوتا رہا۔ یہ دیکھ کر حکومت نے باقی لوگوں کو گرفتار کرنا لاحاصل سمجھا اور جن لوگوں کو گرفتار کیا تھا ان کو بھی شہر سے دس میل دور لے جا کر چھوڑ دیا۔ وہ پیدل چل کر دوسرے دن صبح خان بہادر صاحب کے گھر آ گئے۔

لیکن اعلان کرنے والے جو دیہاتی اور ناواقف تھے، اس وجہ سے اعلان اور پوسٹر میں کافی الٹ پھیر ہوا۔ پوسٹروں میں سے بہت سے صرف الٹے ہی نہیں لگے بلکہ جیسے سے بھی لگ گئے اور اعلان کرنے میں بعض محلوں میں بات کو کچھ سے کچھ کر دیا گیا۔ ایک والنٹیر نے تو یہ اعلان کیا کہ ـــ میاں سے اور سرکار سے چل گئی ہے اس لئے میاں نے سب شہر والوں کو فلاں جگہ فلاں وقت بلایا ہے تاکہ سب ان کا ساتھ دیں۔ ایک اعلانچی نے سبھا کو کتھا کر دیا۔ جب لوگوں نے پوچھا کہ کتھا ہوگی تو کیا پرشاد بھی بٹے گا؟ تو اس نے اکڑ کر کہا ـــ میاں کتھا کرائیں اور پرشاد نہ بٹے!! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

لیکن اعلان جیسا بھی ہوا ہو، لوگ اس کا مطلب سمجھ گئے اور جلسے میں باوجود دفعہ ۱۴۴ کے جوق درجوق جمع ہونے لگے۔ آخر ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ جلسہ کے کنارے تک مقرروں کی آواز کا پہنچنا مشکل ہو گیا۔ جلسے کی صدارت ایک پیر صاحب نے کی۔ پہلی تقریر ان ہی کی ہوئی۔ انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ مسلمانوں کے لئے مسئلہ خلافت کتنا اہم ہے اور اس کے لئے

قربانیاں کرنا کتنی بڑی خدمت اسلام ہے۔

اس پر جلسہ میں اللہ اکبر اور مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے لگائے گئے ان دونوں نعروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں حصہ لیا۔ صدر کی تقریر کے بعد ایک خوش گو شاعر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے یہ نظم پڑھی۔

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمہ توحید گلبانگ اذاں کب تک

آخری مصرع پر تو بعض لوگ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور بہت جوش و خروش کا سماں چھا گیا۔ عورتیں جو قناتوں کے پیچھے بیٹھی تھیں اپنے ہاتھوں کی سونے کی چوڑیاں اور کانوں کے بندے اتار اتار کر صدر صاحب کی خدمت میں اپنے چندے کے طور پر بھیجنے لگیں۔ پھر نو آدمیوں نے ایک ایک کر کے صدر صاحب کی معرفت جلسے کو اس بات کی خبر دی کہ وہ کافروں کی ناپاک سرزمین یعنی ہندوستان کو چھوڑ کر ہجرت کر کے افغانستان جا رہے ہیں۔ اس پر فلک شگاف نعرہ اللہ اکبر بلند کئے گئے۔ صدر صاحب نے لوگوں کو مطلع کیا کہ

مہاجروں کی آسانی کے لئے لاہور میں ایک دفتر قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع دے کر انھوں نے لوگوں کی ہجرت کے لئے ہمت افزائی کی۔

صدر صاحب کے بعد شتا ق احمد صاحب سابق خان بہادر تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ "مولانا عبدالقدوس کو جس جرم پر گرفتار کیا گیا ہے اس کا میں نے عدالت میں ایک بار ارتکاب کیا تھا اور اب پھر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ انگریزی فوج میں ملازمت کرنا حرام ہے حرام ہے حرام ہے۔ میں حکومت سے کہتا ہوں کہ وہ مجھے بھی گرفتار کرلے"۔ ان کی تقریر کے بعد دیر تک تحسین کے نعرے گونجتے رہے۔ اور لوگوں کا جوش عروج کو پہنچ گیا۔

راحت رسول نے پہلی مرتبہ سرکار کے خلاف جلسے میں شرکت کی تھی۔ وہ لوگوں کے جوش و خروش سے بے حد متاثر تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وطن سے ہجرت کرنا اور جیل جانے کا خطرہ مول لینا بھی اس طرح کھیل سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح لوگ سمجھ بھی رہے ہیں اور عمل بھی کر رہے ہیں۔ جب راحت تقریر کرنے کو کھڑا ہوا تو اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی اس نے صرف اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان بہت غریب ہے اور ہندوستان کے کسان ننگے اور بھوکے ہیں۔ اس نے دیہاتی ننگ، بھوک اور بے بس زندگی کی تصویر کشی بڑے دل نشیں انداز میں کی اور کہا کہ ان لوگوں کو ان کی مصیبتوں سے نجات دلانے کے لئے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور ایسی غریب پرور آزادی کے لئے ہم لوگ

جو قربانی بھی کریا سو کم ہے۔ راحت کی تقریر کو لوگوں نے بہت غور سے سنا۔ ہر طرف سناٹا چھایا رہا اور پہلو تک بدلنا بند ہو گیا۔ لیکن درا س تقریر کے بیچ میں تحسین کے نعرے بلند ہوئے اور ختم ہونے کے بعد اللہ اکبر کے نعرے لگے مگر جب راحت بیٹھا ہے تو اس کے بعد بھی کچھ دیر تک سناٹا چھایا رہا۔

تقریر کے بعد جب راحت بیٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ لیڈروں کی اکثریت نے اس کی تقریر کو کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔ ایک صاحب تو بے تکلفی کے انداز میں کہنے لگے کہ بھائی راحت صاحب "کہاں آپ نے دین کے مسئلے میں لاکر دنیا کو ملا دیا۔ کہاں غریبی اور کہاں مذہبی جہاد؟"

گھر آنے پر سلیمہ نے پوچھا۔۔۔۔۔

"ہم کو بھی بتاؤ کہ جلسہ میں کیا ہوا؟"

"لوگ بہت جوش میں ہیں یہ حالت ہے کہ اگر خون کا ایک قطرہ بھی مانگو تو لوگ اپنے گلے اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر ڈال دیں اور اپنے خون کے دریا بہا دیں۔ خاص کر مسلمانوں کا تو عجب حال ہے۔ وہ سمرنا کے مظلوموں کا حال سن کر اس طرح رو دیئے گویا وہ انکے قریب ترین عزیز ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود بھی جوش و خروش کے ایک سمندر میں بہتا چلا جا رہا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ یوں ہی بہتا رہوں۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم انگریز کو کیسے نکالیں گے اور پھر نکالنے کے بعد کس طرح اپنے کسانوں اور غریبوں کی حالت سنبھالیں گے۔ لیکن دل کہتا ہے کہ تو کیوں متفکر ہے آخر ہمارے لیڈروں نے کچھ سوچ ہی لیا ہوگا۔ اس لئے اب ان پر بھروسہ کر کے

آگے بڑھو۔"

اس وقت باہر کسی نے آواز دی زبیدہ جاکر خبر لائی کہ "کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔"

راحت باہر گیا وہاں شہر کانگریس کمیٹی کے صدر اور سکریٹری تھے اور ان کے ساتھ وہ لالا جی بھی تھے جن کے مکان میں راحت اب آکر رہا تھا۔ سکریٹری نے "آپ کی قربانی کے شہر بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔ جہاں جاؤ لوگ یہی باتیں کر رہے ہیں کہ یا تو آپکی کوٹھی۔ بنگلے اور خانساماں والی زندگی، یا اس معمولی سے گھر میں آ گئے ہیں اور آپ کی میم صاحبہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا رہی ہیں۔ گھر کے سب لوگ کھدر پہن رہے ہیں۔ واہ وا! ہمارے شہر میں اس طرح کی قربانی کی یہ مثال پہلی مثال ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اپنی عقیدت کے پھول پیش کرنے آیا ہوں۔"

راحت نے کچھ انکساری کی اور کچھ اپنے اندرونی احساسات کا اظہار کیا پھر سکریٹری نے کہا کہ "بدیسی کپڑوں کا ڈالا جلانے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ شہر کانگرس کمیٹی کا ارادہ ہے کہ اس اندولن میں آپ بھی پورا ساتھ دیں۔"

"میں حاضر ہوں۔ آپ جو کہیں گے وہ کیا جائے گا۔"

"سول لائنس اور صدر محلے کے لوگ ہماری بات نہیں سنتے ہیں لیکن اگر آپ وہاں جائیں گے اور وہ دیکھیں گے کہ کپتان صاحب بہادر بھی اپنا عہدہ تیاگ کر ملک کی سیوا کر رہے ہیں تو پھر انکے دلوں میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائیگی اور وہ ہمارا ساتھ دینے لگیں گے۔"

راحت نے دوسرے دن صبح چلنے کا وعدہ کر لیا۔ کانگرس کے آدمیوں کی بات کے ختم ہو جانے کے بعد لالا جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"شریمان کپتان جی۔ ایک پرارتھنا میری بھی ہے۔ آپ پہلے کہہ دیں کہ مان لیں گے تو پھر ارج کروں۔"

"لالا جی آپ کہئے میرے بس میں ہے تو ضرور مان لوں گا۔"

"آپ نہ مانیں گے تو میں بہت دکھی ہوں گا۔ وہ پرارتھنا یہ ہے کہ اس ٹوٹے پھوٹے گھر کو جو کسی طرح بھی آپ کے لائق نہیں ہے اپنا ہی گھر سمجھئے جب تک جی چاہے رہئے اور کرایہ کی کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں بھارت ماتا کی اور کچھ سیوا نہیں کر سکتا ہوں۔ تو یہ چھوٹا سا کام ہی کر لینے دیجئے کہ میں آپ کے ایسے نیتا کی سیوا کر لوں۔"

یہ کہکر لالا جی۔ راحت کا پاؤں چھونے لپکے۔

راحت گھبرا گیا۔ اس نے لالا جی کو لپٹا لیا اور کہا۔

"ہائیں ہائیں۔ لالا جی آپ اتنی مہربانی کریں اور پھر وہ بھی اس طرح؟"

"اسے مہربانی نہ کہئے۔ مہربانی تو آپ کریں گے اگر اسے سویکار کر لیں گے۔"

راحت نے لالا جی کی بات صرف اس لئے مان لی کہ سب کانگرسی ہمدردوں نے ان کی تائید کی۔ اور راحت کو لالا جی کی پر خلوص التجا کے سامنے اپنے سب عذر بے جان نظر آنے لگے۔

ابھی لالا گئے بھی نہیں تھے کہ سات خوش پوش و کھدر پوشوں کی ایک ٹولی آئی جس نے بہت۔ احترام سے راحت کو سلام کیا اور یہ کہنے لگے . . . . .

"آپ کی قربانی سے ہم لوگ سب بہت متاثر ہیں۔ بار میں چار روز سے ہر وقت اسی کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ ہم لوگوں کا آپ کو سلام کرنے کا بہت جی چاہتا تھا لیکن پہلے سے جان پہچان نہ ہونے کی وجہ سے ہچکچاہٹ تھی۔ آج ہم اتنے لوگوں نے طے کیا کہ آپ کی خدمت میں ہدیہ عقیدت پیش کرنا ضروری ہے آپ نے ہم لوگوں کے سامنے ایسی عظیم مثال پیش کردی ہے کہ سب کے دل ہل گئے ہیں۔ پولیس کی کپتانی تو بادشاہی ہوتی ہے اور یہ عہدہ تو عام طور سے انگریزوں کو ملتا ہے۔ اس عہدہ کی حسرت میں تو ہم ہندوستانی مرتے ہیں۔ ایسے عہدہ سے اور استعفا!!"

یہ کہکر ان وکیلوں میں سے ایک نے ایک سنہرا ہار نکال کر راحت کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر سب نے بڑھ بڑھ کر باری باری راحت کے گلے میں پھولوں کی یا پھولوں کے ہار ڈالے اس اظہار عقیدت کو دیکھکر زبیدہ بے تحاشا اندر بھاگی۔ اور بے حد خوشی اور مسرت کے ساتھ ہاروں کی خبر سلیمہ کو سنائی اس پر سلیمہ بھی پھاٹک کے پاس آکر ان لوگوں کی بات سننے لگی۔

ایک وکیل کہہ رہا تھا۔

"ہم لوگ اس بات پر غور کر رہے تھے کہ کوئی صورت ایسی بھی ممکن ہے کہ ہم لوگ آپ کے سامنے ہیں یہ بھی آپ کے نقش قدم پر چل سکیں۔ اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہماری گزر بسر وکالت ہی پر ہوتی ہے اور اسکے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہم لوگ زیادہ بڑے وکیل نہیں ہیں۔ بس اوسط آمدنی ہے۔ چونکہ وکالت چلانے کیلئے کچھ ٹیم ٹام بھی کرنا پڑتی ہے اس وجہ سے ہم لوگ

نہ کوئی جائداد بنا سکے ہیں اور نہ سرمایہ اکٹھا کر سکے ہیں ایسے میں سوال یہ ہے کہ
وکالت چھوڑ دیں تو کریں کیا؟ اگر دال روٹی کا بھی سہارا مل جائے تو اسے چھوڑنے
کو تیار ہیں"۔

راحت نے کہا۔ "میں نے تو جتنی جو کچھ کیا ہے خدا کے سہارے پر کیا ہے
میرے پاس موٹر ہے تھوڑا بہت فرنیچر ہے اور بہت ہی معمولی جائداد ہے"۔
ایک وکیل صاحب جی نے پوچھا۔ "چرخہ کات کر کیا گزر کی جا سکتی ہے؟"
راحت "کانگریس کے بعض لیڈر تو کہتے ہیں کہ اگر گھر بھر یہ کام کرے تو
گزر بسر بھر کی آمدنی ہو سکتی ہے"۔
"میرا جی چاہتا ہے کہ اس بات کو آزما دیکھوں۔ اگر یہ بات ٹھیک نکلی
تو پھر واقعی گاندھی جی نے ہندوستان کا آدھا مسئلہ حل کر لیا"۔
"آپ کیسے آزمائیں گے؟"
"فاقہ کشی کے خطرے مول لے کر"۔

(۴)

جب راحت صدر۔ کے محلہ میں گشت لگانے گیا تو بہت سے گھروں سے تو
مرد اور عورتیں محض اسے دیکھنے ہی کیلئے نکل آئے اور پوچھنے لگے کہ یہی وہ کپتان
پولیس ہیں جنھوں نے استعفا دیا ہے۔ مگر جو بھی آیا وہ دو چار بدیسی کپڑے ضرور
ہی ساتھ لیتا آیا۔ صدر میں ایک شخص نے ایک بہت بڑی سی گٹھری لا کر راحت
کے قدموں پر ڈال دی اور کہنے لگا۔

"میری ماں۔ اہلیہ اور بیٹیاں ان سب کو آپ کی بیگم صاحبہ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔" "کل بھی ان سب کو لیکر میرے گھر آجائیے۔"

"کل نہیں پہلی یا دوسری کو۔" "کیوں خیریت ہے۔"

"دہنس کر) یہ جو گٹھری ہے۔ اسمیں ان لوگوں کے کل کپڑے ہیں۔ اب ان کے پاس صرف ایک ایک کھدر کی چادر ہے جسے وہ پہنے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے کپڑے جو بھی بنیں گے وہ پہلی کو بنیں گے۔ اس سے پہلے ممکن نہیں۔"

راحت نے اسکے جذبات سے متاثر ہوکر اسے محبت سے لپٹا لیا۔ پھر راحت بڑھ گیا۔ اس نے چند ہی گھر طے کئے ہوں گے کہ ایک نوجوان سائکل پر بدحواس بھاگتا ہوا اسکے پاس آیا۔ بہت تیز رفتاری سے بائیسکل چلانے کی وجہ سے اسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ اتنا ہانپ رہا تھا کہ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اپنی سانس پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ رک رک کر کہنے لگا۔"

"خدا کا شکر ہے۔ آپ یہیں ہیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں چلے نہ گئے ہوں۔ کھدر کے یہ تھان آپکی نذر ہیں۔ میری درخواست یہ ہے کہ جس شخص کے گھر میں اب کپڑے نہیں ہیں۔ اور عورتیں صرف چادریں لپیٹے ہوئے ہیں انکی طرف سے یہ تھان انکو ہدیہ دیدیجئے" یہ کہکر وہ جوان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے بائیسکل پر بھاگ گیا۔ اس نے راحت کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ وہ نوجوان کا نام اور پتہ پوچھتا اور اسکی کچھ تعریف کرتا۔ قربانی اور خدمت کی یہ دوسری مثال بھی پہلی سے کم نہ تھی۔ جانے یہ نوجوان کون تھا اس نے عورتوں کی حالت کی بات کب سنی تھی کب وہ بائیسکل پر تھان خریدنے گیا۔ اور کیسے اتنی جلدی لے آیا۔ راحت نے

دل میں کہا کہ قربانی کا یہ جذبہ افراد کا نہیں ہے۔ پوری قوم کا ہے جس کا اظہار افراد سے ہو رہا ہے۔

راحت نے وہ دونوں تھان اس شخص کو دیئے جسکے لئے آئے تھے۔ اس شخص نے یہی سمجھا کہ راحت نے منگوا کر دیئے ہیں۔ اس پر کیا منحصر جن لوگوں کے سامنے نوجوان تھان دے گیا تھا ان کا بھی یہی خیال تھا حالانکہ راحت برابر اس سے انکار کرتا رہا۔

جب راحت ذرا رات گئے گھر پہنچا ہے تو سلیمہ اور زبیدہ دونوں کچھ خوش اور کچھ گھبرائی ہوئی ملیں۔ پوچھنے پر سلیمہ نے کہا۔

"آج تو عجیب طرح کا دن گزرا۔ صبح زبیدہ حسب دستور سبزی لینے جو گئی تو سبزی فروش اسکے ساتھ ساتھ گھر تک چلا آیا اور کہنے لگا کہ آپ بٹیا صاحبہ کو تکلیف نہ دیجئے ہمارا روزانہ آکر پوچھ جایا کردوں گا اور جس چیز کی ضرورت ہوگی خود ہی دے جایا کرونگا۔ پھر اس نے جو سبزی زبیدہ لینے گئی تھی وہ دی تھی۔ اور پھر بہت سی اور سبزی بھی بہت اصرار سے دی۔ اور قیمت میں ایک پیسہ بھی قبول نہیں کیا۔" سبزی فروش ابھی گیا ہی ہوگا کہ طرح طرح کی عورتیں آنے لگیں۔ کوئی برقع میں کوئی اچھی ساری میں، کوئی معمولی حیثیت کی، اور یہ سب گھر کا کام زبردستی کرنے لگیں۔ کسی نے جھاڑو دی، کسی نے باورچی خانہ لیپ دیا، کسی نے برتن دھو دیئے۔ دو لڑکیاں آگئیں تھیں انھوں نے چاؤں چاؤں کر کے مجھے باورچی خانہ سے چلے آنے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر دو گھنٹے کے اندر اندر جانے کیسے کیسی طرح کی ہانڈیاں تیار کر کے رکھ دیں۔ اور پھر سلام کر کے اور کل آنے کا وعدہ کر کے چلی گئیں۔

"ایک بیوی جو سن میں تمہاری ماں کے برابر ہوں گی اور صورت سے

بہت ہی شریف معلوم ہوتی تھیں وہ تانگے پر برقع میں آ بیٹھا وہ یہ اصرار کرنے لگیں کہ میں لیٹ جاؤں تو میرے پاؤں داب دیں۔ زبیدہ کی بجد خاطریں ہوئیں۔ بجانے کتنی مٹھائی آئی۔ کتنے پھل آئے۔ گڑیاں آئیں اسی طرح معصوم کو لوگ دن بھر پیار کرتے رہے۔" زبیدہ بھاگ کر گئی اور اپنی گڑیاں اٹھالائی اور دکھانے لگی کہ ان کے کپڑے بھی کھدر کے تھیا۔

سلیمہ کہنے لگی "یہ سب کیا ہو رہا ہے (ہنس کر) ان مہربانیوں کا سامنا آخر کیسے کیا جائے میں تو آج بہت ہی سٹپٹائی رہی۔"

راحت نے یہ سن کر سول لائن اور صدر محلے میں جو کچھ ہوا تھا وہ سنایا پھر کہنے لگا۔ "مہاتما جی سچ کہتے ہیں کہ عدم تشدد کے ساتھ جو قربانی حق کے خاطر کی جائے اس میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ میرے تو خیال و خواب میں کبھی نہ تھا کہ لوگ مجھے اس طرح ہیرو بنا لیں گے۔" جس دن بدیسی کپڑوں کا الاؤ جلنے والا تھا اس دن صبح کو پڑوس کی ایک عورت گٹھری لیکر آئی اور سلیمہ سے کہنے لگی۔
"ہم لوگ یہ کپڑے نہیں پہنیں گے جو دیکھتا ہے کہتا ہے کہ یہ تو انگریزوں کی بیٹریاں ہیں میاں نے کہا کہ جاکر لوٹا آؤ۔"

سلیمہ نے راحت کو بتلایا کہ "میں نے یہ سوچ کر کہ بدیسی کپڑے جلائے جائیں گے کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ غریبوں کو استعمال کیلئے دیدیئے جائیں یہ سوچ کر میں نے اپنے کپڑے پڑوس کی ایک غریب عورت کو جو میرے یہاں داگیری کیلئے دوڑ رہی تھی دیدیے تھے۔ وہ اب اس طرح واپس آگئے ہیں۔" راحت نے جھوم کر کہا۔

واہ رے گاندھی۔ واہ رے محمد علی اور شوکت علی اور واہ رے مولانا عبدالباری ان لوگوں نے کیسی آگ بھردی ہے قوم میں!! اب تو سال دو سال کے اندر ملک آزاد ہے۔"

باب

ٹوڈی بچہ ہائے ہائے

(۱)

فرخ تڑپ کر بولا۔

"یہ بات سچی ہے کہ انگریزی حکومت بے ایمان ہے اور رشوت خور ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پولیس کس طرح شریفوں کو ڈرا دھمکا کر نوٹوں کی گڈی وصول کرتی ہے۔"

اک دم سے لڑکوں میں جو شور سا ہو رہا تھا وہ ختم ہو گیا اور سب اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابھی تک صرف نویں اور دسویں درجوں کے طالب علموں کی یہ بات چیت جاری تھی لیکن اب مرکز توجہ ساتویں درجہ کا ایک دبلا پتلا طالب علم بن گیا۔ فرخ کو لڑکوں نے اٹھا کر ایک میز پر کھڑا کر دیا۔ وہاں سے فرخ نے وہ سارا واقعہ اونچی آواز میں کہہ سنایا کہ کس طرح وہ اپنے باپ کی گرفتاری کے وقت کاغذات لے کر بھاگا تھا اور لالہ شام ناتھ کے گھر پہنچا تھا، اور کس طرح

پھر دروغہ نے آکر اسکو گھیرا اور پھر لالہ جی پر بغاوت کا جھوٹا الزام لگاکر۔ ان سے نوٹوں کی گڈی وصول کرلی۔

فرخ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک لڑکے نے چلاکر کہا۔

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔ کہیں اس طرح دن دھاڑے سب کے سامنے کوئی رشوت دے سکتا ہے؟ بھلا ایسی بات عقل میں سما سکتی ہے؟"

فرخ نے واقعہ بہت وضاحت اور خود اعتمادی سے بیان کیا تھا اور سننے والے کافی متاثر ہوگئے تھے۔ لیکن اس چیلنج سے پھر مجمع کا رنگ بدلنے لگا لڑکوں میں آپس میں کھسر پھسر ہونے لگی اور جلسہ اکھڑنے سا لگا۔ اس وقت دسویں کلاس کا ایک طالب علم اچک کر ایک میز پر کھڑا ہوگیا اور چیخ کر کہنے لگا۔

"خلافت والے اور کانگریس والے لوگوں کو بہکانے کیلئے ایسے ہی جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ فرخ تو ہے ہی ایک ایسے شخص کا لڑکا جسے بغاوت کے جرم میں کالے پانی کی سزا ہو چکی ہے۔"

اب فرخ کی ہوا جو ذرا دیر کیلئے بندھ گئی تھی اکھڑ گئی۔ اس اسکول میں سرکار کے خلاف باتوں کا چلنا کچھ آسان بھی نہ تھا۔ کیوں کہ یہاں سرکاری افسروں کے لڑکے پڑھتے تھے اور ان کی بڑی شان تھی بعضوں کو چھوڑنے اور لے جانے کیلئے موٹریں آیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی بعض لڑکوں کے باپ اور چچا جو مجسٹریٹ یا ڈپٹی یا کپتان پولیس ہوتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر سے ملنے آجایا کرتے تھے سالانہ جلسوں میں تو اگلی کرسیوں کی روشن قطاریں ایسے ہی سرپرستوں سے بھری رہتی تھیں۔ بڑے افسروں کے لڑکوں کی اپنے ساتھیوں پر کافی دھونس رہتی تھی اور

بعض بعض چھوٹے ماں باپ کے لڑکے افسروں کے لڑکوں کی خوشامد بھی
کرتے رہتے تھے۔ جب سے خلافت کی تحریک نے زور پکڑا تھا تب سے
گورنمنٹ اسکول میں سرکاری افسروں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی
اور ان کے لڑکے بھی اپنے ہم جماعتوں کو پارٹیاں وغیرہ زیادہ دینے لگے
تھے اور پارٹیوں میں تحفے بھی دینے لگے۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے ابھی
تک اس اسکول کے لڑکوں میں اسکول کے بند کرنے کی تحریک کا کیا سوال
اسٹرائک تک کی تحریک نہیں چل سکی تھی۔ آج پہلا موقع تھا کہ لڑکوں
نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ چار روز کے بعد گاندھی جی اور مولانا عبدالباری
صاحب کے حکم سے شہر بھر میں جو اسٹرائک ہونے والی ہے اس میں وہ
شریک ہوں یا نہ ہوں۔ یہ سوال اس موقع پر خاص طور سے اس وجہ
اٹھا تھا کہ پرنس آف ویلز ہندوستان آنے والے تھے اور اس اسکول
نے یہ طے کیا تھا کہ جب وہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھیں گے تو اس
موقع پر اسکول میں ایک خاص تقریب منائی جائے گی جس میں گورنر صاحب
آئیں گے اور ان کے سامنے لڑکے "گاڈ سیو دی کنگ" گائیں گے اس غرض
سے لڑکوں کو اس گانے کی ٹریننگ دی جائے گی۔ اس ٹریننگ کیلئے لڑکوں
کا انتخاب بھی کر لیا گیا تھا اور ان کو اس گانے کی پریکٹس بھی کرائی جا رہی تھی۔
اس ٹریننگ کو زیادہ با اثر بنانے کے لئے ایک دن ان لڑکوں کے
سامنے پرنس آف ویلس کی تصویر لگا دی گئی اور لڑکوں سے کہا گیا کہ اس کو
سلامی دو۔ اس پر دو مسلمان لڑکوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ شرک ہے

ہیڈ ماسٹر نے ان لڑکوں کو بلا کر بید بھی لگائے اور جرمانہ بھی کر دیا۔ اس سے لڑکوں میں زبردست بے چینی پھیل گئی اور انٹرول میں فیلڈ میں جلسہ ہونے لگا جس میں ایک میز لا کر پلیٹ فارم بنا دیا گیا۔ پھر ہر لڑکا اپنی سی کہنے لگا۔ پھر ایک لڑکا جو اپنے کانگریسی رجحانات کیلئے مشہور تھا اس نے اسٹرائک کے حق میں ایک اچھی سی تقریر کی۔ لیکن اسی وقت ایک دوسرے لڑکے نے جوابی تقریر کی اور کہا کہ ہندستان میں جو امن اور ترقی دیکھنے میں آ رہی ہیں وہ سب انگریزوں کے طفیل میں ہیں۔ ان تقریروں کے بعد فرخ نے وہ تقریر کی جس کا اوپر تذکرہ آیا ہے۔

جن لڑکوں نے فرخ کو جھوٹا قرار دیا تھا ان میں سے ایک ڈپٹی کپتان پولیس کا لڑکا تھا اور دوسرا ایک رائے بہادر کا لڑکا تھا۔ یہ دونوں کچھ سمجھا کر اور اسکول کے دوستوں کو کافی پارٹیاں بھی دے چکے تھے اور خاص خاص لڑکوں کو تحفے بھی دے چکے تھے۔ پھر سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ جو بات انھوں نے کہی تھی وہ دل کو لگتی بھی تھی۔ جس وقت فرخ کے خلاف فقرے زوروں پر تھے ٹھیک اسی وقت ایک گوشہ سے آواز آئی "فرخ ٹھیک کہتا ہے"۔

یہ شوکت الشان تھا جو اسکول میں نواب زادہ مشہور تھا اور فرخ سے ایک جماعت آگے تھا اور سب جانتے تھے کہ فرخ اور شوکت میں دوستی نہ تھی۔

شوکت الشان میز پر چڑھ کر کہنے لگا۔ "یہ ٹھیک کہتا ہے جس دن یہ واقعہ ہوا ہے میرے ابا حضور جو جناب لالہ جی کے دوست ہیں وہاں موجود تھے اور انھوں نے بھی یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انکو لالہ جی کی اس ذلت پر بہت دکھ ہوا تھا اور گھر آ کر انھوں نے یہ سب واقعہ مجھے سنایا تھا لیکن یہ بات

مجھ کو آج ہی معلوم ہوئی کہ وہ لڑکا جو وہاں سے غائب ہو گیا وہ یہی ہے فرخ۔
شوکت الشان کی اس گواہی کے بعد پھر مجمع کا رنگ بدل گیا۔

"اسٹرائک ہوگی" "ہڑتال ہوگی" "ہوگی اور ضرور ہوگی"
کچھ لڑکوں نے مخالفت کرنا چاہی لیکن انکی کسی نے نہ سنی پھر تو نعرے لگنے لگے۔
"مہاتما گاندھی کی ـــ جے" "محمد علی شوکت علی کی ـ جے"
"مولانا عبدالباری ـــ زندہ باد۔

لڑکے اتنے جوش میں آگئے کہ اسی وقت کتابیں لے کر نعرے لگاتے ہوئے اسکول سے جلوس کی شکل میں نکل گئے اور امین آباد کا چکر لگا کر حضرت گنج کی طرف بڑھے جو انگریزوں اور انگریزوں کے حمایتوں کا بڑا مرکز تھا۔ قریب قریب سارا اسکول خالی ہو گیا تھا۔ پھر بھی کلاسوں میں سات سات آٹھ آٹھ طالب علم پہنچ ہی گئے۔ اس پر ہیڈ ماسٹر کا حکم آگیا کہ چاہے کلاس میں ایک طالب علم ہو، پڑھائی بند نہ کی جائے۔

جب سڑکوں پر جلوس جا رہا تھا تو فرخ کی نظر شوکت پر پڑی وہ لڑکوں میں گھستا گھستا اس تک پہنچ کر کہنے لگا۔

"آپ نے مجھے بہت سہارا دیا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ ابا حضور بھی وہاں موجود تھے" شوکت الشان نے خوش ہو کر فرخ سے ہاتھ ملایا۔

"میرا بہت دل چاہتا تھا کہ میں اس لڑکے کو دیکھوں جو اتنے پولیس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہوا ہو گیا"
فرخ بڑی زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا "وہ تو بڑے مزے کی بات ہوئی۔

انکی آنکھوں میں دھول میں نے انہیں نوٹوں کی گڈّھی نے جھونکی تھی۔ ہوا یہ کہ ادھر لالہ جی اپنے زنانے محل سے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈّی لیئے باہر نکلے اور اُدھر سب اس طرح ان نوٹوں کو تکنے لگے کہ ان کو اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہا۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ ان لوگوں کی محویت کو سمجھ لیا کہ اور یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ موقع غنیمت ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ پھر تو میں دبک کر ایک پولیس والے کے برابر سے نکلا۔ اس کو کچھ ٹھیس بھی لگی لیکن پھر بھی وہ نوٹوں کی گڈّی کے نظارے میں اتنا غرق تھا کہ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ اس سے نکل کر میں ڈیوڑھی میں آگیا۔ اتفاق سے دربان بھی اپنی جگہ سے ہٹ کر اندر پہنچ چکا تھا۔ اور وہ بھی اسی نظارہ میں غرق تھا۔ اس لیئے میری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوئی اور میں گلیوں میں ہوتا ہوا اپنے ابا کے ایک دوست کے گھر پہنچ گیا۔

"تم کو پولیس والوں سے ڈر نہیں لگا۔" "نہیں۔ کیوں کہ ابا سمجھایا کرتے تھے کہ پولیس والوں کے پاس بے ایمانی ہوتی ہے۔ ظلم ہوتا ہے۔ لیکن علم، عقل، ذہن شناسی کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔"

"بھئی میری تو لال پگڑی والے کو دیکھ کر جان نکلتی ہے۔"

"میرا ساتھ رہا تو یہ ڈر نکل جائے گا۔" "ساتھ ایسا اب ہم دونوں دوست رہیں گے۔ تم نے آج تقریر بڑے معرکی کی ہے۔ ابا حضور بہت خوش ہوں گے۔ جب سنیں گے کہ میں اس ہوشیار لڑکے سے ملا ہوں جو اس طرح نکل گیا تھا۔"

"کیا ابا حضور خلافت میں شریک ہیں۔" "شریک تو نہیں ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ہمارے ذاتی علاقے پر غیر قابض ہو رہے ہیں اسی طرح

مسلمانوں کے علاقے پر بھی غیر قابض ہو رہے ہیں اس لئے۔ ۔ ۔ ۔"

اب جلوس ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کے سامنے سے گزر رہا تھا اس لئے سب پوری آواز سے چلانے لگے۔

"مہاتما گاندھی کی ــــ جے"؛ "مولانا شوکت علی محمد علی کی ــ جے" "ہندو مسلمان کی جے"۔

فرخ اور شوکت نے بھی ان نعروں میں شرکت کی۔ اِن نعروں اور اسکے جوش میں تھوڑی دیر کے لئے فرخ اور شوکت کی بات چیت رک گئی۔ آگے نکل کر شوکت نے پوچھا۔

"آپ کے والد صاحب کو کس جرم میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ ؟"

"ایک بڑی عجیب سی کہانی ہے۔ کہتے ہیں کہ افغانستان میں کوئی صاحب ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں کسی صاحب کو خط لکھا کہ امیر افغانستان کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں دیسی جنگ چھڑ جائے جیسی ۱۸۵۷ء میں چھڑی تھی تو وہ حملہ کر دیں گے اور اس طرح دو طرفہ حملوں سے گھر کر انگریزی طاقت ٹوٹ سکتی ہے اور ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے نجات پا سکتا ہے آزادی مل جانے کے بعد پھر ہندوستان میں اسلامی حکومت بن جائے گی۔ وہ خط نہ تو کاغذ پر لکھا گیا تھا اور نہ قلم یا پنسل سے۔ بلکہ کوئی طرز تحریر ہوتا ہے جسے خط گلزار کہتے ہیں جس میں صرف پھول پتیاں ہوتی ہیں اور کوئی حرف نہیں ہوتا ہے اور جاننے والے اس خط کو اسی طرح پڑھ لیتے ہیں جیسے ہم لوگ الف۔ ب۔ میں لکھی ہوئی چیز کو پڑھ لیتے ہیں۔ وہ خط اس خط گلزار میں ایک ریشمی رومال پر کاڑھا گیا تھا اور کسی کو دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں فلاں شخص کو پہنچا دیا جائے۔ مگر وہ ریشمی رومال جس شخص کی معرفت ہندوستان بھیجا گیا تھا، وہ اگرچہ قومی تحریک میں بہت معتبر سمجھا

جاتا تھا۔ لیکن اس نے دغا دی اور وہ ریشمی رومال سرکار کو دیدیا۔ پھر سرکار نے بعض لوگوں کی مدد سے خط پڑھ لیا۔ اس پر ان لوگوں کی تلاش ہونے لگی جن کے بارے میں یہ خیال کیا گیا کہ وہ خط انکے نام ہو سکتا ہے۔

"میرے والد پر بھی یہ الزام لگایا گیا کہ اس خط کے مخاطب وہ بھی ہیں اور دلیل یہ دی گئی کہ ہمارے اخبار میں جگہ جگہ جو پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں وہ ریشمی رومال کے پھول پتیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اور پھر یہ دکھلایا گیا کہ ابا چکن کا جو کرتا پہنے ہوئے تھے اس میں بھی ویسی ہی پھول پتیاں تھیں۔"

"پھول پتیاں تو چکن میں ہوتی ہی ہیں۔"

"ہمارے وکیل نے کہا تھا کہ بات یہ نہیں ہے کہ ریشمی رومال کی پھول پتیاں ابا کے کرتے یا ابا کے اخبار پہ بنی ہوئی ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ خط لکھا ہی ایسے پھول پتیوں میں جاتا ہے جو عام طور سے رائج ہوں تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور سب اسے معمولی چیز سمجھیں۔ مگر سرکار نے کچھ نہ سنا اور ابا کو کالے پانی کی ——"

فرخ کی آواز بھرا گئی اور وہ باتیں کرتے کرتے رو دیا۔ یہ دونوں جلوس نے آخری سرے پر آگئے تھے۔ شوکت نے فرخ کو اس طرح روتا ہوا دیکھ کر ایک طرف کھینچ لیا۔

"رو مت۔ بہادر بنو۔"

"شوکت سن میں بھی دو تین سال بڑا تھا اور فرخ سے ایک کلاس آگے بھی تھا۔ اس نے یہ بات کہی بھی تھی بڑے بھائی کی طرح۔ ہمدردی پا کر فرخ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"شوکت بھائی ——"

"شوکت کی بھی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔"

"فرخ دیکھو آج کل تو بڑے بڑے لوگ جیل جا رہے ہیں۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں۔ ابا نے چلتے وقت کہا تھا کہ بیٹا فرخ دیکھو شیر بچہ بننا۔ مگر مجھے ابا بہت یاد آتے ہیں۔ ہر وقت یاد آتے ہیں۔ مجھے اس وجہ سے اس ظالم خونخوار حکومت سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں جب بھی کسی پولیس والے کو دیکھتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں اور بس چلے تو انگریز کی بوٹی بوٹی کاٹ ڈالوں"۔

فرخ کے آنسو اس کے عصر نے پی لئے تھے۔

"آؤ شوکت بھائی عہد کریں کہ ہم لوگ اپنے گورنمنٹ ہائی اسکول میں اسٹرائک کرائے بلکہ اس کو بالکل بند کرا کر رہیں گے"۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرے کلاس کے آٹھ دس لڑکے اور ساتھ ہیں۔

"لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا کریں۔ آج ہم سب بہت جوش میں ہیں اور آج اتنا بڑا جلوس بھی نکال لیا ہے، لیکن جو لڑکے اسکول ہو کر آرہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کلاسوں میں لڑکے پہونچ گئے اور پڑھائی ہوتی رہی۔

"ہمارے یہاں وہ ایکا ہی نہیں جو اور اسکولوں میں نظر آتا ہے"۔

فرخ۔ "کچھ پرواہ نہیں۔ ہمت مرداں مدد خدا"۔

(۲)

دوسرے دن فرخ نے اسکول میں کچھ ایسا تماشہ دیکھا کہ اس کی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ ہوا یہ کہ شہر کے وہ بڑے آدمی جن کے لڑکے اس اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ سب خود موٹروں، موٹر سائیکلوں اور بگھیوں پر اپنے اپنے لڑکوں کو اسکول پہونچانے آگئے، اور ہم کر انھوں نے کلاسوں کا ایک ایک چکر بھی لگایا اور اپنے لڑکوں کے ساتھیوں اور دوستوں کو سمجھایا بھی کہ نادان لوگوں کے کہنے

میں آکر اسٹرائک کرکے اپنے کیریر کو غارت نہ کرو۔

اسکول میں لڑکے عام طور پر پیدل آتے تھے یا بائیسکلوں پر آتے تھے۔ ابھی سائیکل بھی کافی مہنگی چیز تھی اور صرف بڑے آدمیوں کے لڑکوں کے پاس ہوتی تھی۔ اس لئے اس چیز سے بھی عام لڑکے مرعوب تھے۔ کچھ لڑکے کرایہ کے تانگوں پر بھی آتے تھے آج جو اتنے موٹر اور موٹر سائیکلیں آئیں تو اسکول کے سب ہی لڑکے بہت مرعوب ہو گئے اور ان کے دلوں میں اپنے اپنے کیریر بنانے اور بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے کی تمنا بہت چمک گئی۔ دن بھر کیریر بنانے کی باتیں ہوتی رہیں اور سہ پہر تک اسکول کی فضا بالکل ہی بدل گئی۔ اور اسٹرائک ناممکن نظر آنے لگی۔

فرخ کو ان کے والد کے اخبار کے سابق کام کرنے والوں نے بتلایا کہ شہر میں بڑے لوگوں نے خلافت اور کانگریس کا توڑ کرنے کے لئے ایک اسی طرح کا ادارہ امن سبھا کے نام سے بنا لیا ہے۔ اور اسی کی تجویز کے مطابق آج بڑے لوگ اپنے اپنے بچوں کو خود لے کر اسکول گئے تھے۔

فرخ نے دوسرے دن اپنے کلاس کے لڑکوں کو امن سبھا کا حال بتلایا اور کہا کہ یہ سب سرکاری چال ہے۔ لیکن اس کی باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور اسکول میں پرانی وفاداری والی فضا قائم ہو گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے حالات کا اندازہ لگا کر نوٹس لگا دیا کہ جو لڑکا مہاتما گاندھی کی جے یا کسی اور قومی لیڈروں کی جے یا انقلاب زندہ باد کہے گا اس کا رسٹی کیشن کر دیا جائے گا۔ اس نوٹس کے لگنے کے آدھے ہی گھنٹہ کے اندر اندر ایک لڑکے کا نعرہ لگانے کے جرم پر دو سال کے لئے رسٹی کیشن بھی کر دیا گیا۔ حالانکہ وہ برابر کہتا رہا کہ میں نے ایسا نہ کوئی نعرہ

لگایا ہے نہ لگاؤں گا۔"

شام کو جب شوکت اور فرخ ساتھ ساتھ اسکول سے نکلے تو دونوں چپ چپ تھے۔ فرخ اندر اندر کھول رہا تھا اور شوکت کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب شوکت کے پاس سے سائیکل پر رام گوپال نکل گیا تو شوکت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک دن میں یہ حالت ہو گئی کہ سلام دعا تک نہیں گویا پہچانتے ہی نہیں۔"

"کون تھا؟"

"کون تھا!! یہ گوپال ابھی کل تک جو میرا ایسا دوست تھا کہ میں اس کے گھر رات کے دس دس بجے تک رہتا تھا۔"

"مجھ سے بھی کلاس کے بہت سے لوگوں نے بات چیت کرنا بند کر دی ہے۔"

آپ کو گوپال کی اس بات کا بہت افسوس ہے؟"

"افسوس ہے تو۔ مگر :"

"مگر کیا؟"

"کچھ نہیں :"

"کیا آپ مجھے اپنا پکا دوست سمجھ سکتے ہیں جو بات نہیں بتا رہے ہیں ـــــ"

شوکت نے محبت سے فرخ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"کیا آپ کا دوست بننے میں اب کوئی کسر ہے؟ کہو تو تمہارے گھر

چیلوں سے

"ضرور ضرور۔ یہ بتاؤ کہ جیسے تم گوپال کے گھر رات گئے تک ٹھہرتے تھے۔ ہمارے یہاں بھی ٹھہرو گے؟"

"اس سے تو میرا بڑا کام بن جائے گا۔"

"کیسا کام؟"

"پھر بتلاؤں گا۔"

شوکت فرخ کے یہاں آنے جانے لگا اور اس کی فرخ کے بڑے بھائی مولوی محمد نظیر سے بھی ملاقات ہو گئی اور وہ بھی شوکت کو پسند کرنے لگے۔ کیوں کہ شوکت ان کی نصیحت بھری باتوں کو سر جھکا کر گھنٹوں سن سکتا تھا۔ جب ان کو شوکت مل جاتا وہ فوراً تقریر شروع کر دیتے۔

"تاش کھیلنا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں۔ آخر اس سے ملتا کیا ہے؟ ہار جیت، ہار جیت۔ مگر کیسی ہار اور کیسی جیت۔ ہارو تو بھی ویسے ہی رہو اور جیتو تو بھی ویسے ہی کے ویسے۔ حدیث شریف میں آیا ہے......"

"انگریزی بال ان میں کیا دھرا ہے نہ کوئی خوبصورتی اور نہ سجاوٹ اور اگر خوبصورتی اور سجاوٹ ہوتی بھی تو مرد کو سجاوٹ کی کیا ضرورت۔ مولانا روم کہتے ہیں......"

معمولی گفتگو میں بھی مولوی نظیر کوئی آیت پڑھتے تو قرأت سے پڑھتے اور مثنوی کا کوئی شعر پڑھتے تو پوری طرح گا کر سناتے۔

شوکت مہینہ کی پہلی تاریخ سے آٹھ تاریخ تک مسلسل رات کو آتا

رہا اور دس بجے تک ٹھہرتا رہا اور مولوی صاحب کی باتیں سنتا رہا۔
نویں دن شوکت نے کہا کہ فرخ۔ "آج سے میں تمہارے یہاں
رات کو نہیں آؤں گا اس سے یہ نہ سمجھنا کہ کوئی بات بری لگی۔"
"پھر کیوں نہیں آؤ گے؟ میں جانتا ہوں کہ بھائی جان کی باتوں
سے تمہارا ناک میں دم آگیا۔ میری تو ان کی نصیحتوں سے جان نکلتی ہے۔"
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"
"پھر کیا بات ہے"؟
"پھر بتلاؤں گا۔"
فرخ کو شوکت کی یہ رازداری بری لگی۔
"نہ بتلاؤ ہوگی کوئی بات۔"
جب فرخ ناراض ہوگیا تو شوکت کچھ مسکراہٹ اور کچھ خجالت
سے کہنے لگا۔
"بھئی میں مہینے کے شروع تاریخوں میں گھر سے غائب رہتا ہوں
یہ ایک شاطرانہ چال ہے۔ میرے والد صاحب کو ان کی موروثی جایداد سے
تھوڑی سی گزارے کی رقم ملتی ہے۔ اب تک ہوتا یہ تھا کہ ادھر مہینے کی پہلی
ہوئی اور ادھر پرانے مصاحب چیٹر قناتیے آگئے اور باتیں ہونے لگیں کہ "حضور
زعفرانی چائے اور ہوائی شیرمالیں تیار ہوں۔ عالی جناب آج تو بادام بھرا
مرغ مسلم تیار ہو۔ حضور اللہ رکھے بہت دنوں سے متنجن نہیں کھایا ہے۔ وہ کیوں
نہ دم پخت تیار ہو۔ آج تو بٹیروں کی بریانی دم دی جائے۔ یہ سب کام اسی طرح
جلد کیے جاتے کہ چار پانچ دنوں میں سب رقم غائب ہو جاتی تھی۔ جب ان لوگوں کو یقین

ہو جاتا تھا کہ اب ایک پیسہ بھی نہیں رہا تو پھر پہلی تاریخ تک کے لئے غائب ہو جایا کرتے تھے۔ اور یہ بھی غالباً اس وجہ سے کہ ابا حضور فاقے کر لیتے ہیں، مگر قرض نہیں لیتے۔

نواب چچا حضور کے یہاں جو شادی ہوئی تو میں وہاں آدھی آدھی رات تک ٹھہرنے لگا۔ اس درمیان میں پہلی آگئی۔ اور مصاحبین حسب دستور اکٹھا ہو گئے اور فرمائشیں کرنے لگے اس پر والد حضور نے کہا کہ "بھئی رنگ رلیاں سب اچھی لگتی ہیں۔ لیکن اگر صاحبزادے نہ شامل ہوں تو پھر ان میں کیا مزا۔"

مصاحبوں نے کہا کہ اے حضور بھلا ان کے بغیر کیا ہو سکتا ہے۔ سونے کے نوالے بھی زہر معلوم ہوں گے۔ مصاحبین آٹھ دس روز تک اسی انتظار میں روزانہ شام کو آتے رہے کہ میری شام خالی ہو تو کام بنے۔ آخر جب مہینے کی دس تاریخ ہو گئی تو انھوں نے آنا بند کر دیا۔ میں نے ان لوگوں کے نہ آنے کا راز دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ان تاریخوں میں کہیں اور جاتے ہیں۔ تب سے میں یہی کرتا ہوں کہ مہینے کی شروع تاریخوں میں شام کو گھر پر ملتا ہی نہیں ہوں۔

"ابا حضور اپنی وضع کے پابند ہیں وہ ان مصاحبوں سے نہیں نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی وضع یہ بھی کہ وہ میرے بغیر کسی اچھی چیز کو چھوتے تک نہیں ہیں۔ اس طرح کام بن جاتا ہے اور پیسے بچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات ایسی نہیں ہے جو کسی سے کہی جائے۔ میں نے تمھارے سوا کسی کو نہیں بتلائی۔"

فرخ نے شوکت کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہنے لگا۔

"مجھے اس بات کے پوچھنے پر اصرار نہ کرنا چاہیئے تھا۔ میں نے غلطی کی۔ معاف کر دیجئے۔"

"نہیں اب ہم دونوں میں ایسے پردے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ آئی تو گوپال جس نے شوکت سے بول چال بند کر دی تھی۔ اسکول کی چھٹی ہوتے ہی شوکت کے پاس جا کر کہنے لگا۔

"یہ نہیں ہو سکتا؟"

"کیا نہیں ہو سکتا؟"

"میرے ہوتے ہوئے تم کسی اور کے گھر جاؤ۔"

"تم ہی نے تو بولنا چھوڑ دیا تھا۔"

"ہاں۔ بولنا چھوڑا تھا مگر پھر اس وقت میں میں نے اپنے گھر میں بھی سب سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ گھر والے کہتے تھے کہ مہاتما جی اور محمد علی شوکت علی کی جے پکارو گے تو تمہارے باپ چچا اور بھائی تمہارا منہ نہ دیکھیں گے۔ گھر والے کہتے تھے جو لوگ ایسے نعرے لگاتے ہیں ان کو اپنے گھر نہ بلاؤ بلکہ ان سے ملنا بھی چھوڑ دو۔ میں نے ان لوگوں کا حکم تو مان لیا۔ مگر گھر بھر سے بات چیت کرنا بند کر دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کل میں نے اپنے محلے کے جلسے میں خوب جے پکاری اور پھر گھر جا کر سب سے بولنا بھی شروع کر دیا اور کہہ دیا کہ شوکت گھر آئے گا اور ہم دونوں جے جے کریں گے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"نہ کسی نے کہا کہ کرو نہ کہا کہ نہ کرو۔"

"اب کیا کرو گے؟"

"اگر گھر والوں نے سختی کی تو میں جامعہ ملیہ چلا جاؤں گا جسے محمد علی شوکت علی نے علی گڑھ کالج بند کر کے کھولا ہے۔ وہاں میرا ایک کزن گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جامعہ کے لوگ مفت پڑھاتے ہیں اور کھانے اور رہنے کا بھی مفت بندوبست کر دیتے ہیں۔

(۳۲)

ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کے بند ہونے کی خبروں نے گورنمنٹ اسکول لکھنؤ کے طالب علموں میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا

اس دوران میں ایک نیا حادثہ پیش آ گیا۔

پرنس آف ویلس کے اعزاز میں جو تقریب ہونے والی تھی اس کو زیادہ منظم بنانے کے لئے ایک دن مکمل ریہرسل کیا گیا۔ وہ لوں کا فیلڈ میں شامیانہ نصب کیا گیا۔ اس کے پیچھے خوبصورت قنات لگا کر اس کے آگے چوکا بچھایا گیا۔ اس پر بہت بڑی میز رکھی گئی۔ جس کے پیچھے دو کرسیاں تھیں جن پر اصل تقریب کے دن گورنر صاحب مع اپنی میم صاحب کے بیٹھنے والے تھے۔

میز پر بادشاہ کی تصویر رکھ دی گئی۔

اسٹیج کے سامنے دور دیہ کرسیوں پر ٹیچر بیٹھے۔ ان کے پیچھے طلبا بیٹھے۔ جب سب بیٹھ چکے تو بیچ سے گانے والوں کی ٹولی مارچ کرتی ہوئی آئی۔ آ کر اس نے پہلے تو تصویر کو سلوٹ دیا۔ پھر تخت کے سامنے ہالا بنا کر کھڑے ہو گئے

اور گانے لگے۔

"گوڈ سیو دی کنگ"

اتنا ہی کہا تھا کہ ادھر ادھر سے سی سی کی آوازیں آنے لگیں ان سے گانے والوں کو بے چینی ہوئی اور ان کی آوازیں تال سے گرنے لگیں۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی عادت تھی کہ جس لڑکے پر ناراض ہوتے تھے اس کو کہتے تھے۔

"یو فول۔ یو ٹوڈ"

یہ عادت یہاں تک ترقی کر گئی تھی کہ کبھی کبھی وہ ٹوڈ کا لفظ مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی اور محمد علی کے لئے بھی استعمال کر جاتے تھے۔ لیکن جب بھی وہ لڑکوں کے سامنے ان کے لیڈروں کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے تو لڑکوں کو بہت برا لگتا تھا۔

اس موقع پر جب لڑکے گانے میں جھجکنے لگے تو ہیڈ ماسٹر نے کہا "یو ٹوڈ" اس پر کسی مخالفت کرنے والے لڑکے نے پکار کر کہا۔

"ٹوڈی بچوں اچھی طرح گاؤ"

ٹوڈی بچے کا منھ سے لفظ نکلنا تھا کہ اس کو طالب علم بولے اور پھر کسی نے نعرہ کے لہجے میں پکارا۔

"ٹوڈی بچہ ---"

دوسروں نے کہا۔

"ہائے ہائے"

پھر تو اب نعرہ لگے

"ٹوڈی بچہ ــــــــ ہائے ہائے"

"ٹوڈی بچہ ــــــــ ہائے ہائے"

ان نعروں کا اتنا شور ہوا کہ گوڈسیو دی کنگ چل ہی نہ سکا۔

پھر رفتہ رفتہ لڑکے اٹھ کر کھسکنے لگے اور جلسہ کچھ ایسی بدنظمی کا شکار ہو گیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو مجبوراً جلسہ برخواست کر دینا پڑا۔

جب امن سبھا کے ممبروں کو لڑکوں کی اس حرکت کی خبر ملی تو انھوں نے طے کیا کہ لڑکوں کے وہ سرپرست جو اونچے عہدوں پر ہیں جا کر اسکول میں جلسہ کریں اور لڑکوں کو سمجھائیں کہ تم اپنا فیوچر کیوں برباد کر رہے ہو۔

چار دن کے بعد اسکول میں پھر شاندار جلسہ کیا گیا جس میں لڑکوں اور سرپرستوں اور ٹیچر سب کے لئے بہت اعلا درجے کی چائے کا انتظام کیا گیا جلسہ پہلے رکھا گیا اور چائے بعد میں تاکہ ایسا نہ ہو کہ چائے پی پی کر طالب علم چلے جائیں۔

جلسہ کی صدارت ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے کی۔ پہلی تقریر ہیڈ ماسٹر صاحب کی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ طالب علموں کا فرض ہے اپنا کیریر بنانا۔ ان کے والدین اسی غرض سے ان کو اسکول بھیجتے ہیں۔

ان باتوں کو طالب علموں نے غور سے سنا۔

آگے چل کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا کہ

"وہ لوگ اپنا کیریر کیسے بنا سکتے ہیں جو سرکار برطانیہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیوں کہ تمام عہدے اور ترقیاں سرکار کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ لوگ جو آج لیڈر بنے گھومتے ہیں وہ سب ایسے لوگ ہیں جن کو زندگی میں

کسی قسم کی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے میرے بیٹو، اگر تم اچھی اور باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو سرکار برطانیہ کے وفادار رہو۔

صدر نے اس موقع پر زور سے کہا

"ہیر۔ ہیر۔ ہیر۔ ہیر"

سرکاری عہدے داروں اور سرپرستوں نے بھی جواب میں کہا

"ہیر۔ ہیر"

لیکن اسٹوڈنٹ میں سے کسی نے نعرہ لگایا۔

ٹوڈی بچہ۔

سینکڑوں آوازوں نے جواب دیا۔

"ہائے ہائے"

پھر تو ہر طرف سے یہی نعرے بلند ہونے لگے۔

ٹوڈی بچہ

ہائے ہائے

ٹوڈی بچہ

ہائے ہائے

نعروں کا اتنا زور ہوا کہ صدر کا "آرڈر آرڈر" کسی نے بھی نہیں سنا۔

صدر نے بہت غصے سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہاں کچھ "کانس پیریٹر" گھس آئے ہیں۔ ان سب کی زبردست خبر لی جائے گی۔ پولیس ہماری مدد کو موجود ہے۔"

اور یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ کسی نے صدر کی یہ بات سنی یا نہیں سنی اور یہ بھی
کہنا مشکل ہے کہ جلسے سے اٹھنے کی پہل کس نے کی۔ چند منٹ میں چڑیوں کے
جھنڈ کی طرح بھر بھرا کر اسٹوڈنٹ اٹھے اور اس شامیانے کی طرف بھاگے
جہاں کھانے پینے کا سامان تھا۔ ادھر سے گزرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

صدر۔ آڈر۔ آڈر

دو منٹ کے اندر جلسے گاہ میں ڈھائی تین سو حاضرین جن میں
آدھے سرپرست تھے اور آدھے ان کے لڑکے بیٹھے رہ گئے۔

صدر صاحب نے جلسہ برخواست کر دیا۔ پھر سب حاضرین چائے
پینے شامیانے کے نیچے پہونچے مگر وہاں ان کو صرف چائے ہی ملی۔ کیوں کہ
کھانے کا جو کچھ سامان تھا وہ طالب علموں نے جلسے سے جاتے وقت صاف
کر دیا تھا۔

"کیا اسٹوڈنٹس کی یہ حرکت کافی نہیں ہے یہ دکھانے کے لئے
کہ جو لوگ سرکار کے خلاف ہیں وہ سب ننگے بھوکے۔ گندے اور بد معاش
ہیں ـــــ"

یہ مختصر سی تقریر صدر صاحب نے اس وقت کی جب وہ چائے
پی رہے تھے۔

اگلے دن اسی سلسلے میں ایک ہنگامی جلسہ بلایا گیا اور اس میں یہ مسئلہ
پیش ہوا کہ ٹوڈی بچہ ـــ ہائے ہائے کے نعرے کو کیسے روکا جائے لوگوں نے
کہا کہ ہیڈ ماسٹر سے اپیل کی جائے کہ وہ جئے کاروں اور انقلاب زندہ باد
کی طرح اس نعرہ کو بھی جرم قرار دے دیں اور جو اسٹوڈنٹ یہ نعرہ لگائے

اس کا رسٹی کیشن کر دیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب بھی امن سبھا کے جلسے میں موجود تھے۔ انھوں نے یہ بات سن کر کہا۔

یہ نعرہ ایک بے معنی نعرہ ہے اس لئے اس پر لڑکوں کو ٹوکنا ٹھیک نہ ہوگا اگر ان کو ٹوکا گیا تو پھر وہ کوئی اور اسی طرح کا لایعنی نعرہ ایجاد کر لیں گے۔ اس قسم کی شرارت طالب علموں کے مزاج کا جز ہے۔ اس لئے اس نعرے کو نظر انداز کر دینا ضروری ہے۔

امن سبھا کے ممبروں کو ہیڈ ماسٹر کی یہ طالب علم شناسی بالکل نہیں بھائی۔ اس وقت تو یہ لوگ چپ ہو گئے۔ لیکن اسی دن رات کو سبھا کے صدر سکریٹری اور اہم ممبروں نے ڈپٹی کمشنر سے ہیڈ ماسٹر کی شکایت کی اور کہا کہ اس میں انتظامی سلیقہ نہیں ہے۔ اس شکایت پر اچانک ہیڈ ماسٹر کا تبادلہ ہو گیا اور تین دن کے بعد ان کی جگہ ایک نیا ہیڈ ماسٹر آ گیا۔

نئے ہیڈ ماسٹر نے آتے ہی پانچ لڑکوں کا رسٹی کیشن کر دیا۔ اسی دن کچھ لڑکوں کا جلسہ ہوا اور یہ طے پایا کہ اسکول میں اسٹرائک ہونا ضروری ہے لیکن سوال یہ تھا کہ لڑکوں کو کس طرح اسٹرائک پر آمادہ کیا جائے۔ اس لئے کسی خاص کوشش کی ضرورت تھی۔ اسی دن فرخ اشوک اور گوپال شہر کانگرس کمیٹی کے پاس مشورے اور مدد کے لئے پہونچے۔ لیکن بڑے لیڈر جن کو لڑکے جانتے تھے وہ سب جیل جا چکے تھے اس لئے وہاں ان لوگوں کا کام نہیں بنا۔

جب یہ لوگ مایوس واپس آ رہے تھے اس وقت ان کا سامنا راحت رسول سے ہو گیا جو شہر کانگرس کمیٹی کے دفتر میں کسی کام کے لئے اپنی کار پر سوجھ پور

سے ابھی ابھی آیا تھا۔

شوکت۔ "جانتے ہو گوپال اور فرخ کہ یہ کون صاحب ہیں"

"نہیں۔"

"یہ وہی راحت رسول ہیں جو ایسے ہی تھے اور استعفا دے کر کانگرس میں شامل ہو گئے ہیں۔"

"یہ اگر ہمارے اسکول میں تقریر کر دیں تو کام بن جائے۔ پھر تو سارے ٹوڈی بچے بلوں میں جا چھپیں اور کسی کو آکر یہ کہنے کی ہمت نہ ہو کہ بچو اپنے کیریر کی فکر کرو۔"

تینوں لڑکوں نے راحت رسول کو سلام کر کے اپنا اور اپنے اسکول کا تعارف کرایا اور اپنے یہاں کا معاملہ بتایا۔ پھر درخواست کی کہ "کل صبح چل کر ایسی تقریر کر دیجئے کہ ہماری اسٹرائک کامیاب ہو جائے۔"

راحت رسول۔ "اچھا تو آپ اسی اسکول سے آئے ہیں جس نے "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کا نعرہ ایجاد کیا ہے۔ اب تو یہ نعرہ ہمارے صوبے بھر میں چلنے لگا ہے بمبئی میں بھی۔ ایسے اسکول میں تو ضرور ہی آؤں گا۔ جس نے قومی تحریک کو ایک نیا نعرہ دے دیا ہے۔"

(۴)

راحت نے شہر کانگرس کمیٹی کے سامنے وہ معاملہ پیش کیا جس کے لئے وہ آیا تھا اس نے کہا۔

"سورج پور میں موہن جی اوسط قسم کے وکیل تھے جن کو بیٹھنے میں مناسب آمدنی ہو جاتی تھی۔ انھوں نے کچھ گاندھی جی سے متاثر ہو کر اور کچھ ملک کی محبت میں

وکالت چھوڑ دی اور اپنا گھر بیچ کر چرخا چلوانے کا کام شروع کر دیا۔ کہنے لگے
کہ میں ان چرخوں سے ایک طرف لنکا شائر کی کمر توڑ دوں گا اور دوسری طرف بھوکے
ہندستان کا پیٹ بھر دوں گا۔ انھوں نے دو ہزار چرخے خرید لیے اور ایک ہزار
روپے کی روئی پھر تین آدمیوں کو جنھوں نے بائیکاٹ کی تحریک میں ملازمت چھوڑ
دی تھی۔ ملازم رکھ لیا۔ اور اس دھن میں لگ گئے کہ سوجی پورہ سے کٹ پور تک جو
سڑک گئی ہے اس کے کنارے کنارے جتنے موضع اور آبادیاں ہیں ان سب میں
چرخے چلوا دیئے جائیں۔ ہر آبادی میں کئی کئی جلسے ہوئے۔ ان جلسوں میں چرخے
بانٹے گئے۔ چرخا چلانا یوں سکھلایا گیا کہ روئی کی پونیاں بنوا بنوا کر دے دی گئیں
کہ چرخا چلانے کی مشق کرو اور اس میں جتنی روئی ضائع ہو، ہو جانے دو۔"

موہن جی نے ایسی سخت محنت کی کہ دو مہینے میں دو ہزار گھروں میں چرخے
پہنچوا دیئے اور پھر اپنے آدمیوں کو لگا دیا کہ وہ روزانہ پچاس پچاس گھروں پر جائیں
اور جہاں جہاں سوت تیار ہو گیا ہو اسے دام دے کر خرید لیں اور جس شخص سے
سوت لیں اس کو کاتنے کے لئے اور پونیاں دے آئیں۔ مگر اس طرح کی جد و جہد کا
نتیجہ یہ ہوا کہ موہن جی کے گھر میں فاقے ہونے لگے۔

"یہ کیسے"

شہر کانگریس کمیٹی کے جو ممبر موجود تھے انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ اس طرح کہ ساری اسکیم فیل ہو گئی۔ اس طرح آ کر جو بہت سا
سوت اکٹھا ہو گیا ہے۔ وہ طرح طرح کا ہے اس کا کپڑا بننا مشکل ہے اور
بنا بھی لیا جائے تو بھی جو رقم سوت خریدنے پر خرچ کی گئی ہے وہ واپس آنے
سے رہی کیوں کہ جو کپڑا تیار ہوگا۔ وہ ایسا خراب ہوگا کہ زیادہ امکان تو

یہ ہے کہ وہ فروخت ہی نہ ہو۔ اور فروخت ہو بھی گیا۔ تو اتنے کم دام ملیں گے کہ روپیہ میں پندرہ آنے کا تو ضرور ہی نقصان ہوگا۔ اسے اونے پونے بیچنا ہوگا۔ اس طرح بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

"پھر کپڑے کی قیمت کا حساب لگا کر پہلے ہی سے سوت کی قیمت کیوں نہ کم کر دی گئی۔"

ایسا کیا جاتا تو سوت کی قیمت اتنی کم ہو جاتی کہ آمدنی کی خاطر کوئی شخص بھی چرخا نہ چلاتا

"آمدنی کی خاطر نہ چلاتا نہ سہی۔ ملک و قوم کی خاطر تو چلاتا ہی —"

"موہن جی کا تجربہ یہ کہتا ہے کہ غریب اور دیہاتی لوگ ایسی قربانیاں کرنے پر آمادہ نہیں کئے جا سکتے ہیں۔"

خود کیا انڈین کمیٹی کے بعض ممبروں کو راحت کی اس بات پر سخت غصہ آیا

ایک مولانا صاحب جو عبا اور پگڑی میں کسے کسے لگے۔

"میاں صاحبزادے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہندستان بھر میں کہیں بھی چرخا نہ چلتا۔"

ایک صاحب جو بہت موٹی دھوتی۔ بہت ڈھیلے کرتے میں تھے اور سر پر بے حد بھاری چوٹی رکھتے کہنے لگے۔

"میں آپ کی بات نہیں مان سکتا۔ ایسا ہونا سمجھ سے باہر ہے۔"

راحت۔ "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ایسی ٹھوس حقیقت ہے کہ آپ میں سے جو شخص بھی چاہے جا کر دیکھ لے۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ اور بھی بڑی بڑی دشواریاں ہیں اس راہ میں۔"

صوبہ کانگرس کے صدر جو لکھنؤ کے کامیاب وکیل تھے۔ لیکن اب وکالت چھوڑ چکے تھے اس وقت وہ گاؤ تکیے کے اوپر اس طرح بیٹھے تھے گویا کہ وہ گدا ہوا۔ راحت کی یہ بات سن کر زرا تیکھی آواز میں کہنے لگے۔

" وہ دشواریاں کیا ہیں ؟

" کسان بیکار بیٹھے رہتے ہیں ، لیکن چرخا نہیں کاتتے۔ اگر کاتتا ہیں تو ان کی وہ ادھیڑ اور بوڑھی عورتیں جو کھیتوں میں کام نہیں کر سکتی ہیں۔ اس وجہ سے فی چرخا بہت کم سوت پیدا ہوتا ہے۔ اتنا کم کہ دورہ کرنے والوں کی تنخواہ بھی اس سے نہیں نکلتی۔

" اور کیا " ؟

اور یہ کہ ...."

" سنیئے۔ ایسی باتوں سے کیا حاصل ہوگا آپ ان مسئلوں کو جس طرح حل کر سکتے ہوں کیجئے۔ اور جتنی رقم کی ضرورت ہو اس کے لئے اپنے ضلع میں چندہ جمع کیجئے۔ صوبہ کانگرس کے صدر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

" لیکن جب راحت صاحب کہہ رہے ہیں تو وہ اس معاملے میں ہم کو بھی کچھ کرنا چاہیئے "

آخری بات لکڑی کے مسلمان تاجر نے کہی اور یہ کہتے ہی اس نے جیب سے چیک بک نکال کر اسی وقت ایک رقم لکھ کر راحت کو دے دی اور کہا کہ اگر پھر ضرورت ہو تو اور لے لیجئے گا۔

(۵)

سرکار کو اور اس کے ذریعہ امن سبھا والوں کو خبر پہونچ چکی تھی کہ صبح

گورنمنٹ ہائی اسکول لکھنؤ پر دھرنا دیا جائے گا۔ اس اسکول کی شہر میں کچھ ایسی حیثیت تھی کہ سرکار نے گورا فوج بھیج دی جس نے آکر اسکول سے کچھ فاصلے پر ایک سڑک کے کنارے اپنی صفیں مع مشین گنوں کے جما دیں۔ اس فوج کو صرف اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ دھرنا دینے والے مرعوب ہو جائیں۔ دوسری طرف شہر کے وہ سب بڑے آدمی جن کے لڑکے یہاں پڑھتے تھے اپنے لڑکوں کو پہلے کی طرح کاروں اور موٹر سائیکلوں پر لے کر آنے لگے۔ لیکن دھرنا دینے والے پہونچ چکے تھے اور وہ نعرہ لگا رہے تھے۔

ٹوڈی بچہ ——— ہائے ہائے"

ٹوڈی بچہ ——— ہائے ہائے!

شہر کا انگریز ڈپٹی کمشنر خود بھی ایک ڈپٹی کلکٹر کی کار میں موجود تھا۔ وہ اردو کافی جانتا تھا۔ یہ نعرہ سن کر کہنے لگا۔ "ٹوڈی بچہ کیا ہوتا ہے اور اس ہائے ہائے کا کیا مطلب ہے آج تک آپ لوگوں میں سے کسی نے کبھی یہ پتہ نہیں لگایا؟"

اس سوال کا جواب سب نے یہی دیا۔

"اس نعرے کے کوئی معنی نہیں۔"

ڈپٹی کمشنر کو سرکاری افسروں کی کم علمی پر حیرت ہوئی۔ اس نے کہا "جو لفظ اس جوش سے بولا جائے وہ لایعنی نہیں ہو سکتا آپ لوگ مہربانی کر کے اس کو ڈکشنری میں دیکھیں!"

ایک ڈپٹی کلکٹر نے اطاعت گذاری کے لہجے میں کہا۔

سرکار میں ضرور اس کو اردو اور ہندی دونوں کی ڈکشنریوں میں میں

دیکھوں گا۔"

اردو اور ہندی ڈکشنری تو دیکھے ہی، مگر فارسی اور عربی ڈکشنری بھی دیکھیے۔

مگر حضور اس لفظ میں تو ٹ ہے اور ڈ ال ہے"۔

"اس کی فکر نہ کیجئے ہو سکتا ہے کہ اصل لفظ "تودی" ہو۔

لڑکے ٹولیوں میں اکٹھا تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ جو طالب علم بھی آتا تھا نعرہ لگانے والوں کو دیکھ کر نہ تو کلاس میں جاتا تھا اور نہ ان لوگوں کی طرف آتا تھا۔ وہ اسکول کے احاطے میں کسی جگہ تماشائی بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔

آج کلاس خوب صاف کئے گئے تھے۔ ان کے فرش اور کرسیاں اور میز چمک رہے تھے۔ ٹیچر صاحبان کلاس کے دروازوں پر اندر آنے والے طالب علموں کو خوش آمدید کہنے کو موجود تھے۔ سرپرست طالب علموں میں گھوم رہے تھے اور ان کو کلاسوں میں جانے پر آمادہ کر رہے تھے۔ آخر آدھ گھنٹے کے بعد شہر کے بڑے بڑے آدمیوں کے بچوں کی ایک ٹولی ہمت کر کے کلاسوں کی طرف بڑھی۔ اور شرماتی جھجکتی ہوئی کلاسوں کے اندر چلی گئی۔

ماسٹروں نے ان طالب علموں سے کہا کہ تم لوگ دروازے کے سامنے اس طرح بیٹھ جاؤ کہ معلوم ہو کہ کلاس لگا ہوا ہے تاکہ تم لوگوں کو دیکھ کر اور لڑکے بھی اندر آنے کی ہمت کریں"۔

لیکن یہ لوگ ایسا نہ کر سکے اور کلاسوں کے گوشوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ کلاسوں کے سامنے صرف ٹیچر صاحبان رہ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد سرپرستوں اور ڈپٹی کمشنر کی ہمت دلانے پر پچاس ساٹھ لڑکوں کی ایک ٹولی آگے بڑھنے لگی۔ اس نے ٹوڈی بچہ ـــ ہائے ہائے

کے جواب میں امن سبھا کا یہ نعرہ لگایا۔

"ہڑتال کرانے والے —— ملک کے دشمن ہیں۔"

یہ ٹولی ابھی دس ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ کھدر کی شیروانی میں ملبوس راحت اپنی موٹر سے اترا اس کا اترنا تھا کہ جے جے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ اس وقت اسکول کی چار دیواری پر ایک جگہ چادر ڈال کر اس کو اسٹیج کی شکل دے دی گئی اور راحت نے اس پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی ——

"قوم کے نونہالو !! ......"

راحت کو دیکھتے ہی لڑکوں کی وہ ٹولی جو امن سبھا کے نعرے لگاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی رک گئی اور تقریر سننے لگی۔

انگریز ڈپٹی کمشنر پولیس کپتان پر بہت ناراض ہوا کہ جب راحت کے خلاف وارنٹ رات ہی کو جاری کر دیا گیا تھا تو پھر اسے رات ہی کو گرفتار کیوں نہ کر لیا گیا۔

یہ بات ڈپٹی کمشنر کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آئی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص شہر لکھنؤ کے بیچ میں واقع شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر میں جائے اور پھر وہاں سے نکل کر مع کار کے ایسا غائب ہو جائے کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی تک خبر نہ لاسکیں جن کو اس ڈیوٹی پر پہلے سے لگا دیا گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن اسے یقین تھا کہ پولیس کے آدمیوں میں بھی کچھ نہ کچھ غدار پائے جاتے ہیں۔

راحت نے ہر طرف دیکھ کر کہا۔

"اے نونہالو! میں تم میں سے ہر ایک سے کہتا ہوں"۔

اسکول کے سامنے ایک بہت خوبصورت چمن تھا جس میں گلاب اور سورج مکھی پھول رہے تھے۔ یہ پودے ہوا کے ہلکے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

راحت نے ان پودوں کی طرف اشارہ کرکے کہا

ہو ترے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

مگر آج زینت کیسی باتوں سے ہو سکتی ہے وطن کی؟ جانتے ہو یہ بات؟

راحت کی تقریر اس جگہ تک پہونچی تھی کہ اسے وارنٹ دکھا کر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پھر تو ٹوڈی بچہ ۔۔۔ ہائے ہائے کے نعرے لگنے لگے اس میں وہ لڑکے بھی شامل ہو گئے جو اب تک تماشائی تھے۔ سب طالب علم بے حد جوش میں آگئے۔ اور بلا کسی خاص پروگرام کے وہ جلوس بنا کر امین آباد کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

اسی دن ایک پرانی عمارت میں نیشنل ہائی اسکول کھل گیا اور اس اسکول کے لئے پورا اسٹاف مع ہیڈ ماسٹر کے مہیا ہو گیا۔

یہ اسکول ایک مولانا کی پرانی خانقاہ میں کھول دیا گیا جو پرانے شہر کے ایک گوشے میں واقع تھی۔ یہاں بڑے سے اصاطے کی طرح کا صحن تھا جس میں بڑے بڑے پیڑ۔ بڑی بڑی جھاڑیاں اور سوکھی گھاس تھی اور سامنے بے حد بڑے بڑے دو دالان آگے پیچھے ہوتے تھے۔ بیچ میں بھی دونوں طرف کافی لمبے لیکن بہت کم عرض کے دو دالان تھے۔ بس کل مکانیت یہی تھا۔

کران کو تقسیم کر کے وہاں کلاس بنا دیے گئے۔ اسی دن کسی نے وعدے کے مطابق بلیک بورڈ، بہت سی بنچیں بھیج دیں۔ کلاس کے لئے ڈسکیں اور ٹیچروں کے لئے کرسیاں اور میزیں نہ مل سکیں۔ ٹیچروں نے ایک ایک بنچ رکھ کر اس طرح کام چلا لیا کہ آدھی بنچ پر خود بیٹھے اور آدھی پہ کتابیں رکھتے۔ اس طرح بنچوں سے اسکول کا آفس بھی بن گیا۔ اس بنچوں کو کھڑا کر کر رکھ کر الماری بھی بنا لی گئی۔ آفس میں پنوں کی جگہ ببول کے کانٹے استعمال کئے گئے اور پیپر ویٹ کی جگہ اینٹوں کے ڈھلے ہوئے ٹکڑے۔ لیکن پیپر ویٹ کی یہاں ضرورت اگر پڑتی بھی تھی تو خاص خاص دن جبکہ ہوا بہت زور سے چلے۔ چاہے وہ گرمیوں کا موسم ہو یا جاڑوں کا۔ ورنہ عام طور سے پیپر ویٹ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی کیوں کہ اس اسکول میں لکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔

صفائی کے مکمل ہونے کے دوسرے دن لڑکوں نے یوم خوشی منایا۔ فرخ نے صفائی کے کاموں میں بہت دلچسپی لی تھی۔ خاص کر چڑیا بڑوں کے بھگانے کے لئے جو روشن دان بنائے گئے۔ اس کام کا سہرا تو اسی کے سر بندھا ہے وہ ایک بوڑھے معمار کو بلا لایا، اس کو ایک چیر کے بکس پر عزت سے بٹھا دیا اور اس کے مشورے سے آٹھ دس لڑکوں کو لے کر اس کام میں لگ گیا۔ اس نے نہ صرف دیواروں سے اینٹیں نکال کر جگہ پیدا کی۔ بلکہ کما اینٹیں بازار سے لا کر گارا بنا کر روشن دانوں کا چوکھٹا بھی بنا دیا اور اس پر چونا بھی پھیر دیا۔

اسکول کے افتتاح کے دن طالب علموں نے پھر یوم مسرت منایا اس کا ہیرو شوکت تھا۔ اس نے پکوان کا بھی انتظام کیا اور خود اپنی سرکردگی میں

قوالی کی ٹولیاں بھی بنائیں۔ قوالی نو بجے صبح سے جو شروع ہوئی تو دو بجے تک مسلسل چلتی رہی۔ اور یہ چیز تو چھ سات مرتبہ گائی گئی۔

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

دو دن کے بعد ایک دوپہر کو کسی نے بچوں کے ناشتے کے لئے پانچ سیر بھنے چنے بھیج دیئے۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو اس کا رد عمل یہ ہوا کہ دوسرے دن سے بچوں کے دوپہر کے کھانے کے لئے عمدہ عمدہ مٹھائیاں پھل، پکوان، کباب، پراٹھے اور حلوے اور طرح طرح کی چیزیں مختلف لوگوں کی طرف سے آنے لگیں اور اتنی آئیں کہ لڑکے اور ٹیچر بھی کھاتے اور آنے جانے والے بھی کھاتے اور اس پر بھی اتنا بچ رہتا تھا کہ شام کو بہت لوگ کچھ نہ کچھ باندھ کر اپنے گھر لے جاتے تھے۔

باب (۱۵)

کلدو

(۱)

امر کی تندرستی اب اچھی تھی اور رمضان خاں کی دوا سے اس کو کافی فائدہ ہوا تھا۔ رمضان نے امر اور چینا کی اس زمانے میں بھی تھوڑی بہت خبر گیری کی تھی جب یہ لوگ کھیت مزدور بن گئے تھے اور بہت سخت دن گزار رہے تھے لیکن اس زمانے میں رمضان کی اپنی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی شہر سے اکثر گداگر تنگ آ کر یہ لوگ سکاری سے تنگ آ کر دیہات آ گئے تھے اور ادھر

ادھر کی چھوٹی موٹی خراب زمینوں پر کاشت کرنے لگے تھے۔ ان سے کچھ زیادہ پیدا نہ ہوتا تھا، اور آئے دن نت نئے نئے مسئلے اٹھتے رہتے تھے۔ کبھی بیج نہیں تو کبھی پانی نہیں۔ کبھی لگان چڑھ رہا ہے اور کبھی آپس میں لاٹھیاں تن گئی ہیں۔ ان مسئلوں کو سلجھانا اور اتنے آدمیوں کو سنبھالنا۔ یہ سب رمضان کے سر تھا اور وہ اس چیز کو کئی سال سے نباہ بھی رہا تھا۔ لیکن ان الجھنوں میں اس پر بھی وہ امر کے پاس چوتھے پانچویں روز آ تا رہتا تھا اور جب آتا تو تھوڑی سی تمبا کو ضرور ساتھ لاتا تھا اور اسے امر کے لئے چھوڑ جاتا تھا۔

امر کی کھانسی کسی طرح اسے نہیں چھوڑتی تھی ایک دن رمضان اپنے گھر والی کو دکھانے کے لئے شہر سے ایک حکیم کو بلا لایا۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ جہاں اپنے گھر کے مریضوں کو دکھلایا وہاں امر کو بھی دکھلا دیا اور پھر اپنے پاس سے دوائی بھی لا دی۔ اس دوائی سے دھیرے دھیرے امر کی کھانسی چلی گئی۔ اب وہ اچھا تھا اور محنت سے اپنی کھیتی کو دیکھتا تھا۔

چنیا اب خوش تھی۔ کیوں کہ امر تندرست تھا اس کے پاس ایک اچھی کام دینے والی گائی تھی۔ رامو بڑا ہو رہا تھا اور کام کا نکل رہا تھا۔ بالو بھی امر کے کھیت میں تھوڑا بہت کام کرتا تھا۔ لیکن اس کام میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ وہ کھیتی سے بس اتنا فائدہ اٹھاتا تھا کہ اس کے علاوہ کھیتی کے نفعوں سے بھی اسکا نے کوئی غرض نہیں رکھی۔ وہ ایک پیسہ تک نہیں لیتا تھا۔ وہ گھر میں صرف روٹی کھا لیتا تھا۔

امر اور چنیا کا خیال تھا کہ لام پر سے جو وہ پیسہ لایا تھا اس میں سے کچھ اس کے پاس باقی ہے۔ کیوں کہ وہ چنیا کے لئے تیل اور کنگھی بھی لاتا

رہتا اور کبھی انس کے لئے اور کبھی امر کے لئے۔ کبھی بچوں کے لئے دھوتی اور کرتا بھی۔

رفتہ رفتہ بالو اب بہت چپ چپ رہنے لگا۔ بس اسے دلچسپی صرف ایک بات میں رہ گئی تھی۔ وہ یہ کہ رامو کو وہ پڑھنا لکھنا سکھاتا تھا۔ مگر وہ بھی گنڈے دار یعنی دو دو اور تین تین دن کے ناغوں کے بعد۔

چمپا اپنے دیور کے لائے ہوئے تحفوں پر بھی اتراتی تھی اور اس بات پر بھی کہ میرے دیور کے پاس کچھ پیسہ ہے اور اس بات پر بھی کہ اس کو پڑھنا اور لکھنا دونوں چیزیں آتی ہیں۔

چمپا اپنے دوارے بیٹھی ترکاری کاٹ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بھگوان کی کرپا سے ہم لوگوں کے برے دن کٹ گئے۔ کہ ادھر سے رام لال گزرا —

"رام رام بھوجی۔ دیکھو کیسا اچھا کدو لایا ہوں۔ پکاؤ اور مجھے بھی کھلاؤ۔"

چمپا نے گردن اٹھا کر رام لال کو نظر بھر کر دیکھا۔

"میں کیا کروں گی اتنا بڑا کدو۔ دیکھتے نہیں ہو کہ میرے سامنے کتنی سبزی دھری ہے۔"

"ارے یہ کدو بڑا میٹھا نکلے گا۔ گودا ایسا ہوگا جیسے گیندے کا پھول دیکھو تو پکا کر۔"

"میرا من نہیں چاہتا ہے کدو کھانے کو۔ اسے تو لیتے ہی جاؤ بھیا —"

"اب تو تمہیں لے جاؤں گا۔ لو میں چلا۔"

رام لال نے کدو چنیا کے آگے لڑھکا دیا وہ بھاری پتھر کی طرح اس کی طرف گھومتا ہوا بڑھا اور راستہ میں پڑی ہوئی سبزیوں کو کچل کر اس کی گود سے آ لگا۔ رام لال لڑکوں کی طرح کدو لڑھکا کر اچانک بھاگتا ہوا نکل گیا۔ اور پھر ذرا دور جا کر اس نے مسکرا کر چنیا کی طرف دیکھا اور چلا گیا۔ رام لال کی آنکھوں میں وہی پرانی شرارت والی چمک تھی۔

چنیا کو رام لال کا اس طرح کدو دینا، یوں بھاگنا اور پھر یوں دیکھنا اچھا تو لگا لیکن اس کی نظروں میں وہ برے دن پھر گئے۔ جب یہ سلسلہ ابھی ایک فصل پہلے تک چلا تھا۔ ان دنوں میں کہاں تھا رام لال؟ اسے کیوں نہ میری یاد آئی۔ نہ میری یاد آئی اور نہ راموکی جسے وہ کسی زمانے میں گود میں لٹکائے پھرتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو رام لال نے اس راکھی ہی کا پاس کیا ہوتا جو میں نے اس کی کلائی پر باندھی تھی۔

راکھی؟ ہاں راکھی! مگر راکھی سے پہلے کیا تھا۔ وہ تو مرتا تھا مجھ پر۔ جان جاتی تھی میرے لئے۔ پھر مجھ کو چھوڑ کر مرا بھی تو کس پر؟ دھنری پر۔ دھنری جس نے پہلے بابو پر ڈورے ڈالے تھے اور پھر بابا سے کیسے رام لال کو گانٹھ لیا ہے بڑی چالاک ہے مگر رام لال کے گھر بیٹھ جانے کے بعد وہ چالاکی ذرا بھی تو نہ چلی اور ان دونوں میں ایک سال بھی تو اچھی طرح سے نہ نبھی۔ رام لال کے مزاج کا کچھ ٹھیک نہیں۔ وہ تو بکری ہے جو جہاں بھی ہریالی دیکھے گی چرنے دوڑے گی۔

چنیا ان ہی خیالوں میں تھی کہ رامو کدا ہیں لئے ہوئے درخت کے

نیچے سے جہاں وہ بیٹھا بابو سے پڑھ رہا تھا، اپس ہوا جیا کی ماتا نے زور مارا اور اس نے رام لال کو دل سے نکال پھینکا اور رامو کی طرف دیکھنے لگی اور سوچنے لگی کہ پڑھا لکھا کسان کبھی کسی نے سنا ہے۔ اب میرے گھر میا بھگوان کی کرپا سے دو دو ایسے ہو جائیں گے۔

دھنری رام لال کے گھر بیٹھ گئی اور رام لال نے پٹواری اور گاؤں کے مالکوں کا پیٹ نہیں بھرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع دار نے دھنری کی اس حرکت کو خلاف قانون قرار دے کر اس کو کھیت سے بے دخل کر دیا۔ رام لال اس بے دخلی کے خلاف دوڑ دھوپ کرنے لگا اور ہر دوسرے تیسرے دن لکھنؤ جانے لگا۔ ایک دن وہ جو لکھنؤ سے آیا تو اپنے ساتھ دو گٹھریوں بھر مال لایا اور اپنے گھر کے دوارے اس نے بساط خانے کی چیزوں کی دکان لگا دی۔ کچھ دنوں کے بعد رام لال نے دکان پر دھنری کو بٹھا دیا۔ دکان اچھی چلنے لگی۔ اور رام لال کسان سے بساطی ہو گیا۔

ایک دن رام لال لکھنؤ سے جو آیا تو وہ بہت خوبصورت چوڑیوں کا ایک سٹ لایا اور اسے مہاراج کی خدمت میں پیش کیا۔ مہاراج گھر لے گئے۔ ان کی پتنی نے وہ چوڑیاں جو دیکھیں تو ان پر لوٹ لوٹ ہو گئیں اور لے کر پہننے لگیں۔ لیکن چوڑیاں چھوٹی تھیں جو کسی طرح بھی ان کی کلائی تک نہ پہونچتیں۔ بڑی مہاراجن نے خود بھی تمام جتن کر ڈالے اور رمضان خاں کی بیوی کو بلوا کر جو کہ چوڑیاں پہنانے میں بڑی ماہر سمجھی جاتی تھیں، ان کے ہاتھ سے بھی زور لگوا لیا۔ لیکن نتیجہ صرف یہی ہوا کہ دو تین چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ اور کچھ حاصل نہ ہوا۔

آخر وہ چوڑیاں چھوٹی مہارا جن یعنی شیام کی استری کے پاس آئیں اور بہت آسانی سے چڑھ گئیں اور ٹھیک بیٹھیں۔

پندرہ دن کے بعد رام لال نے مہاراج کو پاؤں کی انگلیوں میں پہننے والے بچھوے نذر کئے وہ بھی پہلے مہاراج کی پتنی نے پہننے کی کوشش کی اور جب ان کی موٹی انگلیوں میں نہ چڑھ سکے تو بڑی مہارا جن نے چوڑیوں کی طرح وہ بھی چھوٹی مہارا جن کے پاس بھجوا دیے۔

اب کرشن پورہ ایک چھوٹے گاؤں سے بڑھ کر بہت بڑا گاؤں ہو گیا تھا کیوں کہ یہاں سے پانچ میل پر ماہی پور میں جو ایک بہت بڑی شکر مل بنی تھی اس کے بہت سے مزدور کرشن پورہ میں رہنے لگے تھے اور کرشن پورہ کے لوگ بھی وہاں کام کرنے لگے تھے۔ آبادی کے بڑھ جانے کی وجہ سے کرشن پورہ کی بستی کے کنارے ایک اچھا سا مندر بن گیا تھا جہاں دونوں وقت سنکھ اور گھنٹے بجتے تھے اور پوجا پاٹ ہوتی تھی۔ چھوٹی مہارا جن کو ایک دم سے پوجا کا شوق ہو گیا وہ روزانہ سندھیا کرنے کے لئے بڑی مہارا جن کو لے کر مندر جانے لگیں۔

ایک دن سانولی چتیا سے کہنے لگی۔

"جب مہارا جن جاتی ہوتی ہے تو اس وقت رام لال مندر سے لوٹتا ہوتا ہے اور بڑی مہارا جن کو دیکھتے ہی وہ لپک کر ماتا جی کہہ کر نمستے کرتا ہے۔ بس ادھر اس کی آواز سنی اور چھوٹی مہارا جن باوجود اپنے موٹاپے کے اس طرح لجا کر گھونگھٹ کے پلو کو رام لال کی اور کھینچ لیتی ہیں جیسے کہ وہ بارہ تیرہ برس کی لونڈیا ہوں"

"کیا رام لال بھیا کی اور چھوٹی مہارا جن کی مڈبھیڑ روز ہوتی ہے!! ایسا اتفاق روز کیسے ہوتا ہے؟"

"گھانسو کی بتو بتاتی ہے کہ رام لال آ کر مندر کے ایک ایسے کونے میں بیٹھتا ہے جہاں سے سڑک کا موڑ دکھلائی دیتا ہے۔ وہ برابر اُدھر ہی دیکھتا رہتا ہے۔ جہاں اس موڑ پر دونوں مہارا جن دکھلائی دیں۔ وہاں وہ ہری ہری جپتا ہوا اٹھا اور گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔"

کچھ ہی دنوں بعد مہارا جن کو کٹ پورہ سے باہر کے مندروں کو جانے کا بھی شوق ہو گیا۔ وہ لکھنؤ اور دوسرا جگہوں کے دھارمک میلوں میں بھی جانے لگیں۔ اور جب وہ جاتیں تو رام لال بھی کسی نہ کسی کام سے کٹ پورہ کے باہر ضرور جاتا تھا۔ جب یہ چیزیں بڑھنے لگیں تو گاؤں والے ان کو دیکھنے لگے اور ان پر تبصرہ کرنے لگے۔ اس پر تبصرے پہلے آنکھ کے اشاروں اور مسکراہٹوں میں ہوتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ وہ کھسر پھسر کی شکل میں آ گئے۔ اور اس کے بعد لوگ باقاعدہ آپس میں ان کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

چند مہینوں کے بعد اچانک مہارا جن کا باہر کے میلوں اور مندروں میں جانا بند ہو گیا۔ مندر وہ ضرور جاتیں مگر بڑے مہاراج کے ساتھ۔ رام لال جو مہاراج کا بڑا بھگت بنا ہوا تھا اس کا بھی مہاراج کے یہاں جانا بہت کم ہو گیا۔

"یہ سب کیوں ہوا؟"

چیتیا نے سانولی سے جو اسے ایک جگہ مل گئی تھی روک کر یہ سوال پوچھ لیا۔

"مہاراج نے اپنی بہو اور رام لال کو کسی جگہ ایک ساتھ دیکھ لیا تھا"

"تم کو کس سے معلوم ہوا؟"

"دھرمو کہتا تھا"

"تب ہی مہاراج نے دھرمو کو نکال دیا"

"نکال کہاں دیا۔ اس کو شکر مل میں نوکری دلوا دی"

"شیا مو مہاراج نے کیا کیا؟ اپنی بہو کی کچھ خبر لی؟"

"سنا ہے کہ بہت مارا پیٹا"

گاؤں والوں کی زندگی ایک بندھے ٹکے ڈھرے پر چلتی ہے جس میں تنوع نہیں کے برابر ہوتا ہے اس لئے جہاں بھی کوئی بات ذرا بھی معمول سے ہٹی ہوئی نظر آ گئی۔ گاؤں والے اس کا ہر ے پہلو سے جو مزیدار ہو مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر مزے لے لے کر اسے بیان کرتے ہیں۔ بیان میں جہاں جو کمی محسوس ہو' اس کو اپنی طرف سے پورا کر دیتے ہیں۔ مدتوں اس چیز کی تکرار کرتے رہتے ہیں۔ درگا جی کی سگریٹ کی ڈبیہ کیسی تھی۔ انھوں نے سگریٹ کیسے جلایا درگا جی کے جوتے میں کیسے فیتے بندھے تھے وہ فیتے چھیدوں سے کس طرح سے گزرتے جو چیز ان لوگوں کی سمجھ میں پوری طرح نہ آئے' جیسے موٹر سائیکل۔ گراموفون' کیمرہ یا کسی اور طرح کا مشین وغیرہ اس کو بھی اپنی طور پر بیان کر ہی ڈالتے ہیں اور جو باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں ان کی خانہ پری خیالی باتوں سے کر دیتے ہیں کبھی کوئی کہہ دیتا ہے کہ گراموفون کے اندر میں نے اپنی آنکھوں سے آدمی کو بیٹھے دیکھا۔ کبھی یہ کہ کیمرہ کے اندر پہلے تصویریں رکھی رہتی ہیں۔

رفتہ رفتہ گاؤں والوں نے رام لال اور مہاراجن کی باتوں کی بھی ایک

کہانی بنائی وہ چلتی رہی۔ اور چلنے کے ساتھ ساتھ اس کی ہر بات کی لمبائی چوڑائی
بڑھتی رہی، پھر وہ کہانی دوسری باتوں میں گھل مل کر ختم ہو گئی اور ان کی جگہ
دوسری دلچسپ چیزوں نے لے لی۔ پھر ایک دن رام لال اچانک غائب ہو گیا۔
چنیا کے کانوں تک رام لال کی حرکتوں کے چرچے پہونچتے رہے اور اس پر وہ
دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ کیوں کہ اس کو آج بھی یاد تھا کہ رام لال کس طرح
آ کر میرے پاس بیٹھ کر باتیں چکنایا کرتا تھا اور کس طرح گھر کے کاموں میں دلچسپی لیا کرتا تھا،
اور پھر جب میں نے اس کو راکھی باندھی ہے تو اس نے کس طرح ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی
کلائی بڑھائی تھی۔ ان سب باتوں کو چنیا نے قیمتی چیز کی طرح اپنے دل میں چھپا رکھا تھا
اور اس کے دل میں رام لال کی ایک عزت تھی۔ لیکن اس عزت میں پہلی ٹھیس اس وقت
لگی جب اس نے اپنے برے دنوں میں دیکھا کہ رام لال نے میری ذرا بھی خبر نہ لی۔ اگر خبر لی
بھی تو دھنری نے لی۔ جس سے میں کسی زمانے میں نفرت کرتی تھی۔ پھر جب رام لال
اسی دھنری کی ناقدری کرنے لگا جس کو وہ پیار کر کے لے گیا تھا تو چنیا کی نظروں میں
وہ اور گر گیا۔ اور اب مہاراجن والی بات سن سن کر تو وہ اپنے دل میں شرمندہ ہونے
لگی کہ میں نے ایسے شخص کو اپنے دل میں اونچا استھان کیوں دیا تھا؟
کچھ دنوں کے بعد رام لال واپس آ گیا اور کہنے لگا کہ تیرتھ کر کے آ رہا ہوں۔
وہ اپنے ساتھ گنگا جل بھی لایا تھا اور گاؤں کے ہر اہم آدمی کے لئے کوئی نہ
کوئی چھوٹا موٹا تحفہ بھی لایا تھا وہ ہر شخص سے ملنے گیا اس کو تحفہ بھی دیا اور گنگا
جل بھی۔ اور اس طرح باتیں کیں جیسے وہ کبھی بدنام ہوا ہی نہ تھا۔ آنے کے تیسرے
دن چنیا سے بھی ملنے آیا۔ اس کے لئے گنگا جل لایا اور ایک ڈبیا میں کاجل بھی۔ کہنے لگا۔
"یہ دونوں چیزیں پرشاد ہیں۔"

چیتا پرشاد سے تو انکار نہ کرسکی۔ کون دھرم والا اس سے انکار کرسکتا تھا۔

رام لال اب دوسرے تیسرے دن چیتا کے گھر کے پھیرے کرنے لگا۔ چیتا اس کو مُنہ نہیں لگاتی تھی۔ لیکن رام لال نے اس بات کی پروانہ کی اور جس طرح وہ آتا تھا اسی طرح آتا رہا اور چیتا دھیان دے یا نہ دے وہ رامو، یا رانی کو یا چھوٹی سی سیتا کو مخاطب کرکے باتیں چکناتا تھا۔

اتفاق سے ایک ایسی بات ہوگئی کہ چیتا اپنی بے رخی کو واپس لینے پر مجبور ہوگئی۔ وہ یہ کہ دو دن کے اندر اندر اس کی دونوں بیٹیاں رانی اور سیتا بیمار پڑ گئیں۔ دونوں کو بڑے زور کا بخار چڑھا۔ اور ایک مرتبہ جو چڑھا تو پھر اُترنے کا نام ہی نہیں لیا۔ محلّے کے لوگوں نے جو جو ٹونے ٹوٹکے بتائے وہ سب کئے گئے لیکن پھر بھی بخار کا زور نہ ٹوٹا۔ اب چیتا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر یا وید کو دکھا کر علاج کرائے۔ لیکن سب سے قریب جو اسپتال تھا وہ سوج پور میں تھا۔ اتنی دور دو دو بیمار بچوں کو لے کر جاؤں تو کیوں کر جاؤں، یہ زمانہ ایسا ہے کہ بیل بھی خالی نہیں ہیں کہ کسی سے گاڑی مانگ کر اس میں ان کو لٹا کر چلی جاؤں۔ پھر اگر کسی طرح پہنچ بھی گئی تو وہاں ٹھہروں گی کہاں۔ اور چار دن تو ٹکنا ہی ہوگا۔ رہا کٹ پور میں رہ کر علاج کرنا سو وہاں تھے تو ایک حکیم۔ مگر ان کو سب لٹیرا کہتے تھے کیوں کہ وہ پیسے لے کر دوا دیتے تھے اور جوں جوں فائدہ ہوتا جاتا تھا، دوا کے دام بڑھاتے جاتے تھے۔

چیتا نے علاج کا خیال تو چھوڑ دیا۔ لیکن بچوں کی فکر لینا بھی اب مشکل ہوگیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ کسی کو قے ہو رہی ہے۔ کوئی پانی مانگ رہی ہے۔ یا پیشاب کرنا چاہتی ہے، اور چیتا رسوئی میں کھانا بنا رہی ہے۔ امر کھیت پر ہے، یا بوا در

راموبھی اس کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ ایسے میں، چیتا بہت بوکھلا جاتی تھی۔ مگر رام لال یہ حالت دیکھ کر روزانہ آنے لگا تھا۔ اور بچوں کی خبر گیری کرنے لگا۔ اس کی اس مہربانی سے چیتا بہت ممنون ہوتی تھی۔ ایک دن بہت بگھل کر کہنے لگی۔

"رام لال بھیا۔ میں ایک بار پھر تمہارے راکھی باندھوں۔ بہت جی چاہتا ہے۔"

"راکھی!! ــــــ راکھی ــــــ؟"

رام لال نے بہت حقارت سے جواب دیا۔

(۲)

چند دنوں کے بعد رانی اور سیتا دونوں کے سارے بدن پر چیچک اُبل پڑی۔ اور باوجود سیتلا مائی کی پوجا کے اس نے بہت زور باندھا۔ لیکن تین ہفتوں کے بعد چیچک مرجھا گئی، اور پھر ان کی پپڑیاں جھڑنے لگیں اور دونوں لڑکیاں اچھی ہونے لگیں۔ سیتا تو کھڑی ہو گئی تھی۔ لیکن رانی کے چہرے پر بہت کم دھبے پڑے تھے۔

ابھی رانی ٹھیک طرح سے اچھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پھر بیمار پڑ گئی اور پھر ایسا بخار آیا جو اُترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ یہ کیا؟ پھر سیتلا مائی آگئیں؟

رانی کا بخار کسی طرح نہ ٹوٹا۔ آخر وہ کہنے لگی کہ حکیم کو دکھا دو اور خوشامدیں کرنے لگی۔ آخر حکیم کو دکھا دیا گیا۔ لیکن دوائی کے دام نہ ہونے کی وجہ سے علاج جاری نہ رہ سکا۔ بس گنگا جلی ہی سے علاج ہوتا رہا۔ اسی حالت میں ایک دن رانی نے روتے ہوئے ماں، باپ، چچا اور بھائی کے سامنے دم توڑ دیا۔

رانی کی تیرھویں کے بعد چیتا نے رام لال سے کہا:۔

"بھیا رام لال تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے وہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔"

رام لال نے احسان بھری نظروں سے دیکھ کر کہا:۔
" لیکن وہ ممنونیت کس کام کی جس سے ایک پیار بھری نظر بھی نہ ملی "
چیتا پیٹھ موڑ کر کچھ کام کرنے لگی۔ اور اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

رات کو جب رام لال آیا اور رامر کے ساتھ بیٹھ کر چلم پینے لگا تو چیتا بھی وہاں بیٹھ گئی۔ ذرا دور پر گنے کے کھائے ہوئے چھلکے پڑے تھے۔ چیتا ان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔

" یہ دیکھو۔ کبھی یہ رس کے بھرے تھے۔ پر اب کیا رہ گیا ہے۔ اسی طرح میرا برا حال ہے جو کچھ تھا بچوں میں چلا گیا۔ اور ان میں سے دو مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب مجھ میں رس کہاں ہے۔"

چیتا نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کے دل کی ــــ سچی آواز تھی۔ اس کی پچھلی تکلیفوں نے اس کو تجربہ کار بنا دیا تھا تو رانی کی موت نے اس کو جوان سے ادھیڑ بنا دیا اور ساتھ ساتھ اس کے جذبات کا سارا رُخ بدل گیا۔

چیتا اپنی بات کہہ کر بلا آواز کے رونے لگی۔ اور رامر اس کو سمجھانے لگا۔ رام لال چپ چاپ اُٹھ کر اس طرح چلا گیا گویا اب نہ اس کو مالتی کے غم سے کوئی غرض ہے اور نہ چیتا کے رونے سے۔ چیتا نے اس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن اسے اس بے مروّتی پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس شخص کو نہ مجھ سے ہمدردی ہے اور نہ بچوں پر دیا آتی تھی۔ اس کو تو ایک لت ہے عورتوں کو بگاڑنے کی۔

ایک مہینے کے بعد بابو نوکری کے ارادے سے کان پور چلا گیا۔ اور اسی دن رام لال بھی طویل عرصے کے لئے غائب ہو گیا۔

باب (۱۶)

کالی راتیں

①

راحت کو اپنی گرفتاری پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ گھر ہی سے اس کی تیاری کر کے چلا تھا۔ سلیمہ نے پوچھا تھا کہ آپ کو اپنی گرفتاری کا اتنا یقین کیوں ہے؟ آپ تو ایک سیدھے سادے کام کے لئے جا رہے ہیں کسی قانون شکنی کے لئے تو جا نہیں رہے ہیں۔ تو راحت نے جواب دیا تھا کہ میرا دل کہتا ہے کہ انگریز اب مجھے زیادہ آزاد نہیں رکھ سکتے۔

راحت نے محلے والوں اور کانگرس اور خلافت کے کارکنوں سے کہا تھا کہ اب میں تو چلا۔ تم لوگ میرے گھرانے کی دیکھ بھال کرنا۔

راحت جب جیل کے پھاٹک میں داخل ہوا ہے تو وہ خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ جب میں پھاٹک سے باہر آؤں گا تو اس وقت دنیا بدل چکی ہو گی یعنی انگریزی

راج جا چکا ہوگا اور قومی حکومت قائم ہوگی۔ صرف اسی کو نہیں بہت سے لیڈروں کو خیال تھا کہ چند ہی مہینوں کے اندر انقلاب ضرور آجائے گا۔ اس لئے راحت جیل کے اندر جاتے ہی انقلاب کی خبر کا انتظار کرنے لگا۔ اور نمازوں میں اس کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔ نماز کا ایسا پابند ہو گیا کہ ایک سال تک اس کی ایک نماز بھی قضا نہیں ہوئی۔

جیل ان دنوں جیل کیا تھا ایک کلب گھر تھا۔ باہر سے طرح طرح کے کھانے آتے تھے وہ اڑتے تھے اور تاش، شطرنج، داستان گوئی مشاعرہ اور بحثوں میں وقت کٹتا تھا۔ تین مہینے تک راحت کو سوائے بیوی بچّوں کی جدائی کے جیل کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد اسے جیل کی صحبت، صحبت ناجنس معلوم ہونے لگی اور بیرک کے اندر ایک خاص قسم کی بو محسوس ہونے لگی جس سے جی بہت گھبراتا تھا۔ اور ہر وقت یہ بات یاد آتی تھی کہ میں جیل میں ہوں۔

ایک مولانا صاحب ہر شخص کو ہر وقت نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ بات راحت کو اتنی نہیں کھلتی تھی۔ جتنی یہ کہ جب وہ نصیحت کے زور میں ہوتے تھے تو اس وقت ان کے منہ سے تھوک اڑتا تھا وہ ان کی داڑھی پر موتی بن جاتا تھا لیکن دوسروں کے منہ پر مکھی۔ راحت جتنا مولانا سے ان کی اس عادت کی وجہ سے بھاگتا تھا اتنی ہی مولانا راحت کی طرف کشش محسوس کرتے تھے۔

ایک فرینچ کٹ داڑھی والے مولوی صاحب تھے جن کو جیلر نے آئینہ اور قینچی رکھنے کی اجازت دے دی تھی وہ روزانہ صبح کو ایک گھنٹہ داڑھی کو ہموار کرنے پر صرف کرتے تھے۔ اور مصروفیت کے دوران میں وہ راحت کو اپنے جنسی تجربات

سنایا کرتے تھے ان کے خیال میں عورت بس صرف عورت ہوتی ہے اور اس کو عورت ہی سمجھنا چاہیئے۔ صبح راحت جہاں بھی ہو یہ آئینہ اور قینچی لے کر اس کے پاس پہنچ جاتے اور بولنا شروع ہو جاتے۔

"یار راحت ایک تجربہ اپنے شہر میں میں نے ایک دہی والی کو دیکھا کالے کپڑوں سے اس کا گورا رنگ پھوٹا پڑتا تھا اور رنگ کے ساتھ ساتھ بدن بھی۔ پھر تو میں نے پھینکیں اس پر اپنی کمندیں........"

سب قصے اسی طرح شروع ہوتے تھے کہ ایک عورت نظر آئی اور یہ کمندیں پھینکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ان پر لٹو ہو جاتی اور اپنے کو ان کے حوالے کر دیتی یہ کچھ دنوں اس سے اپنا سلسلہ رکھتے پھر سیراب ہو کر یہ اس کو چھوڑ دیتے۔ مگر وہ دیوانہ وار ان کی گلی کے چکر کاٹا کرتی۔

ایک تھے شرما جی جو پوجا پاٹ کے بعد ایسے شخص کی تلاش میں نکلتے جو خاموشی سے ان کی سن سکتا ہو۔ ان کو سب سے اچھا راحت نظر آتا۔ شرما جی اسے دیکھتے ہی کہتے۔

"ارے شرمیان جی۔ نمستے۔ میں نے کہا جرا گریبوں کی بھی کھبر پالے لیجیے۔"

شرما جی کی ساری باتیں ایک مرکز پر گھومتی تھیں۔ وہ یہ کہ وہ ہزاروں خوبیوں کے لیڈر ہیں لیکن افسوس نہ اوپر والوں نے ان کو پہچانا نہ برابر والوں نے اور نہ جے لگانے والوں نے۔

راحت اگر موڈ میں ہوتا تو کہتا۔

"شرما جی اگر کہیں میں ہوتا گاندھی جی یا موتی لال کی جگہ ملک کا لیڈر تو آپ کو بلا کر فوراً اپنا ذاتی لیڈر بنا دیتا اور پھر خود آپ کی آگیا کے انوسار سارے کام کرتا۔

شرما جی یہ سن کر بہت زور سے ہنستے اور پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہتے۔

"سبھی میں تو لیڈری ایسی گدی بناتا جس پر دو آدمی ایک ساتھ بیٹھ سکتے اور جو کام کرتا وہ تمہاری مرضی کے بغیر نہ کرتا۔"

راحت کہتا۔

"سچ شرما جی ؟"

"ہاں سچ ہے۔ میں جنیو کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

شرما جی جنیو کی قسم بہت کھایا کرتے تھے۔ شاید ان کو اس بات کا بہت زبردست احساس تھا کہ میں اونچی ذات والا ہوں جو کہ اس جنیو کو پہنتا ہے۔

موہن رائے سکسینہ، ہر وقت دیوار سے پیٹھ لگائے چھت کی طرف تکا کرتے اور چاہتے کہ کوئی پوچھے کہ کن خیالوں میں ہو موہن بابو۔ اور وہ فوراً چل نکلیں۔

"کیا بتاؤں تمہاری بھابھی کی گود میں چھوٹا بچہ ہے اور وہ خود بھی بالکل بچہ ہی ہیں، ہنوز نا تجربے کار۔ میرا ہی دل تھا جو ایسی پتنی کو تیاگ کر جیل چلا آیا۔"

لوگ کہتے ہیں۔

"چلے بھی آئے اور ابھی تک معافی مانگ کر واپس بھی نہیں گئے بڑے سورما ہو سکسینہ جی۔"

سکسینہ جی اس تعریف پر خوشی کے مارے ذرا لجا جاتے۔ "ایسی پتنی چھوڑ کر آیا ہوں کہ....."

چاند پرشاد اور رام اگروال ہر وقت یہ اسکیم بنانے میں لگے رہتے کہ باہر نکل کر کون سا کاروبار کریں گے۔

"کپڑے کا دھندا اچھا رہے گا۔"

"نہیں اینٹوں کا بھٹا سب سے اچھا رہے گا۔"

پھر روپیہ آنہ کا جوڑ گھٹاؤ ہوتا۔ پھر حصہ بانٹ کا معاملہ طے ہوتا۔ ان لوگوں میں یہی بات چیت

صبح سے شام تک چلتی رہتی تھی۔

قیدیوں کے ہال کے بیچ میں تیس چالیس آدمیوں کی بھیڑ رہا کرتی تھی وہاں یہ بحثیں ہوتیں کہ ہندوستان آج آزاد ہوگا یا کل آزاد ہوگا یا سال بھر کے بعد آزاد ہوگا۔ گاندھی جی کے پاس اپنی عقل ہے یا وہ موتی لال یا مولانا محمد علی شوکت علی یا کسی اور کی عقل سے کام کرتے ہیں۔ انور پاشا زندہ ہیں یا شہید ہوگئے۔ امیرالمومنین سلطان عبدالحمید اچھے حکمراں تھے یا خراب۔ اگر ہندوستان آزاد ہوگیا تو کیا ہندوستان کے مسلمان افغانستان کی مدد سے یہاں مسلم راج نہ قائم کرلیں گے۔ انھوں نے اگر ایسا کیا تو پھر کیا ہوگا۔

یہ بحثیں بھی ہوتیں اور یہ بھی کہ اُردو اچھی زبان ہے یا ہندی اور لوٹا صاف برتن ہے یا لٹیا اور دھوتی اچھا لباس ہے یا پائجامہ۔ مزاق مذاق میں ہر قسم کی فرقہ وارانہ باتیں بھی کہہ دی جاتیں تھیں اور تلخ سے تلخ فقروں کا تبادلہ بھی ہوجاتا تھا۔ لیکن یہاں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا ذہن ملکی تحریک میں اتنا اُلجھا ہوا تھا کہ جو بحث بھی ہو اس کا رُخ جلد ہی نان کوآپریشن کی تحریک کی طرف مڑ جاتا۔ اور پھوٹ آتے آتے رہ جاتی۔

(۲)

چار بجے نیشنل ہائی اسکول لکھنؤ میں چھٹی کا گھنٹہ بجا اور لڑکے حسب عادت خوشی سے شور مچاتے ہوئے اسکول سے باہر جانے لگے۔ لیکن نویں درجہ کے لڑکوں میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کیوں مولانا قیصری تاریخ اسلام پر تقریر کر رہے تھے ان کی یہ تقریر ایک بجے سے جاری تھی اور اسکول کے چار پیریڈ جو تین گھنٹوں کے

ہوتے تھے، گزر چکے تھے، لیکن تقریر جس طرح شروع ہوئی تھی اسی طرح ابھی تک جاری تھی۔ صلاح الدین ایوبی کے بہادری کے کارنامے، جنگ صلیبی کو پاش پاش کر دینا پھر محمد غوری کی بہادری یا محمود غزنوی کا بت فروشی پر بت شکنی کو ترجیح دینا۔ آصف الدولہ کا قحط کے زمانے میں قحط زدوں کی امداد کے لئے امام باڑہ بنوانا، ترکی کے سلطانوں کی بہادریاں اور انور پاشا کے روسیوں سے مقابلے۔ مولانا قیصری کی تقریر میں ایک قصہ دوسرے سے جڑتا چلا جاتا تھا اور سب سے مطلب ایک ہی نکلتا تھا۔ وہ یہ کہ مسلمان بہادر ہوتا ہے، انصاف پسند ہوتا ہے، اس کا حق ہے کہ وہ حکمراں بنے۔ ساری دنیا اس کی جائداد ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور:۔

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
جی میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہوگئیں

سب سے زیادہ جس لڑکے پر اس تقریر کا اثر ہوا وہ شوکت انسان تھا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد جب وہ گھر لوٹ رہا ہے تو اس کے دل سے صدا آرہی تھی۔

کاش اپنے مقبوضہ ممالک واپس مل جاتے۔

رات جب شوکت کے والد رفیع انسان کہنے لگے کہ کاش اپنا علاقہ واپس مل جاتا اس وقت شوکت کے دل نے ان کی آواز سے آواز نہیں ملائی بلکہ وہ یہ کہتا رہا کہ کاش مسلمانوں کے مقبوضہ ممالک ان کو واپس مل جاتے۔

نیشنل ہائی اسکول کی تعلیم پرانے اسکول کی تعلیم سے بالکل الگ تھی۔ یہاں بڑے بڑے مقرر آکر تقریر کرتے تھے اور اپنی تقریروں سے طالب علموں میں قومی جذبات کو ابھارتے تھے۔ حساب، جغرافیہ، انگریزی اور نصابی کتابیں، ان کی تو بہت کم باری آتی تھی جس دن کوئی نیا مقرر نہیں آتا تھا اس دن اسکول کے ٹیچر کلاس لے لیتے تھے۔ لیکن وہ بھی لیڈروں کی راہ چلتے تھے اور قومی تقریریں کیا کرتے تھے۔

کبھی کبھی کوئی قومی شاعر بھی آجاتا تھا جو قومی نظمیں اور قومی ترانے سناتا تھا۔ مقرروں میں سے بھی بعض ایسے تھے جو اپنی تقریر میں جب بھی شعر پڑھتے تھے تو گاکر پڑھتے تھے جب اس طرح کی خوش الحانیاں ہوتی تھیں تو طالب علموں کو بہت لطف آتا تھا۔

سب ہی مقرر تاریخ اسلام اور قرطبہ اور بغداد ہی کے بارے میں تقریریں نہیں کرتے تھے۔ بعض مقررین ایسے بھی تھے، جو راجہ ہریش چندر، مہاراجہ رام چندر جی اور شری کرشن جی مہاراج، مہاتما گوتم بدھ اور راجہ رام موہن رائے پر بھی تقریریں کرتے تھے۔

مسلمان لیڈر جوش کی بہت قدر کرتے تھے اور جو شخص پر جوش ہوتا تھا اس کو بہتر انسان قرار دیتے تھے۔ ان کی تقریروں کا رفتہ رفتہ کچھ ایسا اثر ہوا کہ تین چار لڑکے ایسے بن گئے جو ہر وقت جوش میں بھرے رہتے تھے مثلاً سبق میں کہیں برٹش گورنمنٹ کا لفظ آگیا تو وہ میز پر گھونسا مار کر کھڑے ہو جائیں گے اور ٹیچر کی ذرا بھی پرواہ نہ کریں گے۔ کھڑے ہو کر یا تو ایک ایڈومنٹ کی ایک تقریر جھاڑ دیں گے یا ایک جوشیلی نظم گا دیں گے۔

جوشیلے لڑکوں میں نمبر اوّل تھا واعظ الدین کا جس نے اپنا تخلص بھی اپنے جوش کی مناسبت سے رعدؔ رکھ لیا تھا۔ جب لوگ پوچھتے تھے کہ کیا آپ کچھ کہتے بھی ہیں تو رعد جواب دیتا نہیں۔ لوگ پوچھتے پھر تخلص ابھی سے کیوں رکھ لیا۔ وہ جواب دیتا تاکہ کوئی اور اس تخلص کو نہ رکھ سکے۔ اس کے جوش کا ایک واقعہ بہت مشہور ہو گیا وہ یہ کہ ایک مرتبہ وہ نب خریدنے گئے دکان دار نے ایک نب کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ انگریزی نب ہے برسوں چلے اور نہ گھسے۔"

انگریزی کا لفظ سننا تھا کہ آگیا رعدؔ صاحب کو جوش۔

"انگریزی نب کی اور تعریف۔ ہائے غلامانہ ذہنیت......"

رعد صاحب نے گرج گرج کر پانچ منٹ کی تقریر جھاڑ دی اور اتنی بلند آواز سے جھاڑی کہ بیس بیس گز کے اندر کے سب لوگ سمٹ کر سُننے لگے کہ کیا بات ہے۔ دوکان دار اس تقریر سے ایسا مرعوب ہوا کہ اس نے رعد کو وہ نب بلا قیمت کے دے دی۔

لڑکے سمجھ گئے کہ رعد صاحب۔ انگریز، انگریزی، برٹش، برٹین اور ایسے لفظ قطعی برداشت نہیں کر سکتے ہیں کیوں کہ آدمی جوشیلے ہیں۔

لڑکوں نے کچھ دنوں تک اس جوش کی بہت قدر کی۔ پھر اچانک لڑکوں کو محسوس ہوا کہ رعد صاحب کی گرج کا بٹن ان کے ہاتھ میں نہیں۔ بلکہ ان کے ساتھیوں کے ہاتھ میں ہے۔ پھر تو ان کے ساتھی اس بٹن کو استعمال کرنے لگے اور ایسا ہونے لگا کہ کلاس میں رعد صاحب باقاعدہ پڑھ رہے ہیں کہ کسی نے چپکے سے ان سے کہہ دیا۔

"بھئی تم تو انگریزی الفاظ بالکل انگریزوں کی طرح پرونا ونس کرتے ہو۔"
بس یہ سننا تھا کہ گرجنے لگے رعد۔

اب تو لڑکے دن میں تین چار مرتبہ ضرور رعد کو اسی طرح چھیڑ دیا کرتے۔ اور رعد بھی دُھن کا پکّا تھا وہ ضرور جوش میں آجاتا۔ لیکن ایک دن کام بگڑ گیا، ہوا یہ کہ رعد کے باپ اور چچا اسکول آئے اور انھوں نے رعد کو بُلا بھیجا۔ رعد گھبرا گیا کہ کوئی ایسی ہی بات ہے جو وہ لوگ آئے ہیں۔ وہ کلاس سے جانے لگا۔ اس وقت لڑکوں نے گرج کا بٹن دبانے کی کوشش کی اور چلّا چلّا کر کہنے لگے۔

"چلنے کا ڈھب تو دیکھو۔ بالکل انگریز معلوم ہو رہا ہے۔"

"دیکھو لالٹین نہیں کہتا ہے لین ٹرن کہتا ہے بڑا بنا ہے انگریز۔"

مگر رعد کو باپ اور چچا کے پاس جانے کی ایسی جلدی تھی کہ اس کو ٹھہر کر گرجنے کا ذرا بھی موقع نہ ملا۔ اس دن سے "گرج" کا رعب کیا لڑکوں اور کیا رعد دونوں کے دل میں کم ہو گیا۔ صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ اس سے رعد کا جوش ذرا دھیا پڑنے لگا

ایک دن پھر ایک اچھے مقرر نے تاریخ اسلام پر ایک بہت زور دار تقریر کر ڈالی جو دو گھنٹے اس طرح چلی کہ انٹرول کے آدھے گھنٹے کے بعد جاکر ختم ہوئی۔ اس تقریر نے پھر شوکت کے دل پر وہی اثر چھوڑا کہ کاش اپنے مقبوضہ ممالک واپس مل جاتے۔ جب اس پر یہ جذبہ طاری ہو جاتا تھا تو وہ تنہائی پسند ہو جاتا تھا۔ اس وقت تنہائی پسندی میں وہ اسکول کے باہر فیلڈ کی طرف جانے لگا کہ اس وقت اس نے دیکھا کہ دو عورتیں برقعہ پہنے کھڑی ہیں اور ان کی نگرانی میں ان کے دو خادم سب لڑکوں کو مٹھائی کے دونے بانٹ رہے ہیں۔ شوکت اپنے خیالوں میں اتنا غرق تھا کہ اس نے

نہ خاتون کی طرف توجہ کی اور نہ دونے کی طرف اتنے میں ایک خادم ایک دونا لیکر دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ نواب شوکت صاحب یہ حقیر ہدیہ ضرور قبول فرمالیں۔

"کون ہیں یہ بیگم صاحبہ جو میرے نام سے واقف ہیں؟"

"میں بہت شرمسار ہوں کہ آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا ہوں۔ مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔"

"اجازت نہیں" نیشنل اسکول والوں کی خدمت کرنا تو کوئی ایسی بُری بات نہیں ہے کہ لوگ اس خدمت کی وجہ سے اپنا نام بتاتے شرمانے لگیں۔

دونوں خاتونوں میں سے ایک زرا قریب آگئی تھیں۔ انھوں نے ہلکی آواز میں کہا۔

"مصلحت نیست از پردہ بروں افتد راز"

شوکت نے کھنکتی ہوئی آواز میں جو یہ مصرع سنا تو اس کے لب پر آگیا۔

"چرغ کو..............."

مگر اس نے فوراً ہی اپنی زبان پکڑ لی مگر خاتون نے اس کو بھی نہ چھوڑا اور چھوٹتے ہی کہا۔ —— "جائیے کوئی ہو آپ کو کیا" ——

یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ لوٹ گئی۔ ریشمی برقعہ میں ایک لہر آکر نکل گئی۔ اس لوٹنے میں تیکھاپن تو تھا، پر لگاوٹ کے ساتھ تھا۔ ناراضگی کے ساتھ نہیں۔

اس کے بعد ہفتوں شوکت نے اس خاتون کا اسکول میں انتظار کیا لیکن وہ نہ آئی۔ شوکت کے دل میں یہ سوال بار بار اٹھتا رہا کہ وہ کون ہوسکتی ہے؟

کیسی تیز فہم تھی کہ چرخ زبان سے نکلا اور سمجھ گئی کہ میرے لب پر یہ شعر آگیا ہے

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اور جواب بھی کیسا جواب دیا جس میں شوخی بھی اور رکھ رکھاؤ بھی۔ حملہ بھی اور بچاؤ بھی کہنے کو سب کہہ دیا مگر گرفت کی گنجائش نہ چھوڑی۔ یہ حاضر جواب کون ہو سکتی ہے۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ وہ کسی اونچے گھرانے کی تھی اور مسلمان تھی مگر یہ تیزی!!

شوکت کا انتظار جاری رہا اور اسکول میں تقریریں جاری رہیں لیکن اب تقریروں کا رُخ ذرا بدل گیا تھا۔ اب مسلمان لیڈر یہ جتانا چاہتے تھے کہ مسلمان برتر ہیں اور حکمرانی کا حق انھیں کو حاصل ہے۔ جواب میں ہندو اپنے فرقے کو بڑھاتے تھے ہندوؤں کے پچھلے کارنامے گنانے تھے اور اس رشتے سے اپنے کو حکمرانی کا مستحق قرار دیتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے تھے کہ جب اکثریت ہماری ہے تو حکومت بھی ہماری ہی ہو گی۔

تاریخ پر جب بھی تقریر ہوتی یہ سوال اُٹھتے کہ اکبر کی پالیسی اچھی تھی یا اورنگ زیب کی؟ اکبر عزت کا مستحق ہے یا مہارانا پرتاپ؟ اورنگ زیب ہندوستان کا ہیرو تھا یا شیواجی؟ ہندو سو سال سے غلام ہیں یا آٹھ سو سال سے؟ یہ بحثیں روز بروز کلاس روم سے نکل کر لڑکوں میں بھی ہونے لگیں اور پھر بازاروں گلیوں اور گھروں پر بھی ہونے لگیں۔ ان بحثوں سے ہندو مسلمان لڑکوں میں جو ربط تھا کہ مسلمان علمار کی تقریریں بھی دونوں ہی سنتے تھے اور ہندو پنڈتوں کی تقریریں بھی دونوں سنتے تھے

وہ گھٹنے لگا۔

لیکن ان بحثوں سے پہلے ہی شوکت کا جی نیشنل اسکول سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔ اسے دو باتیں بہت ناگوار ہوتی تھیں ایک تو یہ کہ لڑکے چاٹ کے دونے کلاسوں میں لے آتے تھے اور وہاں چپڑ چپڑ کر کے کھاتے تھے اور پھر زوردار ڈکاریں لیتے تھے اور دوسرے یہ کہ غلط اردو بولتے تھے اور اس پر ٹوکو تو پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ پروا کیا کرتے خود اُستاد غلط اردو بولتے تھے۔ ان دونوں باتوں پر اضافہ یہ کہ شوکت دن بدن دیکھ رہا تھا کہ میں اپنے ان دوستوں سے جو ابھی تک گورنمنٹ اسکول میں ہیں حساب میں پچھڑتا جا رہا ہوں۔ پہلے وہ فرخ اور گوپال سے اپنی یہ تکلیفیں بیان کیا کرتا تھا پھر رفتہ رفتہ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ دونوں میری ان باتوں کو سن کر کچھ خوش نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے شوکت اپنے ان احساسات میں اکیلا رہ گیا۔

(۳)

دھنری یوں تو کچھ مزے ہی میں تھی کیوں کہ اس کی دوکان خوب چلنے لگی تھی اور اکیلی ایک ذات ہونے کی وجہ سے اس کا خرچ بھی بہت کم ہو گیا آمدنی زیادہ تھی اور خرچ کم۔ اس طرح اس کو خوب اللے تللے کرنے کا موقع ملتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی زندگی کا طریقہ بدلنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں، مگر ہونے یہ لگا کہ چار پانچ مہینے کے اندر اندر اس کی دوکان پر

محلّے کے لونڈے اکٹھا ہونے لگے اور تاش کھیلنے لگے اور "بھوجی دھنزی" سے فحش مذاق کرنے لگے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہونے لگی جو کافی پریشانی کی تھی۔ وہ یہ کہ دھنزی کی آنکھیں دو سال سے خراب ہو رہی تھیں وہ اور خراب ہوگئیں اس وجہ سے اندھیرا ہو جانے کے بعد اس کو چیزیں اور پیسہ صاف نظر نہیں آتے تھے اس کی اس حالت سے فائدہ اٹھا کر بعض خریدار زیادہ سودا اٹھا لے جاتے اور بعض کھوٹی اکنیاں دے جاتے۔ دھنزی ہر آنے جانے والے کے سامنے یہ دکھڑا روتی رہتی مگر اس معاملے میں کوئی اس کی کچھ مدد نہیں کرتا۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ بکری جو برابر ہوتی رہی، اس وجہ سے دو مہینے کے بعد دوکان کا سامان کم ہونے لگا اور بعض چیزیں تو بالکل ختم ہوگئیں۔ اب سوال یہ اٹھا کہ لکھنؤ سے کون جا کر ضروری سامان خرید کر لائے۔ دھنزی اپنے کو تو اس کام کے لئے بالکل ہی ناموزوں سمجھتی تھی وہ تو کہتی تھی کہ میں لکھنؤ گئی تو سودا خریدنا کیسا راستہ ہی بھول جاؤں گی۔ دھنزی اسی فکر میں ایک مہینے سے تھی کہ ایک دن راستے میں بابو نظر پڑا۔ دھنزی نے اس کو راستے ہی میں روک لیا۔

"تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ منہ کالا کر گیا۔ موا تھا ہی ایسا۔ مگر اس کے جانے کے بعد میں بالکل ہی اکیلی رہ گئی۔ ایسا کوئی نہیں ہے جو لکھنؤ جا کر میری دوکان کے لئے سودا خرید لائے۔ گاؤں کے لوگ یوں ہی میری آنکھوں کے خراب ہو جانے سے سودا زیادہ اٹھالے جاتے ہیں اور کھوٹے سکّے دے جاتے ہیں۔ اگر میں کسی کو پیسہ دے کر سامان لینے بھیجوں تو وہ جانے کتنے پیسے خود رکھ لے اور کیا سامان لائے اور کیسا لائے؟

سامان نہ منگواؤں تو کام کیسے چلے۔ تم نے تو ایک زمانہ میں میری بڑی مدد کی ہے۔ کیا ایسے وقت بھی ہاتھ نہ بٹاؤ گے؟"

بابو کھڑا رہا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب دھنری کچھ تو بولو "کچھ تو کہو" بار بار کہہ کر تھک گئی تو بابو چپ چاپ چلا گیا۔ دھنری اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔

مگر دوسرے دن رامو نے آکر دھنری سے کہا۔

"چاچا اپنے کسی کام سے لکھنؤ جا رہے ہیں انھوں نے کہا ہے کہ دوکان کے لئے کچھ سامان منگوانا ہو تو منگوا لو۔ اور کہا ہے کہ میں اس کام کو جانتا تو نہیں ہوں پر اپنی طرف سے بھی کوشش کروں گا کہ جو کچھ لاؤں وہ ویسا ہی ہو جیسا تم چاہتی ہو اور جہاں تک ہو سستا ہو۔"

"جیو بیٹا تم بھی اور تمہارے چاچا بھی۔ وہ تو بچپن کا بھلا مانس ہے۔"

بابو اب دھنری کی خبر لینے لگا۔ جب دھنری کے پاس کھوٹے سکے بہت آنے لگے تو اس نے ایک دن کہا کہ

"اب تم شام سے یہ کرنا کہ جس گاہک سے بھی اکنی ملے اسے الگ رکھنا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ کس گاہک سے کون سی اکنی ملی ہے۔"

دھنری نے اس دن اس ترکیب پر عمل کیا اور اپنی ساری میں چھ جگہ چھ اکنیاں باندھ لیں۔ جب بابو نے پوچھا تو اس نے ہر ہر اکنی کو نکال کر بتا دیا کہ کون کس کی دی ہوئی ہے۔ اس میں سے ایک اکنی کھوٹی تھی اور وہ نکلی رمضان کے لڑکے پیر بخش کی۔ بابو اسی وقت رمضان کے پاس چلا گیا اور اس سے معاملہ کہہ دیا۔ اگر بابو کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید رمضان بگڑ جاتا

لیکن بابو کو دیکھ کر رمضان نے کہا کہ تم بیٹھو میں ابھی پوچھ گچھ کرتا ہوں ۔ وہ اندر چلا گیا اور وہاں سے کچھ دیر کے بعد آکر کہا۔

پیر کو اکنی اس کی ماں نے دی تھی۔ اس کی ماں کے پاس جو ریزگاری رکھی ہوئی تھی۔ دیکھو اس میں ایک اور ایسی ہی ملی ہے۔ تم جانو کہ ہم لوگ ایسی اکنیاں بناتے نہیں۔ اور مجھے تو اچھی بری اکنی کی کچھ تمیز بھی ہے مگر پیر بخش کی ماں کو کوئی تمیز نہیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک لونڈا دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ دھنری کو کلاتی اس کے گھر میں بند کر کے مار رہا ہے اور وہ زور زور سے رو رہی ہے۔ بچے اس نے ہچکتے ہوئے کہا کہ میں نے ابھی ذرا ہی دیر ہوئی اس طرف پیر بخش کو جاتے دیکھا تھا۔

بابو نے رمضان کی طرف دیکھا اور رمضان نے بابو کی طرف۔ پھر دونوں اٹھ کر دھنری کے گھر کی طرف بھاگے۔

دھنری کے گھر کے دروازے بند تھے اور اندر سے اس کے رونے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ کسی کے مارنے کی بھی۔ رمضان دروازہ بھڑ بھڑا کر کہنے لگا۔

"کون ہے؟ —— کون ہے؟ —— دروازہ کھولو! کھولو!! دروازہ نہیں کھلا تو اسے توڑ دوں گا۔ کھول سالے میں تیرا خون چوس لوں گا۔ ایک بے مددگار بڑھیا کو اس طرح مارے گا بزدل، نمک حرام......"

جب رمضان نے دروازہ پر بہت سے مکے مارے اور اندر والے کو بہت گالیاں دیں تو مارنے والا اگر دروازہ کھولنے لگا۔ اس وقت تک دروازہ پر کافی مجمع ہو چکا تھا

اور سب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے کہ دروازہ کے پیچھے سے کون نکلتا ہے جس نے اس بے دردی سے درزی کو مارا ہے۔

دروازے کے دونوں پٹ جدا ہوئے تو ایک بھاری جسم ان کے پیچھے تھا وہ نکل کر جب روشنی میں آیا تو سب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ارے رام لال۔"

رمضان پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا کہ میں شوہر اور بیوی کے معاملہ میں دخیل ہوا۔ اس بات کا تو گاؤں میں کسی کو بھی حق نہیں ہوتا ہے۔ مگر رمضان نے فوراً بات بناتے ہوئے کہا۔ "کون جانتا تھا کہ تم اپنے گھر میں یوں چھپ کر گھس جاؤ گے اور کسی سے ملنے سے پہلے اس کے دروازہ بند کروگے۔ چلو ذرا گھر چل کر کچھ کھا پی لو۔ دیکھو باغ کے امرود اور آم آئے ہیں اور دیکھو بھیا ہمارے منہ سے جو کچھ نکل گیا ہے اس کو تو بالکل ہی بھول جاؤ۔ سمجھ لو کہ رمضان سے ہو گئی ایک بے وقوفی!"

رام لال ذرا کھسیا کر کہنے لگا۔

"بات یہ ہوئی رمضان بھیا۔ میں سید حا دکان پر جو آیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ سامان بہو تھائی رہ گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ دکھلا تو نے کتنی رقم اکٹھا کی ہے۔ وہ رقم جو لائی وہ نکلی ۲۰ روپیہ اب بتلاؤ کہ یہ بات غصہ کی تھی یا نہیں کہ چھ مہینہ میں ساری دکان اڑ گئی۔ بھیا اس پر میں اپنے آپے میں نہ رہا۔

رمضان رام لال کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے گھر لے آیا اور پھر اس کی اچھی طرح آؤ بھگت اور بیٹری سے تواضع کی۔

"رام لال بھیا تم تھے کہاں؟"

میں کانگریس کے اندولن میں لگ گیا تھا۔ مہاتما گاندھی جی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹا کیا تم جیل نہیں جاؤ گے۔ میں نے کہا جاؤں گا کیوں نہیں باپو۔ بس اسی دن بلکہ اسی وقت جیل چلا گیا۔ لیکن وہاں کیا بتلاؤں کس ٹھاٹ سے رہا۔ دونوں وقت دودھ جلیبی کھائی اور جیل کے سرکاری نوکروں پر حکومت جتائی۔"

قربان نے پوچھا۔

"کیوں بھیا تمہاری اتنی خاطر کیوں ہوئی؟"

"سب کو معلوم تھا کہ مہاتما گاندھی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آگیا دی تھی۔ یہ عزت اُنھوں نے اور کسی کو کب دی تھی۔ یہ خبر جیل میں ہر ایک کو پہنچ چکی تھی۔"

"تم پہلے جیل میں پہونچے تھے یا یہ خبر؟"

"بس سمجھ لو ساتھ ساتھ دونوں پہنچے۔"

"تو پھر دونوں میں زبردست دوڑ ہوئی ہوگی۔"

"میں دوڑ ووڑ کیا جانوں۔ بس یہ جانتا ہوں کہ میری آؤ بھگت بہت ہوئی اور سب کی زبان پر یہی تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے کندھے پر گاندھی جی نے ہاتھ رکھ کر آگیا دی تھی۔ مگر ہٹاؤ ان باتوں کو کہو گاؤں کا کیا حال ہے؟"

رام لال کی باتوں میں سب جانتے تھے کہ نمک مرچ خوب ہوتا ہے۔ لیکن دیہات کے لوگوں کو نمک مرچ ملانے پر کوئی خاص اعتراض کبھی نہیں ہوتا تھا بشرطیکہ بات جو کہو مزے کی ہو۔ رام لال کو باتیں چکنانا تو آتی ہی تھیں۔ لگا وہ

اندرولن اور جیل کے قصے سُنانے۔

اس دن کے بعد سے رام لال کی بیٹھک رمضان کے دوارے ہونے لگی۔ یہاں وہ ہر روز آتا اور اندرولن اور جیل کے قصے سناتا۔ کچھ دنوں کے بعد جب رمضان کے یہاں میلاد شریف ہوا تو رام لال نے بے حد کام کیا بَلیاں گڑوائیں میدان صاف کیا جازمین لا لاکر بچھائیں اور پھر جب میلاد ہو چکا تو جازموں کو اُٹھا کر اور جھاڑ کر جہاں سے لایا تھا وہاں پہونچا بھی آیا۔ میلاد شریف بھی اس نے بیٹھ کر بہت ادب سے سُنا اس طرح رام لال رمضان کے گھر کا دوست بن گیا۔

(۴)

جیل کی زندگی اب بے کیف ہو گئی تھی۔ سیاسی بحثیں بدمزگی سے شروع ہوتیں اور چڑچڑے پن پر ختم ہوتیں۔ لوگ اپنے گھروں اور بیوی بچوں کو یاد کرنے لگے تھے اور دوسروں سے ان کے بارے میں باتیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جس سے بھی وہ اپنے گھر کا تذکرہ چھیڑتے وہ خود اپنے گھر کی رام کہانی لے کر بیٹھ جاتا۔ اس طرح کہنے والے کی زبان بند ہو جاتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خاموش رہ کر اپنے گھروں کے بارے میں ساری باتیں اپنے

ولوں سے کم کرنے لگے۔ اب ان کے ہونٹ خاموش رہتے تھے۔ اس طرح جیل کے مجھے تنہائی کا شکار ہو گئے۔

راحت اپنے دل سے پوچھتا کیا جیل کی مصیبتوں اور تنہائیوں سے تھک گیا ہے جو خاموش رہتا ہے؟ یا ڈر ہے کہ گاندھی جی نے کہا ہے کہ فدم نہیں اُبھرتی ہے جس میں برداشت کی طاقت ہو۔ راحت تم کتنا برداشت کر سکتے ہو۔ بتلاؤ؟ راحت کو موجودہ زندگی سے ذرا اکتاہٹ تو ضرور محسوس ہو رہی تھی، لیکن وہ ابھی ایسا تھکا نہیں تھا کہ آگے چلنے کی ہمت باقی نہ رہی ہو۔

یہ جیل چار مہینے سے لبالب بھرا ہوا تھا اس لئے کوئی نیا قیدی یہاں نہیں بھیجا گیا اور نئے قیدی کے نہ آنے کی وجہ سے کسی کو پتہ نہ چلا کہ تحریک کس رفتار سے چل رہی ہے اور گاندھی جی جیل پہونچ گئے ہیں یا ابھی باہر ہیں۔

ایک دن راحت نے اچانک دیکھا کہ جیل کے پھاٹک کی طرف سے خان بہادر صاحب مشتاق احمد چلے آ رہے ہیں۔

"ارے آپ! کب گرفتار ہوئے؟"

"ایک ہفتہ ہوا۔"

"حکومت کا کیا حال ہے؟"

آج ہی کل میں وہ جھک جائے گی۔ عدالتوں کا تو ایسا بائی کاٹ ہوا ہے کہ وہاں اُلّو بول رہا ہے۔ علی گڑھ کالج اور بنارس ہندو کالج توڑ دیئے گئے اور ان کی جگہ دو قومی کالج کھل گئے۔ دونوں میں ہزاروں

ہندو اور مسلمان طالب علم داخل ہو گئے ہیں!

پھر اس کے بعد فوراً ہی خان بہادر نے کہا۔

"آپ کے گھر میں سب خیریت ہے۔ ہر شخص کی یہی کوشش ہے کہ وہ آپ کے خاندان کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل کرے!"

مشتاق احمد کے آنے سے سیاسی قیدیوں میں خاصی چہل پہل ہو گئی کیونکہ ایسی اچھی خبریں جو معلوم ہوئیں تو سب کی امیدیں تازہ ہو گئیں۔

"دیکھو میں جو کہتا تھا کہ عدم تشدد حکومت کا زور توڑ دے گا وہی ہوا نا۔"

"ابھی کہاں ہوا؟"

"ارے ہوا نہیں تو ہوا ہی چاہتا ہے!"

"تب ہی تو میں کہتا تھا کہ جیل والوں کا رویہ کیوں بدلا ہوا ہے۔ وہ دل میں سمجھ رہے ہیں کہ جو لوگ آج ان کے قیدی ہیں وہ کل حکمراں بننے والے ہیں۔"

"ہم لوگوں کو ایسے کورده مقام پر ڈالا گیا ہے کہ تازی خبروں کو ترس گئے۔"

دوسرے دن جیل میں مولانا عبدالقدوس آ گئے۔

"مولانا آپ کا کیا یہاں تبادلہ ہو گیا ہے؟"

"نہیں میں پرسوں رہا ہو گیا تھا۔ کل پھر پکڑ لیا گیا۔"

"کیا آپ سے پھر کوئی ایسی بات ہوئی تھی؟"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ مہاتما جی نے جوں ہی تحریک واپس لینے کا اعلان کیا تو اس پر ضلع بھر کے وہ سب لیڈر جو آزاد تھے پکڑ لئے گئے۔"

"تحریک واپس!!"

یہ آواز قیدیوں میں ایک سرے سے اُٹھی اور دوسرے سرے تک چلی گئی۔ سب آوازیں مل کر ایک طویل چیخ بن گئیں۔

"ہاں - چورا چوری کے موقع پر مہاتما جی نے کہا کہ ہندوستان ابھی عدم تشدد کے لئے تیار نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ہمالیائی غلطی کی جو ایسے ناتیار ہندوستان کو عدم تشدد میں جھونک دیا۔"

"تحریک واپس لے لی!!!"

"ایسی تیسی اس عدم تشدد کی۔"

"یہ مہاتما!!"

"ہندو مہاتما لے جا اپنا عدم تشدد! اسی پر تو میں کہتا تھا کہ آزادی اگر مل سکتی ہے تو........"

"ٹھہرو پوری بات تو سننے دو۔ چورا چوری میں کیا ہوا تھا۔" خان بہادر نے کراہ کر پوچھا۔

"گورکھپور کے پاس ایک چھوٹی سی جگہ ہے جسے چورا چوری کہتے ہیں وہاں کانگرس کے حمایتی ایسے جوش میں آ گئے کہ انھوں نے ایک تھانہ کو جلا ڈالا اور وہاں کے تھانہ دار کو مار ڈالا۔ اس پر گاندھی جی نے فیصلہ کر لیا

کہ ملک عدم تشدّد کے لئے تیار نہیں ہے۔

" بس اتنی سی بات !"

جی ہاں اتنی سی بات۔"

" اس پر تحریک واپس لے لی مہاتما نے ؟"

" ہاں تحریک واپس لے لی مہاتما نے اسی بات پر !"

خان بہادر نے جھلا کر کہا۔

" بنیا چلا تھا حکومت سے لڑنے !"

اب تو قیدیوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو گاندھی جی کو گالیاں نہ دے رہا ہو۔ سب سے زیادہ بپھرے ہوئے تھے خان بہادر !

" ہم لوگوں نے اپنی زندگیاں اسی لئے برباد کی تھیں کہ اس طرح کے عدم تشدد کے لئے !!"

" کیا کبھی ایسی ستیہ گرہ بھی ہو سکتی ہے کہ چالیس کروڑ انسانوں میں سے ایک کا بھی بال بیکا نہ ہو ؟"

" کیا یہ بھی ممکن ہے کہ دشمن سے کسی شخص کو بھی بالکل کسی طرح کی بھی نفرت نہ ہو ؟"

راحت کا بھی عدم تشدّد پر رہا سہا عقیدہ ختم ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انگریزوں اور اس کے حمایتوں سے جنگ بھی کرو ساتھ ساتھ ان سے نفرت نہ کرو۔ یہاں تک کہ خیال میں بھی ان کے ساتھ تشدّد نہ برتو۔ ایسا نہ ہونا ناممکن ہے۔

خان بہادر نے مسلمان قیدیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"بھائیو۔ اگر آزادی لے سکتا ہے تو مسلمان ہی لے سکتا ہے۔ ان جیو رکھشا کرنے والے بنیوں اور ہندوؤں سے یہ ممکن نہیں۔ آزادی کے لئے خون بہانا ہوگا اپنا بھی اور دشمن کا بھی۔ اور خون بہا سکتا ہے تو کون؟ ہم مسلمان!

جو کہ تیغوں کے سایے میں پل کر جواں ہوئے ہیں۔"

اب تو ہندوستان کے مسئلے کا حل یہی ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تلوار دے دو۔"

"صرف مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں کیوں؟ کیا راجپوت مسلمانوں کے دوش بدوش نہیں لڑ سکتے ہیں؟"

"اب تو دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی دہشت پسند جنگجو خفیہ پارٹیاں بننا چاہیئے۔"

جیل میں ہر سیاسی قیدی بے چین تھا۔ آدھے سے زیادہ قیدی یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھوں نے کانگرس یا خلافت کا ساتھ دے کر حماقت کی۔ باقی آدھے یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان سے غلطی ضرور ہوئی ہے لیکن یہ نہیں کہ انھوں نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ بلکہ یہ کہ انھوں نے گاندھی کے ایسے لیڈر کی قیادت قبول کی جیل والوں کا بھی رنگ بدل گیا تھا۔ وہ اب ان سیاسی قیدیوں کو جو گاندھی کی سیاست سے بیزار تھے یا پوری طرح کانگرس سے غیر مطمئن تھے ان کو یہ موقع دیدیتے تھے

کر وہ آپس میں ملیں اور تبادلۂ خیالات کریں۔

راحت جب خان بہادر صاحب سے باتیں کرتا تو ان کے خیالات کی طرف جھک جاتا۔ لیکن جب تنہائی میں آتا تو دل میں کسی جگہ سے آواز اٹھتی کہ خان بہادر کی باتوں میں کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہے۔

بحثوں میں لوٹا، لٹیا، پیجامہ، اور دھوتی، اُردو اور ہندی کی بحثیں پھر ابھر آئیں۔ لیکن ابھی تک اُن میں تلخی نہیں آئی تھی۔ ہنسی ہنسی میں زہر بھرے فقرے کسے جاتے تھے لیکن وہ ہنسی ہی میں اُڑا دیئے جاتے تھے ان میں تلخی اس دن آئی جب باہر سے یہ خبر آئی کہ مصطفےٰ کمال نے قسطنطنیہ فتح کر لیا ہے۔ اس دن جیل کے سب مسلمان خوشی سے بے حال ہو گئے اور ہندؤں سے کہنے لگے کہ ملک اسی طرح فتح کئے جاتے ہیں اور آزادی کے لئے اس طرح خون بہایا جاتا ہے۔ بھلا بنیوں کے عدم تشدد سے کبھی کچھ ملا ہے جو آج ملے گا؟

گاندھی جی کی تحریک کامیابیوں کے دوش پر سفر کر کے ناکامی کی منزل تک پہنچی تھی، اور مصطفےٰ کمال کی تحریک ناکامیوں کی آغوش میں پل کر کامیابی تک پہنچی تھی۔ یہ دونوں چیزیں رات اور دن کی طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے جو آئیں تو راحت کا بھی عقیدہ عدم تشدد پر سے ڈانواڈول ہونے لگا وہ سوچنے لگا کہ دشمنوں کے ڈنڈے اور جوتے کھانے میں کیا دھرا ہے۔ کہیں مسلح فوجیں عدم تشدد کے ذریعہ میدان سے ہٹائی جا سکتی ہیں؟ اگر مصطفےٰ کمال کی جگہ گاندھی جی

ہوتے تو کیا وہ قسطنطنیہ فتح کر لیتے ؟

مصطفےٰ کمال کی کامیابی جوں جوں گونجنے لگی ہندو قیدیوں کی باتوں میں تلخی آنے لگی۔ کیوں کہ ان کو یقین آنے لگا کہ اگر ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو اس بات کا کافی امکان ہے کہ ہندوستان کے مسلمان امیر افغانستان اور مصطفےٰ کمال سے ساز باز کر کے ہندوستان پر اپنا راج قائم کر لیں۔ کیوں کہ یہ عدم تشدد کو ذرا بھی نہیں مانتے ہیں۔ ہندو بچارے عدم تشدد میں الجھے رہیں گے اور مسلمان ان کو غلام بنا لیں گے۔

اب ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے زہر بھرے مگر خوبصورت فقروں کا جواب تلخ اور بھونڈے فقروں اور تقریروں سے ملنے لگا۔

" یہ لٹیا بھی خوب گول گول چیز ہے۔ دھار تو اس سے نکلتی ہی نہیں سکتی۔ بس بھل سے پانی نکل پڑتا ہے۔ اور دیکھو بھائی لٹیا کا کام تو دیکھو۔ ذرا سا پانی اس میں آتا ہے۔ جو ایک ہی دفعہ میں بہہ جاتا ہے۔ اس پانی سے اور اتنی بڑی صفائی کا کام !"

"مگر لوٹے کی ٹونٹی سے تو سب کچھ اچھا ہے۔ ٹونٹی تو وہ چیز ہے جو کبھی دھل ہی نہیں سکتی ۔"

" نہ دھل سکے ۔ لیکن اس سے جو چیز بھی دھوؤ وہ تو صاف ہو جاتی ہے اور خوب صاف ہو جاتی ہے ۔"

" یہ دھوتی بھی کیا چیز ہے ذرا پاؤں ہلاؤ اور سب کچھ سامنے آجائے ۔"

" تہمد میں پاؤں ہلانے کی بھی ضرورت نہیں بس ذرا سی جنبش کافی ہے ۔"

"بھئی یہ ہندی بھی خوب زبان ہے۔ ایسے ایسے الفاظ سُننے میں آتے ہیں جو ڈکشنری میں کہیں نہ ملیں۔"

"اور یہ اُردو بھی خوب ہے۔ تشریف لایئے۔ تشریف لے جایئے۔ تشریف رکھیئے۔ اس میں ہر شخص کے پاس اس کی تشریف بھی ہوتی ہے اور لانا، جانا، رکھنا، اُٹھانا سب اسی بیچاری تشریف پر گزرتا ہے۔"

اور سُنو:۔ دوستو تم بھی ہندی کے مخالف نہ بنو
بعد مرنے کے کھُلے گا کہ یہ کتنی کام کی بات
بس کہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات"

راحت نے جب استعفا دیا تھا تو اس کے سامنے پہلا مسئلہ تھا ہندوستان کی غریبی اور دوسرا مسئلہ تھا ملک کی آزادی۔ لیکن اب جیل کی زندگی کی اُلٹ پلٹ نے درجنوں مسئلے اس کے سامنے لاکر کھڑے کر دیئے اور ساتھ ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ لاکر کھڑا کر دیا کہ میں نے کپتانی سے استعفا دے کر حماقت تو نہیں کی ہے؟ میں نے جن لیڈروں پر بھروسہ کیا ہے کیا وہ واقعی اس قابل ہیں؟ اور یہ کہ ہم لوگوں نے چھ مہینے اور سال کے اندر اندر آزادی مل جانے والا خواب جو دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر اب کیا ہوگی۔ چھ مہینے اور سال بھر کی جگہ دس بیس سال آجائیں گے یا صدیاں!

راحت کی یہ سب پریشانیاں ہزار گنی بڑھ گئیں جب اس نے سنا

کہ کانگرس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ پنڈت موتی لال اب حکومت سے کوآپریشن کر رہے ہیں اور الکشن میں مع اپنی پارٹی کے حصہ لے رہے ہیں۔ اور گاندھی جی کھدر کے کاموں میں لگ گئے ہیں۔

کھدر کے کام؟ روایت کے سوت جی اوربان کے ناکام تجربے یاد آ گئے۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جیل سے نکل کر کیا کروں گا اور کہاں جاؤں گا؟

(۵)

ایک دن راحت کو ایک خفیہ ذریعہ سے سلیمہ کا خط ملا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ راحت کے جیل خانے کے چھ ماہ کے بعد اس کا ایک خوبصورت اور تندرست بچہ پیدا ہوا تھا جو اب سال بھر کا ہو گیا ہے اور خوب تماشے کرتا ہے۔ فریدہ اور مقصود اچھے ہیں اور اپنے باپ کو

ہر وقت یاد کرتے ہیں باقی سب خیریت ہے۔

یہ خط پاکر راحت کو جیل کی پابندیوں کا بہت زبردست احساس ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ان آنسوؤں کو چھپانے کے لئے فوراً جانماز پر بیٹھ کر سجدہ میں گر گیا۔

راحت کا دل کہہ رہا تھا کہ کاش کوئی اس کو اتنا یقین دلا دیتا کہ وہ حق پر ہے اور اس کا استعفا دینا اور جیل آنا۔ یہ سب ملک اور اسلام کے لئے مفید ہے۔ لیکن وہاں کون تھا جو یہ یقین دلاتا۔ اس وقت تو ہر شخص کے دل میں شکوک تھے۔ کم سے کم اتنا مضبوط یقین جو دوسروں کو بھی تسکین دے دے کسی کے بھی پاس نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بڑے لیڈروں کے پاس ہو لیکن اس جیل میں بڑا لیڈر ایک بھی نہ تھا۔

سلیمہ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ " باقی سب خیریت ہے " لیکن جب اس کے ہاتھ سے یہ جملہ نکلا ہے تو اس نے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے تھے۔ خیریت کہاں چھوٹا بچہ جو بہت تماشہ کرتا ہے بخار میں پھنک رہا تھا اور چوبیس گھنٹے سے چولھا نہیں جلا تھا کیوں کہ پاؤ بھر آٹا تو ان لوگوں کے پاس ضرور تھا لیکن ایندھن تولہ بھر بھی نہ تھا۔

بارش کا زمانہ تھا تیز بارش ہوتی تھی اور ہوا کے جھکڑ چلتے تھے یہ سارا خاندان ایک ایسے دالان میں گزر کرتا تھا جہاں بوچھار کو روکنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ نہ دروازے اور نہ پردے۔ اس وجہ سے جب بارش تیز ہوتی تھی تو دالان کے اندر بوچھار آتی تھی۔ اگر رات ہوتی تھی

تو سلیمہ بستر سمیت کر بچوں کو لے کر ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اور یہ سب اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک کہ بوچھار کا زور کم ہو جاتا۔

چھوٹا بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا اور راحت کو گئے صرف پانچ ہی مہینے گزرے تھے کہ لالہ جی نے جنھوں نے خود ہی کہا تھا کہ وہ اپنے مکان کا کرایہ نہیں لیں گے ڈیوڑھی پر آ کر ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "دیوی جی! آپ چھوٹے مکان میں کچھ دنوں کے لئے چلی جائیں اور اس مکان کو بالکل خالی کر دیں تاکہ میں برسات سے پہلے اس گھر کی مرمت کرا دوں۔"

سلیمہ نے کہا "مگر اس چھوٹے گھر میں یہ میزیں صوفہ سیٹ اور الماریاں کیسے جائیں گی؟"

"یہ چلی جائیں چلی جائیں جو نہ جا سکیں ان کو میں ایک کوٹھریا میں بند کر دوں گا۔"

"یہ مرمت کیسی ہے جس کے لئے پورا مکان خالی کرایا جائے؟" یہ بات سلیمہ کے منہ پر آ کر رہ گئی وہ کہتی کیسے جب کہ مکان کا کرایہ نہیں دے رہی تھی۔

چھوٹا مکان جس میں یہ لوگ اٹھ کر آئے تھے وہ چھوٹا مکان نہیں تھا۔ بلکہ بڑے مکان کا شاگرد پیشہ یا سرونٹس کوارٹر تھا۔ جس میں صرف ایک دالان تھا اسی میں کھانا بھی پکتا تھا اور اسی میں ایک طرف پلنگ کھڑا کر کے غسل خانہ بھی بنا لیا جاتا تھا۔

اسی گھر میں خوبصورت بچہ نونہال پیدا ہوا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ ایک طرف پردے کے اندر سلیمہ اور دائی تھی اور دوسری طرف فریدہ اور مقصود۔

نونہال کی پیدائش کے تیسرے دن ایک زبردست حادثہ ہوا وہ یہ کہ سلیمہ کے پاس جو تھوڑے سے زیور تھے وہ ایک صندوقچی میں رکھے رہتے تھے۔ وہ صندوقچی چوری ہو گئی۔ سلیمہ جب چھوٹے گھر میں آئی تو اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ زیوروں کی صندوقچی کہاں رکھے۔ بہت سوچ کر اس نے یہ کیا کہ اپنے سرہانے رکھ لی۔ دن کو بستر تہہ ہو جاتا تھا تو اس سے وہ چھپا دی جاتی تھی اور رات کو تکیوں سے چھپا دی جاتی تھی۔

جب نونہال پیدا ہونے لگا تو صندوقچہ اٹھا کر الگ رکھ دیا گیا وہاں وہ دو دن رکھا رہا اور تیسری رات کو غائب ہو گیا۔ سلیمہ کو جیسے ہی یہ احساس ہوا کہ صندوقچہ غائب ہو گیا ہے اس نے لالہ جی کو خبر کی۔ لالہ جی خود تو نہ آئے مگر انھوں نے پولیس کو خبر کر دی۔ شام کے قریب دو کانسٹیبلوں نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"تم کون ہو"؟ تمہارے شوہر کیا کرتے ہیں؟ وہ سزا پا گئے ہیں تو تم کیا پیشہ کرتی ہو؟ آمدنی کہاں سے ہوتی ہے؟ کوئی گواہ ہے کہ تمہارے پاس اتنے زیور تھے۔ اگر تھے تو تم اتنے چھوٹے سے گھر میں کیوں رہیں۔ یہ لڑکا تمہارے شوہر کے جیل جانے کے کتنے دنوں بعد ہوا ہے؟ کچھ مہینے؟ سچی بات ہے؟ حساب لگایا جائے تو سال بھر تو نہ نکلے گا؟

سلیمہ غصہ اور غم سے نیلی پیلی ہو گئی اور کانسٹیبلوں کے جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اللہ اللہ یہ کانسٹیبل جو اردلی کی طرح دوڑ دوڑ میرے گھر کا کام کیا کرتے تھے اب ایسی باتیں کریں اور ایسے

سوالات کریں!!

سلیمہ اس حادثے سے ایسی گھبرائی کہ اس نے پہلی بار چچا جان اور ان کے صاحبزادے کو خط لکھا اور کہا کہ میری خبر لو۔

چچا جان ہجرت کر کے افغانستان گئے تھے اور پھر چھ سات ہی ہفتے وہاں رہ کر واپس آگئے تھے۔ ان کے واپس آنے کے اور راحت کے جیل جانے کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے صاحبزادے کی طرف سے جو چچا جان کے جانے کے بعد جائداد پر قابض ہو گئے تھے۔ راحت کو ایک عدالتی سمن ملا کہ تم محجوب ہو اس لئے جائداد کے حق دار نہیں ہو اگر یہ بات منظور نہ ہو تو عدالت میں حاضر ہو کر عذر کرو۔ کمال یہ کیا راحت کے چچا زاد بھائی نے کہ یہ سمن کسی طرح جیل کے اندر پہنچوا دیا۔ راحت نے سمن پہ لکھ دیا کہ میں انگریزی عدالت کا بائی کاٹ کر چکا ہوں۔ اس جواب پر عدالت نے راحت کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ سلیمہ کو اس بات کی خبر ہو گئی تھی اس لئے اس نے بھی اب تک ان لوگوں کو کوئی خط نہیں لکھا تھا۔

جب چچا جان اور ان کے صاحبزادے نے سلیمہ کے خط کا جواب نہیں دیا تو فریدہ نے دو خط لکھے۔ ان لوگوں نے اس کے خطوں کا بھی جواب نہیں دیا۔ حد یہ ہو گئی کہ راحت کے چچا اور چچا زاد بھائی جواب خلافت چھوڑ کر تبلیغ اور تنظیم میں لگ گئے تھے۔ سوچ پور آئے اور وہاں چار دن ٹھہرے لیکن دو منٹ کے لئے بھی سلیمہ کے گھر نہیں آئے۔ سلیمہ نے مقصود کے ہاتھ ان کو سلام کہلوایا تو انھوں نے جواب دیا۔

"وعلیکم السلام"

سلیمہ کے پاس کچھ نقد روپیہ تھا وہ چل رہا تھا۔ لیکن اب وہ بھی ختم پر آگیا تھا اور وہ بہت متفکر تھی کہ اس کے ختم ہونے کے بعد کیا کروں گی۔

ان لوگوں کا کھانا اب دال چاول، کھچڑی اور چٹنی روٹی تک آگیا تھا۔ ان سب کے کھدر کے کپڑے بھی اتنے گل گئے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی ان کو پہن کر اگر ذرا بے احتیاطی سے بیٹھ جاتا تھا تو کرتے یا پائجامہ میں سے کوئی نہ کوئی ضرور مسک جاتا تھا اور اس کو رفو کرنا پڑتا اس وجہ سے چھوٹا مقصود تک اٹھنے بیٹھنے میں کپڑوں کا خیال رکھتا تھا۔

لیکن ان لوگوں کو نہ گھر کا دکھ تھا نہ کھانے کا اور نہ کپڑوں کا یہ لوگ ان مصیبتوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے کہ یہ چند دنوں کی بات ہے۔ ادھر راحت جیل سے چھوٹا اور ادھر پرانے دن واپس آجائیں گے۔ البتہ جس دن سلیمہ نے فریدہ سے کہا کہ "بی بی اب میرے پاس تیری فیس کے پیسے نہیں ہیں اس لئے اسکول سے اپنا نام کٹالے۔"

اسی دن سلیمہ کو احساس ہوا کہ بُرے دن کافی طویل ہیں۔ یہی احساس فریدہ کو بھی ہوا اور مقصود کو بھی۔ چناں چہ اسی دن سے مقصود نے، جو ہر روز ایک پیسہ ضرور لے لیتا تھا پیسہ مانگنا کم کر دیا۔

کچھ دنوں کام چلانے کی راہ سلیمہ نے یہ نکالی کہ طے کر لیا کہ میں اپنا فرنیچر بیچ ڈالوں۔

اس کو اس بات کی بڑی کوفت تھی کہ بڑے مکان میں لالہ جی نے جو کرایے دار
رکھے تھے وہ میرا فرنیچر اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا کہ وہ ان ہی کا ہے
اور ایسا پرانا اور بے کار ہے کہ جس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔
جیسے چاہو استعمال کرو۔ ان لوگوں کے بچے صوفہ سیٹ پر بیٹھ کر کھانا
کھاتے تھے اور دال اور سالن اس پر خوب گراتے تھے چھوٹے بچے
اس پر بٹھا دیئے جاتے تھے اور جب وہ پیشاب کر دیتے تھے تو اوپر سے
پانی بہا دیا جاتا تھا۔ مرغ صوفہ سیٹ کی پیٹھ پر آکر بانگ دیا کرتا تھا
اور کبوتر بیٹ کیا کرتے تھے۔

سلیمہ نے دو ایک مرتبہ وہاں جا کر بہت مہذب طریقہ سے درخواست
کی کہ ذرا فرنیچر کا خیال رکھا جائے تو سب نے یہی کہا کہ
"خیال تو بہت رکھا جاتا ہے لیکن جب گھر میں ہے تو استعمال بھی
ہوگا۔ اور جب یہ گھر بچے والا گھر ہے تو بچے بھی استعمال کریں گے۔"
بچے گیند تھاپی کے بھی شوقین تھے وہ وکٹ کی جگہ ڈرائنگ روم
کی میز کو استعمال کرتے تھے اور کھیلنے کے بعد اسے اٹھانا بھول جاتے تھے
اس طرح یہ میز دھوپ اور بارش کا مزا لوٹتی رہتی تھی۔

فرنیچر بیچوں تو کیسے بیچوں؟ یہ بات سلیمہ کی سمجھ میں نہیں آئی اس
کے فروخت کے لئے سلیمہ نے جب بھی لالہ جی سے کہلوایا انھوں نے ہمیشہ
گول گول جواب دیا۔

ایک دن موہن جی کو مقصود کہیں مل گیا اور کسی سلسلہ میں موہن نے

پوچھا کہ تم کون ہو جب اس نے راحت کا نام لیا تو موہن جی نے مقصود کے گھر والوں کی خیریت پوچھی ۔ جب مقصود نے سلیمہ کو یہ بات بتلائی تو سلیمہ نے فریدہ اور مقصود کو بھیج کر موہن جی سے یہ درخواست کی کہ کھڑے کھڑے ذرا آجائیے ۔

موہن جی اسی وقت آ گئے ۔ موہن جی کو راحت نے ایسے نازک وقت پر امداد دلوائی تھی کہ اس کی یاد موہن جی کے دل سے کبھی نہ نکل سکتی تھی ۔ آج کل وہ بھی بہت پریشان معلوم ہوتے تھے ۔ ان کے کھدر کے کرتے اور دھوتی میں پیوند لگے تھے اور چپل اتنا پرانا تھا کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اصل میں لال تھا یا کالا ۔

موہن جی کو ہمدرد پا کر سلیمہ نے اپنی کچھ تکلیفیں بتلائیں اور کہا کہ "میں چاہتی ہوں کہ اونے پونے جن داموں ممکن ہو یہ فرنیچر بک جائے تاکہ لالہ جی کو اس چھوٹے گھر کا کچھ نہ کچھ کرایہ ضرور دیدوں ۔"

موہن آبدیدہ ہو کر بولے ۔

راحت صاحب جیل میں ہیں اور آپ کی یہ پریشانیاں ہیں ! افسوس میرے گھر کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں ہے ـــــ جی چاہتا ہے کہ میں کچھ خدمت کرتا ۔ مگر کیا کہوں ۔ خیر ۔ شاید آپ کا یہ کام میں کرا دوں ۔

موہن جی نے خریداروں کو فرنیچر لا کر دکھلانا شروع کیا لیکن جو خریدار بھی آتا بڑے گھر کے کرایہ دار اس کو بھڑکا کر بھگا دیتے ۔ آخر ایک نیلامی کی مدد سے موہن جی نے فرنیچر نیلام کرا دیا ۔ اور اس طرح اس سے کچھ

معقول رقم مل گئی۔ اس سے سلیمہ نے اپنے اور بچّوں کے چند جوڑے کپڑے بنا لئے اور لالہ جی کو دو روپیہ مہینے کے حساب سے چھوٹے گھر کا کرایہ بھجوا دیا۔ لالہ جی کرایہ پاکر بہت خوش ہوئے اور سب رقم بلا کسی تکلف کے رکھ لی۔ البتہ اپنی مہربانی کا اظہار یہ کہہ کر کر دیا "کہ جب بھی پہلی تاریخ کو کرایہ آجائے گا تو میں دو روپیہ کی جگہ صرف ایک روپیہ چودہ آنے لیا کروں گا۔ اپنے منیم کو بھی ہدایت کر دوں گا کہ اگر میں نہ ہوں اور اس کے پاس کرایہ آئے تو وہ بھی اتنی چھوٹ دے دے۔"

سلیمہ کی اگر کسی نے خبر لی تو وہ اس کا بھائی مکرم تھا جو آنریری مجسٹریٹ تھا اور امن سبھا کا صدر تھا اور امید رکھتا تھا کہ اسی سال اس کو کوئی بڑا سا خطاب مل جائے گا۔ مکرم نے بہن کو نہ روپیہ بھیجا اور نہ ہمدردی کے دو لفظ۔ اس کو سیدھی زبان میں یہ لکھا کہ تم راحت کو لکھو کہ وہ تم کو طلاق دے دے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو تم اخبار میں اعلان کر دو کہ تم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی ہو۔ ایسا کرنا تمہارا فرض ہے۔ رہی تمہاری اور بچّوں کی خبر گیری سو اسے مجھ پر چھوڑ دو۔

سلیمہ کو مکرم سے کبھی کوئی امید نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے بہت خود غرض تھا۔ لیکن سلیمہ کو یہ بھی امید نہ تھی کہ وہ ایسے نازک وقتوں میں اس طرح زخموں پر نمک چھڑکے گا۔ سلیمہ نے مکرم کے پیامبر سے کہا کہ۔

"میرے شوہر نے جو کچھ کیا ہے اس پر مجھے بھی فخر ہے اور بچوں کو بھی رہی ہم لوگوں کی پریشانیاں، سو بھائی سے کہہ دینا کہ حق پسندوں نے کبھی مصیبتوں سے ہار نہیں مانی ہے۔"

سلیمہ موہن جی کا شکریہ ادا کرنے ایک دن برقعہ اوڑھ کر موہن جی کے گھر چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ موہن جی ان کی جوان لڑکیاں دو چھوٹے لڑکے اور بیوی یہ سب میلے کپڑے پہنے دالان میں بڑھئی کا کام کر رہے ہیں۔

موہن جی نے بلا کسی تکلف کے سلیمہ کو اسی طرح برقعہ میں ایک طرف بٹھا کر کہا۔

"آج کل میں چرخوں سے بچوں کی گاڑیاں بنا رہا ہوں۔"

"سلیمہ "جی؟"

"آپ نہیں سمجھیں! ہمیں نے دو ہزار چرخے خریدے تھے اور ان کو دیہاتوں میں تقسیم کرا دیا تھا اور وہاں روئی بھجواتا تھا جو کافی باقی تھی لیکن یہ سب کام ٹھپ ہو گیا۔ کام کے ٹھپ ہونے پر سات سو چرخے رہ گئے اور من ڈیڑھ من سوت جس میں موٹا مہین سب ہی طرح کا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی ذاتی رقم بھی اس کام میں لگا دی تھی۔ اس لئے کام کے ٹھپ ہو جانے سے ہم لوگوں کا دیوالہ نکل گیا اور روزانہ کا خرچ چلانا مشکل ہو گیا۔ میں نے چرخوں اور سوت کو بیچنے کی ہر طرح کی کوشش کر ڈالی لیکن کوئی شخص کوڑیوں کے مول بھی چرخا خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ چرخے میرے یہاں ایندھن کا کام دینے لگے آخر سوچتے سوچتے بھگوان کی کرپا سے ایک دن مجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ میں ایک جگہ سے آری اور بسولا وغیرہ مانگ لایا اور دو چرخوں سے کسی طرح بچوں کے کام کی ایک گاڑی بنا لی بازار لے گیا تو وہ دو روپیہ کی بک گئی۔ تب سے ہم سب گھر بھر مل کر یہی کام کرنے لگے اور اسی طرح روزانہ ایک رقم کما لیتے ہیں۔

سلیمہ حیرت سے موہن جی اور ان کی پتنی کستوری بائی اور لڑکیوں کو دیکھنے لگی اور یہ دیکھنے لگی کہ یہ لوگ کس طرح خوشی خوشی مل کر یہ کام کر رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا ہم لوگ ایسا کام نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن خود سلیمہ بہت کمزور تھی اور گود میں بچہ تھا فریدہ بھی کمزور تھی اور چھوٹی تھی مقصود کمزور تھا اور بچہ تھا۔ اس لئے سلیمہ نے طے کیا کہ بڑھئی کا کام ہم لوگوں کے بس کا نہیں۔

"موہن بھیا ایسا ہی کوئی کام مجھے بھی نکالنا پڑے گا۔ میرے پاس سلائی کی مشین رہ گئی ہے۔"

"آپ لوگوں کا موٹر کیا ہوا؟"

"وہ تو سرکار نے ان پر جو جرمانہ لگایا تھا اس کے عوض ضبط کر لیا۔"

جب سلیمہ واپس آ رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ میں سلائی تو کروں لیکن گھروں سے کپڑے کیسے لاؤں؟ خیر کوشش کروں گی۔ جو ڈھونڈھ پائے گا۔۔۔۔۔۔ خدا بڑا مسبب الاسباب ہے دیکھو اس نے موہن جی کے گھر لا کر محنت کرنے اور روزی کمانے کی ایک راہ تو سمجھا دی۔

موہن جی نے چرخے کا کام اس عزم سے چلایا کہ مہاتما جی کہتے ہیں کہ اسے چلنا چاہیئے۔ اس لئے میں اسے چلا کر رہوں گا۔ اور کامیابی سے سب امکانوں کا جائزہ لے کر اسے کامیاب بناؤں گا اور اسے ایک بزنس بنا کر دکھا دوں گا۔
موہن جی نے کام شروع تو کیا بہت زور سے لیکن وہ ذرا ہی دور چل کر رک گیا۔ اور چلانے کے لئے رقم کی ضرورت ہوئی۔ پہلے تو موہن جی کو چار چار اور پانچ پانچ ہزار کا گھاٹا بھرنے والے ملتے رہے لیکن جب تحریک ٹھنڈی ہونے لگی تو چار چار، پانچ پانچ ہزار دینے والے چار پانچ روپیہ دینے میں بھی تکلف کرنے لگے اور آخر میں تو چند پیسوں کا ملنا مشکل ہو گیا۔
جب یہ نوبت آ گئی تو موہن جی نے اپنے آپ سے کہا کہ "مہاتما جی فیل ہو گئے۔" پھر انھوں نے کارکنوں میں جا کر اعلان کر دیا کہ چرخے کا کام بند کر دو۔ یہ اعلان کرنے کے بعد وہ گھر آئے اور گم سم بیٹھ گئے۔ کیا سوراج، چرخا، عدم تشدد یہ سب ہوائی قلعے ہیں؟ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر چرخے کا کام چلا کیوں نہیں؟ میری ساری کوشش بیکار کیوں گئی؟ موہن جی کے سامنے وہ ٹھوس اسباب تھے جن کی وجہ سے چرخے کی تحریک ناکام ہوئی تھی اور ان کی بنا پر ان کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ تحریک اس طرح چل ہی نہیں سکتی ہے جس طرح مہاتما جی چاہتے ہیں۔ یعنی یوں کہ گھر گھر چرخا چلے اور اسی سے ملک بھر کا کپڑا پیدا ہو ـــــ جب یہ ممکن نہیں ہے تو پھر کیا مہاتما جی کے سب نظریے ایسے ہی ہیں؟۔
موہن جی پر ایک دن اور ایک رات گزر گئے کہ انھوں نے نہ کسی سے کوئی

بات کہی اور نہ کسی بات کا جواب دیا۔ کھانا سامنے آگیا تو دو لقمے کھا لئے۔ رات کو ایک منٹ کے لئے بھی آنکھ نہ لگ سکی۔ صبح انھوں نے گھر بھر کو اکٹھا کیا اور پھر ان سے کہا کہ "میرا من پر کار پر کار کے شکوک کا شکار ہو رہا ہے اس لئے شانتی ڈھونڈنے کے لئے میں ایک ہفتے کا اپاس رکھوں گا جس میں روزانہ دو نیبو اور پانی کے سوا اور کچھ نہیں استعمال کروں گا۔"

موہن جی کی ابھی تک ان کے بیوی بچّوں کی نظروں میں بڑی عزت تھی سب نے ان کے اس فیصلے کو بہت احترام سے سنا۔ البتہ ان کی بیوی اور بڑی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو آگئے موہن جی نے اسی دن گاندھی جی کی طرح صبح کی پرارتھنا سب کے ساتھ کی اور پھر اسی طرح سندھیا بھی کی۔ دن بھر موہن جی گاندھی جی کی سوانح حیات پڑھتے رہے اور سوچتے رہے۔

تیسرے دن موہن جی بہت کمزور ہو گئے لیکن اس پر بھی وہ اس پر تیار نہیں ہوئے کہ ڈاکٹر کو بلایا جائے۔

"بھگوان یا تو میرے من کو شانتی اور روشنی دے یا پھر مجھے اٹھالے"۔

تیسرے اور چوتھے دن کی درمیانی رات بہت سخت گزری۔ لیکن موہن جی یہی کہتے رہے کہ یہ فیصلہ بھگوان کو کرنا ہے کہ زندہ رہوں یا نہ رہوں۔ اگر مجھے خود فیصلہ کرنا ہوتا تو ڈاکٹر کو ضرور بلاتا۔"

صبح کو موہن جی کی آنکھ لگ گئی پھر جو جاگے تو حالت اچھی تھی

انھوں نے اٹھ کر اشنان کیا اور پرارتھنا کی پھر اس دن کے بعد سے اگرچہ کمزوری بڑھتی گئی لیکن بے چینی اور تکلیف سے نجات رہی۔

آٹھویں دن صبح کو موہن جی بے حد کمزور تھے لیکن مسکرا رہے تھے مسکرا کر انھوں نے ایک پیالی میں آدھی چائے اور آدھا دودھ ملا کر پیا اور پھر اسی دن رات کو دلیا کھایا۔

نویں دن موہن جی نے بیری بچوں کو اکٹھا کر کے کہا۔

میں گاندھی جی کو اب بھی بہت بڑا لیڈر سمجھتا ہوں اور سچا سمجھتا ہوں ان کے چرخے کی تحریک ضرور ناکام ہوئی لیکن بڑے بڑے سائنٹسٹ جو تھے انھوں نے بھی بار بار غلطیاں کی ہیں۔ غلطیوں کے بعد ہی صحیح چیز ہاتھ آئی ہے۔ میں نے اپنے اسکول میں پاتھ آف پیس پڑھی تھی آج مجھے وہ یاد آ رہی ہے۔ اس میں بڑے بڑے موجدوں اور سائنس دانوں کے حالات ہیں۔ ان حالات کا خلاصہ یہی ہے کہ سینکڑوں ناکامیوں کے بعد جا کر کامیابی سے بھینٹ ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن یہی چرخے کی تحریک کامیاب ہو گی اور میرے ہی ہاتھوں کامیاب ہو گی۔ لیکن اب شروع کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ہو گا کہ اس میں کیا کیا خرابیاں ہیں اور ان کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ابھی میں نہ چرخے کی تحریک پر سوچ سکتا ہوں اور نہ اس کی خرابیاں نکال کر ان کی اصلاح کر سکتا ہوں ابھی تو سب سے بڑا پرشن یہ ہے کہ میں اپنے کٹمبھ کا پیٹ کیسے پالوں؟ کیا پھر سے وکالت شروع کر دوں؟

کیا کسی سیٹھ ساہوکار کی یا کسی وکیل کی خوشامد درآمد کرکے نوکری حاصل کروں؟ میں نے ان سب باتوں پر بہت وچار کیا لیکن اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر تم سب دل سے میری سہایتا کرو تو میں بلا کسی کی خوشامد کئے اپنے اور اپنے کٹمب کے لئے راہ نکال لوں۔"

موہن جی نے سب کی طرف دیکھا۔ بہتی بیٹے اور بیٹیاں سب کے چہروں پر عزم تھا کہ ہم آپ کا پورا ساتھ دیں گے۔

"دیکھو تین سو چرخے میرے گھر میں بکھرے ہوئے ہیں اور اتنے ہی دیہاتوں میں بکھرے ہوئے ہیں اب یہ سب بیکار ہیں۔ کیوں نہ ان سے کچھ چیزیں بنا کر بیچی جائیں۔ میں نے کبھی کبھار آری اور بسولے سے کام لیا ہے اور سمجھتا ہوں کہ اگر پندرہ بیس دن ان سے کام لوں تو میرا ہاتھ خوب رواں ہو جائے گا اب رہا سوال کہ ان چرخوں کی لکڑی سے بن کیا سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ بہت سی چھوٹی موٹی چیزیں بن سکتی ہیں لڑکوں کے لئے گاڑیاں اور کچھ کھیل کی چیزیں صراحی دان ایک گھڑے کی گھڑونچی۔ اس طرح کی چیزیں بنا کر پانچ چھ سو چرخوں میں سے ایک ہزار روپیہ تو نکل ہی آئے گا اگر یہ روپیہ تین مہینہ کے اندر اندر آ گیا تو سات آٹھ سو ضرور بچایا جا سکتا ہے۔ اس رقم سے اور لکڑی آ سکتی ہے اور میں دو ایک اچھے بڑھئی لگا کر کام کو اور آگے بڑھا سکتا ہوں۔ اگر حالات نے ساتھ دیا تو سال دو سال کے اندر ہم لوگوں کی حالت سنبھل جائے گی۔"

"لیکن اصل کامیابی تب ہوگی جب بچوں کی پڑھائی بھی چلے اور صحت بھی

اور سب خوش بھی رہیں اس کے لئے آنگن میں سبزیاں بونا چاہیئے و رزش کرنا چاہیئے اور صبح و شام بھگوان کو یاد کرنا چاہیئے۔"

اس دن سے یہ پروگرام چلنے لگا موہن جی کا گھر ایک طرح کا آشرم بن گیا جہاں دونوں وقت پرارتھنا ہوتی پھر چار گھنٹے ہر شخص جسمانی کام کرتا جس میں ترکاریاں بونا گھر صاف کرنا بھی شامل تھا، اور پھر موہن جی کے ساتھ مل کر چرخے کی لکڑی سے کھلونے بنانا۔

موہن جی خوش تھے۔ اور ان کی خوشی سے ان کی پتنی بھی خوش تھیں لیکن لڑکے اور لڑکیاں تو مارے باندھے اس زندگی میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی تفریح کی کوئی چیز اس زندگی میں نہ تھی۔ بس کام کام کام، اور پرارتھنا۔ پرارتھنا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے !؟

(۶)

"تم چاروں خیریت سے ہو۔"

"ہاں دیکھ لو سب اچھے ہیں۔"

"اچھے تو نہیں نظر آتے ہو۔ تم سب دُبلے اور زرد نظر آتے ہو۔ اور یہ چھوٹا منّا بچہ تو بہت ہی کمزور نظر آتا ہے۔ کیوں میاں تم کیسے ہو؟"

ننھے نونہال نے پہلی مرتبہ راحت کو دیکھا تھا لیکن اس پر بھی اس نے

اپنے اور باپ کے درمیان کھڑی ہوئی لوہے کی سلاخوں پر اپنی منی منی ہتھیلیاں ماریں اور زور سے ہنسا جس سے اس کے آگے کے دونوں دانت نکل آئے۔ ہنس کر وہ زور سے بولا۔ "غوں اوں کاں غاؤں بی۔"

اس کی ہنسی اور اس تقریر سے ان پانچوں کی محفل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سب ہنسنے لگے۔

"بھئی یہ صاحبزادے تو بہت دلچسپ ہیں۔"

"جی ہاں ہم سب کو دن بھر اسی طرح ہنساتے رہتے ہیں۔"

سلیمہ نے بات جو کہی تھی وہ ٹھیک تھی ان لوگوں کی پریشانی کی زندگی میں نونہال خوشی کا خزانہ تھا۔

راحت۔ "خرچ کا کیا انتظام ہو رہا ہے۔ چچا جان وغیرہ کچھ کر رہے ہیں۔"

سلیمہ۔ "کام تو چل ہی رہا ہے۔ مگر وہ لوگ تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے اور فریدہ نے ان کو کئی خط لکھے۔ مگر انھوں نے جو چپ سادھی ہے تو وہ نہیں ٹوٹی البتہ خان بہادر صاحب کے ذریعہ انھوں نے کہلوایا ہے کہ تم سب لوگ لکھنؤ آجاؤ اور جب تک بچوں کے باپ رہا نہ ہو جائیں وہیں رہو۔ اب آپ جو کہیں۔"

"شرع قانون اور رسم کی رو سے تو ہمارا ان لوگوں پر حق ہے مگر انھوں نے جائداد کے بارے میں جو کچھ کیا ہے کہ اس زمانہ میں سمن نکلوایا جب کہ میں جیل میں تھا، اس سے دل پھٹ گیا اور ان لوگوں سے مایوسی ہو گئی۔ پھر بھی وہ اپنے ہی ہیں اس میں شبہ نہیں کہ سوج پور کے لوگ ہمارا تمہارا بہت خیال کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ غیر ہیں۔"

سلیمہ کی راحت رسول سے جیل میں یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلی تو گرفتاری کے چند ہی مہینوں بعد ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد نہ کوئی ملاقات ہوئی اور نہ خط ملا۔ کیوں کہ راحت رسول کو کسی معاملہ میں یہ سزا دی گئی تھی کہ خط لکھنے اور ملاقات کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اب جاکر ملاقات کی اجازت ملی تھی۔ اس لئے راحت کو سلیمہ کے حالات کی پوری خبر نہ تھی اس کو نہ تو یہ معلوم تھا کہ سوج پور والوں کا خبر گیری کرنا کیسا۔ ان لوگوں نے تو راحت کو بالکل ہی بھلا دیا ہے۔ لالہ جی نے بڑا مکان خالی کرا کے اس کے گھرانے کو سرونٹس کواٹر میں بھجوا دیا ہے اور اس کا بھی کرایہ وصول کر رہے ہیں۔ اور سلیمہ کے گھر میں زیور اور نقدی جو کچھ بھی تھی وہ چوری ہو چکی ہے اور اب سلیمہ سلائی کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی ہے۔

یہ ملاقات صرف دس منٹ رہی اس کے بعد یہ چاروں تو ایک طرف روتے ہوئے روانہ ہو گئے اور دوسری طرف راحت رسول نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا اور پانی برس رہا تھا۔ یہ لوگ ریل سے اتر کر اکّے پر جیل تک جو آئے تھے تو ان کی رضائیاں اور کپڑے بھیگ گئے تھے اب ان ہی کپڑوں میں یہ لوگ پھر کھلے اکّے پر بیٹھ کر واپس گئے اور ان کپڑوں اور بستروں میں ریل کا سفر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب سوج پور واپس پہنچے ہیں تو چاروں کو سخت زکام ہو گیا اور کھانسی آنے لگی چھوٹے بچے اور سلیمہ کو تو بخار بھی ہو گیا۔ لیکن سلیمہ کو مجبوراً بخار میں بھی سلائی کا کام کرنا پڑا۔ اگر ایسا نہ کرتی تو گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا۔

نونہال کو جو بخار چڑھا تو پھر وہ اترا ہی نہیں۔ پندرہ دن میں وہ بہت دُبلا ہو گیا۔ سلیمہ نے اسے لے جا کر محلے کے ایک حکیم کو دکھلایا۔ لیکن ان کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ایک دن وہ برقعہ اوڑھ کر

اور اپنے تینوں بچوں کو لے کر اس انگریز ڈاکٹر کے یہاں پہونچی جس کا علاج اس وقت ہوتا تھا جب راحت رسول کپتان تھا۔ ڈاکٹر نے راحت رسول کا نام سن کر مریض کو تو دیکھ بھی لیا اور نسخہ بھی لکھ دیا اور فیس بھی نہیں طلب کی۔ لیکن نسخہ ایسا لکھا جو صرف انھیں کے دواخانہ میں بندھ سکتا تھا اور اس کے دام تھے پندرہ روپیہ سلیمہ صرف دو روپیہ لے کر گھر سے چلی تھی مجبوراً وہ نسخہ لئے ہوئے بلا دوا کے گھر واپس چلی آئی۔

پندرہ روپیہ کہاں سے آئیں۔ پورا دن اسی فکر میں گذر گیا۔ شام کو سلیمہ نے محلہ کی ایک بوڑھی عورت کو بلایا اور ...... فریدہ سے کہا کہ اس کے ساتھ تم ایک پر مشتاق احمد صاحب کے یہاں جاکر میرا خط دے آؤ۔ اور جواب لے آؤ۔

مشتاق احمد صاحب کی سیاست بدل چکی تھی۔ ایک سال سے انھوں نے جائدادوں کے خرید و فروخت کا کاروبار شروع کیا تھا اور اس سلسلے میں مستقل لکھنؤ میں رہنے لگے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ اس وقت لینا چاہیئے۔ جب وہ دولت اور ثروت میں ہندوؤں کے برابر آجائیں اور اس غرض سے مسلمانوں کو تجارت کرنا چاہیئے۔ کیوں مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب یہی ہے کہ انھوں نے تجارت چھوڑ دی ہے۔

مشتاق احمد مسلمانوں کے کانگریس میں شرکت کے خلاف تھے اور اسی اثر سے راحت رسول کے بھی خلاف ہوگئے تھے۔ انھوں نے اتنا کیا کہ جیل سے آتے ہی دوسرے تیسرے دن سلیمہ کے گھر آئے تھے۔ یہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی اس لئے دروازے پر کھڑے کھڑے خیریت پوچھی تھی۔ مقصود کو مٹھائی کھانے کے لئے دو روپیہ دیئے تھے لیکن پھر اس کے بعد

انھوں نے سال بھر کوئی خبر نہ لی۔

جس وقت فریدہ نے مشتاق احمد کو خط دیا اس وقت اتفاق سے شیخ صاحب یعنی راحت رسول کے چچا بھی وہیں موجود تھے مشتاق احمد نے پوچھا کہ آپ نے اب تک راحت کے بیوی بچوں کی خبر کیوں نہیں لی۔ وہ سنتے ہی کہنے لگے۔

"ارے خبر لوں تو کیسے لوں۔ کوئی مجھے اپنا سمجھے جب ہی تو یہ ہو سکتا ہے جب راحت رسول نے استعفا دیا اسی وقت میں نے کہا کہ بیوی بچوں کو اپنے گھر بھیج دو اور تب سے اب تک یہی کہہ رہا ہوں ارے بھائی جب اپنا گھر موجود ہے تو پرائے شہر میں اور پرائے گھر میں کیوں رہو۔"

مشتاق احمد صاحب نے فریدہ سے زبانی کہا کہ اپنی امی جان سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ شیخ صاحب آپ کے بزرگ ہیں ان کی خواہش کا پورا کرنا آپ پر فرض ہے۔ اس لئے آپ لوگ لکھنؤ چلی جائیے۔"

پھر وہ شیخ صاحب کی طرف گھوم کر کہنے لگے۔

" اور کہنا کہ شیخ صاحب کا اصرار ہے کہ وہ آپ لوگوں کو ساتھ لے کر لکھنؤ جائیں گے۔"

شیخ صاحب مشتاق احمد کے اشارے کو سمجھ گئے اور کہنے لگے۔

" ہاں ہاں۔ میں کل صبح لکھنؤ جا رہا ہوں۔ اسی وقت تک تم سب لوگ یہاں آجاؤ یا اسٹیشن پر مجھ سے مل لو۔ پھر سب ساتھ چلیں گے۔

سلیمہ نے مشتاق احمد صاحب سے پچیس روپیہ قرض مانگے تھے لیکن اس کے عوض انھوں نے یہ جواب بھجوایا۔ سلیمہ کو نہ ان کا یہ جواب پسند آیا اور

نہ شیخ صاحب کا اس طرح کا بلاوا۔ اگر واقعی وہ ان لوگوں کو ساتھ لے جانا چاہتے
تھے تو گھر پر آ کر خود ہی کیوں نہیں کہا۔ لیکن بچے کی علاج کی مجبوری ایسی تھی
کہ سلیمہ کو یہ مارے باندھے کا بلاوا منظور ہی کرنا پڑا۔

(۷)

لکھنؤ میں شیخ صاحب کی بیوی اور راحت رسول کی بھاوجوں نے
جس طرح استقبال کیا اس سے سلیمہ کو آ کر بہت افسوس ہوا۔
"جب راحت رسول کو گئے ہوئے دو سال ہو گئے تب گھر کی یاد
آئی۔"
"ارے ان کو تو گھر یاد بھی آ گیا۔ راحت رسول کو تو کبھی یاد ہی نہیں
آیا۔"
"ان کو یاد آیا ؟ کیسی بات کہتی ہو۔ ارے وہ تو کہو بچے کی بیماری نے
کہا کہ چلو لکھنؤ چلو۔ جب ہارے تو چلے نا یا رے۔"
یہ باتیں یوں کڑوی بھی تھیں اور بہت کڑوی بھی تھیں۔ لیکن جس
لہجے سے وہ کہی گئی تھیں اس میں تو کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا۔
سلیمہ ہوا پنے خاص عزیزوں کی طرح نہیں بلکہ غریب اور بے سہارا
عزیزوں کی طرح نچلی دالان میں ٹھہرایا گیا۔ اور صرف پہلے دن کھانا دسترخوان

پر ملا اس کے بعد سینی میں لگ کر آنے لگا۔ دو روز تک تو پورا خاصے کا کھانا آیا۔ پھر اس میں فیجا ترمیم ہو گئی۔ وہ یہ کہ گوشت صرف ایک وقت ہو گیا۔ ایک وقت صرف دال آنے لگی۔

چار دن گزر گئے اور بچے کی علاج کی کوئی فکر نہیں کی گئی۔

حالانکہ سلیمہ نے لکھنؤ آتے وقت ریل پر اس کی حالت چچا جان کو تفصیل سے بتا دی تھی۔

البتہ بچے کی بیماری دیکھ دیکھ کر خوب خوب فقرے کسے گئے۔

"ارے اگر آج راحت رسول کپتان ہوتا تو ایک سے ایک بڑا انگریز ڈاکٹر اور سول سرجن اور جانے کون کون آتے۔"

مگر اب اپنے شوہر کی سیاست کی وجہ سے بچاری سلیمہ معمولی سے حکیم کو بلانے سے بھی معذور رہی۔

پھوپی جان بہت ہمدردی سے بولیں "حکیم کی بات اچھی کہی تم نے بیٹی—

ڈاکٹر کا علاج تو مہنگا بھی ہوتا ہے اور گرم بھی۔ کسی حکیم ہی کو بلا کر دکھا دیا جائے۔"

اس کے بعد گھر بھر نے رائے زنی شروع کر دی۔

"ہر موئے جھوائی ٹولہ والے حکیم کو نہ بلانا وہ تو سول سرجن کے برابر کی فیس لیتے ہیں۔"

گلی میں جو حکیم بیٹھے تھے۔ وہ تو صرف ایک روپیہ فیس کا لیتے ہیں۔ اور ان کے مطب میں جا کر دکھلاؤ تو بلا فیس کے دیکھ لیتے ہیں۔

"سب سے اچھا علاج تو شاہ مینا کے ہسپتال کا ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر دیکھتا ہے اور اچھی سے اچھی دوا ملتی ہے۔ لیکن نہ فیس نہ دوا کی قیمت۔"

"مگر یہ وہاں پر کیوں دکھلانے لگیں وہ سرکاری ہسپتال ٹھہرا اور یہ ٹھہریں سرکار کا بائیکاٹ کرنے والی۔"

یہ سب باتیں آپس میں ہوتی رہیں۔ دوا دو تین دن تک یوں ہی چلتی رہی۔ یہ باتیں کی تو اس طرح جاتی تھیں گویا کہ وہ ہرگز اس غرض سے نہیں ہو رہی ہیں کہ سلیمہ ان کو سنے۔ لیکن پھر بھی ایسے حساب اور انداز سے کی جاتی تھیں کہ سلیمہ کے کانوں میں ایک ایک لفظ پہونچ جاتا تھا۔

راحت رسول کی بڑی پھوپھی ابھی زندہ تھیں۔ وہ بہت بوڑھی ہو گئی تھیں اور بڑھاپے کو جانماز اور پنج سورہ کے نذر کر چکی تھی۔ لیکن ہر نماز کے بعد آکر وہ بچے پر پھونک ضرور ڈال دیتی تھیں۔ اور جو دوا سمجھ میں آتی تھی اپنے پیسوں سے منگوا کر پلاتی تھیں۔ مگر جب ان دواؤں سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو انھوں نے شیخ صاحب سے سلیمہ کے سامنے کہا۔

"ارے اس موئے بچہ کا کیا ہوگا۔ ہر وقت بخار میں پڑا پھنکتا ہے۔"

پھوپھی کے اس طرح دخل دینے پر دوسرے دن صبح کو ایک حکیم صاحب آئے انھوں نے نبض دیکھی، حال سنا اور پھر نسخہ تجویز کیا۔ پھوپھی نے فوراً تین دن کے نسخے اسی وقت منگوا دیئے۔ جب سلیمہ دوائیاں لے کر ان کو پکانے باورچی خانہ پہونچی تو مغلانی نے دکھائی سے کہا کہ ابھی چولھا خالی نہیں۔ سلیمہ چولھے کے خالی ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ چولھا خالی ہوا تو جاکر بارہ بجے خالی ہوا۔ اس وقت تک بچے کو غذا دی جا چکی تھی اس وجہ سے جب دوا کا وقت نہیں رہا۔ لیکن اس پر بھی خادمہ

نے بلا سلیمہ کے کہے دوا پکا دیا۔ شام کو جب دوا پلانے کا وقت آیا اس وقت وہ بہت ٹھنڈی ہو چکی تھی اور پھر وہی سوال تھا کہ چولھا خالی نہیں ہے۔ خادمہ کو بہت ڈانٹا۔ اس کی ڈانٹ سن کر پھوپھی بھی باورچی خانے میں آ گئیں اور انھوں نے چولھے سے اپنے سامنے کوئلے نکلوا کر الگ رکھوائے اس پر دوا رکھوا دیا تب جا کر وہ گرم ہوئی اور بچہ کو دی گئی۔

بچہ کو حکیم صاحب کی بتائی ہوئی دوا تو ملی پر ان کی بتائی ہوئی غذا نہ ملی۔ غذا میں حکیم صاحب نے خاص طور سے انار کا عرق بتلایا تھا وہ تو ایک دن بھی نہ ملا۔

جب حکیم صاحب کی دوا سے فائدہ نہ ہوا۔ تو پھر شیخ صاحب کی بہوئیں شاہ مینا کے اسپتال کی باتیں کرنے لگیں۔ جہاں ڈاکٹر مفت دیکھتے تھے اور دوا مفت ملتی تھی۔

سلیمہ کو معلوم تھا کہ لکھنؤ میں راحت رسول کے بہت سے دوست ہیں جس میں چار پانچ، ڈاکٹر بھی ہیں۔ لیکن اس کو ان کے نام معلوم تھے اور نہ پتے معلوم معلوم تھے اور دو ایک ڈاکٹر جن کے نام معلوم تھے۔ ان کے پتے نہیں معلوم تھے۔ سلیمہ نے شیخ صاحب کے صاحبزادوں سے بار بار کہا کہ راحت رسول کے دوستوں کو خبر کر دو کہ میں یہاں ہوں اور جن دوستوں کے نام معلوم تھے ان کے نام بھی سلیمہ نے بتا دیے۔ لیکن کسی صاحبزادے نے بھی اس کی فرمائش پر ہاں نہیں کی۔

اب بچے کی بیماری بہت زور پکڑ گئی تھی اور وہ بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے ہر وقت روتا رہتا تھا اس رونے پر بھی ہر وقت اعتراض ہوتے تھے۔ "تو بڑا رونا ہے۔ اس کی وجہ سے تو نیند حرام ہو جاتی ہے ہمارے"

"کیا باجا ہے کہ ہر وقت بجتا رہتا ہے۔"

ان باتوں سے اور بچے کی بیماری سے سلیمہ کا دل کٹا جاتا تھا۔ لیکن وہ فریدہ اور مقصود کے خیال سے اپنے اوپر بہت جبر کرتی تھی۔ اور کسی وقت بھی پریشانی ظاہر نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کے آنسو ضرور کئی مرتبہ جھلک آتے تھے۔ خاص کر رات کو تو وہ کئی مرتبہ باقاعدہ روتی تھی۔

ایک دن سلیمہ نے عشاء کی نماز کافی رات گئے پڑھی اور نماز کے بعد دعا مانگنے لگی۔ دعا میں اسے ایسا رونا آیا کہ قابو سے باہر ہو گیا۔ مجبوراً اس نے منھ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تاکہ آواز نہ نکلے۔ لیکن اس پر بھی آنسو اور ہچکیوں کی آوازیں نکل ہی گئیں۔ وہ سجدے میں گر پڑی۔ یہ گرنا ارادے سے نہیں ہوا بے قابو ہو کر سرزد ہوا۔ اس وقت اس کو سر پر ہاتھ کی ہلکی سی تھپک محسوس ہوئی اور پھوپھی کی آواز آئی۔

"رو نہ بیٹی۔ خدا کی مرضی سے برا وقت پڑا ہے تو خدا کاٹ بھی دے گا۔ ان لوگوں کا تو خون سفید ہو گیا ہے۔ میرا بھی سارا پیسہ دبا لیا ہے ان کم بختوں نے۔"

اس دن سے پھوپھی نمازیں اور پنج سورہ کے کاموں سے وقت نکال کر بچے کے پاس بیٹھنے لگی اور سلیمہ کا تیمارداری میں ہاتھ بٹانے لگیں۔ انھوں نے بھی یہ مشورہ دیا کہ برقع پہن کر چپکے سے چلی جاؤ اور بچہ کو سرکاری اسپتال میں دکھلا آؤ۔ چھپ کر جاؤ کیوں کہ شیخ صاحب اگر سنیں گے کہ ان کی بہو خیراتی اسپتال میں ان کے پوتے کو دکھلانے گئی تو اس سے ان کی شان میں بٹا لگے گا۔ اور وہ بہت ناراض ہوں گے۔

پھوپھی کے کہنے سننے پر سلیمہ آخر اسپتال جانے پر تیار ہو گئی۔ لیکن

جب وہ جانے والی تھی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ مولانا عبدالقدوس جیل سے
رہا ہو کر آئے ہیں اور راحت رسول کا سلام لائے ہیں۔ سلیمہ نے فریدہ کو ان کے
پاس بھیجا۔ مولانا نے جب راحت رسول کی باتیں کیں تو فریدہ کے آنکھوں میں آنسو
بھر بھر آئے۔ پھر مولانا نے ذرا پیار سے جو گھر کی خیریت پوچھی تو فریدہ پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی۔ بات یہ ہوئی کہ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ امی لکھنؤ آکر
بہت پچھتا رہی ہیں اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی ہیں۔ اللہ اگر ان کے پاس واپسی
کا کرایہ ہوتا اور سورج پور میں کچھ بھی سہارا ہوتا تو وہ فوراً واپس چلی جاتیں۔

مولانا نے فریدہ کی دل دہی کی تو اس نے سب کچھ اگل دیا۔ مولانا نے
کہا کہ بیگم صاحبہ سے کہنا کہ اس وقت تو میں جا رہا ہوں کل اپنی بیوی کو لے کر
آؤں گا اس دن شام کو آپ سب کو اپنے گھر لیے جاؤں گا۔ راحت صاحب نے کہا کہ وہ مجھے سگے بھائی
کی طرح سمجھتے ہیں اور میں جو ان کے گھر کے لئے مناسب سمجھوں بلا کسی جھجک کے کر سکتا ہوں۔

فریدہ نے آکر جب یہ باتیں سلیمہ کو بتائیں تو وہ سخت فکر میں پڑ گئی۔
وہ مولانا کی باتوں سے یہ سمجھی کہ وہ مجھے سورج پور لے جانا چاہتے ہیں۔ سوچنے لگی
کہ مولانا کہتے ہیں کہ ان کو انھوں نے سگا بھائی کہا ہے۔ ضرور ایسا کہا ہوگا۔
مولانا غلط نہیں کہیں گے۔ لیکن وہ لاکھ زبان سے سگا بھائی کہیں پر ایسا کہنے سے
وہ سگے بھائی ہونے سے رہے۔ میں تو وہ نامحرم ہی۔ پھر ان کے گھر میں ہی کیسے رہیں
گی۔ اور کن لوگوں کے سہارے رہوں گی۔ فریدہ لڑکی ہے۔ لڑکا ہوتی تو تیرا
اس کا ساتھ ایک طرح کا ساتھ ہوتا۔ لیکن اب تو وہ بھی ایک
نازک چیز ہے

پھوپھی سلیمہ کی سچی ہمدرد تھیں اس لئے سلیمہ نے ان کو سب معاملہ

بتا دیا۔ یہ بات پھوپھی کو بھی پسند نہ آئی کہ سلیمہ گھر چھوڑ کر غیر شہر جا کر غیروں
میں رہے۔ ان کی رائے تھی کہ جب تک راحت نہیں آ جاتے سلیمہ کو چاہیے جو بھی
ہو جائے، اپنے ہی گھر میں رہنا چاہیئے۔ خاندانی عورتوں کا یہی طریقہ ہے۔ اگر یہاں
نہ رہ سکتی ہو تو پھر میکے چلی جاؤ۔ ان دونوں راستوں کے علاوہ اور کوئی راستہ
نہیں۔ یہ یاد رکھو کہ تمھارے ساتھ لڑکی بھی ہے۔

پھوپھی کی رائے سن کر سلیمہ نے کسی حد تک ارادہ کر لیا کہ مولانا کے ساتھ
نہیں جاؤں گی۔ لیکن ایک سوال یہ تھا کہ نہ جانے کے معنی بچے کی جان سے ہاتھ دھو بیٹھنا۔
سلیمہ اتنی پریشان رہی کہ اس کو رات بھر نیند نہیں آئی۔

مولانا عبدالقدوس نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا اور دوسرے دن دس
بجے تک وہ مع اپنی بیوی کے آ گئے۔ بیوی اندر آ گئیں اور انھوں نے کہا کہ مولانا
نے کہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ پرائی جگہ جانے میں کیا کیا قباحتیں ہیں۔ لیکن راحت
صاحب نے کہا ہے کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب زمانے
کے جو حالات ہیں، ان میں پرانے رشتے ناتے کام نہیں دیں گے اور خیالات کی بنا
پر جو نئے رشتے بنیں گے وہی کام دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے
کہ اب لوگ مجھے پنڈت راحت رسول کہتے ہیں اور مشہور کر رکھا ہے کہ میں نے
اپنی شدھی کرائی ہے اور یہ کہ سرکار پرست عزیز مجھ سے اتنے خفا ہیں کہ وہ یہ
ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ میں ان کا عزیز ہوں اس لئے ۔۔

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی

مولانا نے ایک رومال بھیجا اس پر راحت رسول نے کوئلے سے مذکورہ
مصرع لکھ دیا تھا وہ کوئلہ کافی جھڑ گیا تھا لیکن پھر بھی مصرع پڑھا جا سکتا تھا

سلیمہ نے خط پہچان لیا۔ اس رومال نے سلیمہ کا سارا تذبذب دور کر دیا۔ سلیمہ نے شیخ صاحب سے کہا کہ انھوں نے مجھے لکھا ہے کہ سورج پور ہی میں رہوں۔ اس لیے میں وہیں جاتی رہوں۔

چچا جان کے گھرانے والوں کے طعن تشنے، اجلے کٹے فقرے، اور ان کے ساتھ ساتھ اس بات پر خوشی کہ سلیمہ کی بلا گئی۔ اسی فضا میں سلیمہ بچوں کو ساتھ لے کر راحت کے خاندانی گھر سے رخصت ہو گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو پھوپھی نے آکر آبدیدہ ہو کر گلے سے لگایا، دعائیں دیں اور کہا کہ خدا پر بھروسہ رکھو۔ سب مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ پھر انھوں نے ایک پرانا سا بٹوا دیا اور کہا کہ یہ میرا بٹوا ہے۔ میں اسے استعمال کے لیے نہیں دے رہی ہوں۔ صرف اس لیے دے رہی ہوں کہ تم اسے میری یادگار اور اپنے ایک بزرگ کے تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھنا۔ اور کوئی ایسا ہی وقت پڑے تو اسے کھول کر سامنے رکھنا اور خدا سے دعا مانگنا۔"

سلیمہ کا خیال غلط تھا کہ مولانا اسے سورج پور لے جانا چاہتے ہیں۔ مولانا نے سلیمہ کو لکھنؤ کے ایک مسلم محلہ میں جہاں شرفا رہتے تھے لا کر ایک چھوٹے سے گھر میں اتار دیا۔ سلیمہ کی گھرستی اور سامان انھوں نے سورج پور جا کر موہن جی کے گھر سے لا کر پہلے ہی رکھ دیا تھا۔

"میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ شیخ کے یہاں آپ کو ٹھہراؤں کہ راحت رسول صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو لکھنؤ میں رکھا جائے۔ کیوں کہ شاید یہ بات شیخ صاحب کو ناگوار ہوتی کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے آپ ان کے گھر میں نہ رہیں۔ یہ محلہ مسلمانوں کا ہے۔ سب شریف ہیں۔ سب لوگ آپ کا خیال رکھیں گے اور امید ہے کہ شکایت کی کوئی بات نہ ہوگی۔

سلیمہ کے دل نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ شکایت کی کوئی بات نہیں ہوگی لیکن یہاں سوال یہ تھا کہ آمدنی کا ذریعہ کیا ہو۔ سلیمہ کو یقین تھا کہ چوں کہ میں نے راحت کو زیوروں کی چوری کے بارے میں کچھ لکھا نہیں تھا اس لئے ابھی مولانا کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہوگی کہ میں اب بالکل بے پیسہ ہوں۔ ادھر مہینوں سورج پور میں گزر بسر صرف سلائی پر ہوتی تھی۔ یہاں اس محلے میں کام کہاں سے ملے گا۔

سلیمہ نے اس سامان کا جائزہ لیا سورج پور سے آگیا تھا۔ اتفاق سے اس میں دو تین دن بھر کا اناج نکل آیا۔ لیکن اناج سے کیا ہوتا ہے ایندھن بھی تو چاہیئے اور بچے کی دوا علاج کے لئے پیسہ بھی تو چاہیئے۔

لیکن مولانا عبدالقدوس نے آتے ہی نونہال کو اسپتال لے جاکر دکھلا دیا۔ اور دوا بھی لے آئے۔ وہ دو دن تک لکھنؤ میں رہے اور اس زمانے میں دوا لاتے رہے ان کے جانے کے بعد یہ کام فریدہ کرنے لگی اس علاج سے نونہال ذرا سنبھل گیا۔

آخر سلیمہ اور فریدہ نے ان تمام لوگوں سے جو اس سے ملنے آتے جن سے ملنے یہ دونوں خود گئیں، صاف صاف کہہ دیا کہ ہم سلائی کا کام کرتے ہیں۔ لیکن اس محلے میں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے تھے جن کے کپڑے خود ان کے گھروں میں سیے جاتے تھے۔ اس لئے ان لوگوں سے تو کام نہیں بنا۔ لیکن محلہ میں ایک چکن کے کرتوں اور ٹوپیوں کا کارخانہ تھا رفتہ رفتہ وہاں سے کام ملنے لگا۔ اس کے کام میں پیسے کم ملتے تھے لیکن کام برابر ملتا رہتا تھا۔

اب فریدہ بھی کافی ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اس طرح گھر چلنے لگا۔

(۸)

ٹوپی کے پلوں کی مشین سے بخیہ کرکے ٹوپی تیار کرنا اور کرتوں پر تریائی کرنا یہ کام تو بہت ملتا تھا اتنا کہ ماں بیٹی دونوں صبح تڑکے سے رات چراغ جلے تک مسلسل اسی میں لگی رہتی تھی لیکن اس کے باوجود بھی دونوں کو دال روٹی سے زائد نہیں ملتا۔ اور جب یہ کارخانہ والے سے مزدوری بڑھانے کو کہتیں تو وہ جواب دیتا کہ دوسرے اس سے بھی کم پر کام کرنے کو تیار ہیں۔ سلیمہ جانتی تھی کہ یہ بات اس کی ٹھیک ہے۔ کیوں کہ بہت سی عورتیں جو اچھا خاصا کام کر سکتی تھیں وہ بھی سلیمہ کے پاس آ آ کر کہتی تھیں کہ کام کچھ زیادہ ہو تو ہم کو دے دو۔

راحت کے خاندان کی چکن کے کپڑوں کی سلائی اور تریائی سے لسٹم پسٹم گزر ہو رہی تھی کہ ایک بہت بڑا حادثہ ہو گیا۔ شبرات کا تہوار آیا۔ مقصود نے بہت ضد کرکے ماں سے دو پیسے لئے اور ان کے پٹاخے لایا ایک پٹاخا چھوٹ کر اچکا اور اچک کر اس گٹھری پر جا کر پڑ گیا۔ جس میں ٹوپی کے پلے تھے مقصود اور فریدہ ان دونوں کی نظر اس پر نہیں پڑی ذرا دیر میں جب گٹھری جلنے لگی تب ان دونوں نے دیکھا اور دوڑ کر پانی ڈالا مگر اتنی دیر میں بہت سے پلے جل چکے تھے اور بہت سے داغ دار ہو گئے۔

سلیمہ اور فریدہ نے جو یہ دیکھا تو دونوں کے حواس غائب ہو گئے رات

کو سلیمہ فریدہ کو لے کر کارخانہ والے کے گھر گئیں اور اس سے یہ بات بتلائی۔ وہ سخت پڑ گیا اور کہا کہ میں تو ان بیلوں کے دام لے کر رہوں گا۔ جب سلیمہ نے بہت خوشامد کی تو اس نے حساب جوڑ کر کہا اچھا لاگت کے دام دے دو اور کل ہی دے دو اگر ایسا نہ کیا تو میں بے عزت بھی کروں گا اور چوری کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے بھی کر دوں گا۔

سلیمہ کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح اس نے فریدہ کو بھیج کر مولانا عبدالقدوس کے سالے صالح کو بلا بھیجا۔ کیوں کہ مولانا عبدالقدوس کوئی مہینے سے باہر وعظ کہنے کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ ان کی بھی بہت چھوٹی حیثیت تھی۔ تین بائیسکلیں کرایہ پر چلاتے تھیں اور سائیکل کی مرمت وغیرہ کرتے تھے ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں جو سلیمہ کی مدد کرتے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کارخانہ دار بہت سخت آدمی ہے۔ جو کہتا ہے وہ کرے گا ضرور۔ اس لئے تم اس کو میری ضمانت پر مہاجن سے قرض لے کر روپیہ ادا کر دو پھر مہینے مہینے اسے ادا کر دینا۔ یہ تجویز بہت ٹیڑھی تھی سلیمہ قرضہ سے بہت گھبراتی تھی اور سودی قرض کو تو وہ برا بھی سمجھتی تھی۔ لیکن بندھا خوب مار کھاتا ہے۔ اب اس کے بدن پر نہ کوئی زیور تھا اور نہ صندوق میں کوئی دھراؤ جوڑا جو بیچ کر کچھ ادا کر سکتی۔ سلیمہ نے آنکھوں کے آنسو پونچھ کر ہاں کہہ دیا۔

صالح اور اس کا ایک ترہ کا ضامن بنے اور مہاجن سے روپیہ لے آئے۔ کارخانہ دار کو ادا کر دیا گیا۔ لیکن اس قرضے کے بوجھ سے سلیمہ کی ہنسنا بالکل ختم ہو گئی۔

لکھنؤ میں تین مہینہ رہنے کے بعد ان لوگوں کو اپنے کھانے اور رہنے

کا معیار بہت گرا دینا پڑا تھا۔ گوشت ہفتہ میں ایک مرتبہ رہ گیا تھا باقی دن صرف دال روٹی پر کٹتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دال سے گھی بھی غائب ہو گیا تھا۔ جب پہلے دن دال تیل سے بگھاری گئی ہے تو فریدہ نے بہت ناک بھوں چڑھا کر کھائی تھی۔ لیکن جس دن سے مہاجن کا قرض چڑھا اس دن سے دال کے اندر سے تیل کی بگھار بھی گئی۔

دن کٹتے رہے۔ ان دنوں میں سے ایک دن سلیمہ کو کھانسی آئی۔ آئی تو پھر ایسی آئی کہ اس نے پیچھا ہی نہ چھوڑا کہ رات کو دو تین بار کھانسی کے مارے آنکھ کھل جاتی تھی۔ علاج؟ علاج کے لئے پیسہ کہاں سے آئے۔

مقصود اب کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ صالح نے اس کا نام محلے کے پرائمری اسکول میں لکھوا دیا۔ وہاں سے دوسرے دن وہ ایک پرچہ لایا جس پر کتابوں کے نام کاپیوں کی تعداد لکھی ساتھ ساتھ سلیٹ۔ پنسل۔ قلم اور ربڑ وغیرہ۔ یہ سب کہاں سے آئے؟ دو تین دن جو مقصود بلا اس سامان کے گیا تو استاد نے اسے مرغا بنا دیا۔ وہ گھر آ کر اس ذلت پر بہت رویا۔

تیسرے دن وہ کسی طرح اسکول جانے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن سلیمہ نے ٹیچر کے نام خط دے دیا کہ دو چار روز میں سامان آ جائے گا اتنے دنوں کے لئے اسے معاف کر دیجئے۔ یہ خط لے کر وہ راضی ہوا اور ڈرتا ہوا اسکول گیا۔ لیکن اس دن دو لڑکے اسے گود میں لے کر آئے اور کہا کہ کبڈی کھیلنے میں وہ ہاتھ کے بل گر گیا۔ اس سے ہاتھ میں چوٹ آ گئی۔

مقصود بے طرح کراہ رہا تھا۔ پھر فریدہ کے ذریعہ صالح صاحب

کو بلایا گیا وہ منصور کو لیکر اس کے پر اسپتال گئے۔ وہاں سے دو گھنٹے بعد خبر لائے کہ منصور کے
ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اسلئے اسکو اسپتال میں بھرتی کر لیا گیا ہے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ آپریشن
کرنا پڑے لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں ہے مگر کسی کو بچے کے پاس رہنا چاہیئے۔

اب کون جائے اسپتال۔ نونہال بھی اتنا کمزور بچہ تھا کہ اسکو بھی بیمار ہی سمجھنا چاہیئے
اسپتال میں جانا ہی ضروری نہیں یہ بھی ضروری ہے کہ سلائی کا کام کیا جائے تاکہ سب طرح اطمینان ہو
سلیمہ نے فریدہ کو ملازم کے ساتھ اسپتال بھیجدیا اور خود سلائی میں لگ گئی سلیمہ کی
پریشانیاں اس وقت حد سے گزر گئیں جب مہاجن نے آکر تقاضہ کیا کہ اس مہینے اگاہی کی
قسط نہیں پہنچی ہے اور دوپہر کو آکر مکاندار نے تقاضہ کیا کہ دو مہینے سے کرایہ نہیں پہنچا ہے۔
شام کے قریب اسپتال سے فریدہ یہ کہنے گھر آئی کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اور سب چیزیں
تو اسپتال سے مل جائیں گی لیکن یہ ایک دوا تم بازار سے خرید لاؤ۔ سلیمہ نے فریدہ کو خالی ہاتھ
یہ کہکر واپس کر دیا کہ دوا کے بجائے میری دعا کام کرے گی۔

ٹوپی کا کارخانہ دار اب ایک اور حرکت کرنے لگا تھا وہ کام لے کر خود آتا رات گئے
آتا اور باہر ڈیوڑھی پر کھڑے ہو کر سلیمہ سے دیر تک باتیں بنایا کرتا سلیمہ اسکو ٹالنے کی ہر
ممکن کوشش کرتی لیکن وہ گھنٹہ پون گھنٹہ سے پہلے نہ جاتا کبھی کہتا کہ کوئی چیز اپنے ہاتھ
کی پکائی ہوئی کھلا دیجئے۔ کبھی یہ کہ مجھ سے کسی چیز کی فرمائش کیجیے۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا کہ کافی رات گئے وہ آیا۔ اس دن فریدہ بھی نہیں تھی اسلئے
سلیمہ نے اسکو ٹالنے کے لئے کہا کہ میرے بچے کی طبیعت اچھی نہیں ہے وہ اسپتال میں ہے اور میں
اس کے پاس جا رہی ہوں اسلئے آج کام نہیں لوں گی کل کسی وقت منگوا لوں گی لیکن چکن کی
دکان والا اس پر بھی کھڑا رہا کبھی پوچھتا کہ بچہ کیسا ہے۔ کبھی کہتا کہ چلئے تو میں اسپتال ہو آؤں

آخر سلیمہ نے دروازہ کے پاس آ کر ذرا تیزی سے کہا کہ "اگر تم ایسے ہی مہربان ہو تو صلاح بھائی کو بلاؤ ان سے کچھ کام ہے اور اگر اتنا بھی نہیں کر سکتے ہو تو جاؤ تاکہ میں ان کے پاس جاؤں جب تک تم کھڑے ہو میں باہر نہیں نکلوں گی"۔ سلیمہ نے بہت مشکل سے اپنے غصے کو ضبط کیا محض اس خیال سے ضبط کیا کہ اگر اسنے کام دینا بند کر دیا تو پھر زندگی کیسے چلے گی ورنہ اسکے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ سلیمہ کے لہجے کی تیزی چکن کے کارخانے والے نے بھانپ لی اور وہ چلا گیا اسکے جانے کے بعد سلیمہ نے اپنے غصے کو بجھانے کیلئے پانی پینا چاہا۔ اس وقت اسکو پتہ چلا کہ گھڑے میں پانی نہیں ہے جب سے سلیمہ اس گھر میں آئی تھی اسکا ایک بڑا مسئلہ تھا پانی کا اس گھر میں نہ نل تھا نہ کنواں نل گلی میں گھر سے کافی دور تھا وہاں سے چھوٹی بالٹی میں بھر کر مقصود کو پانی لانا پڑتا تھا وہ اس کام سے بہت گھبراتا تھا۔ لیکن سمجھا بجھا کر ڈانٹ ڈپٹ کر اس سے یہ کام لے لیا جاتا تھا جب وہ اسکول جانے لگا تو یہ کام ایک وقت فریدہ کرنے لگی۔ آج دونوں اسنپیاں میں تھے تو پانی آیا ہی نہیں۔ پانی بھی جو پینے کو نہ ملا تو سلیمہ کا دل کچھ اس طرح سے ٹوٹا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سوتا پھوٹ نکلا وہ بلا آواز کے بلک بلک کے رونے لگی لیکن منہ نیچے روتے اسکو وہ رات یاد آئی جب وہ راحت کے ساتھ موٹر پر لکھنؤ سے سوچ پور جا رہی تھی اور راستہ میں راحت نے شکرانے کی نماز پڑھی تھی اسوقت رات کے تاریک سناٹے میں خدا کو گواہ بنا کر ان دونوں نے ملک قوم کی خاطر قربانیاں کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیا اس فیصلے کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ چھوٹے ہنسی خوشی جھیلو ۔۔ وہ رات سلیمہ نے سوچنے میں کاٹ دی صبح محلے کی ایک لڑکی کو خوشامد کر کے صلاح صاحب کو بلوایا اور انکو خط دیکر شیخ صاحب کے گھر پھوپھی کے پاس بھیجا پھوپھی بھی سخت بیمار تھیں لیکن انھوں نے خط پڑھوایا پڑھ کر چاک کر ڈالا اور جواب میں ایک بند لفافہ بھیجا اور زبانی دعا کہلوا دی۔

سلیمہ نے وہ لفافہ دھڑکتے دل سے کھولا اس میں ایک لپٹا ہوا کاغذ تھا وہ کھولا تو اسکی تہوں میں سے ایک سونے کا چھلا نکلا۔ سلیمہ پھوپھی کی اس محبت سے بہت متاثر ہوئی اس چھلے نے ماں پریشانیوں کی چند گرہیں کھول دیں اور دن کٹنے لگے ۔۔ پہلی جلد ختم ہوئی

(ملاحظہ فرمایئے دوسری جلد)

ملنے کا پتہ: کتاب دان ۲۱/۳ ریور بینک کالونی ۔۔ لکھنؤ